

عشق نامہ
رحمید

نچا کہا یاں آپ بیٹیاں بگ بیٹیاں

سنگرزشت

ماہنامہ

اگست 2012

گلشن عالی

معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK

سوزِ عشق: حوالہ دہی خیلوی کے عشق ناکام کا قصہ

عشق مسلسل: پاکستانی ڈاکٹر اور برطانوی شہزادی کے عشق لا حاصل کی روداد

عشق نگین: 80 سال کے حصہ 25 سال کی اماکارہ کے دھاکا خیر عشق کا حوالہ

ان کے علاوہ بھی بہت ساری معروف و غیر معروف ہستیاں کی داستانِ عشق ناکام

سرگزشت
ناکام عاشق
امدادہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

عشق پیرانہ سالی
عشق رنگیں
مریم کے خان

اس شہر موصوفہ کا نگہ کیا جس
نے پیرانہ سالی سے عشق کیا

عشق کتھا
سرابِ عشق
نسیم منصور

بالی ووڈ کی معرکہ اداکارہ
کے ناکام عاشق کی داستان

بیان عشق
شکست عشق
ابن کبیر

ایک یورپی شہزادی
کے ناکام عاشق کی کتھا

گفت و شنید
شہر خیال
مدیرِ اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

ذکر عشق
سوزِ عشق
تنویر ریاض

پاکستان کا بچپان کج جانا
والے لگو کار کی روداد پرست

فلمی الفیلہ
علی سفیان آفاقی

فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں،
معروف فلم کار کے حقیقی شبِ دروز

عشق مسلسل
لصف ملک

ایک پاکستانی فلم لائبریری
شہزادی کی داستانِ عشق

شخصیت عشق
مجزوبِ عشق
ناکھڑ ساجد امجد

معروف فلسفی کے
ناکام عاشق کی روداد قصہ سیراد

مانہ عشق
عشق بے چین
منظر امام

ماضی قسز کی بیوی کوئین
کے عشق ناکام کی داستان

احوال عشق
عشق کم نصیب
صائمہ اقبال

میر کا صد کی بیوی
کے عشق کی دلچسپ کتھا

کین سالہ عشق
دو عہدِ دروغ
قارئین

نمائے بدلتے رہے گرجے عشق
میں کوئی تب یوں نہیں آئی

اصل عشق
عشق حقیقی
زین مہدی

عشق مجازی عشق حقیقی تک
سفر کرنا والے حافظ کی کہانی

عشق ظالم
خیرِ عشق
نسیم رضامہر کی

ہذا ظالم و جاہل بہت مگر
وہ بھی عشق کے ہاتھوں ناکام ہوا

دوسری سچ بیانی
اصولِ عشق
شہابینہ

آپ نے محبت کی گئی آپ لیے پھول
کی جیتی تیرے کا جگر کاٹ گیا

پانچویں سچ بیانی
عشق نامکمل
خرم و حاجات

اے ایک کس کی تھی شہزادی
اور یہ خواہوں میں رہتا تھا

روایتی عشق
دشمنِ عشق
نوال فقار و شکیلانی

داستانِ عشق جسے ناکامی
نے لائے والے بسا دیا

معاشرت
سراب
کاشف زبیر

بے مثل و ولولوں سے گندمی تھلکہ
خیز داستان، ابورکھ کر نے والی تحریر

تیسری سچ بیانی
عشق کی انتہا
نیلقریاسمین

عشق دو الگ نصف میں نہیں،
ایک نصف میں بھی ہو جاتا ہے

چھٹی سچ بیانی
معراجِ عشق
ارشاد علی

ایک جدا گانہ تلاش کی
دلچسپ سچائی عشق کا گانہ تلاش

اقسام عشق
عشق شش جہت
عافیہ فاروقی

عشق کی بہرے اس کی میں
ہیں لپٹی سیرے چن کا نذر کر

پہلی سچ بیانی
عشق نامتناہی
صبیح یار خان

مشرق و مغرب کے
دو دل مسل نہ کے

چھوٹی سچ بیانی
پیلا عشق
احمد رضا

دو معصوم دل، پچھٹنے کا کرب
جھیلنے کے لیے زندہ ہیں

ساتویں سچ بیانی
تقدیرِ عشق
شاہین لظہر

اس عشق کی نہیں
عشق نبھا کر دکھایا



1722 عیسوی میں شیخ پورہ ضلع کے گاؤں چند پالہ شیر خاں میں سید قطب شاہ کلید شاہ کے گھر ایک بچے نے جنم لیا۔ سید قطب شاہ بہت بڑے عالم فاضل تھے مگر خاندان سادات سے تعلق ہونے کی وجہ سے علم کی قدر کرنا جانتے تھے۔ درس و تدریس سے خصوصی لگاؤ تھا۔ بچے کا نام اپنی پسند سے وارث علی رکھا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اسے تعلیم کی جانب راغب کیا۔ ابتدائی تعلیم خود ہی۔ حرف چچی سے روشناس کے بعد غور کیا جانے لگا کہ اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے کہاں بھیجا جائے۔ بالآخر خرقہ عقال قصور کا نکلا اور اسے قصور بھیج دیا گیا تھا کہ وہ اس دور کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے یعنی کسی مستند استاد سے پڑھ سکے۔ وہاں مسجد کوٹ میں مولانا غلام نبی الدین درس دیا کرتے تھے۔ دور پار کی رشتہ داری بھی تھی پھر ان کے نام کی شہرت ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ وارث علی کو انہی کی شاگردی میں دیا گیا تھا۔ شاگرد میں قابلیت ہوتو استاد کو درس میں مزہ آتا ہے۔ انہوں نے وارث علی کو جرہ جرہ علم کا دریا پلانا شروع کر دیا۔ عمر کے ساتھ قابلیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہیں وارث علی کی دوستی بھٹلے شاہ سے ہوئی اور انہوں نے مولانا غلام مرتضیٰ قصوری کے پاس قصور جانے کا منصوبہ بنایا۔ قصور کے مولانا غلام مرتضیٰ کا بڑا شہرہ تھا۔ دور دور سے طلباء کھینچے چلے آتے تھے۔ درس میں ایک انبوہ کثیر شامل ہوتا تھا۔ قصور پہنچ کر یہ دونوں بھی ان کے درس میں شامل ہونے لگے، کئی سال کے بعد مولانا مرتضیٰ قصوری نے کہا کہ اب آپ اس قابل ہو چکے ہیں کہ دوسروں کو درس دے سکیں۔ آپ فارغ ہو چکے ہیں۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پاک پتن میں حضرت بابا فرید گنج شکر کے مزار پر پہنچے اور منازل سلوک طے کرنے کے جتن میں لگ گئے۔ منازل سلوک طے کرنا آسان نہیں ہے۔ روکی سوچی وہ بھی صرف ایک وقت کھاتے، روزے پے روزہ رکھتے اور عبادت میں وقت صرف کرتے، جب سلوک کی منزل طے ہوگئی تو مزار مبارک کے گدی نشین دیوان صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور نئی منزل کی تلاش میں نکل پڑے۔ ان دنوں مختصہ سب سے بڑا شہر مانا جاتا تھا۔ یہاں کی بندرگاہ پر دور دور کے ممالک سے تجارت آتے رہتے تھے۔ وہ مختصہ پہنچ کر ایک مسجد میں فروکش ہو گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی درس و تدریس کے درمیان اس مشہور مگر متنازعہ قیدہ قصے نے جنم لیا جس پر تاریخ داں بھی مغالطے میں ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ صرف وارث شاہ کے قلم سے نکلا ایک قصہ ہے مگر زیادہ تر لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فرضی نہیں حقیقت ہے اور بھگ بھری سے وارث شاہ کو عشق ہو گیا تھا۔ یہ عشق جب بڑھا اور اس کے چرچے شہر میں ہونے لگے تو لوگ وارث شاہ کے دشمن بن گئے۔ ان کا الزام تھا کہ ایک عالم دین ہو کر وہ کسی طرح ایک غیر محرم عورت سے ملتا ہے، عشق کی پٹیلیں بڑھ رہا ہے۔ یہ خبر بھگ بھری کے والدین کے لیے سوہان روح بن گئی تھی۔ علاقے کے لوگ طعنہ دیتے۔ عزت خاندان کو داؤ پر لگا دیکھ وہ سب پریشان ہو رہے تھے۔ انہوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے بھگ بھری کی شادی کرادی۔ جس لڑکے سے بھگ بھری بیابانی گئی تھی اس کی بہن بھی وارث شاہ کی دیوانی تھی، اس نے انتقام جھوٹی بچی باتیں پھیلانا شروع کر دیں۔ ان باتوں نے وارث شاہ کو پریشان کر دیا اور انہوں نے علاقہ چھوڑ دیا وہ ملک ہائس چلے آئے۔ یہیں 1766ء میں انہوں نے قصہ ہیر رانجھا تصنیف کیا۔ ملک ہائس میں طویل قیام کے بعد پھر چند پالہ شیر خاں آ گئے۔ راستے میں قصور میں قیام کیا اور اپنے استاد کو میر رانجھا کا کچھ حصہ سنایا تو وہ بولے ”تم نے موعج کی رتی میں موتی پرو دیے ہیں“ چند پالہ شیر خاں میں ہی اب نے 1798ء میں انتقال فرمایا اور گاؤں سے باہر قبر بنی۔ اسی مزار میں ان کے بھائی اور والد بھی دفن ہیں۔ وارث شاہ نے ہیر رانجھا کے علاوہ عبرت نامہ، اشتر نامہ، وارث شاہ وکی کسی بھی تالیف کی۔

مجھے عشق ہے اپنے وطن سے، میں عشق کا اسیر ہوں۔ کیونکہ اس کا حسن، اس کا وقار، اس کی عظمت ہمارے دل میں ہی نہیں ہماری روح میں بھی سمائی ہوئی ہے کیونکہ یہ فقط زمین کا ایک ٹکڑا نہیں، یہ عطیہ خداوندی ہے۔ شب قدر دعاؤں کے مستجاب ہونے کی رات ہے۔ اسی رات کا یہ تحفہ ہے۔ یہ تحفہ دو سو سالہ غلامی فرنگ اور لاکھوں جانوں کے نذرانے کے بعد حاصل ہوا ہے، اس لیے بھی ہمیں پیارا ہے۔ ہم اس کے عشق میں پور پور ڈوبے ہوئے ہیں مگر کچھ لوگ مسلسل ہمارے عشق کو ناکام کرنے کی سعی لا حاصل میں مصروف ہیں۔ یہ ٹی وی کے اینکرز، یہ سیاست کے مہرے اور خود ہم میں موجود نادان دوست اور فقیہ کالم اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ دشمنان وطن کی کوئی کتاب سنار ہے ہیں تو کوئی دشمنوں کے بڑے شہروں میں پھیلی بے حیائی کو ہمارے معاشرے میں ضم کرنے کی کوشش میں ہیں۔ کوئی اسلام تو کوئی زبان کا نام لے کر اخوت و بھائی چارے کا گلا کاٹنے پر کمر بستہ ہے۔ گویا ایک ہم ہیں اور انبوہ رقیبان ہے۔ یہ سب کے سب رقیب عشق، کہیں نہ کہیں سے، کسی نہ کسی کے غلام ہیں تبھی تو ہر ایک نے سنگ اٹھا رکھا ہے اور ہم اقبال ساجد کے یہ اشعار گنگنا رہے ہیں۔

تلمے ہوئے ہو کیوں تاریخ کو مسخ کرنے پر
سخن کے باب میں کوئی تو باب کاشت کرو
تمہارا اپنا عمل خود تمہارے بس میں ہے
ثواب کاشت کرو یا عذاب کاشت کرو

شہر خیال



✽ عشق سرگزشت کے اسیر اعجاز حسین سٹار کی پور قصل سے گہرا فاشانی
”شاطر مصلح“ کے کریک نے آخر کچھ کیا تو بے صرف گفتار کے غازی نہیں ہیں، وادھر
ہمارے سیاست دان صرف اپنے بینک اکاؤنٹ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ سارے
منصوبے اور دعوے کاغذی ہیں۔ عوام موقع کل کے مطابق ان کے رنگ بدلنے پر
جراثی کا اظہار ہی کر سکتے ہیں اس لیے ہمیں سسر کریک مونیٹرن کے مثبت
کارناموں پر نظر رکھنی چاہیے۔ مثنی پہلو کو نظر انداز کر دینا چاہیے، یوں وہ اپنی
خامیاں بھی دور کر لیں گے۔ شریا قبال کے لوگ دلچسپ لگے، یہاں عجیب
الطفرت ہونے کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ ان کی سادہ دلی اور خلوص کی اہمیت دل کو
بجائی۔ ان کی رعیتیں تو ہم سے ملتی جلتی ہیں اور توہمات میں بھی ہمارے

قریب ہیں۔ ان کی جفا کشی قابل قدر ہے۔ ایف بی آئی کا جنم میں پولیس کس جفا کشی کرتی رہی حتیٰ کہ ایک سیزمی پر کتنی
تحقیق کی اور نتیجہ خیز معلومات حاصل کیں وادھر ہماری پولیس پکڑے گئے مجرموں کو قتل سے بچانے میں تعاون فراہم کرتی ہے۔ صرف اسی
مضمون کو بنایا جائے تو ہم کسی سے نظر نہیں ٹکس سکتے۔ فلی الف لیلہ ہماری دوستی کا سامان نہ کر سکی۔ ہمیں انڈیا کے اداکاروں سے خاص
دلچسپی نہیں ہے البتہ ہاشمی کے حوالے سے تصویریں اچھی لگیں۔ آفاقی بھائی غزل کا نیک غلام علی پر لکھیں، میں ان کا بڑا مداح ہوں۔ اب بچ
بانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ جال کی شریا فطری جذبوں کی وجہ سے مجبور تھی۔ محبت کی سیزمی کو آسان جان لیا اور اسے میں رکھتے ہوئے سانپوں کو
نظر انداز کر دیا اور جلد بازی اور غیر احتیاط پسندی کی وجہ سے یعقوب کی سازش کا شکار ہو گئی۔ وہاں نجد کی آمد اور دیر سے حالات کو سنبھالنا
قابل قدر ہے لیکن شریا کی خوش قسمتی کا بھی بڑا ہاتھ ہوا اور بڑی صورت حال قابو میں آ گئی، یہاں تک کہ عزت محفوظ رہی اور رسوائی سے بھی سامنا
نہ ہوا۔ سب اللہ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے۔ غیب میں جب ایک ساتھ دو کرداروں کے حالات چلے تو کافی الجھن ہوئی پھر بعد میں راستے جدا
ہوئے تو بات سمجھ میں آنے لگی کہ کتنی پیچیدگی پیدا ہو گئی لیکن ذات باری تعالیٰ نے اپنی حکمت عملی سے سارے مسائل حل کر دیے ورنہ دونوں
گھراؤں میں طوفان آنے میں کون سی کمی رہتی تھی۔ اب تمام معاملات سلجھ گئے ہیں اور ہر شخص اپنی جگہ خوش اور مطمئن ہے۔ اسے خصوصی کرم
نوازی کہہ سکتے ہیں۔ ذرا سی بات تھی لیکن بڑے بڑے بڑے ہو گئی اور کتنے حادثوں کو جنم دے گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انور کمال سے کوئی لغزش
ہوئی ہے جس کی سزا انہیں مختلف انداز میں سبکتی پر رہی ہے۔ بھلا کون ہے قصور اتنی الجھنوں کا شکار بننا ہے۔ کاش کے امان نے جب رہنا کو بر باد
کیا تھا تو گھر میں موجود اپنی بہن کو بھول بیٹھا تھا، وہ خطرناک عزم لے بیٹھی تھی، اسی خود مر لڑکی سے توقع بھی کی جاسکتی تھی کہ وہ بھائی کو
سزا دینے کے لیے خود کو کسی لشکے کے حوالے کر دیتی لیکن اس نے دوسری راہ اپنائی، یہ بالکل سچ ہے، جس گھر میں ایسی لڑکیاں ہوں، کوئی مرد
بیک نہیں سکتا۔ ڈیڑی، پاپا اور میں، میں رشتوں میں جتنا خلوص ہو اور نیک نیتی کی بنیاد پر تعلقات ہوں لیکن ایسی بے تکلفی دوسروں کو ضرور دکھائی
دے گی اس لیے احتیاط ضروری ہے۔ خاص طور پر سچے مثنیٰ آ لیتے ہیں۔ اسلام نے محرم اور غیر محرم کے لیے جو حد مقرر کی ہے اس پر عمل ہمیں کی
پیچیدگیوں سے بچالیتا ہے۔ ابن اوفیٰ میں مثنیٰ میاں معاملہ ہم اور ساتھ عیار بھی تھے۔ لوگوں کی دیکھی دگ پر ہاتھ رکھنا جانتے تھے پھر شہر کے
مکینوں کی مصروفیات بھی کئی مسائل کو جنم دیتی ہیں جنہیں بھگتانا ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ مثنیٰ میاں شاید پہلے حالات کا جائزہ لیتے رہے،
کمزور یاں نوٹ لیں اور اپنی صلاحیتوں کو آزمائے کا قصد کیا اور کامیاب ٹھہرے۔ وہ ایک درک تھے، کام کرنا اور لینا جانتے تھے۔ اسی کو کیش
کر لیا اور مثنیٰ کیے چاہے سب مکین مطمئن ہوں لیکن انہوں نے دوسروں کی لالچی اور مجبوری سے فائدہ اٹھایا، وہ ناجائز کمائی کے عمرے میں
آتا ہے، اس کا حساب دینا ہوگا۔ کہانی میں رہیں نہ ہونے کے باوجود وہ مثنیٰ کی مثنیٰ تیسرا مثنیٰ میں ہم کی بغاوت ایک حد تک خفیک ہے، وہ
غیر معمولی حسین مثنیٰ جس کے مقابلے میں ہم نے کوئی مثنیٰ نہ تھا۔ مثنیٰ پھر تو قیر نے نفرت کی چلتی آگ پر تیل کا کام کیا، وہ بھورا تھا

بھلے رس چوس کر ڈان بھرنے کی تاؤ میں تھا، یہ اتفاق تھا کہ سارا منصوبہ سارے آگیا ورنہ لٹنے میں سر ہی کیا رہی تھی لیکن ہم کی ہمت پر داد
دیکھ کر اس کی فطری بزدلی سے کام نہ لیا اور اس نے بھلے کا سر چل دیا، یوں آزاد پرندہ پھندے میں آ جائے تو اس کے پھرنے کا منظر دیکھنے
والا ہوتا ہے۔ گرگشت میں انسان کے بدلتے خیالات پڑھ کر حیران ہو گیا ہوں پھر تیرہواں گ مزاج کا لڑکا تھا۔ یہ ظاہر کوئی کی زبان سے بات
کرنے والا اندر سے نرم دل اور مفاہمت پسند تھا، بھلا کون سوچ سکتا ہے کہ وہ اتنا بدلتا جائے گا۔ وہ ایک معمولی نفسیاتی گروہ کو بھلانے کے لیے
پر خطر زندگی گزار رہا تھا۔ اسے سن پند زندگی ملی ہے تو تارہ کے حق میں بھی بہتر ہوا ہے۔ وہ حقیقی خوشیوں سے لطف اندوز ہو رہی ہے اور تیرہ کی
نیت شادی سے پہلے ظاہر ہو گئی ہے ورنہ وہ کبھر کر رہ جاتی۔ تیرہ اس محفل کے سب دوستوں نے سراہا ہے جس کے لیے شکر یہ قبول کیجئے اور رانا
محمد سجاد اگر صدرت پر فائز ہیں تو یہاں کی محنت اور لگن کا صلہ ہے اور دوسروں کے لیے تحریک ہے۔“

✽ عاھر ساحل کی ڈیرا اسماعیل خان سے آمد ”امید ہے کہ قارئین، مصطفین اور ادارہ سب بخیریت ہوں گے۔ میں عمرہ 10 سال
سے سرگزشت کا خاموش قاری ہوں۔ سرگزشت مجھے بے حد پسند ہے۔ اس جیسا رسالہ میں آج تک نہیں پڑھا۔ کل ہی جولائی کا شمارہ
ملا ہے۔ ابھی صرف سرورق پر ہی نظر دوڑائی ہے۔ سرورق بہت ہی پسند آیا۔ باقی تمام کہانیاں ابھی تک باقی ہیں۔ میں نے ابھی نہیں پڑھیں۔
میری آپ سے التجا ہے کہ جس طرح عمرہ دراز سے آپ نے شمارے میں فلی الف لیلہ کا طویل سلسلہ شروع کر رکھا ہے، بالکل اسی طرح فلی
دنیا سے باہر نکل کر پاکستان کی کرکٹ، کھلاڑیوں اور سابقہ سٹیز کھلاڑیوں کے مختلف ملکوں کے سفر نامے اور انٹرویوز کا ایک طویل سلسلہ شروع
کریں، پلیز پلیز۔ یہ ہماری ہی خواہش اگر ہو سکے تو اس بارے میں ضرور غور کیجئے گا (کھلاڑیوں پر خاص نہیں لکھ چکا ہے۔ وقتاً فوقتاً مضمون
دیتے رہتے ہیں) اور میرا پہلا خطا اور پہلی کوشش کو دہی کی نوکری میں مت پیچیدہ دینا۔ عشق کا کام بہت شہرت سے انتظار ہے۔“

✽ کوچہ عشق سرگزشت کے پڑانے اسیر، عبدالرؤف عدم کی راولپنڈی سے یاد آوری ”وقت اور مصروفیت نے فل کر ایک ایسی
دیوار بنا دی کہ جس کے باعث ہم محصور ہو گئے اور پھر مجبور ہو گئے اور اسی وجہ سے شہر خیال سے دور ہو گئے لیکن اب وقت نے پلٹا کیا۔
مصروفیت کا بت پاش پاش ہو گیا۔ غرضت کے باغ میں بہار آ گئی۔ مجبوری اور شہر خیال سے دوری کو زوال آ یا تو ہم بنا وقت ضائع کیے اپنے
شہر خیال کی ویلیز پر پہنچ گئے۔ سنے اور پڑانے لوگوں کا احتجاج دیکھا، کچھ لوگوں نے ہمیں ٹوڑا پیچھا تا جبکہ کچھ نے اجنبی جانا۔ رانا محمد سجاد کو
صدرت کی کرسی پر براجمان پایا تو مبارک باد کے پھول ان پر پھرا دیے۔ سدرہ بانو ناگوری کو دعاؤں کا تحفہ دیا۔ اعجاز حسین سٹار سے
معلومات کا ذخیرہ حاصل کیا۔ طاہر الدین بیگ کو گلے سے لگایا کیونکہ ان کا کسی سے اپنے کڈل چاہ رہا تھا۔ احمد خان توحید کی ذریعے تین
شادیوں کا راز جاننے کی کوشش کی۔ سعید احمد چاند سے سلام دعا ہوئی۔ مہوش رفیق کی جانب گئے۔ مگر وہ خود کو تلاش کرنے میں مصروف نظر
آئیں۔ طاہر گلزار صاحب کو سلام پیش کیا، دیگر تمام دوستوں سے تعارف حاصل کرنے کے بعد حسن غالب کی خدمت میں حاضری دی اور مختصر عمر
میں مجبوری صاحب کے کارنامے پڑھنے کو دل بے اختیار جھوم اٹھا۔ شاطر مصلح بہت خوبصورت تحریر ہے۔ مصنف کا انداز تحریر دل موہ لینے
والا ہے۔ واقعی، مگر ایک نے اگر غرور بردی تو وہ اپنی جگہ جرم ہے لیکن اس کے اچھے کام اپنی جگہ قابل ستائش ہیں۔ ایف بی آئی کا جنم دلچسپ
تحریر ہے۔ ایڈر کے شاطرانہ ذہانت کے ذریعے اس کی اعلیٰ حکام سے اپنی تمام باتیں منوالیں۔ فلی الف لیلہ اس بار اپنے دام سحر میں
گرفتار نہ کر سکی۔ رسوا ایک مشہور زائد رسوا کی زندگی کا خاکہ ہے۔ یقیناً نامور اداکارانہ، رسوا کو بھی تاریخ کی گمانیوں میں رسوا نہیں ہونے
دے گی۔ سچ بانیوں میں جال بہت پسند آتی۔ نجمہ کاردار بہت خوبصورت ہے جس نے شریا کو رسوائی کے گڑھے میں گرنے سے بچایا۔ غیب
فلی انداز لیے ایک اڑا گئے کہانی ہے۔ عابدہ کے اٹارنے دونوں خاندانوں کو خوشیوں میں رنگ دیا۔ بساط زیت نے زیادہ متاثر نہ کیا۔
ذرا سی بات پڑھ کر مثنیٰ بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ کاش خوبصورت کہانی ہے، بھندل کا کردار بہت زبردست ہے۔“

✽ عشق سرگزشت سے بخور خالد یوسفی نے لہ سے لکھا ہے ”میکیز کے ایک سیلاب بلانچ میں اپنے پورے قد سے کھڑا سرگزشت
اپنے باپچن اور رنگینی خیال کے باعث سب سے الگ اور ممتاز نظر آتا ہے، اللہ کرے زور شباب اور زیادہ۔ حسین دول آ ویز سرورق کی دلکشی
نگاہوں کو تیرہ کیے دیتی ہے۔ جولائی کا شمارہ ملنے ہی فخرست پراک نگاہ ڈالتے ہی اپنی محفل کی جانب لپکے لپکے ٹھہر گیا ہے، نگاہ شہر خیال کا
موسم۔“ اپنا نام دیکھا تو نام کی فطری نظر آئی کہ بھوا خالد یوسفی سے خالد یوسف چھپ گیا، چلے کوئی بات نہیں۔ سبھی دوستوں کے تیرہ سے پڑھے
اور محفل کے آخر میں مہدی حسن کی رحلت کا پڑھ کر جیسے ڈھم پھرے تازہ ہو گیا۔ آہ امل نے تاک کر کیا سیر اچھا کر فزل کا گنگی کا فن ہی نتیجہ
کر دیا۔ الہامی مردوں میں گانے والا ہر شگیت کا راجا موسیقی کے آسان کاروشن ستارہ ہائے ہائے ہائے، بھلا کس منہ سے کیسے صاحب کردہ
مجزر نما آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہے، وہ غزل گانگی کی دم توڑی صنف میں مڑوں کے جہان آباد کرنے والا یوں خاموشی سے
چلا گیا ”یوں آٹھے آج اس مٹی سے ہم، جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے“ یا پھر خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر نے مجھے کہا تھا کہ تیرے چپانے میں
گردش نہیں باقی ساتی۔ اور تری بزم سے اب کوئی اٹھا جاتا ہے۔ مہدی حسن خوش نصیب تھے کہ زندگی میں ہی بے پناہ پذیرائی دیکھی۔
(سرگزشت نے بھی ان کا زندگی نامہ ان کی زندگی میں شائع کر کے خراب کیا ہے، مگر وہ ان کے مخصوص طور پر پسند کیا





تھا۔ وہ قاضی میں جلا جتے مگر انہوں نے خصوصی طور پر اپنے ہوتے سے چڑھا کر ساتھ اور بہت پسند کیا تھا (موسیقی کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں جنرل ایوب خان نے تمغہ امتیاز، جنرل ضیاء الحق نے تمغہ حسن کارکردگی، جنرل پرویز مشرف نے بلال امتیاز سے نوازا۔ علاوہ ان میں 9 گراویا اور 23 ممبران کے حصے میں آئے۔ 1979ء میں بھارتی ضلع جالندھر میں سہیل ایوارڈ اور نیاپلی حکومت نے گھور کھانا ایوارڈ دیا۔ 25 ہزار کے لگ بھگ قلمی وغیرہ کی قیمت، مغزلیں اور گانے گائے۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے شہرہ آفاق کلام "گلوں میں رنگ بھرے، یادوں بھار چلے" انہوں نے 1962ء میں گایا اور بس بھراس کے بعد پیچھے مگر نہ دیکھا۔ ایک سے ایک شاہکار غزل، گیت، نغمے یوں سمجھئے وہ ایک مالا مالا پروتے چلے گئے۔ آج یوں ہی بغیر کسی خصوصی کوشش و کاوش کے ان کے چہرہ مبارک نے ذہن میں گونج رہے ہیں، ڈرا دیکھتے تو نظر ڈال کر کہہ سکتے ہیں کیا گھوڑا ہے۔ دل ہی دکھانے کے لیے آج بھی کوئی نہیں تھا، غم عاقبتی سے پہلے۔ یوں زندگی کی راہ میں ٹکرا گیا کوئی۔ زندگی میں تو بھی پیار کیا کرتے ہیں۔ دل ویراں ہے تری یاد ہے تہائی ہے۔ مجھے تم غم سے گرا تو رہے ہو۔ اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں۔ اک حسن کی دیوی سے مجھے پیار ہوا تھا۔ یہ کاغذی پھول جیسے چہرے۔ جو دروہلا اپنوں سے ملا۔ رقص و خیر بکن کر بھی کیا جاتا ہے۔ جب بھی چاہیں ان کی صورت بنالیتے ہیں لوگ۔ آفاقی صاحب سے دست بستہ عرض ہے کہ خدا سے تم بڑے آپ کو محبت کا ملہ و عاقل عطا فرمائے، آپ جلد از جلد طبی الف لیلہ کا ایک گزشت اس عظیم کلاکار کی یادوں سے آباد کریں، انتظار رہے گا۔ انتہا سنا اس بارش انداز رہے، میں تو انہیں ذہانت کے کپسول کہوں گا (واہ! کیا خوبصورت بات کہی آپ نے) صفحہ 5 صغیر بھگھرے، معلوماتی، خود افزا اور بڑے چلے پار سے تو پر ہے کی جان ہیں اور اس بار تو انتخاب بے حد داد لے گیا۔ راہی صاحب نے مرزا آبادی بیک رسوا پر مختصر مگر سیر حاصل مضمون لکھا، امرا و ادا جان ادا میں تحریریں واصل اردو ادب کا عطر ہیں کہ جب جب، جہاں جہاں ان پر لکھا جائے تحریر کی خوشبو چھپائے نہیں جھپٹی۔ قلمی الف لیلہ کی موجودہ قسط دلپ کلاکار اور ہم عصروں کے واقعات لکھ کر فی نظر آئی، تارہ کے حلقہ آبی تفصیلی معلومات اس سے قبل نہیں نظر سے گزر رہیں، شاندار آفاقی جی، ماضی کی یادیں آپ یوں تازہ کر دیتے ہیں جیسے اب تب کی بات ہو۔ سراب کے بارے میں کیا لکھیں کہ شاید یہ کوئی خط ہو جس میں اس دلچسپ اور مدیوٹا تحریر کے بارے میں تو سنی نکلت نہ ہوں۔ ڈاکٹر مجاہد امجد نے حسن غالب میں عبدالرحمن بجنوری سے متعارف کرایا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ شخص 33 برس کی عمر پانے کے باوجود اس قدر ادبیت رکھنے والا کام چھوڑ گئے۔ یہی حال اپنے سعادت حسن منٹو کا ہا کہ شخص 39 برس کے لیکن اردو افسانوں کا دامن تھے سوتیوں سے بھر گئے، انتظار کیا ٹھوکیاں ختم، تاکام عشق کی روداد سنا، اہم نمبر اگلے ماہ روانہ کیا کرانے کی جان کر دی مسرت ہوئی۔ وہ جن کے عشق کا نام ہو جائیں، وہ امر ہو جاتے ہیں۔ بڑے آدمی کھاتے ہیں اور کامیابی کی صورت میں شوہر کا طوق لگے میں ڈالنے سے یعنی یہ واقعہ ہے جہاں ناگاہی ہی دراصل کامیابی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ آپ پٹاری سے کیا کچھ نکالتے ہیں، روایت لیکن یہی کہتی ہے کہ سرگزشت نے بھی اپنے مداحوں کو باپوں نہیں کیا۔ بہر حال پردہ آٹھنے کی شہر ہے نگاہ عشاق دل تمام نہیں ہیں۔

عاشق سرگزشت ایم اے خالق بھٹی، رحیم باغ خان کا انداز شوق "سرگزشت ایک ڈائجسٹ نہیں ایک تاریخ کا نام ہے جس میں ماضی کی تاریخ کے علاوہ دنیا جہاں کی معلومات اکٹھی ملتی ہیں ورنہ تو ملک میں سینکڑوں ہزاروں ڈائجسٹ، میگزین، رسائل چھپ رہے ہیں لیکن یہ اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے کہ اس میں جہاں تاریخ اور دنیا کے بارے میں معلوماتی مضمون پڑھنے کو ملتے ہیں وہیں پرچہ جتنی پر معاشرے میں گزری کچھ کہانیاں بھی ذہن کو کھلاشتی ہیں جنہیں پڑھ کر اپنی اصلاح کا موقع ملتا ہے۔ شہرہ کے حوالے سے ماضی اور حال میں جیسے واقعات پڑھ کر سلور سکرین کے خود خال اور اس سے وابستہ افراد کے بارے میں صحیح معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں، ویڈیو سرگزشت۔ ادارے میں..... کہ پڑھنے کے بارے میں پڑھا۔ کہ پڑھنے اور قلمی حکمرانوں کے لیے لازم و ملزوم حقیقت بن چکی ہے۔ مختصر جتنی چودری خلیق انزل کی کی پاکستان تحریک کے حوالے سے خدمات پڑھیں۔ حسن غالب ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کے بارے میں ڈاکٹر ساجد امجد۔ شاطر صلح میں ابن بکیر نے ایک امریکی کے فراڈ کے حوالے سے صحیح معلومات فراہم کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شریا پر تحریر۔ صابر اقبال کی ایف بی آئی۔ علی سفیان آفاقی کی قلمی الف لیلہ میں ماضی کی شوہر شخصیت کی تصاویر نے مضمون کو چار پانچ گونے دیے ہیں۔ این جی ویدیو کی شہریوں کے شہر کا دوسرا حصہ پڑھا پسند آیا۔ مختار آزاد کی سینگ چور، ایاز راہی کی رسوا، شکیل صدیقی کی آؤان اور زین بھدی کی گنگنے پڑھ کر اپنے اگلے ذہن کو مزید ذہانت سے سرفراز کرنے کا موقع ملا ہے۔ صحیح جتنیوں میں فی الحال ڈی ڈی پیپا اور میں، محبت، بساط زیت پڑھی ہے مزید نوڈ شینگ کے درمیان واقعہ ملنے پر پڑھنے کی کوشش جاری رکھوں گا۔ رانا سجاد کو کسی صدارت مبارک، مسٹر علی خان، سسر سدرہ بانو ناگوری، اعجاز حسین سٹار، طاہر الدین بیگ، احمد خان توحیدی، سعید احمد چاند، راجا تیب نواز تیب، مسٹر مہوش رفیق، ملک جاوید محمد خان سمرانی، ڈاکٹر محمود فیاضی مسر طاہر بھگزار، خالد یوسفی اور رانا حبیب الرحمن نے تبصرے کا صحیح حق ادا کرنے کے علاوہ اپنے خطوط سے جن معلومات سے نوازہ ہے وہ قابل تحسین ہے، تمام دوستوں کا شکریہ۔



کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ایک مضمون سرگزشت چودری خلیق انزل کی سوانح عمری کی مختصر جھلک پر مشتمل تھی۔ صفحہ 11 تو خطوط کی عظیم محفل شہر تھی۔ اپنے ضلع سے رانا محمد سجاد صدارت کی کرسی پر راج کرتے نظر آئے، دل خوش ہو گیا۔ تبصرہ اچھا تھا۔ مسٹر علی خان نے وزارت قلمی کے عہدے کو مناسب انداز میں پیش کیا۔ صاحب! ذرا شہر خیال کے نام سے بھی پڑھ لیا کریں ویسے کہ انہوں پر آپ کا تبصرہ بہت عمدہ رہا۔ شوکت رحمن شنگ، یہ کیا بات ہوئی صرف تین جملوں کا تبصرہ یعنی دل کھول کے لکھا کریں۔ بے شک تمام حالت و واقعات کا غصہ خلیق میں نکال لیا کریں کہ یہ اپنی ہی محفل ہے، یہ شہر خیالات کے اظہار کا ہے۔ ہر کسی کو اپنے خیالات پیش کرنے کا حق ہے۔ جتنی کا لیٹر اچھا تھا کہ جتنی کا نام پتا معلوم ہو تو بندہ کے پاس جنوری کا سرگزشت موجود ہے ان کو بھجوا دیا جائے گا۔ سدرہ بانو ناگوری اسٹریٹس ملک کے حالات روز بروز خرابی کی طرف گامزن ہیں۔ قائم نے برصغیر میں آزادی کی روشنی کا دیا اس ملک کی صورت میں روشن کیا تھا لیکن آپ کو پتا ہے، دیا اندر سے اندر سے میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ بس باہر اس کی روشنی پھیلنے سے تو بس آج کے حکمرانوں نے پاکستان کو دیا بھڑکھا ہے، یہ دوسری دنیا کو کوئی فائدہ نہ رہا ہے اور خود گھپ اندر عیروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ یہ دیے سے بلب بنے گا جو خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ اعجاز حسین سٹار اب بھی مزہ آگیا آپ نے تو اتنا طویل اور دلچسپ تبصرہ لکھ کر دل بیت لیا۔ اگر خاص شاعرے میں بھی آپ کا طویل عشق تبصرہ ہو تو سونے پر سہا گروالی بات ہو جائے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ طاہر الدین بیگ! سرگزشت کی ٹیم ایک دو افراد پر نہیں بلکہ ان لوگوں افراد پر مشتمل ہے۔ آپ کس کس سے ملتے پھرتے ہیں گے؟ ہر وہ فرد جو سرگزشت سے کسی نہ کسی حوالے سے جڑا ہوا ہے خواہ قاری ہو لکھاری یا محراب کرنے والا۔ سرگزشت کی ٹیم کے کلاڈی ہیں، اب سوچ لیں۔ سب سے پہلے مجھے سے بھی ذہنی بڑے گی، ماہا، احمد خان توحیدی! توحید کے مکمل حقائق پر پورا اترنے کے لیے شاید کروڑوں لوگوں محترم، مہم صرف چار شاہدوں کا نام نہیں، دین کے مکمل احکامات پر عمل کرنا لازم ہے۔ سعید احمد چاند از بدست مگر جب ایسی باتیں ہم سوچ سکتے ہیں اور ایسے واقعات پر کڑھ سکتے ہیں، رو سکتے ہیں مگر عملاً حالات درست ہونے کی امید اس ملک میں دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ خالد یوسفی! آپ کا انداز تحریر بہت بھایا۔ رانا حبیب الرحمن! ابھی تک آپ چل میں ہو یہ جان کر افسوس ہوا۔ اب آتے ہیں کہ انہوں کی طرف، سویرا کو فتح خان نے منظم منصوبے کے تحت نہایت ہوشیاری سے ان کو ایک اور کوئی مقصد حاصل کے بغیر جو ملی چھوڑ دیا۔ رانا خان کی نگرانی کر داتے ہوئے شہباز ملک خود ای کے زیر نگرانی آگیا اور آخری آواز غائب ڈیوڈ شاکر ہو سکتی ہے۔ صحیح بات تو آجندہ ماہ ہی معلوم ہو سکے گی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے شریا قلیوں کی روایات کو عمدہ انداز میں بتایا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہاں ایک گورت دوشوہر رہتی ہے۔ الف بھی آئی کا ختم معلوماتی تحریر تھی۔ قلمی الف ملی میں پڑانے ادا کاروں کے واقعات دوبارہ پیش کیے گئے۔ شہریوں کا شہر دوسرا حصہ ذہن پران نقش و نقوش چھوڑ گیا۔ زین بھدی نے قلمی جتروں پر بہترین تحقیق پیش کی۔ صحیح بیانیوں میں جال، بساط زیت، کاش، این وقت اگر گرت اس ماہ کی بہرست تحریریں تھیں۔

ملک رحیم بخش اعوان رقم طراز ہیں "جون 2012ء کے شمارے سرگزشت میں مجاہد اعظم والی تحریر میں نور الدین زنگی کی حضور سرور کائنات خواب میں زیارت کرنے اور اپنے جد مبارک تک ناپاک ہاتھ پہنچنے کی دوری کی ہدایت فرمائی پڑھی۔ صاحب تحریر نے لکھا ہے کہ حضور رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ان تقویوں سے بچنا کہ ظہرہ ذہن پر بہت گراں گزرا اور جو بھی اپنے آقائے دو عالم ﷺ سے دلی محبت رکھتا ہے اسے بھی گراں لگے گا۔ تم تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ دو جہاں کے آقا اپنے ایک امتی سے کہیں کہ مجھے بچاؤ۔ یہ شان رسول ﷺ کے خلاف ہے۔" (آپ نے بجا فرمایا، یہ سبھی سہا ہوئی۔ مصنف کے ساتھ ہم بھی مضرت خواہ ہیں) سرگزشت کے عشق میں ڈوٹی سدرہ بانو ناگوری نے کراچی سے لکھا ہے "آقا انکل کے ادارے سے کیا۔ انکل اب تو ہمیں ملک کا ذرہ ذرہ پریشان کی گرد میں ڈال رہا ہے۔ بدعنوانی اور لوڈ شیڈنگ ان سب عذابوں نے ہمارا سانس لینا دشوار کر دیا ہے۔ شہر خیال کی محفل خوب زوروں پر رہی مگر خالد یوسفی نے عمدہ تبصرہ کیا بہت اچھا لگا۔ صفحات پلٹتے پلٹتے اچانک ہی نظر سڑا ناکام کے اشتہار پر پڑی گویا انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں۔ سراب میں اس دفعہ یوں لگے جیسے چڑیا بھر کے شیر نے اچانک بجنورہ توڑ کر اعلان کر دیا ہو کہ خبردار میں جنگل کا شیر ہوں۔ اتنی تیزی اور اتنی پھرتی کہ میں اس قسط کو دو دفعہ پڑھنا پڑا کہ کہانی آگے نکل رہی تھی اور ہم پیچھے رہ گئے تھے۔ قلمی ملی میں اس دفعہ آفاقی انکل ماضی کی یادیں لے کر آئے ہیں ان کے لیے ایک بات پر شکوہ کرنا جہاں کی کس دور کے لوگ اپنے ہیر و کجیلہ ہی فراموش کر دیتے ہیں۔ سوا انکل آپ کے زمانے میں ایک فی وی تھا اور وہ بھی بارہ بجے بند ہو جاتا تھا اور آج کے نوجوان بچا سون چھوڑ دیکھتے ہیں۔ سب کے ہیر و زور اور گرد و دروں پر نظر رکھنا ہوتا ہے اور چوبیس گھنٹے فی وی آن رہتا ہے۔ سوا انکل انٹرنیٹ، آئی پیڈ، آئی فون آخر کس ایجاد کا نام لوں کہ ان میں مہارت حاصل کر لی ہے پھر نہیں بک اور یوٹیوب، کانچ اور یوٹیوب کے معاملات! مستقبل کی گھر پھر مٹنے کی سیاست اس کے بعد گرا نام چلتا ہے تو ویڈیو کم سے استفادہ دوتی کے تھے پھر آخر میں تھیں جا کر رومان کے لیے وقت نکالنا آپ کے زمانے میں اتنی مصیبتیں تھیں؟ آپ ہم سے شکوہ کرتے ہیں۔ آپ کو ہم نوجوانوں پر ترس کھانا چاہیے کہ اتنی ہی زندگی اور اتنی ساری مصیبتیں تو ہم کس کس کو یاد رکھیں اور کس کے بھلائیں اور اس کے بعد والدین کی ڈانٹ کہ تم کو کسی کام کے نہیں ہو۔ آپ کے

زمانے میں اتنی مصیبتیں کہاں تھیں؟ ہم تو جو غم میں گھری ہوئی نسل ہیں جو نہ جانے کس کی یوٹی فصل کاٹ رہے ہیں۔ اللہ ہم پر رحم فرمائے (تجلی) زین مہدی مختلف گنتیوں کے بارے میں معلومات لے کر آئے۔ اچھے سزناے کے شوقین ہم بھی بہت ہیں مگر شہریوں کا شہر صرف دو اقساط پر مشتمل ہے۔ گویا ابھی کھٹی برقرار ہے۔ امید ہے اگلا سزا۔ دس سے بارہ اقساط پر مشتمل ہوگا۔ سچ بیانیوں میں سب سے پہلی کہانی جال نوجوان اور نادان لڑکیوں کے لیے سبق آموز تحریر ہے۔ اور کمال کی تحریر ذرا سی بات نے لیوں پر بے اختیار ہی مکان کھیر دی اور ادارے میں لفظ پانک کا مطلب بتاویں، کیا اس کا مطلب غیر متوازن ہے۔ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟ (جی ہاں ترازو کے پلڑے سے غیر متوازن ہوں تو اس کو پانک کہتے ہیں۔ یہ لفظ شکرست سے بھاگا پھر ہندی اور اردو میں آیا)

✽ عافیت خان خشک، کرک سے تم طراز ہیں۔ ”معلوم نہیں کتنے برسوں سے سرگزشت کا قاری ہوں اور میں از خود ہر ماہ سوچتے سوچتے شہر خیال میں داخل ہونے سے روہ جاتا ہوں۔ آج نیا شمارہ پڑھا تو سوچا کہ اب کی بار لکھ ہی لوں اور شہر خیال کے دوستوں سے تعارف و ملاقات کا شرف حاصل کر ہی لوں۔ اب تک پڑھا نہیں لیکن میں تو سرورق و نگار سب جان جاتا ہوں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے۔ سرگزشت میں وہ سب ہوتا ہے جو قاری کو چاہیے۔ اب میں کس کس کے بارے میں لکھوں۔ کس کس کا نام لوں۔ خدا کرے یہ سزا جاری رہے۔ کئی سال پہلے معراج رسول صاحب کو ایک خط لکھا تھا انہوں نے مختصر جواب سے نوازا تھا۔ اب تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ لکھنے پر آئے تو کئی صفحات سیاہ ہوں لیکن پھر کئی شہر خیال کے دوستوں سے استدعا ہے اختصار ایسا نہ ہو کہ پڑھنے کے لیے صرف شہر خیال ہی رہ جائے۔“

✽ انور فخر عارف سرگزشت مدیحہ خان، ماریہ خان، راول پنڈی سے لکھتی ہیں۔ ”آپ نے جون کے شمارہ میں ہمارا خط شائع کیا بہت بہت شکریہ۔ سرگزشت ہمیں انیس جون کی شام کو ملا۔ تبصرہ سے قاصر ہوں، وجہ ہم بچوں کی خالد بن گئی تھی۔ ہاسٹل میں خاصی مصروفیت رہی۔ آئندہ ہر وقت مطالعے کے بعد تبصرہ کی سعی کریں گے۔ گھریلو خاندان داری، بچوں کی پرورش پھر گھر والوں سے آگے پیچھے ہو کر مطالعہ کرنا۔ وقت کا مسئلہ۔ ہر وقت مطالعے کے بعد ہی سرگزشت و پاکیزہ کی محفل میں تبصرہ ہو سکتا ہے۔“

✽ عاشق سرگزشت رانا حبیب الرحمن گوجرہ سے مرسل ہیں۔ ”اس دفعہ رسالہ میں تاریخ کویش پر سیشن کوٹ سے خریدی اور سب سے پہلے آزادی کے سپاہی چوہدری خلیق الزماں کی سرگزشت پڑھی۔ اس کے بعد شہر خیال میں انٹری کی رانا محمد صاحب فرٹ سیٹ پر براجمان تھے۔ ڈاکٹر انفل صاحب و اہل بیات ہے۔ ہر دفعہ کچھ معروف لوگ ہی کیوں کر کر رہے ہیں۔ سرگزشت کو بھی سیاست سے تعبیر دے دیں کیونکہ سیاست میں بھی ہوتا آیا ہے۔ اتنا تو سب جانتے ہوں گے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت بھی فن سے مزین ہوتا ہے) سجاد صاحب عشق ہمیشہ ہی ناکام ہوتا آیا ہے۔ اتنا تو سب جانتے ہوں گے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت بھی عشق ناکام ہو گیا تھا جس کی وجہ سے پہلاں وجود میں آیا۔ ازل سے بھائی بھائی کا دشمن بنا ہے۔ اس لیے عشق کا میاب نمبر نہیں بلکہ ناکامی میرے خیال میں اب اپنی کوئی وادی نہیں جیسے وادی کاغان، وادی کشمیر، وادی کیلاش، وادی غلیم جی وادیوں کا ذکر کیا جائے ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے آپ کا کیا خیال ہے؟ (تمام وادیوں پر مضامین شائع ہو چکے ہیں) دوسرے نمبر پر منظر علی خاں وزیر اعظم بنے بیٹھے تھے۔ آپ کا تبصرہ بھی ٹھیک ہے۔ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ غلط ہے پھر پورگا۔ واقعی انسان آپ جیسا ہو جائے تو شاید ہم بھی کم ہو جائیں اس کے بعد ڈاکٹر انفل صاحب اس دفعہ بغیر نام و پتے والی ابھی بھی پتا لکھنا نہیں بولے گی، اعجاز حسین، امجد خاں توحیدی، راجہ ثاقب نواز ثاقب، ملک جاوید سرکاری درانی، طاہرہ نگار کے تبصرے پسند آئے۔ طاہرہ نگار صاحبہ شعر پسند کرنے کا شکر ہے۔ اس کے بعد انہی پر اپنا خط پڑھ کر خوش ہوئی لگتا ہے اب سسپنس اور جاسوسی کے علاوہ سرگزشت میں ہمیں زیادہ خوش آمدید کہا جا رہا ہے اس لیے ہم نے سوچا ہے سرگزشت کے لیے کچھ لکھا جائے۔ امید ہے ہمیں حوصلہ ضرور ملے گا اور شکر ہے کامیونٹ حلقہ کیا جائے گا۔ تاخیر سے خط بھیجے والے چندہ تاریخ سے پہلے پہلے خط بھیج دیا کریں۔ اس کے بعد اس دفعہ بیت بازی میں میرا شعر جو شمع کے نام لکھا گیا تھا بلکہ دو کوئین جن کے نمبر اکسالیس اور بیالیس تھے جیسے لیکن ان میں سے کوئی بھی شعر نہیں چھا (جیسے) انفل کیا ان کے علاوہ ہم کس پرانے سرگزشت کا بیت بازی کا کوئین استعمال کر سکتے ہیں (نہیں) بیت بازی میں نداملی، حنا علی بخش، ڈاکٹر اتر بانو ناگوری، معذرا پروین، آسمین، منظر علی خان، و زیا احمد کے اشعار بہترین تھے۔ اس کے بعد آتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے خلاف معمول نویں سچ بیانی پڑھی لیکن آپ کو بتانا چاہوں جس وقت میں صرف یہ لفظ ہی پڑھے تھے کہ گویوں کی کرخت بیت ناک اور خون خمد کرنے والی آوازوں سے پورا علاقہ گونج رہا تھا، مہم اسی وقت ایک کونے میں دیک کر بیٹھ گئے۔ دیکھا تو بخشی خانے میں ایک قیدی نے ایک دوسرے قیدی کو تائن ایم ایم کی آٹھ گولیاں مارویں اور وہ تڑپ کر کھنڈا ہو گیا۔ مہم ڈر گئے تھے پھر پورا ڈیڑھ گھنٹہ گولیاں قیدی اور پولیس کے درمیان چلتی رہیں اور ہم کہانوں میں اٹھکھال ڈالے دعائیں پڑھتے رہے پھر چارپوں نے مقابلہ کرنے کے لیے دیوار کو نشانہ بنایا اور دیوار توڑ ڈالیں۔ میڈیا بھی لیٹ پیچھا تھا لیکن اس وقت وہ قیدی بھی موت سے ہٹ کر ہو گیا تھا۔ ہم آج تک یہ سننے آئے ہیں کہ میڈیا بہت تیز ہے ہر جگہ جلد پہنچ جاتا ہے۔ یہ واقعہ تیس جون کو ہی پیش آیا اور

یہ سچا واقعہ ہے اس وقت کے کچھ معلومات لیتا چاہتے ہیں تو انکس جون بروز اتوار کے اخباروں میں بعد تصویر پڑھ لیجئے۔ یہ واقعہ بالکل سچا ہے جو میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ اب حالات تیزی سے بدل گئے ہیں ملاقاتیں اور سامان وغیرہ بھی نہیں آنے دیا جاتا۔ لوگ سچ کہتے ہیں کہ حادثات انسان کو بدل دیتے ہیں اور میرے تجربے کے مطابق واقعی انسان حادثے سے بہت زیادہ بدل جاتا ہے۔ کہانی کے ایک حادثے میں پروفیسر نفس خیال اور تارہ اور ڈاکٹر جواد کے بیٹے تیمور کی زندگی بھی حادثے کے بعد ہی بدل چکی تھی۔ اس کے بعد سراب ہماری ٹیوٹ کہانی ہے جہاں شہزاد ملک کو خاں جیسا شاعر و چالاک دشمن سے واسطہ پڑ چکا تھا اور ایک بار پھر پہلی بار کی طرح فتح خان کے توسط دشمن نادر کے ہاتھ میں آ گیا۔ آفاقی صاحب کے ہم بھی ہم خیال ہیں واقعی اب زمانہ بدل چکا ہے۔ اب ایسا ماننا آگیا ہے کہ انسان کے رویے اور انداز فکر کے علاوہ انداز گفتگو بھی بدل چکا ہے اور مزید بدل رہا ہے جیسے اپنی زبان اردو بدل کر انگریزی کی لازمی کردی گئی ہے اور ترقی یافتہ ممالک کے قانون ہم استعمال کر رہے ہیں اور کہانی میں بلکہ ہر شہر میں پانی، گیس اور بجلی کی کوڈ شیڈنگ کے تاثر توڑ دے جو پاکستانیوں کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں اب یہی علاقوں میں پانی اور بجلی یا گیس تو ختم ہو چکی ہے پھر بھی کھل کر مل مقررہ تاریخ تک ادا نہ کرنے کی صورت میں جرمانے کے علاوہ سنگشن بھی کاٹ دیا جائے گا۔ کیا حالات ہیں ہمارے آزاد ملک پاکستان کے، کیا ان حالات میں پاکستان ڈولنے کے بعد ایک جگہ کھڑا رہے گا؟ جی الف لکھی میں دلچسپ کما اور دینا کماری کے کارنامے بھی بہترین تھے۔“

✽ سرگزشت کے عاشق کامل منظر علی خان لاہور سے رقمطراز ہیں شین غالب کے عنوان سے ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر پسند آئی۔ غالب کے بارے میں سچ ہے کہ ڈیڑھ سو سال گزرنے کے باوجود غالب کا کلام جدید ترین ہے۔ تازہ اور دلکش۔ کوئی لفظ بھی متروک نہیں ہوا۔ غالب آج بھی زندہ ہے اور سو سال بعد بھی اسی جدت اور ندرت میں زندہ رہے گا جبکہ دیگر شعرا کے کلام میں اکثر لفظ متروک ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور کلام غالب، یہ انداز نظر خوب ہے۔ شاعر طبع پڑھ کر یہ احساس بڑھا کہ ہمارے اپنے لوگ ہماری ہی قوم میں تعلیم عام کر سکتے ہیں، دوسرے لوگ نہیں۔ کیا نظام تعلیم کے بغیر قوم کو اعلیٰ معیار کو نہیں پہنچ سکتی اور ایک قوم کھلانے کی حق دار ہو سکتی ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ اردو قومی زبان آئین طور پر 1988 میں ملل دفتری زبان بنانے کا وعدہ تھا مگر عملاً نہیں کیا گیا اور قوم کا شیرازہ بکھرا رہا ہے۔ کیا یہ اچھا ہو کہ علاقائی زبانوں، مادری زبانوں کو بھی ابتدائی تعلیم میں رائج کیا جائے؟ دہشت میں دیگر زبانوں میں پڑھنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ تو بھی سبھی کے بھی منہ کی ہے۔ شراپا ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی دلچسپ تحریر تھی۔ الف بی آئی کا جنم تقیثی ادارے کا قیام اور پہلی منظر پڑھ کر حیرت ہوئی۔ جاسوسی نظمیں بھی کیا عجیب ہوتی ہیں۔ فلمی الف لیلہ ذکر حسب حال ہے۔ سینگ چور کے عنوان سے گیندوں کے بارے میں کافی معلومات ملیں۔ کسی نوع کی ہذا دوسروں کی ہذا کی خاصیت ہوتی ہے اور کسی بھی نوع کے مٹ جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی دیگر انواع کے لیے بھی نقصان رساں ہوتا ہے۔ کسی اعلیٰ علم کی بات ہے کہ آخری دور میں جب شہد کی مکھیاں کا دنیا سے خاتمہ ہو جائے گا تو نوع انسانی بھی جلد مادی خاتمے سے ہٹ کر ہوجائے گی۔ واللہ عالم بالاصواب شہریوں کا شہر آسٹریلیا کے معاشرے کی خوبیوں کا عکاس ہے۔ سیاست کے موضوع پر ممالک کی سیر اور وہاں کے معاشرتی سماجی حالات بہت اچھے لگتے ہیں۔ رومار زامح ہادی رسوا اور ادب کی قدیم شخصیت ہیں ان کی وجہ شہرت صرف امر او جان ادائیں بلکہ ان کی تحریروں کی چٹکی اور شہرت بھی ہے۔ ڈاکٹر کلید صدیقی صاحب کا اچھا ترجمہ ہے۔ ہم جوئی اور حادثات خاتمے دلچسپ ہوتے ہیں۔ زندگی خطرات سے عبارت ہے مگر ولولہ انگیز واقعات بہت دلکش ہوتے ہیں۔ تجلی کے عنوان سے آپ نے جواہرات کے بارے میں جو روشنی ڈالی ہے۔ اتنا پوری پوری کتابوں میں بھی معلومات کا ذخیرہ نہیں ملتا۔ ہر گینے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں یا قوت اور مرجان ایک وقت سینے جا میں تو ایک ٹوٹ جاتا ہے یا ضائع ہو جاتا ہے کیونکہ مطاق نہیں ہوتی۔ میکنا ملک خون کی بہت سی پیاریوں کو دور کرتا ہے۔ سراب اچھی جاری ہے۔ سچ بتیوں میں جال، غیب اور کاش پسند آئیں۔ ڈیڈی پا پا اور میں اچھی کاوش ہے۔ کرپشن پر جتنا معراج رسول صاحب کی تحریر حسب حال ہے۔ کرپشن پر بائیں ہوتی رہتی ہیں مگر اعلیٰ ترین مناصب بھی کرپشن زدہ ہوں تو اصلاح کیسے ہو؟ سپاہی کے عنوان سے چوہدری خلیق الزماں کا تذکرہ بھی خوب تھا۔“

✽ عاشق زابر سرگزشت رانا محمد شاہد کا پورے والا سے خلوص نامہ ”جولائی کا شمارہ سخت گرمی میں خریدی۔ گرمی اوپر سے غیر اطمینان اور بے تحاشا شوڈ شیڈنگ نے ہر پاکستانی کی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ جہاں ٹیکریاں، ادا رہے بند ہو رہے ہیں وہیں لالحوں لوگ بے روزگار ہو رہے ہیں۔ اوپر سے حکمرانوں کی بے پناہ کرپشن نے لوگوں کو ان کی بنیادی ضروریات سے بھی محروم کر دیا ہے۔ معراج رسول صاحب نے انتہائی حساس اور اہم موضوع پر لکھا۔ نیب کے سربراہ کا حالیہ بیان ہے کہ ملک میں روزانہ چھ سے آٹھ ارب روپے کی کرپشن ہو رہی ہے۔ دوسری طرف خاندانی سیاست نے ہمارے ملک اور نظام کا مزید بیز اثر ق کیا ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کو حال ہی میں مصر کے کامیاب ہونے والے صدر ڈاکٹر محمد موری سے سبق سیکھنا چاہیے۔ جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہے۔ جس نے کئی فورٹنا یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کی پھر امریکا اور مصر کی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے رہے پتا چھ جب تک ہماری سیاسی جماعتیں بھی بنو، میاں یا

چوہدری خاندان سے باہر نہیں آتے جب تک ڈاکٹر محمد موری، عبداللہ گل، طیب اردکان اور مہاجر محمد جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ آئے نہیں آتے اس وقت تک تبدیلی کی امید رکھنا کاربٹ ہوگا۔ ہمارے ان سیاسی خاندانوں کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ سیاست کسی کی جائز نہیں بلکہ عوام کی خدمت کا نام ہے اور اس کے لیے خاندانی حسب نسب نہیں بلکہ میرٹ ہوتا ہے۔ چوہدری عقیق الزماں کے بارے میں ایک ملٹی سرگزشت میں بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔ تحریک پاکستان کے ان سپاہیوں کے کام ہی دراصل نئی نسل کے لیے مشکل راہ ہیں۔ اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت ڈاکٹر عبدالرحمن جنوری کے بارے میں سرگزشت پڑھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر پھر صاحب ان کمات گوہر نایاب کی زندگیوں وجد و جد کی بھرپور کہانی سنا کر ایک نیا جذبہ انگ پیدا کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کریک ایک شاعر مصلح جو تھا مگر ابتداء جرم نہیں تھا کہ اسے معاف نہ کیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھی نے خیال کے کنارے آبادانک منفرد قبیلے کے بارے میں معلومات سے بھرپور پتھر رکھیں۔ واقعی ان کی رسومات بھی اپنے اندر بہت سی دلچسپیاں لیے ہوئے تھیں۔ صانع اقبال نے ایک نقیشتی ادارے کے قیام کو ایک کہانی کی صورت میں لکھا۔ اندازِ تحریر بہت اچھا تھا۔ فلمی الف لیلہ میں فلم نگری کے ستاروں کی وہ بہت سی باتیں بھی پڑنے کو مل جاتی ہیں جو یقیناً علی بنیام آفاقی کا ہی خاصہ ہیں۔ گینڈے کی زندگی کا احاطہ کرتی مختار آزادی تحریر سینگ چورایڈ وچر وچکی سے بھرپور تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا محمد ہادی رسوا کھنڈی جیسے لوگ ہی ہمارے ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں لیکن ان جیسی شخصیات کے حوالے سے بہت کم لکھا جاتا ہے۔ سرگزشت کا ہی یہ خاصہ ہے کہ وہ ہر شعبے کی ان شخصیات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں جن کے بارے میں تاریخ کی اکثریت بہت کم جانتی ہے۔ تھیل صدیقی نے پانک کی دنیا کی ایک ایڈ وچر بھری مختصر مگر بہترین کہانی پیش کی۔ زین مہدی نے گلیے نما چھوٹے پتھروں کے بارے میں تفصیلاً ذکر کیا۔ ”جال“ بہت زبردست تحریر تھی۔ معاشرہ رنگ برنگے لوگوں کا نام ہے اور یقیناً جہاں بہت سے بُرے لوگ ہوں، وہاں چند اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ جال معاشرے کے مختلف رنگ دکھائی ایک بہترین کہانی تھی۔ تیسرا مشتق یقیناً ایک نہایت اہم پہلو کو آشکار کرتی بہترین کہانی تھی۔ کہانی اور ایک تحقیقی مضمون ”جب ابراہام لیکن کی لاش چوری کی گئی“ بھیجا تھا۔ اس کے مشتق ہی کچھ بتا دیں۔ (یہ تاریخی مضمون پہلے بھی چھپ چکا ہے)

عاشق زائر سرگزشت ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی کا بہرہ زنی، جیسے سے خلوص نامہ ”جناب عبداللہ بیگ کی رحلت سے ایک اور علی چراغ بجھ گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک مبارک فرمان کا مقبوض ہے کہ ایک عالم کی موت ایک جہان کی موت ہے۔ ان کے انتقال پر ہم سب کی کہہ سکتے ہیں، شہر میں ایک چراغ بجھ گیا، ندرا، اک روشن دماغ بجھ گیا۔ حقیقتاً ان کے متعلق لکھنے کا حق انہیں حاصل ہے جو ان کے مقام و مرتبہ کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں یعنی فلمی، ادبی حیثیت کے حامل ہوں، صرف ان سے عقیدت کی بنا پر ہی حق حاصل ہے کچھ لکھا جائے۔ مرحوم نے ایک عالم، ادیب اور علم پرور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مصلح کا کردار بھی ادا کیا۔ ٹیلی وژن پر دکھایا جانے والا پروگرام سوئی نو ایک روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ مبین اختر مرحوم نے ان کی اہلیہ محترمہ سلمیٰ بیگ سے سوال کیا تھا کہ اگر آپ کے خاندان کا ایک کروڑ روپے کا انعام نکل آئے تو وہ اس کا کیا کریں گے؟ جواباً سلمیٰ صاحبہ نے کہا تھا ”میری رقم کی کتابیں خرید لیں گے“ اور بیگ صاحب نے بھی کہا تھا کہ زیادہ رقم کی کتابیں خرید لوں گا۔ یہی جان لیں کہ یہ سوال بیگ صاحب کی غیر موجودگی میں کیا گیا تھا۔ واقعی، علم اور کتاب سونا ہے۔ رانا سجاد صاحب اختلاف رائے میں مضرت کسی، اللہ تعالیٰ کرے اس کو اپنا وارث کے بارے میں میرے ہی خدشات غلط ہوں۔ بھائی احمد خان جو حیدری ہمارے بھائی کو دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکر ہے اور ان کی شغلیائی کی خوشخبری بھی۔ آپ کے سوا کسی نے انہیں دعاؤں میں یاد نہیں رکھا ورنہ ہم تو کچھ رہے تھے کہ شہر خیال کے سارے بانیوں کا دکھ درد سناجھے مگر معلوم یہ ہوا کہ یہاں بھی نفسا کی کاربٹ تھی۔ ظاہر و گہرا، آپ کو بھی یاد ہو تو صرف سرکانی کا مطلب پوچھنا تو عرض ہے کہ یہ مرکب ہے وہ لفظوں یعنی سرکانی کا جس کا مطلب ہے ”چوٹی کا سب سے اعلیٰ پتھر“ اور یہ لقب اور خطاب ہے جدوجہد حضرت، بسم اللہ خدا کا۔ سرور کی سرپرست سرچشمہ وغیرہ جیسے الفاظ سے تو آپ واقف ہیں۔ اس کے اور معانی اور مفہوم بھی بیان کیے جاتے ہیں جو طوالت کی وجہ سے نہیں لکھا۔ اس خاندان کے افراد اچھے، صلح نشان، مہذب، سنجیدہ اور ذریعہ اسما میں خان میں کثیر تعداد کے ساتھ ساتھ ملک اور بیرون ملک کی جگہوں پر آباد ہیں۔ ان علاقے بھی سرکانی نام سے موسوم ہیں۔ مہوش رفیق، آپ کا تیسرا شیک شکا تو ہوتا ہے اس کے علاوہ اعجاز شہار، سعید احمد چاند اور غیر نام و پستے والے محبوب اور مستور سستی تیسرا پندرہ گئے کا شکر ہے۔ محمد یازدانوی اور بادی زبان تو ماں کی طرح ہوتی ہے باندی نہیں اور یہ بھی کہ کلمہ رون کی دیوی، دولت اور قسمت کی دیوی بھی تو ایک سے ایک الگ مذہبی سوچ کا اظہار ہوتا ہے آپ اعلیٰ قلم ہیں، آپ کے الفاظ سندن کر عوام میں رائج ہو جاتے ہیں۔ احتیاط برتن۔“

عشق سرگزشت سے سرشار رانا محمد سجاد کا خط خاندان جمال، مظفر گڑھ سے ”اور ماہ جون ایک ایسی شخصیت کو بھی اپنے ساتھ لے گیا، میری مراد مہدی حسن صاحب سے ہے، جن کی ہر کیفیت محسوس کی جاتی رہے گی۔ سر اور رنگت کا آفتاب غروب ہو گیا۔ ان کے خلا کو پُر کرنے کے لیے دور دور تک کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔ پروردگار ان کو اعلیٰ درجات سے بہرہ ور فرمائے، آمین۔ عبدالودود بیگ، سرشار صدیقی بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ موسم گرما کی کہانی تو عروج پر ہے ہی لیکن سیاسی کارگری بھی اپنے عروج پر ہے، کوچہ اقتدار میں چہرے بدل گئے۔ قوم

کی راہنمائی کا فریضہ سونپا گیا ہے وہ صاحب ہیں جنہوں نے توانائی کے بحران کے خاتمے کی خوشخبریاں سنائیں لیکن انہوں کوئی وعدہ نہ ہوا۔ جولائی کا سرگزشت 28 تاریخ کو موصول ہوا۔ مہراج رسول صاحب اپنے انداز سے اظہار خیال فرما رہے تھے۔ بس جناب، وہاں کیجئے۔ تحریک پاکستان کے سرگرم رکن کا تعارف کرایا گیا۔ بہت پسند آیا۔ شہر خیال میں داخل ہوئے، اپنا خط پھر دست دیکھ کر خوش ہوئی اور آپ نے ہماری درخواست فوراً مسترد کر دی۔ آپ نے جواب بھی خوب دیا۔ منظر علی خاں کا خوبصورت تبصرہ پڑھا، پسند آیا۔ گل حید پر مضمون کا انتظار رہے گا۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ نے تلخ جھینٹوں کا ذکر کیا اور مزار کا تذکرہ حوالے سے آپ نے بتایا، یقیناً جانے بہت دیکھ ہوا۔ قوم کے باپ کے ساتھ یہ سلوک ہے تو بانی لوگوں کا تو کیا کہنا! اعجاز حسین شہار کا بھرپور تفصیلی تبصرہ اور مشتق کا نام نہر کے متعلق بات، اپنی بے چینی کا اظہار ہے۔ مدینہ منورہ سے مشتق اپنی خوبصورت یادوں کا تذکرہ کیا۔ دعا ہے بد میں ڈاکٹروں کی بے بسی کا تذکرہ کیا جو صورت حال آج کل چین آ رہی ہے، انسانیت کی خدمت کرنے کے دعوے کہاں گئے۔ انسانیت کی خدمت کرنے والے انسانیت کو رلا رہے ہیں۔ طاہر الدین اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے آئے۔ احمد خان جو حید کی تبصرہ بھی پسند آیا۔ سعید احمد چاند، اللہ آپ کو حفظ و امان میں رکھے۔ راجا خاقان پناہ نواز، مہوش رفیق بھی حاضر تھے۔ مہوش صاحبہ آپ کی توجہ والی اسٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ سچی آپ بھی اتنی ہی عزیز ہیں جتنے ہم اور باقی ساتھی ہیں۔ سلام تو قبول کر لیا لیکن مبارک باد کس چیز کی۔ جاوید خان مختصر سا تبصرہ، ڈاکٹر محمود فیضانی، اللہ تعالیٰ آپ کو اس خدمت خلق کا بہترین صلہ عطا فرمائے گا۔ خالد یوسف صاحب، خوبصورت تبصرہ خصوصاً دوسرا شعر بہت پسند آیا۔ رانا حبیب الرحمن پروردگار آپ کو جلد رہائی عطا فرمائے۔ محسن غالب تو سرگزشت کے خاصے کی چیز تھی۔ خصوصاً غالب کے شیعہ انیوں کے لیے۔ آپ کے توسط سے ایک نادر روزگار کے حالات زندگی پڑے اور حیرت بھی ہوئی کہ اتنی کم عمری میں اتنا کچھ کر لیا۔ خصوصاً وید مقدس اور دیوان غالب والی بات تو ضرب المل بن چکی اور یہی ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ محسن کام غالب نامی کتاب پڑھنے کے لیے بے تاب ہو گئے ہیں۔ مشتق کا نمبر کا اشتہار بھی سامنے آ گیا۔ تعارف والی شخصیات تو ہم نے پہچان لی ہیں سوائے خاتون اول کے۔ پاکستان کا ذکر حسنا اور لیدی فرمایا ہے۔ بالی وڈ میں سے لکھا ہے۔ انگریزی ادب میں کشش ہے۔ شیک کہا نام ہے؟ (پڑچھ حاضر ہے، جواب دیکھ لیں) شاعر مصلح شروع میں تو بڑی گلی لیکن آخر میں ہم بھی ان کو سراہنے پر مجبور ہو گئے۔ شرابا دلچسپ و معلوماتی تحریر تھی۔ الف بی آئی کا جتنے صانع اقبال نے اس کی تاریخ بتائی، جو آج کل ایک نفرت کی علامت بن چکا ہے۔ فلمی الف لیلہ کی بار بہت دلچسپ لگی۔ خصوصاً دیو اند کا خط بہت دلچسپ لگا۔ سینگ چور اور سرنامہ کا مطالعہ نہیں کیا۔ شاعر کا ایک اور دلچسپ مضمون اور زبردست مضمون رسوا بہت پسند آیا۔ یہ تحریر تو خاص خاص الخاس توجہ سے پڑھی۔ گلینے کا ابھی مطالعہ کرنا ہے۔ سراب کا شفت زبیر صاحب کی دلچسپ تحریروں میں سے ایک تحریر، بہت سچی نیز کچھ پراختیام کیا۔ بے چینی سے اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔“

مہوش رفیق کا پیام کراچی سے ”سب سے پہلے تو بہت بہت نوازش آپ کی ہر ماہ خط شائع کرنے پر۔ سب سے پہلے ادارہ میں پہنچے۔ ہر جگہ کرپشن اور صرف کرپشن ہے۔ سیاسی خاندان کی چلی آ رہی ہے۔ کوئی نظم و ضبط نہیں ہے وہ اس لیے کہ عوام کمزور ہے اور خاوش تماشا بن گئی ہے اور میڈیا جو آزاد ہے وہ غیر ممالک کو کیا دکھانا چاہتا ہے کہ پاکستان کا مطلب دہشت گردی، لوڈ شیڈنگ، ظلم و تشدد میرے اکل اور آئینی لندن سے آئے ہوئے ہیں آج سچ کہنے لگے کہ لندن میں ہر وقت پاکستان نیز چینیز پر یہی نیوز آتی رہتی ہیں فلاں جگہ فائرنگ، فلاں جگہ بم بلاسٹ، فلاں جگہ لوڈ شیڈنگ سے احتجاج میں اور کچھ نہیں۔ لندن میں لوگ جب یہی نیوز دیکھتے ہیں تو پاکستان کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ وہاں جائیں اور لوٹ کر نہ آ سکیں۔؟ اب آپ آئیے شہر خیال کی رانا محمد سجاد صاحب کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ اس دفعہ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ نے محل کرپشن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بھٹی دفعہ کی طرح دل برداشتہ نہیں تھیں۔ کافی اچھا لگا کہ اپنا تذکرہ انہوں نے بنایا۔ اعجاز حسین شہار صاحب کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہترین لگا۔ سعید احمد چاند صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکر ہے۔ میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں بالکل کہ آج جتنی بھی واردتیں، اکٹرا، آپریشن ہوئے کوئی نہیں بیٹھ گیا مگر ہمارے بولنے سے کیا ہوتا ہے سب کچھ ویسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ ہر طرف کرپشن، بے روزگاری، لوڈ شیڈنگ، گرانیز جاری و ساری ہے۔ کوئی پُرسانا نہیں ملتا ہے۔ میڈیا نے اور تباہی مچائی ہوئی ہے۔ تیسرا چار سال کا بھانجا ہے۔ محل میں اسے سو سے وقت کہانی سناتی تھی تو میں نے اسے ہی کہہ دیا کہ بیٹا سو جاؤ پتا چنچن ہو رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں ایک بندو ق لوں گا اور اس کو جا کر تمام میڈیا اور تمام پتھر ڈکھائی دے گا۔ یہاں پر مجھے میڈیا پر اتنا غصہ آ کہ بچنے نے آج کل جو کرپشن اسٹوری دکھائی جاتی ہے اسے ذہن میں رکھ لیا ہے کہ اگر کوئی ڈانے کا تو بندو ق لے کر کوئی رادوں کا قصہ ختم۔“ (آپ نے بہت اہم معاملے کی جانب توجہ دلائی۔ یقیناً ہی طرح کی خبروں اور پروگراموں کا بچوں کے ذہن پر نہایت منفی اثر ہوتا ہے۔ نہ صرف ہی دی جھیلز کو چاہیے کہ اس طرح کے پروگرام نشر کرتے ہوئے لکھ دیں کہ بچے نہ دیکھیں بلکہ والدین کا بھی فرض ہے کہ بچوں کو ایسے پروگرام نہ دیکھنے دیں۔ یہ ایک نہایت اہم انیائی مسئلہ ہے جس پر فروری توجہ کی ضرورت ہے ورنہ نئی نسل برباد ہو جائے گی)

خوش جمالوں کے دلوں میں گھر کرنے والی وہ فسیوں کار شخصیت اہل علم و دانش کے دماغوں کو بھی مسخر کرتا رہا تھا۔ آج بھی اہل دانش اسے علم کی معراج پر دیکھتے ہیں مگر کوئی اس کے ٹوٹے ہوئے دل میں جہانکنے کی کوشش نہیں کرتا کہ وہ کس طرح غم عشق میں مبتلا رہا، سوگ کی دنیا آباد کیے اپنی منزل کی طرف گامزن رہا، اس پر کوئی غور نہیں کرتا، بس سب اس کے فلسفے میں ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ اسے اس عہد کے بڑے فلسفیوں میں شمار کر کے خوش ہولیت ہیں۔

ایک معروف فلسفی کا زندگی نامہ ایک ٹوٹے دل کی کہتا

کارل لڈوگ کے ہونٹوں پر ایک چھکی سی مسکراہٹ ابھرتی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ شاید یہی کہ چھکی کی کیا ضرورت ہے لیکن بڑے پادری نے آنکھیں دکھائیں تو اس نے اپنی ٹوٹی اٹھائی اور گرجے سے باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لیے تو اس کی طبیعت مزید تسخیر ہو گئی اور وہ تیزی سے گھر کی طرف چل دیا۔

کارل لڈوگ یہ بھول ہی گیا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ اس نے سوچا تو صرف یہ سوچا کہ کچھ دیر آرام کر لے گا تو طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ اسی طرح کا بے پروا تھا سونے کے لیے بستر پر لیٹ گیا۔

ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ اس کی بیوی نے اسے بیدار کیا اور اطلاع دی کہ بڑے پادری صاحب آئے بیٹھے ہیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ انہوں نے فرانزکا کو سب کچھ بتا دیا ہو۔ اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا جہاں بڑے پادری صاحب بیٹھے تھے۔ یہاں پہنچ کر اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انہوں نے فرانزکا کو سب کچھ بتا دیا ہے۔

”مجھے معلوم تھا تم ڈاکٹر کے پاس نہیں گئے ہو گے۔ یہی معلوم کرنے آ گیا تھا۔“

”بس جانے ہی والا تھا۔ آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی۔“

”یہ بھی نہیں جانتے۔ اچھا ہوا آپ نے مجھے بتا دیا۔ اب میں انہیں لے کر جاؤں گی۔ انہوں نے تو مجھے یہ تک نہیں بتایا کہ گرجا میں ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔“ فرانزکا نے

بڑے پادری نے چھوٹے پادری کی طرف تشویش آمیز نظروں سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ بڑی طرح کانپ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر حشک کے ایسے آثار تھے جیسے وہ میلوں کا سفر پیدل طے کر کے آ رہا ہو۔

”تمہیں کیا ہو رہا ہے، کارل لڈوگ! تمہارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں؟ ابھی تم اپنا ہاتھ ماتھے تک لے کر گئے تھے تو میں دیکھ رہا تھا کہ تمہیں بڑی دشواری پیش آرہی تھی۔“

”ہاں، کچھ دن سے کبھی کبھی کیفیت ہو جاتی ہے۔ طبیعت میں چڑچڑاہٹ بھی آتا جا رہا ہے۔“

”میرے خیال میں تو یہ تمہارے اعصاب کی کمزوری ہے۔ تم کسی اچھے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟“

”آج یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی ہے۔ اب تو کسی ڈاکٹر کے پاس جانا ہی پڑے گا۔“

”کمال ہے، آج کل کے نوجوانوں کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ تم لوگ اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟ تم کسی ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤ۔ ابھی تو تمہیں میری جگہ لے لی، بہت ترقی کرنی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ دیکھیے، اب میرے ہاتھ بھی نہیں کانپ رہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر ڈاکٹر کے پاس ضرور جانا۔“

”جی فادر، آج ہی جاؤں گا۔“

”تو پھر جاؤ، بیٹھے کیوں ہو؟ تم چھٹی کرو، میں کام سنبھال لوں گا۔“



کہا اور ساتھ ہی کارل لڈوگ کو حکم دیا کہ وہ اس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس ملے۔

کارل لڈوگ نطشے جرمی کے سیکوئی علاقے کا یادری تھا۔ انیسویں صدی میں یہ علاقہ پروشیا کی سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ یہاں وہ لوٹھرین چرچ سے تعلق رکھتا تھا۔

اس نے ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کرایا اور یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ اس کے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اسے یہ بتادیا کہ اگر اس نے علاج نہیں کرایا تو اس پر دورے پڑنے لگیں گے۔ وہ ابھی جوان تھا اور یہ مرض!

وہ علاج کراتا رہا لیکن اس کی صحت روز بہ روز گرتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس ترقی کے بہت مواقع تھے۔ وہ ابھی جوان تھا۔ بادشاہ فریڈرک اسے بہت پسند کرتا تھا۔ وہ بہت جلد بڑے یادری کی جگہ سفیال سکا تھا لیکن اب وہ ڈنٹے واریوں سے گزرنے لگا تھا۔ اب تو وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ کسی دور دراز کے مقام پر جا کر رہے جہاں سکون ہی سکون ہو۔

اس نے خود پر ترقی کے سارے دروازے بند کر لیے اور بادشاہ سے یہ درخواست کی کہ اسے کسی دیہات کے گرجا میں بھیج دیا جائے۔ بادشاہ یہ بھی نہ چاہتا کہ وہ یوں ضائع ہو جائے لیکن اس کی صحت کا خیال کرتے ہوئے اسے ایک پسماندہ گاؤں ”روکن“ بھیج دیا گیا۔

اس گاؤں میں آنے کے بعد کارل لڈوگ کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا کیونکہ یہاں کام کم تھا اور تنہائی زیادہ تھی۔ پریشان کرنے کے لیے ملنے جلنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس کی بیوی فرانز کا یہاں آکر کچھ دنوں گھبرائی ضرور تھی لیکن گاؤں میں اپنی اور اپنے شوہر کی عزت دیکھ کر کبھل بھی گئی تھی۔ کارل لڈوگ نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ صحت ٹھیک ہوتے ہی وہ کسی بڑے شہر کا رخ کرے گا اور اپنے لیے ترقی کے راستے تلاش کرے گا۔

فرانز سکا نے اسے ایک روز یہ خوش خبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس خوشخبری کے لیے کارل لڈوگ کو چار سال انتظار کرنا پڑا تھا۔ اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”دیکھنا میں اپنے بچے کو بہت بڑا یادری بناؤں گا۔“

”ابھی یہ کیا خبر مل رہی ہے یا لڑکا؟“

”لڑکا ہی ہوگا، ہمارے خاندان میں سبھی ہوتا ہے۔“

”آپ تو بس.....“ فرانز سکا شرم کر رہی تھی۔

کارل لڈوگ کے دو ہی شوق تھے۔ شام کے وقت گرہیں بنے بند ہو کر موسیقی سے لطف اندوز ہونا یا پھر بیوی کو

ساتھ لے کر کھیتوں کی طرف نکل جانا۔ دیہات میں اس سے زیادہ تفریح اور ہونجی کیا سکتی تھی۔

دن پر دن گزرتے رہے۔ پھر ان کا پہلا بچہ 15 اکتوبر 1844ء کو پیدا ہوا۔ اتفاق سے یہ وہی تاریخ تھی جب بادشاہ اپنی سالگرہ مناتا تھا۔ کارل لڈوگ نے اپنے بیٹے کا نام بادشاہ کے نام پر فریڈرک رکھا، فریڈرک نطشے۔ فرانز سکا کو ایک کھلونا مل گیا تھا۔ گھر کی تنہائی دور ہو گئی تھی۔

فریڈرک نطشے کی آمد ایسی مبارک ثابت ہوئی۔ ایک بھائی اور پیدا ہوا اور پھر ایک بہن آگئی جس کا نام لڑکھڑکھا گیا۔

فریڈرک نطشے اپنے بھائی اور بہن سے مانوس ضرور تھا۔ خاص طور پر لڑکھڑکے سے تو بہت ہی محبت کرتا تھا لیکن وہ طبیعتاً افسردہ اور خاموش رہنے والا تھا۔ یوں ابھی دیر سے لکھا تھا۔

جیران آنکھوں سے گرد و پیش کے لوگوں کو اس طرح دیکھتا تھا جیسے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔

تین بچوں کی موجودگی نے گھر کو پروانچ کر دیا تھا لیکن بد قسمتی پیچھا کر رہی تھی۔ کارل لڈوگ پر ایک مرتبہ پھر اعصابی دورے پڑنے لگے۔

ایک روز وہ گھر کی بیڑھیاں اتر رہا تھا کہ پاؤں پھسلا۔ بیڑھیاں کوئی ایسی زیادہ نہیں تھیں لیکن پتھر کی تھیں اور سران بیڑھیوں سے ٹکرا گیا تھا۔ یہ چوٹ ہی بہانہ بن گئی۔ اس کے بعد وہ بستر سے نہ اٹھ سکا۔ قوت گویائی ختم ہو گئی۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔

فرانز سکا بڑے جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ تین بچوں کی دیکھ بھال، گھر کے کام کاج اور بستر پر پڑے شوہر کی تیمارداری۔

اس نے اپنی چھوٹی بہن کو اپنے پاس بلایا اور دونوں مل کر یہ بوجھ اٹھائی رہیں۔ تنہا فریڈرک نطشے بہت حساس بچہ تھا۔ اس پر باپ کی بے بسی نے ایسا اثر کیا کہ بالکل ہی خاموش ہو گیا۔

باپ کے پاس خاموش بیٹھا رہتا یا الگ بیٹھ کر قصورات کی دنیا میں گم رہتا۔

اُداسی کے یہ دن اتنے طویل ہو گئے کہ ایک سال گزر گیا۔ اس دوران کارل لڈوگ کا علاج ہوتا رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ دوبارہ نابل زندگی نہیں گزاریں گے۔ کارل لڈوگ کو شاید ڈاکٹروں کی یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ اس نے ڈاکٹروں کو کھنڈل دیا۔ ڈاکٹر تو کہتے تھے،

زندہ رہیں گے لیکن نابل زندگی نہیں گزاریں گے۔ شاید کسی وقت کچھ بہتری آجائے۔ کارل لڈوگ نے بے بسی کی زندگی پر موت کی ترجیح دی۔ ایک دن خاموشی سے رخصت ہو گیا۔

فرانز سکا کیوہ ہوئی۔

فریڈرک نطشے کی عمر اس وقت پانچ سال تھا۔ اس نے اپنے باپ کی لاش دیکھی۔ آہ و بکا کا شور مٹا۔

گرہے میں کھٹیاں بچ رہی تھیں۔ پورا گاؤں اس کے باپ سے زیادہ اس پر آنسو بہا رہا تھا جو صرف پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا تھا۔ اس کا ذہن ایک ایک منظر کو محفوظ کرتا جا رہا تھا۔ اس کے آنسو اس کے دل ہی میں کھیں چھپ گئے تھے۔

پھر وہ اپنے باپ کے جنازے کے ساتھ اس قبرستان تک گیا جہاں اس کے باپ کو قبر میں اتارا جاتا تھا۔ ایک گہری قبر میں اپنے باپ کے تابوت کو اتارتے ہوئے دیکھا۔ لوگ مریکوں جاتے ہیں اور پھر انہیں قبر میں کیوں اتارا جاتا ہے؟ اس کا

معصوم ذہن سوچ رہا تھا۔

وہ گھر لوٹ کر آیا اور جب رات آگئی، گھر عورتوں سے خالی ہو گیا تو وہ اس بستر کے قریب گیا جہاں اس کا باپ لیٹا کرتا تھا۔ ہلکے ہلکے باپ کو آواز دی اور پھر بے اختیار روئے لگا۔

اس کے آنسوؤں نے ایک مرتبہ چہرے پر کھڑکھڑایا۔ وہ سوئے کے لیے لیٹا تو گرہے کی المناک کھٹیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔

بالآخر بہت دیر بعد اسے نیند آئی تھی۔

اس کا بھائی اور بہن بہت چھوٹے تھے۔ انہیں اس سانچے کا اندازہ کیا ہوتا۔ فرانز سکا اپنے آنسو ضبط کیے بیٹھی تھی۔ بچوں سے اپنا دکھ چھپا رہی تھی۔

دوسرے دن کے سورج نے گھر میں قدم رکھا تو ایسی اُداسی ساتھ لایا جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ کچھ ضروری رسومات کے لیے فرانز سکا گرہے کی طرف سے نکلتا تھا۔

”مام! میں بڑا ہو کر اس گرجا کا یادری بنوں گا، بالکل اسی طرح جیسے کہ میرے ڈیڈے تھے۔“

”شاباش میرے بچے! کیوں نہیں؟“

پورا گھر اس سانچے کے ذم کو بھرنے کے انتظار میں زبردستی ہنس رہا تھا۔ فرانز سکا کی چھوٹی بہن کا اس میں بڑا ہاتھ تھا۔ وہ دن بھر بچوں کے ساتھ کھلتی رہتی تھی تاکہ گھر میں ان کی ہنسی گونجتی رہے البتہ نطشے کی طرف سے وہ فکر مند تھی جو،

اب پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گیا تھا۔

وہ ڈراؤنے خواب دیکھتا تھا اور اٹھ کر اپنی ماں سے چمٹ جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اس کیفیت سے نکلنے لگا تھا۔ کئی مہینے گزر گئے بلکہ اب سال ہونے کو آتا تھا۔ ایک رات وہ سوئے کے لیے لیٹا تو آنکھیں بند ہوتے ہی ایک خواب اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ماتھی دھنیں بچ رہی ہیں، ویسی ہی جیسی اس نے باپ کے انتقال پر

ٹی وی میں۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ اس قبرستان میں کھڑا ہے جہاں اس کے باپ کو دفن کیا گیا تھا۔ اپنی دیر میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک قبر کی اور اس کا باپ باہر نکلا۔ وہ گرہے کی طرف جا رہا تھا، کچھ دیر بعد وہ واپس آیا۔ اس کی گود میں ایک ننھا سا بچہ تھا جسے نطشے بالکل نہیں پہچان سکا۔ اس کا باپ اس بچے کو لے کر اسی قبر میں اتر گیا۔ قبر اپنی جگہ آگئی۔ ماتھی دھنیں خاموش ہو گئیں۔

نطشے کی آنکھ کھلی گئیں۔ وہ کچھ دیر ڈر کے مارے کا ہتھارہا اور پھر دوبارہ سو گیا۔ صبح ہوئی اور اس کی ماں اسے بیدار کرنے آئی تو اسے اپنا خواب یاد آ گیا۔ اس نے اپنی ماں کو پورا خواب سنا دیا۔

”تم ابھی تک اپنے ڈیڈی کی موت کو نہیں بھولے ہو۔“

اس کی ماں نے کہا ”بھلائی کی کوشش کرو، زندگی ایک جگہ رک نہیں جاتی۔ ابھی تمہیں بڑا ہونا ہے، اپنے باپ کی طرح یادری بننا ہے۔ ان خوابوں پر نہ جاؤ، چلو اٹھو اور ناشتے کی میز پر آ جاؤ۔“

فرانز سکا نے بیٹے کو سمجھا تو دیا تھا لیکن ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ذرا فرصت ملی تو وہ اس خواب کے بارے میں سوچنے لگی۔ کچھ دیر کے لیے پریشان ضرور ہوئی لیکن پھر اسے وہم کچھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔ اسی طرح خود کو سمجھانے لگی جس طرح وہ کچھ دیر پہلے نطشے کو سمجھا چکی تھی۔

اس خواب نے اسے کئی دن الجھائے رکھا اور پھر بہت سی باتوں کی طرح یہ خواب بھی ذہن سے اتر گیا۔

ابھی اس خواب کو دیکھنے چارہ ماہ گزرے تھے کہ نطشے کا چھوٹا بھائی بیمار پڑا اور چند گھنٹوں کے اندر اندر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

فرانز سکا جب اپنے مردہ بچے پر بین کر رہی تھی تو اسے رورہ کر نطشے کا دیکھا ہوا خواب یاد آ رہا تھا۔ اس کا خواب سچا ہو گیا تھا کیونکہ اسے کارل لڈوگ کی قبر کے برابر ہی دفن کیا جا رہا تھا۔

اس دُہری مصیبت نے فرانز سکا کو توڑ پھوڑ دیا۔ ابھی شوہر کا غم بھلا نہیں پائی تھی کہ گودا بڑ گئی۔ وہ اب یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ گاؤں ہی منحوس ہے۔ پہلے اس کا شوہر اس سے چھین لیا اور پھر اس کا ننھا بیٹا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے قریب بیٹھے ہوئے نطشے اور لڑکھڑکے کو یوں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا جیسے خطرے کے وقت مرثی اپنے چھوڑوں کو پروں میں چھپاتی ہے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس گاؤں میں نہیں رہے گی کہ وہ اپنے بچوں کو قصبہ نومبرگ لے جائے گی جہاں اس کا سیکا تھا۔

اگر اسے سون ہو کر وہ کسی ایسا دروازہ کھول دیتا ہے۔
اس نے اپنے دوستوں کو ساتھ ملا یا، چھوٹا سا راتج بنایا، پردے
کھڑے کیے۔ سب نے مل کر اس کا لکھا ہوا ڈراما راتج کیا۔
بچوں کو تو فخر حاصل ہوا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھتا
رہا اور سب مل کر راتج کرتے رہے۔

بچپن ان ہی کھیل تماشوں میں گزرتا رہا۔ ان تماشوں
میں الڑیہ بھی اس کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

وہ اسکول جانے لگا تھا لیکن پڑھائی میں اس کا دل نہیں
لگ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس کا ایک ساتھی مہنور
کی قدیم درس گاہ میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ ایک رہائشی اسکول
تھا۔ اس کا دوست جب بھی گھر آتا تھا تو اس درس گاہ کی
تعریف کیا کرتا تھا۔ تعریفیں سن کر غلطے کو بھی شوق ہوا کہ وہ
اس اسکول میں داخلہ لے۔

یہ اسکول نمبر ۱۷ سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک
ندی کے کنارے واقع تھا۔ یہ ایک بورڈنگ اسکول تھا یعنی
طالب علموں کو وہیں رہنا پڑتا تھا۔ یہ اسکول چونکہ چند
پادریوں نے قائم کیا تھا اور غلطے چونکہ آئینہ پادری کا بیٹا
تھا اس لیے داخلے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اس کی ماں اسے
وہاں بھیجے ہوئے ہچکچاہٹ رہی تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا، وہ بھی نظروں
سے دور ہو جاتا تھا۔ گھر میں بہت دن تک تاؤ ڈھال اور بالآخر اسے
داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔

وہ گھر اور گھر والوں سے دور مہنور کی اس قدیم درس
گاہ میں چلا گیا۔ اس وقت اس کی عمر تیرہ یا چودہ سال تھی۔
اس اسکول میں آنے کے بعد بھی اس کی پُرانی عادتیں
برقرار رہیں۔ سب سے پُرانی عادت دوسروں سے الگ
تھلگ رہنے کی عادت تھی۔ دوست بنائے تھے مگر بہت کم۔
اس کی دینی افتادہی ایسی تھی کہ بہت کم دوست اس کے معیار
پر پورے اترتے تھے۔ کھیل کود میں بھی اسے دلچسپی نہیں تھی۔
یہ عادت یہاں بھی برقرار رہی۔ اتوار کی سہ پہر کو جب تمام
لڑکے اسکول کے گراؤنڈ میں جمع ہوتے، وہ لمبی سیر کے لیے
نکل جاتا اور دور تک چلا جاتا۔

میں نے ایک بار اس کی والدہ اور بہن اس سے ملنے
آئیں۔ یہ دن اس کے لیے بڑی خوشی کا ہوتا تھا۔ وہ انہیں لے
کر قریبی سرائے میں چلا جاتا۔ یہ سرائے اس کا گھر بن جاتی۔
چند روز کے بعد والدہ چلی جاتی تھیں۔ پھر وہی اسکول کی
تہائی۔

اس تہائی کو دور کرنے کے لیے اس نے کتابوں کو دوست
بنالیا۔ خاموشی سے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے کمرے

بھائی رحمت ہو گیا تھا۔ اب ایلارہ لیا تھا۔
فرانز کا شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ غلطے کی حفاظت کے
لیے گھر میں کوئی اور بھی ہونا چاہیے۔ اس کی ماں کی طرف
سے بھی خط آ رہے تھے کہ وہ نمبر ۱۷ چلی آئے۔ ایک دن
سامان لے جانے والا چٹخڑا دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔
اس نے گھر کا سامان چٹخڑے پر لا دا۔ غلطے اور الڑیہ کا ہاتھ
پکڑا اور گھوڑا گاڑی میں سوار ہوئی۔

غلطے اب جس گھر میں آتا تھا، اس میں اس کی نانی اور دو
خالائیں پہلے سے موجود تھیں۔ گھر میں واحد موصوف فریڈرک
غلطے ہی تھا جس کی عمر اب چھ سال سے اوپر ہو رہی تھی۔
نمبر ۱۷ کوئی بڑا شہر نہیں تھا بلکہ چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن
نہایت خوبصورت جہاں نئے غلطے کی آواں طبیعت کے پہلنے
کے بہت سے مواقع تھے۔

یہاں پہنچ کر اسے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ وہ خاندان
کے بزرگوں کے ناموں اور کارناموں سے واقف ہو گیا۔
بزرگوں کی یہ کہانیاں اس کی نانی اسے سنایا کرتی تھیں جن میں
حقیقت کم مبالغہ زیادہ ہوتا تھا۔ اسے نانی ہی کی زبانی معلوم
ہوا تھا کہ اس کے آباؤ اجداد چھوٹے موٹے تاجر تھے البتہ اس
کے دادا پادری تھے اور اس کے والد بھی۔ غلطے کو تاجر سے
زیادہ پادری بننے کا شوق تھا۔ یہ شوق ہو ہی جانا چاہیے تھا
کیونکہ گھر کا ماحول ہی ایسا تھا۔ وہ سب کو عبادت کرتے اور
نصیحتیں کرتے ہی دیکھتا تھا۔ اس خوف سے کہ غلطے بگڑ نہ
جائے اسے دین کی طرف راغب کیا جا رہا تھا۔ باہر نکلے اور
بچوں کے ساتھ کھیلنے تک سے منع کیا جاتا تھا۔ وہ نانی اور والدہ
کے ساتھ باقاعدگی سے گرجا جاتا رہتا تھا۔ باہر نکلتا بھی تھا تو
دوسرے بچوں سے مختلف ہی نظر آتا تھا۔ سنجیدہ، متین اور کچھ
سوچتا ہوا۔ اسی لیے بچوں نے اسے ”ننھا پادری“ کہا، نہ شروع
کر دیا تھا۔

وہ ابھی اسکول نہیں گیا تھا لیکن گھر پر اس کی تعلیم کا آغاز
ہو گیا تھا۔ گھر کی سب عورتیں اسے اپنی اپنی دانست میں تعلیم
سے آراستہ کر رہی تھیں۔

کارل لڈوگ کو موسیقی سے شغف تھا۔ غلطے نہایت کم سن
میں باپ کے اس شوق کا مشاہدہ کر رہی چکا تھا۔ جب وہ دو سال
کا ہوا تو اسے بھی شوق ہوا۔ گھر میں پیانو رکھا تھا۔ وہ پیانو کھینچنے
لگا۔ جلد ہی وہ دھنیں ترتیب دینے لگا۔ خود ہی چھوٹے چھوٹے
گیت لکھتا اور ان گیتوں کے لیے دھنیں تیار کرتا۔

اس کے اس شوق نے بہت سے بچوں کو اس کے قریب
کروا دیا۔ انہی دنوں وہ اپنی ماں کے ساتھ تھیٹر دیکھنے گیا۔ گھر

میں لاطینی ادب، عبرانی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ ارضیات، نباتات اور فلکیات کی کتابیں دیکھی جا سکتی تھیں۔
درس گاہ کا ماحول مذہبی تھا اس لیے اس کا عقیدہ تھا کہ تمام علوم اپنی جگہ لیکن اصل چیز مذہب ہے جو تمام علوم کی بنیاد ہے۔
شب و روز گزرتے رہے۔ اس عرصے میں اس نے شکر، ہولڈرن اور بائرن جیسے شاعروں کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔
شاعری کی رومان پرور فضا نے اسے دیوی دیوتاؤں کی دنیا میں پہنچا دیا۔ ہر وقت خواب دیکھنا اور اداسیوں کی چادر اوڑھے رہنا اس کا شیوہ بن گیا۔

شاعری کے اس مطالعے نے اس پر ایک اور نتیجہ یہ مرتب کیا کہ اسکول کا نظم و ضبط اسے بوجھ معلوم ہونے لگا۔ اس کی فطرت میں آزاد خیالی سر اُبھارنے لگی۔ اس میں کچھ قصور اس کی عمر کا بھی تھا۔ اب وہ سترہ سال کا ہو گیا تھا۔ شباب کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ اب اسے اساتذہ کے خطبات سننے کے بجائے اپنی روح سے باتیں کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔ اب اس کے عقیدوں میں بھی دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ مذہب سے دور ہونے لگا تھا۔ باپ پادری تھا۔ ماں خدا کے آگے جھکنے والی تھی۔ درس گاہ کا ماحول مذہبی تھا لیکن وہ الحاد کی آنکھوں سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔

مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہی اس کے خیالات میں انقلاب آ گیا۔ اب وہ اپنے باپ کی طرح پادری بننے کے بجائے موسیقار بننا چاہتا تھا۔
اس کی ماں اس سے ملنے آئی تو یہ وحشت ناک خبر اس نے ماں کے کانوں تک پہنچا دی۔

”اب مزید تعلیم حاصل کرنے سے مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔ یوں بھی اب پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اب میں پادری یا پروفیسر بننا نہیں چاہتا۔ میں اب موسیقار ہوں گا۔“
کسی بھی ماں کے لیے یہ خبر اچھی نہیں ہو سکتی کہ اس کا بیٹا آگے پڑھنا نہیں چاہتا۔ اس کی ماں نے اسے سمجھایا، وہ بھی اپنے ارادوں میں ابھی اتنا پختہ نہیں ہوا تھا لہذا اس نے یکدم درس گاہ کو چھوڑ دیا۔

اس نے درس گاہ کو نہیں چھوڑا تھا مگر اپنے ارادوں کو بھی خیر باد نہیں کہہ سکا تھا۔ اس کی سوچوں کے دروازے بند نہیں ہوئے تھے۔ سب سے بڑی سوچ یہ تھی کہ وہ آئندہ کے لیے کون سا راستہ اختیار کرے۔ میں کیا پڑھوں؟ یہ سوال ہر وقت اس کے سامنے رہتا تھا۔ یہاں سے نکل کر وہ کہاں جائے گا؟ یہ دوسرا سوال تھا۔
اس کا دماغ فلکی کا تھا اور وہ خود موسیقار بننا چاہتا تھا۔

یہی وہ دو شاہراہیں تھیں جن پر وہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہتا تھا۔
مستقبل کے اندیشوں نے اسے اتنا پریشان کیا کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ سر اور آنکھوں کی تکلیف میں ایسا جھلا ہوا۔ وہ گھبرا کر ماں کے پاس چلا گیا۔

کال وہ سینے بعد وہ اسکول لوٹ کر آیا تو اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ عام طالب علموں کی طرح معمول کی زندگی گزارے لیکن اس کی سوجھیں پھر بھی اسے چین لینے نہیں دے رہی تھیں۔ اس نے ذہنی سکون کے لیے ایک راستے کا انتخاب کر لیا۔ اس نے قلم ہاتھ میں لے لیا۔ وہ نظمیں لکھنے لگا۔ یہ نظمیں وہ نومبرگ میں اپنے دوستوں کو بھی بھیجا کرتا تھا۔ اس نے چند تنقیدی اور فکری مضامین بھی لکھے اور دوستوں کو بھیجے۔

اپنی ان کاوشوں کی وجہ سے وہ اساتذہ کی نظروں میں آ گیا۔ ان اساتذہ کی مدد سے وہ قدیم ادب اور زبانوں کا مطالعہ بھی کرتا رہا۔

اسکول چھوڑنے کے دن نزدیک آ رہے تھے۔ اسکول کا قاعدہ تھا کہ ایسے سینئر طلبہ کو اساتذہ اپنے گھر مدعو کرتے تھے۔ اسے بھی یہ مواقع ملنے لگے۔ وہ ایسی ہی ایک دعوت میں شرکت کے لیے اپنے ایک استاد کے گھر گیا۔ وہاں کھانے کی میز پر اس نے ایک لڑکی کو دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی صنف نازک کو مرد کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی بھی اس کی آنکھوں کے پیغام سے بے خبر نہ رہ سکی۔ اس نے بھی کئی مرتبہ پلکوں کی جھلک اٹھائی اور اس کے لیے آنکھوں کے چراغ روشن کر دیے۔

کھانے سے فراغت کے بعد جب سب مل کر بیٹھے تھے تو نطشے کے لیے اس لڑکی کے سوا کوئی بھی ماں موجود نہیں تھا۔ نطشے نے اپنے استاد کی فرمائش پر اپنی ہی نظمیں سنائیں۔ وہ لڑکی ان نظموں سے متاثر ہو رہی تھی خود نطشے کا حال یہ تھا کہ ان نظموں کے معنی آج اس پر مکمل رہے تھے۔

وہ اس دعوت سے لوٹ کر آیا تو دل میں یہاں تو بیٹھ رہے تھے۔ اس نے اس رات ایک نظم لکھی جو صرف اس لڑکی کے لیے تھی۔ اس نظم میں نطشے کی دلی کیفیات پوری طرح سامنے آ گئیں۔

دوسرے دن خیال نے اس کا دامن تمام لیا کہ وہ اس نظم کو کس طرح اس لڑکی تک پہنچائے۔ وہ شام کے وقت ان استاد کے گھر ایک کتاب ہاتھ میں لے کر پہنچ گیا۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ ان سے اس کتاب کے چند ابواب سمجھنے آیا ہے۔ اتفاق سے استاد گھر پر نہیں تھے۔ قدرت بھی

شاید اس کی مدد کر رہی تھی۔ اس کی میزبانی ایسی لڑکی کو کرنی پڑی۔ نطشے کو معقول لگ گیا کہ وہ یہ نظم اس لڑکی کو سنا سکے۔
اس دن خوب باتیں ہوئیں۔ وہ یہ بتانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اسے پسند کرنے لگا ہے۔ لڑکی بھی اس سے متاثر نظر آ رہی تھی۔

وہ کئی دن تک پڑھنے کے بہانے ان استاد کے گھر جاتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ کون سی کتابیں ہو سکتی ہیں جو وہ اس لڑکی کو تحفے میں پیش کرے۔ کئی دھنیں سوچتا رہا جو اس کا خیال تھا یہاں تو پڑھ کر اس لڑکی کو سنا سکے گا۔

مسرت کے لمحات میں وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ لڑکی مہمان کے طور پر آئی ہوئی ہے۔ کن دن اسے جانا بھی ہوگا۔ وہ اس روز چند کتابیں ہاتھ میں لے کر اپنی استاد کے گھر گیا۔ یہ کتابیں وہ تحفے کے طور پر اس لڑکی کو دینا چاہتا تھا لیکن وہ لڑکی چاکلی تھی۔ اس نے وہ کتابیں اٹھائیں اور ایک لفظ کہے بغیر وہاں سے اٹھ آیا اور اپنے کمرے میں آکر بند ہو گیا۔ اسے اس لڑکی پر غصہ آ رہا تھا جو اسے بتائے بغیر چلی گئی تھی۔

یہ رزم گہرا نہیں تھا۔ اچھی سی چوٹ بھی جو جلد ہی بھری گئی۔ اس چوٹ نے اسے تکلیف تو نہیں پہنچائی لیکن یہ تجربہ ضرور دیا کہ لوگ پتھر بھی جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ تجربہ اور وہ لڑکی کتنے دنوں تک اس کی تخلیقی صلاحیتوں میں جذب رہی کیونکہ جانے والے چلے جاتے ہیں مگر ان کے قدموں کے نشانات بہت دن تک باقی رہتے ہیں۔

وہ پیا تو بجا تار ہا۔ نئے نمبر تار ہا۔
رخصت کے دن قریب آ رہے تھے۔ اس نے ڈیلوما حاصل کیا اور پھر وٹا کے مدرسے سے فارغ ہو کر نومبرگ واپس آ گیا۔

بڑے دنوں کے بعد وہ نومبرگ کے دوستوں سے ملا تھا۔ لمبی لمبی سیریں کرتا رہا۔ خوش چکیوں میں دن گزرتے رہے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ برسوں کی تسکین اتار رہا ہو۔

ایک شام وہ اپنے دوست پال ڈیون کے گھر بیٹھا تھا کہ یون یونیورسٹی کا ذکر نکل آیا۔ یون جو ان نطشے کو شوق ہوا کہ وہ بھی یون یونیورسٹی میں داخلے۔ اس یونیورسٹی کا علمی وقار اور آزادی اس کے لیے متاثر کن تھی۔

اس نے اپنے دوست پال ڈیون کو آمادہ کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے۔ پال ڈیون نے اپنے ایک کزن کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ وہ تینوں نومبرگ سے نکلے۔ یون تک کا یہ سفر علم سے زیادہ تفریح کے لیے تھا جیسے کوئی نئی دنیا کی سیر کے لیے جاتا ہے۔ چلتے چلتے شرارتوں سے جی

بھلائے وہ یون یونیورسٹی پہنچ گئے۔ ایک نئی دنیا ان کے سامنے بازو پھیلائے کھڑی تھی۔

نطشے نے اپنے لیے ”لسانیات“ اور ”الہیات“ کے مضامین کا انتخاب کیا۔ لسانیات کا اس لیے کہ وہ پرانی زبانوں کا مطالعہ پہلے ہی کرچکا تھا اور الہیات؟ شاید اس لیے کہ مذہب کی طرف سے جو شکوک و شبہات اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے، وہ ان کے درست یا غلط ہونے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا، میں تپائی کی تلاش میں ہوں چاہے وہ کتنی ہی خوف ناک ہو۔

اس نے مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ پادریوں کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی جس کے پابند ضابطوں کے اثرات اب تک اس کے دل و دماغ پر تھے۔ یون یونیورسٹی کے آزاد ماحول میں قدم رکھتے ہی اس کے تئیر بدلنے لگے۔ اس نے تھا، اپنے تصورات میں گم رہنا چھوڑ دیا۔ اس نے بہت سے دوست بنائے اور دیکھتے دیکھتے شوخ اور شیرازوں کا حلقہ اس کے گرد جمع ہو گیا۔ یہ ایسی تہذیبی کمی جوتہ جانے کس نفسیاتی تسمی کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ الگ تھلک رہنے والا ایک لڑکا بزم آرائیوں میں مشغول ہو گیا۔ ان دوستوں کی صحبت میں وہ شراب بھی پینے لگا۔ اس نے بھی سگریٹ تک کو ہاتھ نہیں لگا تھا اور اب شراب پی رہا تھا اور شراب پی کر لڑائی جھگڑے بھی کر رہا تھا، غل غلاؤ ابھی کر رہا تھا۔ اس کا شمار یونیورسٹی کے آوارہ لڑکوں میں ہو رہا تھا۔

اس آوارہ گردی کے مین مین وہ تربیت بھی سرفروری تھی جو اسے گھر سے ملی تھی اور ایک دن یہ تربیت اس پر حاوی آ گئی۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ وہ وقت جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔

اس کے اندر کا پادری جاگنے لگا۔ اس نے اپنے دوستوں کو سمجھانا شروع کر دیا۔

”تم سب یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہو۔ لیکن تعلیم کے سوا سب کچھ حاصل کر رہے ہو۔“
”تمہیں کیا ہو گیا ہے نطشے! کیوں ایسی باتیں کر رہے ہو؟“

”اس لیے کہ میں تمہاری اور اپنی بھلائی چاہتا ہوں۔ ہم نے اگر یہ وقت ضائع کر دیا تو ہم کچھ نہیں سن سکیں گے۔“
”تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“
”تمہاں کو اور شراب چھوڑ دو۔ ہماری تفریحات صحت مند ہونی چاہئیں۔“
”اچھا پادری صاحب، اپنا وعظ چھوڑ دو۔ تم تو ہمیں

جوانی میں بوڑھا بنانے پر تلے ہوئے ہو۔“
 ”جوانی صرف اس لیے نہیں ہوتی جو تم کر رہے ہو؟“
 ”فکرت کرو۔ ہم اس سے بھی آگے جائیں گے۔“
 طوائفوں کے دروازے بند نہیں ہیں۔“
 ”پھر تو تمہارا خدا حافظ ہے۔“

وہ اسی طرح سمجھاتا رہا اور ان دوستوں کو کسی قاعدے اور ضابطے میں لانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اب یہ دوست اس کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ مجبوراً پیچھے ہٹنے لگا۔ سب دوست اس سے چمن گئے۔ وہ پھر سے اکیللا رہ گیا لیکن اس مرتبہ یہ تنہائی اس کے لیے فخر کا باعث نہیں تھی بلکہ باعث عداوت تھی کیونکہ اس مرتبہ اس نے دوستوں کو نہیں چھوڑا تھا۔ دوستوں نے اسے چھوڑا تھا۔

وہ بلا کا خود دار تھا۔ دوستوں نے اسے اس طرح چھوڑا تو اس کی عزت نفس کو کچکا لگا۔ اس کا حوصلہ اسے ناکام دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور یہ اس کی ناکامی تھی کہ اس کے دوستوں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔

اسے اس ماحول سے وحشت سی ہونے لگی۔ ایک روز اچانک ہی وہ اس شہر سے نکلا۔ اب اس کا ارادہ تھا کہ یون یونیورسٹی کے بجائے لیچرگ یونیورسٹی میں تعلیم مکمل کرے گا۔ اس نے لیچرگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں آکر اسے بڑی ٹھانیت ملی۔ نیا ماحول تھا، نئے لوگ تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یون یونیورسٹی کے چار چوتھوں میں اس نے کیسے دن گزارے ہیں اور کس ناکامی سے دوچار ہوا ہے۔ یہاں وہ نئے انداز سے اپنے دن گزار سکتا تھا۔ وہ پوری تندی سے لسانیات پڑھنے لگا۔

ہو کر اس جادوگر کو دیکھنے لگیں۔ نطشے نے جب انہیں یوں مدھوش دیکھا تو پیا نو چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ وہ اپنے پیچھے بلند ہونے والے تھیلے کو رہا تھا۔

وہ وہاں سے بھاگ آیا تھا لیکن واپس آنے کے بعد اپنے بے وقوفی پر ہنس رہا تھا۔ اسی آخری لمحے ہی کہ کیا وہ وہاں پیا نو بچانے گیا تھا۔

کئی دن تک وہ پریاں اس کے تصور میں چکر کاٹتی رہیں اور پھر ایک روز وہ خود وہاں پہنچ گیا۔ اس مرتبہ کوئی لٹی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

لیچرگ واپس آنے پر بھی وہ ایسی جگہوں پر جاتا رہا۔ نتیجہ یہی ہوتا تھا۔ وہ ایسی ہی کسی جگہ سے ایک خطرناک بیماری ساتھ لے آیا۔ اس بیماری نے اس کی جسمانی قوت کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ بیماری اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔

وہ ایک بھیانک تجربے سے گزرا اور پھر بہر حال صحت یاب ہو گیا۔ قدرت نے اسے سنبھال لیا۔ پھر اس نے زندگی بھر ان کوچوں کا رخ نہیں کیا۔

اب کتابیں تھیں اور وہ تھا۔ ایک روز وہ اپنی پسند کی کتابیں دھوڑنے پر انی کتابوں کے بازار میں گیا۔ اس بازار میں اسے بعض نایاب کتابیں مل جاتی تھیں اور مناسب دام پر۔

وہ کچھ دیر مختلف کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اسی الٹ پلٹ میں ایک کتاب اس کے ہاتھ میں آئی۔ کتاب کی پیشانی پر لکھا تھا ”دنیا کا تصور کی حیثیت سے“ مصنف کا نام تھا ”شوپنہاؤز“ یہ کتاب نطشے کی پیدائش سے پچیس سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ گویا اب اسے شائع ہوئے پچاس سال کے قریب ہو گئے تھے۔

اس نے شوپنہاؤز صرف نام سنا تھا۔ اس کی کوئی تعریف نہیں پڑھی تھی۔ اس کتاب میں بھی اسے کوئی شش نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کتاب جہاں سے اٹھائی تھی، وہیں رکھ دی۔ آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ وہ کتاب اس نے بھرا کھالی۔ ایک مرتبہ پھر ورق گردانی کرنے لگا۔ وہ تذبذب میں تھا کہ خریدے یا نہیں اور پھر اس نے وہ کتاب خرید لی۔

اس کتاب نے اس کو ایک اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔ راتوں کی نیند اڑ گئی۔ پڑھتا اور سوچتا، سوچتا اور پڑھتا۔ چودہ دن کی مشقت کے بعد اس نے دو ہزار صفحات پر مشتمل کتاب کو ختم کر لیا۔

نطشے جس تنہائی کی تلاش میں نکلا تھا، یہ کتاب اسے اس تنہائی سے ہم کنار کر رہی تھی۔ اسے برسوں سے ایک مرشد کی تلاش تھی۔ شوپنہاؤز کی صورت میں یہ مرشد اسے مل گیا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ جس وقت یہ کتاب اس کے ہاتھ میں آئی اس سے چھ سال پہلے شوپنہاؤز کی وفات ہو گئی تھی۔ اب وہ اس سے مل نہیں سکتا تھا۔ اپنے ان اخلاقیات پر بحث نہیں کر سکتا تھا جو اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں ابھرے تھے۔

اسے یہ خلاف شوپنہاؤز کی توحید اور باسیت سے تھا۔ شوپنہاؤز اسے بہت آگے تک لے آیا تھا۔ اب نطشے کے لیے ضروری تھا کہ وہ شوپنہاؤز کے قومی خیالات کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھے۔

شوپنہاؤز نے اسے دنیا کو سمجھنے کا ایک زاویہ مہیا کر دیا تھا۔ اسے ایک مضبوط بنیاد ملی تھی جس پر کھڑے ہو کر وہ دنیا کا سامنا کر سکتا تھا۔ شوپنہاؤز نے اسے سکھایا کہ تاریخ اور سیاست فریب ہیں۔

شوپنہاؤز کا وہ اس قدر اسیر ہوا کہ اس نے شوپنہاؤز پر ایک مضمون لکھا اور دوستوں کو سنا یا۔ اس مضمون کا لب لباب یہ تھا کہ شوپنہاؤز تمام فلسفیوں میں سب سے سچا ہے۔ یہ وہ دن تھے جب پروشیا کی فوجی نہیں جاری تھیں۔ لوگوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کیا جا رہا تھا۔ نطشے کی آنکھیں کمزور تھیں اس لیے اب تک فوجی خدمات سے بچتا چلا آ رہا تھا لیکن جب افرادی قوت کی شدید قلت ہو گئی تو اس کا سیر بھی آ گیا۔ اسے گھڑ سوار دہشت میں بھیج دیا گیا۔ ادنی ذوق رکھنے والے ایک شخص کو فوج میں بھیج دینا حماقت تھی لیکن اس تبدیلی سے اسے کچھ دیر کے لیے خوشی ہوئی تھی اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔

”ہیرک میں رہتے ہوئے انسان کو اپنے آپ کو جاننے کا موقع مل جاتا ہے۔“
 اس کی یہ کیفیت عارضی تھی۔ فوجی زندگی کی سختیوں کا اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا۔ اب اس کے ایک اور خط کا اندازہ یہ تھا۔ ”جب ادنی ذوق رکھنے والے کسی شخص کو سپاہی بنادیا جاتا ہے تو وہ دنیا کا سب سے ناخوش حیوان بن جاتا ہے۔“
 اسے فوج میں گئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کسی حاذ پر جانے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ وہ گھڑ سواری کرتے

ہوئے گھوڑے سے گر گیا۔ اس کی پسیلیوں میں شدید بچوت آئی تھی لیکن ناکامیوں سے چڑنے والا نطشے کیڑے بھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یہی ظاہر کر رہا تھا جیسے اسے کچھ نہیں ہوا لیکن جب وہ ہیرک میں واپس پہنچا تو تازہ چوت نے رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا جہاں وہ ایک مہینے تک صاحب فراش رہا۔

اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد حکام نے اسے ہیرک کے بجائے گھر بھیج دیا۔ وہ پھر لیچرگ یونیورسٹی آ گیا۔

وہ تمام توجہ اپنی تعلیم پر صرف کر رہا تھا اور ایسا ذہین طالب علم ثابت ہو رہا تھا جس پر اساتذہ کو فخر ہوتا ہے۔ اس کی ذہانت اسے پھر بھٹکانے پر تلی ہوئی تھی۔ لسانیات کا علم اب اسے فضول معلوم ہونے لگا تھا کیونکہ یہ علم زندگی کے مسائل سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ ایک خیال تو تھانیت ہی خطرناک تھا۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ علم کیسیا حاصل کرے۔ اس کے ذریعے دولت بنائے اور ہیرک جاکر عیش و عشرت کی زندگی گزارے۔

اگر وہ اس خیال پر عمل کر لیتا تو ناکامیوں سے بڑنے والا خود ناکامی کی تصویر بن چکا ہوتا۔

موسیقی سے اس کی رغبت اب بھی باقی تھی۔ ان دنوں وہ موسیقار شومان کا دیوانہ تھا۔ پھر اس نے واگنر کے قومی نغمے سنے۔ جرمن قوم حالت جنگ سے گزر رہی تھی اور اس کے سر پر قومی عظمت حاصل کرنے کا خطبہ سوار تھا۔ واگنر ان خوابوں کو اپنے نغموں میں ڈھال رہا تھا۔

پوری قوم واگنر کی دیوانی ہو رہی تھی لیکن نطشے اتنی آسانی سے گرفتار ہونے والا نہیں تھا لیکن اس کے لیے جال تیار ہو رہا تھا۔

واگنر نے قومی عظمت کے موضوع پر ایک نظم لکھی۔ نظم کیا تھی جادو کا منتر تھا جس نے پورے جرمنی کو پھر کابیت بنادیا۔ یہ نظم نطشے نے سنی تو وہ بھی ششدر رہ گیا۔ اس کے دل میں بے اختیار یہ تمنا جاگی کہ وہ اس عظیم موسیقار سے ملاقات کرے۔ نہ صرف ملاقات بلکہ کسی خیلے کی طرح اس گرو کی خدمت کرے لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ لیچرگ میں نہیں تھا۔ بیس سال پہلے اسے انقلابی سرگرمیوں کے الزام میں اس شہر سے نکال دیا گیا تھا۔ اس عرصے میں اس کے سیاسی رویے بدل گئے تھے۔ شہرت کی بلند یوں تک پہنچ گیا تھا۔ عوام اسے دیوانہ وار پسند کر رہے تھے لیکن ان کی سزا نہیں ہوئی تھی۔

نظمی کے دوست نظمی کی دیوانگی سے واقف تھے لیکن واگز ہوتا تو اس سے ملاقات کرواتے۔

ایک روز اس کے ایک دوست نے اسے خوش خبری پہنچائی۔

”دوست! تمہیں مبارک ہو۔ واگز لیپرگ میں ہے۔“

”وہ چوری چھپے آگیا ہے اور اپنی بہن مادام بروک باس کے گھر ٹھہرا ہوا ہے۔“

”اب اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوگا۔ پورا شہر اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا۔ شاید اسی لیے حکمران اس کی طرف سے غفلت برت رہے ہیں۔“

”اس سے ملاقات کی سہیل کسے ہو؟“

”کل ہی اس کی بہن کے گھر چلے ہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

وہ دوسرے ہی دن اپنے دوست کے ساتھ مادام بروک کے گھر پہنچ گیا جہاں واگز ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ ملاقات پہلے سے طے نہیں تھی اور واگز اس وقت اپنے کام میں مصروف تھا۔ نظمی سے کہہ دیا گیا کہ وہ کل آ سکتا ہے۔

نظمی کو افسوس ضرور ہوا لیکن مہذب طریقہ یہی تھا کہ اسے وقت اسے وقت ملے کر کے آنا چاہیے تھا۔ وہ اور اس کا دوست کل تک کا انتظار کرنے کے لیے لوٹ آئے۔

وہ رات بھر دن نظمی کے انتظار میں کچھ سوتا کچھ جاگتا رہا۔ دن لگتا تو ایک امتحان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ دوسرے دن کا آغاز سخت بارش اور شدید برف باری سے ہو رہا تھا۔ باہر نکلنے کا سوال نہیں تھا واگز کے گھر تک پہنچنا تو دور کی بات، کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس موسم سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا لیکن اس وقت تو یہ بارش اس کے لیے انگاریوں کی بارش تھی۔ ایک طوفان اس کے دل میں تھا، ایک طوفان باہر کیوں میں شور مچاتا پھر رہا تھا۔ شام تک بارش رکنی نہیں تھی۔ اس کی امیدیں دم توڑنے لگی تھیں کہ اس کا دوست آگیا۔

”میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ بارش بہت ہو رہی ہے۔ واگز سے ملاقات کسی اور وقت پر ٹال دی جائے۔“

”یہ غلطی بھی مت کرنا۔“ نظمی نے کہا ”یہ موقع گیا تو پھر کبھی نہیں آئے گا۔“

”اس بارش میں کیسے جاؤ گے؟“

”اپنے مقصد کے حصول کے لیے آدی کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

”تو پھر چلو، ہمت کرتے ہیں۔“

نظمی نے جلدی جلدی کوٹ گلے میں ڈالا۔ چھتری

ساتھ لے لی اور دونوں گھر سے نکل گئے اور واگز کے گھر پہنچ گئے۔ یہ بارش ان کے لیے نعمت ثابت ہوئی تھی۔ بارش کی وجہ سے واگز کا کوئی پرستار وہاں نہیں تھا۔ گھر کے افراد کے سوا گھر خالی تھا۔

نظمی کے دوست نے نظمی کا تعارف کرایا اور پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں واگز کو احساس ہو گیا کہ اس سے ملاقات کے لیے آنے والا کوئی عام طالب علم نہیں ہے۔

ڈنر سے پہلے واگز نے اپنے مہمانوں کو موسیقی سے لطف اندوز کیا۔ اس کی موسیقی میں جادو تھا۔ اس کی باتوں میں جادو تھا۔ یہ ہوئی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس سے ملے اور اس کے سحر میں گرفتار نہ ہو۔ نظمی تو اس سحر میں گرفتار ہونے کے بعد ہی یہاں آیا تھا۔ اس کی تو حالت ہی دوسری تھی۔ وہ تو خواب دیکھ رہا تھا، خواب سن رہا تھا۔

واگز نے ملاقات ختم ہونے کے بعد نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

”میں آپ کو دوبارہ آنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ کسی دن آؤ۔ موسیقی اور فلسفے پر باتیں ہوں گی۔“ یہ دعوت نظمی کو سرشار کرنے کے لیے بہت تھی۔

اس ملاقات کو چند ہی روز ہوئے تھے کہ اس کے ایک مہربان استاد مسٹر ٹیل نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔

”تمہارے لیے ایک عظیم خوشخبری میرے پاس ہے۔“

”آپ ہمیشہ اچھی خبریں ہی سناتے ہیں۔“

”ہاسل یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر کی جگہ ہے۔ میں نے تمہارا نام لکھ کر بھیج دیا ہے، کیا تم اس خبر سے خوش نہیں ہوئے؟“

”بات تو خوشی کی ہے لیکن کیا میری تقرری عمل میں آجائے گی جبکہ میری ڈاکٹر تھی اچھی مکمل نہیں ہوئی۔“

”تقرری اس لیے ہو جائے گی کہ ہاسل یونیورسٹی نے خود تمہارا نام پیش کیا ہے۔ مجھ سے تو صرف رائے مانگی گئی تھی۔ میں نے تمہاری تعریف کر دی ہے۔ یہ کمال ان عمدہ مقالات کا ہے جو تم شائع کراتے رہے ہو۔“

ایک اور خوشی کی بات یہ ہوئی کہ لیپرگ یونیورسٹی نے امتحان کے بغیر ہی اس کی سابقہ کارکردگی کو سامنے رکھتے ہوئے سندسے نواز دیا۔

نظمی ابھی صرف چوبیس سال کا تھا۔ اس عمر میں ہاسل یونیورسٹی کا پروفیسر بننا اس کے اور اس کے گھر والوں کے لیے فخر کا باعث تھا۔

اس نے چند منٹے نومبرگ جا کر اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارے اور پھر ایک نئی زندگی گزارنے سوئٹزر لینڈ کی ہاسل یونیورسٹی پہنچ گیا۔

اسے لسانیات کے ساتھ ساتھ فلسفے کے اضافی لیکچر دینے کو بھی کہا گیا۔

نظمی کو بس ایک افسوس ہوا تھا کہ وہ واگز سے دور ہو گیا تھا لیکن قدرت انہیں ملانا چاہتی تھی۔ اس کا بھی انتظام ہو گیا۔ واگز، لیوکرین ہسپتال کے کنارے ٹریس جن کے مقام پر ایک شاندار خولی میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہ مقام ہاسل سے صرف چالیس میل دور تھا۔ نظمی اس کے پاس ہفتہ وار جانے لگا۔ ان جلد جلد کی ملاقاتوں نے واگز کو اس کا شیدائی بنا دیا۔ نظمی کی دل میں بھی اس کی محبت اور عقیدت کا طوفان اٹھ آیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے دوستوں کو لکھ رہا تھا۔

”مجھ کو ایک ایسا شخص مل گیا ہے جو شوہنار کے تصور نائیڈ کی بہترین تجسیم ہے اور وہ تعجب انگیز حد تک شوہنار کے اعلیٰ فلسفے کا مدراج بھی ہے۔ میری مراد جڑواں ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ ساری دنیا سے مختلف ہے۔ میں جب بھی اس کے قریب ہوتا ہوں تو لگتا ہے جیسے خدا کے حضور میں ہوں۔“

اس زمانے میں واقعی ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی واگز کے لیے وقف کرنے پر آمادہ ہے۔ ایک مرتبہ تو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ ہاسل یونیورسٹی سے دو سال کی رخصت لے کر اپنے آپ کو واگز کی خدمت کے لیے وقف کر دے۔ وہ شاید یہ کرکڑ تانگیوں پر ویشا اور فرانس میں جنگ چھڑ گئی۔ نظمی واگز کو چھوڑ کر جنگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جب الوطنی نے تقاضا کیا اور اس نے طبی اردو کی طور پر اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کر دیں۔ وہ محاذ جنگ کی طرف روانہ ہوا تو فوجوں کا چاہ و جلال دیکھ کر اس پر انکشاف ہوا کہ زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد صرف زندہ رہنے میں نہیں بلکہ مقابلہ کرنے، لڑنے اور دوسروں پر غلبہ پانے میں ہے اس کا یہی نظریہ بعد میں اس کے فلسفے کی بنیاد بنا اور پھر بین یعنی فوق البشری صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے ”مرد مومن“ کا تصور نظمی سے لیا تھا۔

مخاؤں جنگ بریکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ کر چاہ و جلال کا یہ متوالا اپنے حواس کو بیٹھا۔ اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر ہاسل یونیورسٹی پہنچ گیا۔

اس جنگ میں پر ویشا کو فتح حاصل ہوئی۔ نظمی نے جنگ کی کرواہت کچھ کم کرنے کے لیے اپنی

کتاب ”الہ کا جنم“ لکھنی شروع کی۔ وہ اس کتاب کے ذریعے یونانی دنیا میں الہیہ ڈرامے کے آغاز اور اس کے بنیادی تصورات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کتاب مکمل ہوئی تو اس کی روح سرشار تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی اشاعت سے نئی ونگر کی دنیا میں انقلاب آجائے گا لیکن ہوا یہ کہ انقلاب تو بعد میں آتا، کوئی ناشر اسے شائع کرنے پر بھی تیار نہ ہوا۔ مجبور ہو کر اس نے اس کتاب کے مختلف ابواب مختلف جرائد میں شائع کرادیے۔

اس کتاب میں مقبول عام تصورات کا مذاق اڑایا گیا تھا اور جدید جرمی کے مسائل کو قدیم یونان کے مسائل سے منسوب کر کے سمجھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اسی لیے ناشرین اسے شائع کرنے پر تیار نہیں ہو رہے تھے۔ اس موقع پر واگز اس کے کام آیا۔ اس کی سفارش پر واگز کے ناشر نے اس کتاب کو شائع کرنے کی ہامی بھری۔ محبت اور عقیدت کے جوش میں نظمی نے واگز کے کئی کزور پہلو نظر انداز کر دیے تھے۔ یہ کزور پہلو واگز کا غرور اور دوسروں کی اہلیت کا اعتراف کرنے سے گریز تھا۔ نظمی کو اس کا تجربہ اور ادراک ہوا تو اس نے واگز سے دور ہونا شروع کر دیا۔

اس دوری میں خود نظمی کا غرور بھی شامل ہو سکتا ہے کیونکہ اب وہ خود مصنفین کی صف میں کھڑا ہو گیا تھا۔

اس کی ایک اور کتاب ”تاریخ کا جائزہ نام صرف“ شائع ہوئی۔ یہ کتاب تاریخ کے علم کے خلاف لکھی گئی تھی جبکہ اس کے زمانے کے اہل یورپ تاریخ پر بہت نازاں تھے۔

اس ماحول میں تاریخ کو بُرا بھلا کہنا اپنے معاشرے سے ٹکرانا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ ہر وہ بات کہہ اور لکھ رہا تھا جو اس کی سوسائٹی سے متصادم تھی۔

اس کتاب کا بھی وہی مشر ہوا جو اس کی پہلی کتاب کا ہوا تھا۔ اسے پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ جنہوں نے پڑھ لی انہوں نے اس پر سختی رائے دی۔

دوسرے مصنفین کی طرح نظمی نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ اب نہیں تو آنے والا زمانہ اس کی تحریر کو اہمیت دے گا۔

نظمی روز بروز مذہب سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ واگز کا ڈراما ”پاری فال“ شائع ہوا تو نظمی نے اسے واگز کے سبکی ہونے کا اعلان نامہ کہہ کر اسے رد کر دیا۔ وہ واگز کو مذہبی روپ میں دیکھنے کا قائل نہیں تھا۔ دونوں کے بگڑتے ہوئے تعلقات میں مزید لگاؤ پیدا ہو گیا۔

ہاسل یونیورسٹی اس کی مالی امداد کا بڑا سہارا تھا لیکن وہ

کچھ دنوں سے بیمار بنے لگا تھا۔ اس کے کئی قیمتی دن بستر پر گزر جاتے تھے۔ اس نے گھر آکر ایک سال کی چھٹی لے لی۔ اس کا خیال تھا کہ مستقل آرام کرنے سے اس کو صحت مل جائے گی لیکن اس کا یہ خواب ٹوٹ گیا۔ ایک سال ختم ہو گیا لیکن اس کی صحت نے اسے دوبارہ یونیورسٹی نہیں آنے دیا۔ اس نے یونیورسٹی کو خیر باد کہہ دیا۔

اس نے صرف پانچ چھ سال پڑھایا تھا لیکن اس کی خدمات اور صحت کو دیکھتے ہوئے یونیورسٹی نے اس کے لیے تین ہزار فرانک کی سالانہ پنشن مقرر کر دی۔ اب یہی رقم اس کا واحد سہارا تھی۔

یہ پنشن اسے 1876ء سے ملنا شروع ہوئی۔ اس کی جسمانی صحت ناگفتہ بہ تھی لیکن اس کا ذہن جاگ رہا تھا۔ اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا، اس کی فکر آگے بڑھ رہی تھی۔

اس نے تہائی اور فرصت کے دنوں میں ایک کتاب مرتب کر لی تھی۔ اس کا عنوان اس نے انسانیت بے حد انسانیت رکھا۔ یہ کتاب دراصل اس کی کہانوں اور اقوال کا مجموعہ تھی اور 1878ء میں منظر عام پر آئی۔

اس کتاب میں اس کا انداز بیان مختلف تھا۔ اب تک اس کا انداز بیان بھلا اور مصنف کی طرح تھا اپنے خیالات کو اہمیت دیتا تھا اور دوسروں پر چوٹ کرتا تھا۔ اب اس نے دلائل پیش کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کے انداز کو چھوڑ کر اقوال کی صورت میں اپنے خیالات پیش کرنے کا شاعرانہ اسلوب اختیار کیا۔ اس اسلوب میں وہ جھلک ملتی تھی جو بعض بزرگان دین اپنے پیغام کو عام کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

اس اسلوب کی بدولت اسے جرمن زبان کا بڑا ادیب مان لیا گیا۔ نطشے نے اختیار کا جو نیا اسلوب اختیار کیا وہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔ وہ سوئٹزر لینڈ کے پرفضا دیہی علاقوں میں ٹھوکتا رہا تھا۔ اس ایروں کے دوران جو خیالات اس کے ذہن میں آتے رہتے تھے، وہ ان کو کاغذ پر درج کر لیا کرتا تھا۔ کاغذوں کا یہی مجموعہ اس کی کتاب بن گیا۔ یہ ایسا اسلوب تھا جس کی انیسویں صدی کے یورپ میں کوئی اور مثال موجود نہیں تھی۔ اس کا یہ اسلوب یہ بتا رہا تھا کہ نیسویں صدی کا ادب کیسا ہوگا؟

وہ اس وقت کے فلسفیوں سے بھی مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی یہ کتاب محض فلسفے پر مشتمل نہیں تھی بلکہ اسے بہترین تفصیلات والی بھی ثابت کر رہی تھی (بہت بعد میں

فرانز جیسے نفسیات داں نے اس کو لہانا) اس کتاب کی مخالفت بھی ہوئی۔ ان مخالفین میں اس کا دوست واکز بھی تھا جس سے اب اس کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہو گئے تھے۔ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو ضرور پذیرائی ملی تھی لیکن فروخت کے اعتبار سے ناکام ہو گئی تھی۔ بہت کم لوگوں نے اسے پڑھا تھا۔

نطشے بے چارہ اس صدمے سے مزید بے حال ہو گیا۔ وہ بیمار تھا اور صحت کی تلاش میں در بدر مارا پھرتا تھا، اس کا زیادہ تر وقت اٹلی، جنوبی فرانس اور سوئٹزر لینڈ کے صحت افزا مقامات پر گزر رہا تھا جہاں کے موسموں سے وہ اپنی صحت کی بھیک مانگ رہا تھا۔

اس کی بیٹائی اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ اسے نیم پانچا کہا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ کھنے پڑھنے کا کام بند کر دے لیکن یہ مشورہ وہ کیسے مان سکتا تھا؟ کیا سانس لینا چھوڑ دیتا؟ کام جاری رہا تو سر کے درد کا پرانا مرض بھی لوٹ آیا۔ وہ کئی کئی دن ستر پڑا رہتا۔ ڈاکٹر اب اس نتیجے پر پہنچنے لگے تھے کہ اس کی بیٹائی کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ کو بھی شدید خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ وہ اس بیماری کی حالت میں باسل پہنچ گیا۔ یہاں اس کا دوست اور بیک رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے اس بیمار فلسفی کی حصار داری میں دن رات ایک کر دیے۔

اس کی خدوش حالت کو دیکھتے ہوئے اور بیک اور اس کی بیوی نے باہم مشورہ کیا کہ اب نطشے کی حالت سے اس کے گھر والوں کو مطلع کر دینا چاہیے۔ انہوں نے اس کی بہن الزبتھ کو خط لکھ دیا۔ آخر بہن بھی، خط لے کر دوڑی چلی آئی۔ بھائی کو اس حال میں دیکھا تو ششدر رہ گئی۔ چند مہینوں میں کوئی برسوں کا سفر بھی طے کر سکتا تھا۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے بھائی کو برسوں بعد دیکھ رہی ہو نطشے نے بہن کو اپنے سر ہانے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ اس کی موت کا وقت قریب آ گیا۔ اس کے اعزاء اسے آخری بار دیکھنے آئے ہیں۔ اس نے اپنا تحیف اور سرد ہاتھ بہن کے ہاتھ میں دے دیا۔

”الزبتھ! وعدہ کرو کہ صرف میرے دوستوں کو میرے مردہ جسم کے نزدیک آنے دو گی۔ کوئی یونی منڈاٹھائے چلا آئے تو اس کو میرے قریب مت آنے دینا۔ میں اپنا دفاع کرنے کے قابل نہ رہوں گا۔ اور ہاں، یاد رکھو، کسی بادی کو میری لاش کے قریب آنے اور یا کاری کے الفاظ ادا کرنے کی اجازت ہرگز نہ دینا۔ خیال رکھنا، میری تدفین کسی کے

کاقر کی طرح ہو۔ کوئی جھوٹ وہاں نہ بولا جائے۔“ الزبتھ نہایت مذہبی لڑکی تھی لیکن اس وقت وہ بھائی کی باتوں کا کیا جواب دیتی۔ بیٹی سسکیاں مچتی رہی اور سوچتی رہی، اپنے بھائی کو موت کے منہ سے کیسے نکالے؟ وہ اسے اپرا سین کا ڈان کے صحت افزا مقام پر لے گئی اور وہ واقعی موت کے منہ سے نکل گیا۔

اسے ماں کی یاد آئی اور وہ ماں کے پاس ٹومبرگ چلا گیا۔ ماں کی قربت نے اسے واقعی صحت مند کر دیا۔ اسی زمانے میں اس کی کتاب ”مسافر اور اس کا سایہ“ شائع ہوئی۔

آنکھیں پھر سے دیکھ لیں۔ سر کے درد نے پھر شور مچایا۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

”میں نے اسی قدر دکھ اٹھائے ہیں اور اتنی بے شمار چیزوں سے دست بردار ہوا ہوں کہ کسی زمانے کا کوئی راہب کوئی سادھو بھی نہیں جس کی زندگی سے اپنی زندگی کا موازنہ کر سکوں۔“

وہ بیمار تھا۔ جسمانی اذیت میں مبتلا تھا۔ روحانی اذیت الگ تھی۔ وہ کسی سازگار موسم کی تلاش میں مختلف مقامات کے چکر لگا رہا تھا۔

”میرا وجود ہولناک بوجھ ہے۔ شاید میں بہت عرصہ پہلے اس سے نجات پا لیتا لیکن دکھ اور ترب دنیا کی اسی کیفیت سے گزرتے ہوئے میں وقتی اور اخلاقی امور میں نہایت معلومات افزا تجربے کر رہا ہوں۔ حصول علم سے ملنے والی مسرت مجھ کو ان بلند یوں تک لے جاتی ہے جہاں میں اپنی تمام مصیبتوں پر غائب آ جاتا ہوں تاہم دورے ایک پہل کے لیے بھی نجات نہیں ملتی۔ نیم معذوری اس کے علاوہ ہے جو بات کرتا بھی میرے لیے دشوار بنادیتی ہے۔ شدید دورے پڑتے ہیں۔ آخری دورے کے سبب میں ٹین دن اور رات تک تے کرتا رہا تھا۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔“

”میں یوں جیتا ہوں جیسے صدیاں کچھ بھی نہ ہوں۔“ وہ اپنے دوستوں اور محلوں کو یہی پیغامات دیتا رہا تھا لیکن یہ کہے بتاتا کہ بیماری سے بڑھ کر وہ مالی وسائل کی کمی کا شکار ہے۔ غربت اتنی تھی کہ وہ خود کو گرم رکھنے کے وسائل سے بھی محروم تھا۔ وہ کسی مقام پر تھا کہ اس کی ماں کا خط اسے موصول ہوا۔ ماں نے لکھا تھا کہ وہ اپنی صحت پر مناسب توجہ نہیں دے رہا ہے۔

اس نے جواب میں لکھا۔

”صحت سے زیادہ اہم باتیں میرے ذہن میں رہتی

میں نے ہم کی بدلتی تہیں اگست 2012ء کے شمارے کی لطافتیں

ماہنامہ سوسٹی



جال درجال

جنگل بیابان سے جدید نخلستان کا رخ کر لینے والی سنسنی خیز کہانی کے اختتامی واقعات

سلیم فاروقی کے مخصوص آہنگ رنگ

سرورق کی کہانیاں

محبت کی نرگشتیاں نفرت کی چنگاریاں.....
دوستی کی دل فریبیاں..... اور دشمنوں کی عیاریاں.....
دل پسند سرورق کہانیاں

مشرق و مغرب کے رنگ ڈھنگ

مغربی دنیا کے رسم و اطوار..... معاشرت و تغیرات کے گرد و گھومتی مختلف مصنفین کی طبع زاو تر جملہ کہانیاں

سحر

انگریز سلسلے

لکار..... بدلتے ماحول اور گرجے و منوں کی لٹاکاں
طاہر جاوید مغل کا مگر..... ایک نئی ڈگر
یگانہ زن اسماعیل قادری کا سلسلہ گد اداب

چینی نکتہ جینی

آپ کے تبصرے..... بشورے..... عجبتیں.....
شکایتیں..... لکھنوی بی بی لکھنوی باتیں..... آپ کے قلم سے

اور وہ سب جو سوسٹی کا خاصہ ہے

ہیں۔ اس لیے میں اس بیماری کو بھی برداشت کرنے پر تیار ہوں۔ دوسروں کے غلط علاج نے میری مشکلات بڑھائی ہیں۔ آئندہ سے میں خود اپنا معالج بننے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ دیکھنا لوگ کہیں گے، میں ایک احمقاؤں کا گروہ ہوں۔“

اس خط کا جواب دینے کے بعد وہ اپنا علاج ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سواغ نگار بھی نہیں جانتا کہ اس سفر میں اس نے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں؟

جب پاؤں ٹھک گئے تو وہ سمندر سے ساڑھے چھ سو ہزار فٹ کی بلندی پر سوئٹزرلینڈ کے سلو ماریا نام کے گاؤں میں خاموشی سے دن کاٹنے لگا۔ اسے کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ چپ چاپ جنگل کی سیر کو نکل جاتا اور پھر اپنے ٹھکانے پر واپس آ جاتا۔ گاؤں کے لوگ اسے کوئی پراسرار، ہستی سمجھتے تھے۔ کوئی راب، کوئی سادھویا کوئی جوگی۔ گاؤں والے بھی غلط نہیں سمجھ رہے تھے۔ وہ یہی سب کچھ تو تھا۔

اپنی رہی کسی بیٹائی کی روشنی میں کچھ لکھتا رہتا پھر محض کاغذ ٹوٹتا رہتا۔ علالت کے باوجود اس کی موجودہ زندگی قدرے سکون سے گزر رہی تھی۔

کئی دن سے ایک خیال اس کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا لیکن اس خیال کے اظہار کی کوئی واضح صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ فکری کرب ایسا تھا کہ اپنے جسم سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ اب نہ کوئی درد تھا، نہ تکلیف۔ کیا میں نے اپنا علاج ڈھونڈ لیا؟ کیا میں اب بالکل ٹھیک ہوں؟

وہ جنگل کی سیر کو نکلا تو دور تک چلا گیا۔ جنگل کی خاموشی میں اس کے قدموں کی چاپ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ چاپ بھی اس وقت ساکت ہو گئی جب وہ چلتے چلتے ٹھک گیا اور دم لینے کو ایک خردلی چٹان پر بیٹھ گیا۔ یہاں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا جیسے سانس لینے میں اسے کوئی دقت پیش آ رہی ہو۔ ان اچھی ہوئی سانسوں کے درمیان ایک الہام سا اس پر آڑا۔ جس خیال نے اسے پریشان کیے رکھا تھا اس پر مشکف ہو گیا۔ یہ تصور آئندہ اسے بہت شہرت دینے والا تھا۔ اسے ”سکر اسٹل“ کا تصور کہا جاسکتا تھا۔ آگے چل کر اسی تصور نے اس کے فلسفے میں فوق البشر کو جنم دیا۔

اس تصور کا انکشاف ہی ایسا تھا کہ اس کی روح کانپ اٹھی۔ دنیا میں جو کچھ ہیں، یہ ختم ہونے والے نہیں۔ یہ ابدی چکر ہے جو ہمیشہ چلتا رہے گا۔ اس سے پہلے بھی دنیا میں یہی تماشا ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی یہی تماشا دہرایا جاتا رہے گا۔ زندگی نے اس کی ساتھ ہمیشہ تک سلوک کیا تھا اور اب وہ

یہ چپ کر کے والا تھا کہ یہ سلوک ہمیشہ دہرایا جاتا رہے گا۔ اس خیال سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ بڑی دیر تک اس خردلی پتھر پر بیٹھا آنسو بہاتا رہا اور پھر فاصلے بیٹھا ہوا گھر چلا آیا۔

اس نے اپنے اس الہام سے دنیا کو سمجھ لیا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ دوسروں کو کیسے سمجھائے؟ اس خیال کو منطقی اور استدلال کے طریقوں سے نہیں سمجھایا جاسکتا تھا۔ یہ ایک شاعرانہ خیال تھا۔ علامتوں کے ذریعے ہی سمجھایا جاسکتا تھا جسے اس زمانے میں صوفیہ اپنے روحانی تجربات کو علامتوں کے ذریعے بیان کر رہے تھے۔ اس نے سوچا اگر وہ اپنے خیالات کو ماضی کی کسی برگزیدہ ہستی کی زبانی بیان کرے تو لوگوں کے دلوں پر زیادہ اثر کرے گا۔ اس کے لیے اس نے قدیم ایران کی ایک مذہبی شخصیت زرتشت کا انتخاب کیا۔ زرتشت نے بھی ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی تھی، فلسفے بھی یہی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں اس زمانے کے لوگ روایتی عقیدے کو مسترد کر چکے ہیں۔ یوں سبکی خدا کی انسانی زندگی، سماج اور کائنات میں مرکزی حیثیت بھی ختم ہو چکی ہے۔ اب نئے نظام اور نئی اقدار کی ضرورت ہے تاکہ جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کو پُر کیا جاسکے۔ اپنے ان خیالات کے اظہار کے لیے اس نے زرتشت کو وسیلہ بنایا۔

اس نے کتاب کا پہلا حصہ مکمل کیا تھا کہ سلو ماریا میں سردیوں کے شاپ نے چہرہ دکھایا۔ ہڈیوں تک اتر جانے والی سردی ہواؤں نے اس کے حوصلوں کو برف بنا دیا۔ اس نے سامان باندھا اور گاؤں کی بلندی سے نیچے اتر گیا۔

اس کے بعد تاریخ نے اسے روم میں دیکھا جہاں وہ ایک چھوٹے سے رستوران میں ایک روسی نژاد لڑکی سلوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا گیا۔ یہ لڑکی حسین بھی تھی، ذہین بھی اور فلسفے کی طرح آزادی کی دلدادہ بھی۔

فلسفے روم پہنچا تو پھر بے بالوں اور نیلی آنکھوں والی سلوی کی ادنیٰ و ثنائی حلقوں میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ ہر جگہ دیکھی جا رہی تھی ہر جگہ اس کے چرچے تھے فلسفے کی اس سے ملاقات ایک خاتون مادام مین بگ کے گھر پر ہوئی۔ یہ خاتون فلسفے کی پرستار تھیں۔ انہوں نے فلسفے کا تعارف ایسے الفاظ میں کرایا کہ زندہ دل سلوی فلسفے میں دلچسپی لیے بغیر نہ رہ سکی۔ دیر تک فلسفے کے خیالات اور اس کی کتابوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتی رہی۔ مادام مین بگ نے انہیں تنہائی دی اور ان کے پاس سے اٹھ کر چلی گئیں۔

”میں نے آپ کی کوئی کتاب تو نہیں پڑھی لیکن آپ

کمال کے مصنف معلوم ہوتے ہیں۔“
”میں جلد ہی اپنی کتابیں آپ کو دوں گا۔“
”میری خوش قسمتی ہوگی لیکن اس وقت تو میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اب تک میں آپ کی تحریروں سے ناواقف کیوں رہی؟“

”شاید اس لیے کہ میری تحریریں آنے والے کل کے لیے ہیں۔“

”آپ کی عمر تو ایسی ہے جب کوئی کل کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔ اس کے لیے آج ہی سب کچھ ہوتا ہے۔“
”میں اپنے آج کے لیے کل تیار کر رہا ہوں۔“

”آپ بہت دلچسپ ہیں۔“
”میرے دوستوں کے سوا کوئی مجھے ایسا نہیں سمجھتا۔“
”اس حساب سے تو آپ کی دوست ہوئی۔“

”دوستی روح کا سفر ہے، اگر آپ کی روح مجھ سے ملتی ہے تو آپ میری دوست ہیں۔“
”میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟“

”میں شاعر بھی ہوں اس لیے آپ کے حسن نے مجھے متاثر کیا ہے لیکن فلسفی بھی ہوں جو روح کے اندر جھانکتا ہے۔“
”میری روح میں آپ کی یاد دیکھتے ہیں؟“

”روح میں جھانکنے کے لیے قربت ضروری ہوتی ہے۔ ہم ملتے رہیں گے تو یہ فریضہ بھی ادا ہو جائے گا۔“
”اس میں تو برسوں لگ سکتے ہیں، میں اتنے صبر کی عادی نہیں۔“

”میں خود اُداس رہتا ہوں لیکن شوخ لوگوں کو پسند کرتا ہوں اور آپ میں جس مزاح بہت ہے۔“
”مجھے خوشی ہے کہ میں نے کچھ دیر کے لیے آپ کو خوش کر دیا۔“

”آج آپ میرے ساتھ ڈنر چل سکتی ہیں؟“
”مجھے تو خوشی ہوگی کہ میں اتنے بڑے فلسفی کے ساتھ ڈنر چر جا رہی ہوں۔“

وہ دونوں کینڈل ڈنر پر آئے سانسے بیٹھے تو سلوی کا نرم و نازک ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ کسی سے اتنی جلد بے تکلف ہونے کا عادی نہیں تھا۔ خاتون کی قربت بھی اسے کم ہی ملی تھی لیکن سلوی ایک نظر میں اس کے دل میں اُتر گئی تھی۔ وہ بھی اتنی بے باک کہ ہاتھ میں ہاتھ دے بیٹھی تھی بلکہ تھوڑی تھوڑی دیر میں بلکے سے دبا بھی دیتی تھی۔

کھانے کے بعد وہ دیر تک ہونٹ کے لان میں ٹپکتے رہے۔ پھر پیدل ہی بڑی دیر تک چلے گئے۔ سلوی اپنے گھر

محبت کا شاعر

سید فضل شاہ 1882ء میں لاہور سے

متصل آبادی نواں کوٹ میں پیدا ہوئے۔ شاعری فطرت میں رچی بسی تھی۔ پنجابی زبان میں اہم مقام حاصل کیا مگر زیادہ تر عشق کی ناکامی پر اشعار کہے۔ سوئی مہوال لکھ کر پنجابی ادب میں وہ مقام حاصل کر لیا جس کا جواب آج تک پیش نہیں کیا جاسکا ہے۔ سینہ بہ سینہ چلتے والی روایت میں مشہور ہے کہ ابتدا جوانی میں آپ ایک حسین دوشیزہ کے زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے جو عمر میں ان سے بڑی تھی مگر آپ کی دلچسپ باتوں میں بہت زیادہ دلچسپی لیتی تھی۔ وقت کا زیادہ حصہ دونوں ساتھ گزارتے تھے۔ یہی ہم نشینی عشق کا موجب بنی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت زیادہ جاننے لگے لیکن عمر کا فرق دونوں کے درمیان دیوار بن گیا اور اس کی شادی کہیں اور کرادی گئی۔ یہ زخم وہ سہ نہ پائے اور اپنے بے سکونی کا اظہار پوشیدہ انداز میں بذریعہ شاعری کرنے لگے۔ ان کی شاعری خوب پسند کی جانے لگی، کوہ کی راگ میں ان کا درد گاتے۔ سوئی مہوال کو موالی پسند کی سند ملی یہ قصہ زبان زد عام ہوا۔ دور و نزدیک پسند کیا جانے لگا تو آپ نے ہیرا پنجا لکھا۔ اس منظوم قصے کو بھی شہرت حاصل ہوئی پھر قصہ لکلی مجنوں اور یوسف زلیخا کو بھی منظوم کیا۔ رومانی شاعری میں ایک مقام رکھتے ہی تھے۔ ”عشقہ فضل رسول اگر صفت قلمبند کیا تھا۔ 1890ء میں انتقال کیا۔

مرسلہ: ایاز راہی مانسہرہ

احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر کوئی ہم مزاج عورت میری ہمسفر ہو جائے تو میں بہت بڑے بڑے کام کر سکتا ہوں۔ میرا یہ اکیلا پن مجھے اندریں اندر رکھتا ہے جا رہا ہے۔ دنیا مجھے نظر انداز کر دے، مجھے پروا نہیں لیکن کوئی عورت مجھے ٹھکرائے یہ مجھے برداشت نہیں اور شاید ساری دنیا کی عورتوں نے تیرہ کر لیا ہے کہ وہ مجھے ٹھکرائیں گی۔ اسے ایک مرتبہ پھر یاد آ گیا کہ سلوی نے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سوچا کہ سلوی سے بات کرے۔ شاید وہ اب انکار نہ کرے۔

”میں ہر طرف سے ناکام ہو گیا ہوں۔ کیا تم بھی مجھے ناکام رہنے دو گی۔ تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ ہم دونوں کی گردن بچ کر سکتے ہیں۔“

”تو کبھی کی بات ہے کہ تم دنیا بچ کرنے کے لیے مجھ سے شادی کر رہے ہو؟“

”کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم مجھے فتح کرو؟“

”میری فتح تو یہ ہے کہ میں تم سے شادی نہ کروں اور دوستی برقرار رکھوں۔“

”میں اکیلا ہوں سلوی! بہت اکیلا۔ تم میری تنہائی دور کرنے میرے پاس چلی آؤ، مجھ سے شادی کر لو۔“

”میرے پیارے ٹٹھے! جس طرح تمہیں اپنے تصورات عزیز ہیں اسی طرح مجھے بھی ہیں۔ مجھے شادی میں دلچسپی نہیں۔ کسی ایک کے ساتھ پوری زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں تم ہی سے نہیں کسی سے بھی شادی نہیں کر سکتی، میں تو بس آزاد عورت کی طرح رہنا چاہتی ہوں۔“

ٹٹھے، سلوی کے اس جواب سے سخت مایوس ہوا لیکن وہ ٹٹھے تھا، کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اس نے کوشش جاری رکھی۔ دوسری مرتبہ کی ناکامی کے بعد اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ بہن کی مدد لے۔ شاید وہ سلوی کو سمجھا سکے۔

وہ نومبرگ گیا اور بہن کے سامنے انادول کھول کر رکھ دیا۔ اس نے اپنی دوسری دنیا کی ناکامیوں کا ذکر نہیں کیا۔ بس یہ کہا کہ ایک لڑکی سلوی ہے، جس سے وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس لڑکی سے مل لے اور شادی کے لیے راہ ہموار کرے۔ الزبتھ یہ سن کو خوش ہوئی تھی کہ اس کے بھائی کی آوارہ گردی کو آخر کوئی ٹھکانا ملے والا ہے۔ الزبتھ نے ماں کو بتایا تو اسے بھی خوش ہی ہوتا تھا۔ اس کا بیٹا چالیس کے قریب پہنچ چکا تھا اور ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اچھا ہے اس کی شادی ہو جائے۔

الزبتھ نے وعدہ کیا کہ وہ اس شادی میں اہم کردار ادا

کرے گی۔

الزبتھ، واگر کے کھیل ”پارسی فال“ دیکھنے کے لیے جانے والی تھی۔ وہ ٹاؤن برگ آئی تو یہ طے ہوا کہ سلوی بھی اس کے ساتھ جائے تاکہ دونوں میں دوستی ہوے۔

الزبتھ خوش تھی کہ بھائی سے ملاقات ہونے والی ہے۔ ٹٹھے پہلی نظر میں سلوی کا دیوانہ ہو گیا تھا لیکن الزبتھ پہلی ملاقات میں سلوی سے نفرت کرنے لگی۔ الزبتھ کی مذہبی تربیت سلوی جیسی آزاد خیال لڑکی کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔

سلوی نہ صرف آزاد خیال تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ سچی بھی تھی۔ وہ اپنے بارے میں کوئی بات بھی چھپانے کی عادی نہیں تھی۔ ٹاؤن برگ میں قیام کے دوران اس نے نہ صرف اپنے معاشقوں کی فہرست الزبتھ کے سامنے رکھ دی بلکہ اپنے مذہبی خیالات بھی کھول کر بیان کر دیے۔

”شادی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ الزبتھ نے پوچھا۔

”ایک ناگوار بندھن۔“

”کیا شادی کے بغیر کسی سے تعلق رکھنا تمہیں بُرا نہیں لگتا؟“

”نیک اور بدی کو میں اضافی خوبی یا غمازی سمجھتی ہوں۔ نیک بس یہ ہے کہ ہم دوسروں کو خوش رکھیں۔ میں یہ کام بہ خوبی کر رہی ہوں۔“

”تم عورت کے نام پر دھبا ہو۔“

”میں ہی تو اصل عورت ہوں۔ تمہارا بھائی مجھے اسی لیے پسند کرتا ہے۔ میں اس کے فلسفے کے عین مطابق ہوں۔“

”تم نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ سوچنے مجھے کے قابل ہی نہیں رہا۔“

”تم مجھ سے جل رہی ہو کیونکہ تمہاری ابھی تک شادی نہیں ہوئی اور شباب کی منزلوں سے گزرتی ہو، تم حسین بھی نہیں ہو کہ تمہارا کوئی دوست بن سکے۔“

بات ٹٹھے کی شادی سے شروع ہوئی تھی اور ذاتیات پر جا کر ختم ہوئی۔ دونوں میں خوب جھگڑا ہوا۔

وہ دونوں تین مہینے اٹھتی رہی تھیں۔ الزبتھ اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ سلوی ایک بُری عورت ہے۔ اس کے بھائی کو اس سے دور ہونا چاہیے۔

الزبتھ ٹاؤن برگ سے نومبرگ پہنچنے کو طے کر چکی تھی کہ وہ ٹٹھے کو اس بُری عورت سے بچائے گی۔ اس نے گھر پہنچے ہی سلوی کے گناہوں کی ایسی تصویریں بھیجی کہ ٹٹھے کی ماں دانتوں میں انگلیاں دب کر رہ گئی۔

”ماں، کیا تمہیں یہ گوارا ہوگا کہ ایک ایسی عورت ہمارے گھر میں آئے جو شادی کے بغیر دوسرے مردوں کے ساتھ رہتی رہی ہے۔ میرے خیال میں تم نہیں چاہو گی۔“

”پھر ٹٹھے اس کے لیے سفارش کیوں کر رہا ہے؟“

”وہ میرے لوگوں میں بیٹھنے لگا ہے۔ یہ لڑکی بھی انہی میں سے ایک ہے۔“

”اور ٹٹھے کے خیالات؟“

”ان بڑے لوگوں ہی نے اس کے دل میں یہ خیالات ڈالے ہیں جنہیں وہ اپنا فلسفہ کہتا ہے۔“

”مذہب کے بارے میں اس کے کیا خیالات ہیں؟“

”اگر وہ مذہب کو واقعی تو یہ جرتیں کیوں کرتی؟“

”اب ہم دونوں کا فرض ہے کہ ٹٹھے کو اس سے بچائیں۔“

ٹٹھے تو میرگ گیا تو الزبتھ سے اس کی جھڑپ ہو گئی۔ الزبتھ نے اور باتوں کے ساتھ ساتھ ٹٹھے کے فلسفے پر بھی چوٹیں کیں۔ یہاں تک کہ دیکھا کہ اس نے ٹٹھے کے فلسفے کو سلوی کی شکل میں گوشت پوست کے روپ میں دیکھا ہے۔ وہ اپنے خیالات بھی درست کرے اور اس عورت سے ناپا توڑے۔

ٹٹھے ابھی پوری طرح سلوی کی جانب سے بدظن نہیں ہوا تھا۔ یہ معاملہ ٹٹھے نے ہی لیکن وہ اس سے شادی کرنے کا خواہاں تھا۔ اسے یہ بھی بُرا لگ رہا تھا کہ الزبتھ خود تو نیک اور پارسائی کا دعویٰ کر رہی ہے اور سلوی کو بدی کا مجسمہ قرار دے رہی ہے۔

اسے ماں سے امید تھی کہ وہ اس کی حمایت کرے گی لیکن ماں کو الزبتھ پہلے ہی بدظن کر چکی تھی۔ اس نے الزبتھ سے بھی زیادہ ٹٹھے کو اڑے ہاتھوں لیا۔

”تم نے آوارگی میں بڑا کرابی صحت کا بھی ستیاناس کر لیا ہے اور اپنے خیالات کا بھی۔“ جنہیں کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ تم ایک پادری کے بیٹے ہو۔ آج ہر جگہ چرچا ہے کہ تم لادین ہو گئے ہو اور اب ایک بدکار عورت کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہو۔ تم تو اپنے باپ کی قبر کے لیے بھی بے عزتی کا باعث بن گئے ہو۔“

ٹٹھے اس طعن کو برداشت نہ کر سکا اور نومبرگ سے لیپزگ آ گیا۔

سلوی کو الزبتھ کی باتوں سے دکھ ہوا تھا۔ وہ لڑجھک کر آئی تھی۔ اس نے ٹٹھے کا خیال دل سے نکال دیا اور بال رے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ دونوں میں خوب جھگڑیں ہوئے گئیں۔

سلوی اور رے لیپزگ آئے تو ٹٹھے بھی وہیں تھا۔ وہ خوش ہو گیا کہ سلوی سے بات کرنے کا موقع ملے گا۔ شاید وہ اسے مانگ بھی لے۔ وہ تینوں تین مہینے تک لیپزگ میں بیٹھی خوش رہتے رہے۔ تینوں نے طے کیا کہ وہ پیرس جائیں گے۔

پال رے نے ظاہر ٹٹھے کا دوست بنا ہوا تھا لیکن وہ اسے اپنا رقبہ تصور کیے ہوئے تھا اور اب چاہتا تھا کہ اس کا خٹکے کو نکال چھینے۔ اس نے سلوی کو پھر دیا۔ وہ دونوں ٹٹھے کو چھوڑ کر اکیلے ہی پیرس کے لیے روانہ ہو گئے۔

ٹٹھے کو جب معلوم ہوا کہ وہ دونوں پیرس چلے گئے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے اسے اپنے حواس گم ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ پورا دن اور پوری رات سلوی کی بے وفائی کا جشن مناتا رہا۔

ٹٹھے کے شدید احساس نے اسے بے حال کر دیا تھا۔ رقابت کی آگ الگ تھی۔ اگر صرف سلوی اسے چھوڑ کر چلی جاتی تو بات الگ تھی۔ وہ اسے اس کی مجبوری بھی کہہ سکتا تھا لیکن اس نے پال رے کو اس پر فوقیت دی تھی یہ احساس اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس کے اندر ایسی توڑ پھوڑ تھی کہ وہ جنون کے کنارے جا کھڑا ہوا۔

اب وہ بالکل اکیلا تھا۔ صحرائیں کسی اکیلے درخت کی طرح۔ بہن سے اس کی لڑائی ہوئی تھی۔ ماں سے خط کتابت ختم کر چکا تھا۔ سلوی کسی اور کے ساتھ چلی گئی تھی۔ بس ایک شعلہ رہ گیا تھا کہ دور بیٹھے دوستوں کو خطوط لکھتا رہے اور ان سے سلوی کے رویے کی شکایتیں کرتا رہے۔ وہ بھی کر رہا تھا۔ محبت کے بوجھ سے چھٹکارا چاہتا تھا جو تکلیف دہ بن گیا تھا۔

پھر وہ ایک ایسے بچے کی طرح ہو گیا جس کا کھلونا ٹوٹ جائے۔ وہ بہت روئے لیکن یہ سوچ کر صبر کر لے کہ کھلونا تھا ہی خراب ورنہ ٹوٹا کیوں؟

اس نے ہتھیرا ڈال دیے۔ وہ بہن سے ملنے گیا اور سلوی کے بارے میں بہن کے خیالات قبول کر لیے۔ اس نے مان لیا کہ سلوی اس کے ساتھ ٹٹھے ہی نہیں۔ وہ مجبور تو کیا دوست بھی نہیں تھی۔ وہ بد اخلاق تھی، فحاشی میں مبتلا تھی۔ الزبتھ کبھی رہی اور وہ مبتلا رہا۔

یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ سلوی کی محبت دل میں کیوں اتنی گہری آرتی ہے کہ خود اس کی نظروں سے بھی اوجھل ہو گئی ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے اس نے اسے بھلا دیا ہے لیکن شاید نہیں۔ کسی وقت یہ محبت پھر اسے پریشان کرے گی کیونکہ اس محبت کے ساتھ ناکامی کا لفظ بڑ گیا ہے۔ ناکامی کا داغ اتنی آسانی

سے نہیں دھلتا۔
یہ چانس کہیں نہ کہیں لگی رہ گئی جو بعد میں ذم بننے والی تھی۔
وہ اسی غم کو بھلانے کے لیے سلزمز آیا گیا۔ اس نے اکتھار کا ویلہ پھر ڈھونڈا۔ دراصل اس کی کتاب کا کردار زرتشت اس کا ہزار دین گیا تھا جس کے ساتھ وہ وقت گزارتا رہتا تھا۔ زرتشت بھی اس کی طرح اکیلا تھا۔ غلطی کی ڈھارس بندھ جاتی تھی کہ اس کی طرح کوئی اور بھی ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے، زرتشت اسے بیان کر دیتا ہے۔ غلطی کے پاس اب کہنے کو بہت کچھ تھا مثلاً یہ:
”مسیحیت نے اندلس کے شاعر ارتون اسلام کا گھاگھونٹ دیا۔ صلیبیوں نے مسلمانوں سے بار بار لڑائیاں لڑیں لیکن اس سے کہیں بہتر تھا کہ زمین پھٹ جاتی اور وہ اندر سما جاتے۔ صلیبی جنگیں انتہا درجے کی رہتی تھیں۔“
”عورت سرتاپا مقیم ہے اور عورت کا سرتاپا ایک ہی حل ہے جس کا نام حمل ہے۔“
”مرد سے بہتر عورت بچوں کو سمجھتی ہے لیکن مرد میں عورت سے زیادہ بچپن ہے۔ کھرے مرد میں بچہ پوشیدہ ہوتا ہے اور یہ بچہ کھلنا چاہتا ہے۔ عورت، آنکھو اور مرد میں بچے کو ڈھونڈ نکالو۔“
”عورت کو ایک کھلونا ہونا چاہیے۔ پاک اور لطیف مثل جواہرات کے جس میں ایک ایسی دنیا کی شعاعیں چمک رہی ہوں جو ابھی وجود میں نہیں آئی۔“
”عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اطاعت کرے اور اپنی طبیعت کے لیے گہرائی تلاش کرے۔ عورت کی طبیعت سچی ہوتی ہے جس طرح کے اٹھنے پانی کے اوپر ایک متحرک اور طوفان خیز جھلکا۔“
مگر مرد کی طبیعت گہری ہوتی ہے۔ اس کا طوفان نیچے ہی نیچے غاروں میں شور مچاتا ہے۔ عورت کو اندر سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں طاقت ہے لیکن یہ امر پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔“
”تو عورتوں کے پاس جاتا ہے تو چاک نہ بھول جانا۔“
عورتوں کے بارے میں یہ خیالات اسے یقیناً سلوی کے ساتھ رہ کر ملے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ابھی وہ سلوی کو نہیں بھولا تھا۔ ایک تیز فکری طرح اس نے ان تجربوں کو فن بنا دیا۔
وہ ”زرتشت نے کہا“ کا دوسرا حصہ لکھ بیٹھ گیا۔ یہ کتاب لکھتے ہوئے بار بار سلوی کی یاد آ جاتی تھی اور اس کے

لیجے میں، اسلوب کی مٹھاس کے بجائے کڑواہٹ آ جاتی تھی۔ وہ غصے میں بیٹھ اٹھتا تھا۔
”سلوی تو میرے جوتے چاٹنے کے بھی قابل نہیں۔۔۔۔۔“
اس انداز بیان کو معاف کیجئے گا، یہ میری بدقسمتی تھی کہ ایک جھوٹا اور مکار میری راہ میں آیا۔“
وہ سلوی کو جوتیاں چاٹنے کے لائق نہ سمجھے لیکن یہ کہتے ہوئے دراصل وہ اپنی جھینپ منار ہا تھا ورنہ حقیقت یہ بھی کہ وہ اندری اندر اس کی محبت میں سلگ رہا تھا۔ اس کی ناکام محبت تقاضا کر رہی تھی کہ وہ اپنی بہن کو اپنا دشمن سمجھے جس نے اس سے پہلے سلوی کو ٹھکر دیا۔
اس نے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے کہا ”مجھے اپنی بہن سے نفرت ہونے لگی ہے جس نے انتقام کی آگ میں جل کر اس کو پال رے اور سلوی کے خلاف بھڑکایا تھا۔ محبت کیسے کیسے انوکھے رنگوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ تو اس کی محبت نے اسے بالکل ہی بے قابو کر دیا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ سلوی رے کے ساتھ برلن میں رہ رہی ہے (شادی کے بغیر) تو نفرت کا کالا دھبے کے بجائے سلوی کو دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں چھلنے لگی۔ وہ اس وقت وینس میں تھا۔ اس نے اپنے پروفیسر دوست اور بیک کو خط لکھا۔
”میں یہاں چند دوستوں کو مدعو کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں شاید ڈاکٹر رے اور سلوی بھی شامل ہوں گے۔ جن کے ساتھ میں وہ سب کچھ ٹھیک کرنا چاہتا ہوں جو میری بہن نے خراب کر دیا تھا۔“
اس خط سے کچھ اور ظاہر ہوتا ہے، یہ ضرور ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ابھی سلوی کو نہیں بھولا۔ یہی نہیں بلکہ قصور وار بہن کو بھٹاتا تھا۔ وہ انہیں مدعو نہیں کر سکا یا وہ خود نہیں آئے۔ اس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا لیکن لوگوں نے یہ ضرور دیکھا کہ وہ پہلے سے زیادہ مایوس ہو گیا تھا۔ سلوی سے ملاقات کے دوران وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ مناسب شریک حیات مل جانے کے بعد اس کے دن بدل جائیں گے لیکن اب اسے یقین ہو گیا تھا، تنہائی اس کا مقدر ہو گئی ہے۔ جب وہ دیکھتا تھا کہ اس کے بہت سے دوست اپنا گھر بار کراہتے ہوئے زرتشت کے گھر آ رہے ہیں تو اس کی محرومیوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس کے دوست روڈے نے اپنے نوازیدہ بچے کی تصویر بھیجی تو وہ آداس ہو گیا۔ اس نے خط کے جواب میں روڈے کو لکھا۔
”دوست میں کتنی بے معنی اور کتنی ہونی زندگی گزار رہا ہوں۔ کس قدر اکیلا ہوں۔ کیسے بچوں سے محروم ہوں۔“

اسے اب یہ بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اس نے فرائض اور ذمے داریوں سے بھاگ کر ناقابل حلفی نقصان کر لیا ہے مگر اب کھیل اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ اب 43 برس کا ہو گیا تھا اور اکیلا تھا جس طرح بچپن میں اکیلا تھا۔ اس نے کوئی ٹھکانا نہیں بنایا تھا۔ سوئٹزرلینڈ کے چھوٹے سے گاؤں سلزمز میں چھوٹے سے گھر کا ایک کمرہ ملا جاتا تھا جہاں وہ بار بار جاتا تھا اور سب سے چھپ کر آنسو بہاتا تھا۔ وہ جوانوں کو قوت و غلبہ کا سبق دیتا تھا، سلوی کی بے وفائی نے اسے کتنا کمزور کر دیا تھا۔
ستے رستورانوں میں کھانا کھانے اور اپنے کام میں مصروف رہنے کے سوا اس کے پاس اب کوئی کام نہیں تھا۔ چند کپڑے اس کی کل کا نکتہ تھے۔ کاغذ تھے اور ایک بڑا سفری بیک۔ ایک نوٹ بک بھی جس پر چلتے چلتے رک کر وہ اپنے خیالات نوٹ کرتا رہتا تھا۔
اس کی اتنا ہی گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ لوگوں سے اپنی محبت کا رونا روتا رہے۔ اس نے اپنی تحریروں میں کہیں بھی سلوی یا اپنی ناکام محبت کا تذکرہ نہیں کیا تھا لیکن وہ چھپ چھپ کر سلوی کو یاد کرتا رہتا تھا۔ اس ناکامی کو طاقت میں بدلنے کے لیے وہ ہر سال دنیا کو حیران کرتے ہوئے ایک کتاب پڑھنے کے لیے دے دیا کرتا تھا۔ یہی اس کی قوت تھی، یہی اس کی کامیابی۔
اس کی زندگی ایک طویل خودکلامی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ انہی خودکلامیوں سے اس کا فلسفہ مرتب ہو رہا تھا لیکن اس فلسفے کی پذیرائی نہیں ہو رہی تھی۔
اب اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اسے نیم بھجوں کہا جاسکتا تھا۔ اسی دیوانگی کے عالم میں اس نے اپنی شاہکار کتاب ”زرتشت نے کہا“ مکمل کی۔
اس کتاب کے بارے میں خود اس کا خیال یہ تھا کہ اس نے جرمن زبان کو عروج کی بلند یوں تک پہنچا دیا ہے اور یہ وہ کام ہے جو کوئی اور لکھنے والا نہ کر سکتا تھا۔ وہ اپنے اسلوب کو رقص قرار دیتا تھا لیکن دوسروں کا یہ خیال نہیں تھا۔ اس کتاب کی پذیرائی نہیں ہو رہی تھی۔ ناشر نے ”زرتشت“ کا چھپنا حصر شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کتاب کی فروخت ہی نہیں تھی تو ناشر بھی کیا کرتا۔
غلطی نے اپنے خراج ”زرتشت نے کہا“ کے چوتھے اور آخری حصے کے چالیس تھے چھپوائے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بے نئے دوستوں میں تقسیم کرے گا۔ اس نے ایک اور غلطی کی تھی۔ چالیس دوست کہاں سے لانا، وہ صرف سات

دوستوں کی فہرست بنا سکا۔ ان سب کو نئے بھیج دیے۔ جواب کسی کی طرف سے بھی نہیں آیا۔
ایک بوچھا تھا جو اس نے اپنے سر سے اتار دیا۔
اس کے بعد اس کی تین کتابیں اور شائع ہوئیں۔ ان کتابوں کو بھی ناشر نڈل سکا۔
اس کی تمام تحریریں مسیحیت پر جارحانہ حملہ تھیں۔ اسی لیے وہ نامقبول ہو رہا تھا۔ یہ کوئی نہیں سمجھ رہا تھا کہ اس کی جبکہ ان لوگوں سے بھی جنہوں نے مسیح علیہ السلام کی تعلیمات میں تحریف کر دی تھی خصوصاً سینٹ پال اس کام میں سب سے آگے تھا۔
انیسویں صدی کا یورپ دنیا کی سب سے بڑی جارحانہ قوت تھا۔ اس کو قائم رکھنے کے لیے روایتی سچی اخلاقیات کے بجائے نئے اور جارحانہ نظام کی ضرورت تھی۔ غلطی کی تحریریں اسی پس منظر کو پورا کر رہی تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی تحریریں ہی بعد ازاں نازی ازم کے فروغ کا سبب بنیں۔
☆☆☆
وہ اپنی بہن سے اس وقت مل رہا تھا جب اس کی بہن الزبتھ شادی کر کے اس سے بہت دور جنوبی امریکا جا رہی تھی۔ یہ سوچے ہی کہ وہ اس سے بہت دور جا رہی ہے، غلطی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔
”الزبتھ، جانتی ہو تم مجھے کس مقام پر چھوڑ کر جا رہی ہو، میں بالکل تنہا ہو گیا ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ ایک تم تھیں، اب تم بھی جا رہی ہو۔“
وہ اس کے سامنے یہ نہیں کہہ سکا تھا کہ اب سلوی بھی نہیں۔
”بھائی، تم دوبارہ یونیورسٹی کیوں جوائن نہیں کر لیتے؟“
”ساری جرنل یونیورسٹیاں مجھ سے ٹالال ہیں۔ میری بات کون سنے گا؟ میں کس کو پڑھاؤں گا؟“
الزبتھ گونسنے مالا چلی گئی اور وہ لہجہ آ گیا۔
اقتیت ناک تنہائی نے اس کے قدم جنوں و دیوانگی کی طرف بڑھانے شروع کر دیے۔ اب اس کی حرکات سے ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ نارمل نہیں رہا۔
اس نے اپنی بہن کو خط لکھا۔
”کیا میں اکلایے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔۔۔۔۔ جس کو کبھی کوئی ایسا نہیں ملے گا جو اس کو جان سکے۔ جب اس کے پاس خدا کا سہارا بھی نہ ہو، دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے اور میرا یہ حال ہے کہ خدا ہے اور نہ ہی کوئی دوست۔ جن کو تم دوست کہتے ہو وہ بھی دوست ہوا کرتے تھے۔“



مجھ کو چند لوگ دے دو جو میری بات سنیں اور سمجھیں۔ تب میری صحت خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔“

وہ ایک مرتبہ بھر نہیں کہہ سکا کہ سلوی مجھے دے دو۔ وہ بہن سے اپنے تعلقات دوبارہ ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہی تو ایک رہ گئی تھی۔

الزبتھ کا جب بھی خط آتا تھا، وہ اسے یہی مشورہ دیتی تھی ”استاد بن جاؤ، شادی کرلو۔“ وہ بیوی کہاں سے ڈھونڈتا؟ دوسرے نظروں میں سلوی کو کہاں سے لاتا؟

1888ء میں وہ اٹلی کے شہر تورین میں تھا کہ اسے ڈنمارک کے پروفیسر جارج برنڈس کی طرف سے ایک خط ملا۔ اس نے لکھا تھا، ”دیکھ کر میرا خون کھولتا ہے کہ یہاں اسکینڈے نیویا میں آپ کو کوئی نہیں جانتا۔ میں نے بیڑا اٹھایا ہے کہ آپ کو ان لوگوں سے متعارف کراؤں گا۔“

ٹھٹھے کو اس نیم دیوانگی میں بھی ہنسی آگئی۔ اس نے جواب میں لکھا ”میں تو اپنے وطن میں بھی نہیں پہچانا جاتا۔ یہاں کے لوگ تو مجھے اوٹ پٹا نگ اور بے ہودہ سمجھتے ہیں۔“

جان برنڈس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے کوپنہاگن یونیورسٹی میں ٹھٹھے کے تصورات پر پچھڑ دینے کا سلسلہ شروع کیا۔

ان پچھڑ کے ذریعے لوگوں نے ٹھٹھے کے خیالات کو سمجھا اور اسے عظیم فلسفی قرار دیا جانے لگا۔

یہ اس کی شہرت کا نقطہ آغاز تھا لیکن اس کی داخلی حالت بہت ابتر تھی۔ یہ پورا سال اس نے اپنی جانب بڑھتی ہوئی شہرت کے قدموں کی چاب سنتے ہوئے گزرا اور اچانک چھوٹی چھوٹی کتابیں تخلیق کیں لیکن اب اس کے بدن کی عمارت سے اٹھدام اٹھدام کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہ اپنے ایک دوست کو خط لکھ کر فارغ ہوا تھا اور کچھ بر کے لیے گھر کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، ایک کوچوان اپنے گھوڑے پر بڑی طرح چابک برسا رہا ہے۔ گھوڑا بلبار رہا ہے اور اپنی اگلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر اپنی تکلیف کا اظہار کر رہا ہے۔ ٹھٹھے کو محسوس ہوا جیسے یہ چابک اس کی پیٹھ کو زخمی کر رہا ہے۔ وہ چیخ مار کر آگے بڑھا اور گھوڑے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر لٹک گیا اور پھر بے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ شوقین ٹھٹھے کا مالک مکان بھی گھر سے نکل آیا ٹھٹھے کو اس حال میں دیکھا تو اٹھا کر گھر میں لے آیا اور اس کے کمرے میں لے گیا۔ اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔

مالک مکان اسے ہوش میں لے لیا لیکن سوچے بغیر اور با

ہوگا کہ اس سے تو وہ بے ہوش ہی اچھا تھا کیونکہ ٹھٹھے نے ہوش میں آتے ہی اوٹ پٹا نگ حرکتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ گانے گاربا تھا اور شور مچا رہا تھا۔ مالک مکان نے سمجھا کہ اس کا کرایہ دار نشتے میں ہے۔

”چپ ہو جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔ شراب پینا ہے تو کوئی اور کمرہ دیکھو۔ اٹھاؤ اپنا سامان!“

وہ شاید پولیس کو بلا بھی لیتا لیکن ٹھٹھے کی طبیعت سنبھل گئی۔ ایک دورہ ساتھ جو آ کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھینے کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔

اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ دوستوں اور یورپ کی بعض ممتاز شخصیات کے نام خط لکھ رہا تھا۔ ان خطوں کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔

”مصلوب (اس نے اپنے لیے لقب اختیار کیا) 8 جنوری کو روم جانے گا جہاں یورپ کے شہزادے اور پوپ اس کے اعزاز میں اکٹھے ہوں گے۔“

”جب تم نے مجھے دریافت کیا تو مجھے پانا وشار نہ تھا۔ مشکل تو اب مجھ کو کھوتا ہے۔“

ایک خط میں اس نے خود کو ”ڈائوسس“ لکھا۔ یعنی شراب ویش کا پونا دیوتا۔

ہاسل یونیورسٹی کے پروفیسر دوست برک ہارٹ کو لکھا ”میں خدا بننے سے بھی زیادہ ہاسل یونیورسٹی میں پروفیسر بننا پسند کرتا لیکن میں اپنی انا کو اس حد تک نہ لے جانا چاہتا تھا کہ دنیا کی تخلیق ہی کو نظر انداز کر دیتا۔“

خدا کی کا یہ دعویٰ سن کر برک ہارٹ سمجھ گیا کہ اس کی نیم دیوانگی کا دائرہ اصل ہو گیا ہے۔ مزید برآں تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ وہ اسی وقت ٹھٹھے کو لینے تیور ان روانہ ہو گیا۔ وہ ٹھٹھے کے کمرے میں پہنچا تو اسے بے قابو دیکھا۔ وہ شور مچا رہا تھا اور مالک مکان اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

”جناب، اس آدمی نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ اسے فوراً یہاں سے لے کر جائیے۔“ مالک مکان نے برک ہارٹ کو دیکھ کر اس سے کہا۔

”جناب، آپ فکر نہ کریں۔ ہم انہیں لے جانے کے لیے ہی آئے ہیں۔“

ٹھٹھے نے برک ہارٹ کو دیکھا اور اس کے ساتھ ایک کو تو اس نے شور مچانا بند کر دیا اور دونوں کو پہچان لیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلے ہوا آیا اور ایک کے کان میں سرگوشی کی۔

”تمہیں ہائمن ٹولائف نامی قلم یاد ہے؟ جس کی میں

نے دھن بنائی تھی۔ میں تمہیں بتاؤں وہ قلم میری نہیں تھی بلکہ ایک نوجوان روسی خاتون فرالین وان سلوی کی تھی جس سے میری دوستی تھی۔“

یہ غیر متعلق بات سن کر اور برک کو یقین آ گیا کہ ٹھٹھے کی ذہنی حالت نہ صرف محدود ہے بلکہ اس کی دیوانگی کا کوئی نہ کوئی تعلق سلوی سے ضرور ہے۔

اسے ہاسل لایا گیا اور ایک نفسیاتی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ وہ ذہنی طور پر بالکل مفلوج تھا۔ اس کی ماں کو لکھ دیا گیا تھا۔ وہ اس سے ملنے آئی تو وہ بالکل ٹھیک نظر آ رہا تھا۔ وہ ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ الزبتھ کے بارے میں پوچھتا رہا۔ گھر کے اخراجات کے بارے میں فکر مند تھا۔ ہوش مند کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی ماں خوش ہو رہی تھی اور ٹھٹھے کی وہ حالت نہیں سمجھتی جو بتاتی تھی لیکن باتیں کرتے کرتے اچانک چیخنے چلانے لگا۔ اس کی ماں اس کی حالت سے مایوس ہوئی۔

اس کے دوست اس کی دیوانگی کے اسباب جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک سبب یہ بھی سامنے آیا کہ سلوی نے کسی جرمن پروفیسر سے شادی کر لی تھی جبکہ اس نے ٹھٹھے سے کہا تھا، وہ کسی سے بھی شادی نہیں کرے گی۔ ممکن ہے اس شادی کی خبر نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہو۔

تین دن بعد اس کی ماں اسے لے کر نومبرگ چلی گئی اور نومبرگ کے قریب ”جینا“ کے مقام پر اسے وہاں نفسیاتی علاج کے مرکز میں داخل کر دیا۔

شاید دنیا اس کے حواس ختم ہونے کے انتظار میں تھی۔ اس کی شہرت حیرت انگیز طور پر دنیا بھر میں پھیلنے لگی۔ وہ ایک لہجہ بن گیا تھا۔ جرمن قوم پرستوں نے اسے اپنا ہیرو بنالیا تھا۔ اس کی شہرت ہندوستان تک پہنچی فلسفی علامہ اقبال نے اسے مجذوب فرما کر کہا اور ایسی روحانی شخصیت کا درجہ دیا جو مناسب رہنمائی نہ ملنے کے سبب راہ سے راہ ہو گیا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ جب لوگ مجھ سے رجوع کریں گے تو میں ان سے دور چاچکا ہوں گا۔ اس کے یہ الفاظ پورے ہو رہے تھے۔ اس کی شہرت پھیل رہی تھی اور وہ خود اس شہرت سے بے نیاز تھا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اسپتال کے باہر کیا ہو رہا ہے؟

قوم پرست نازیوں کو اس فلسفی کے خیالات میں اپنے عزائم کی تھک ڈھونڈنے میں جلدی کا میاں مل گئی۔ انہوں نے ٹھٹھے کی نگری بزرگوں کی قبرست میں سب سے بلند درجہ دے دیا۔

بدقسمت نگری بزرگ کی حالت یہ تھی کہ بے ربط جملے

بولتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی ان باتوں میں ربط بھی آ جاتا تھا جس سے یہ امید بندھتی تھی کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ اس دنیا میں واپس آ جائے گا، جہاں سے وہ بہت دور چلا گیا تھا۔

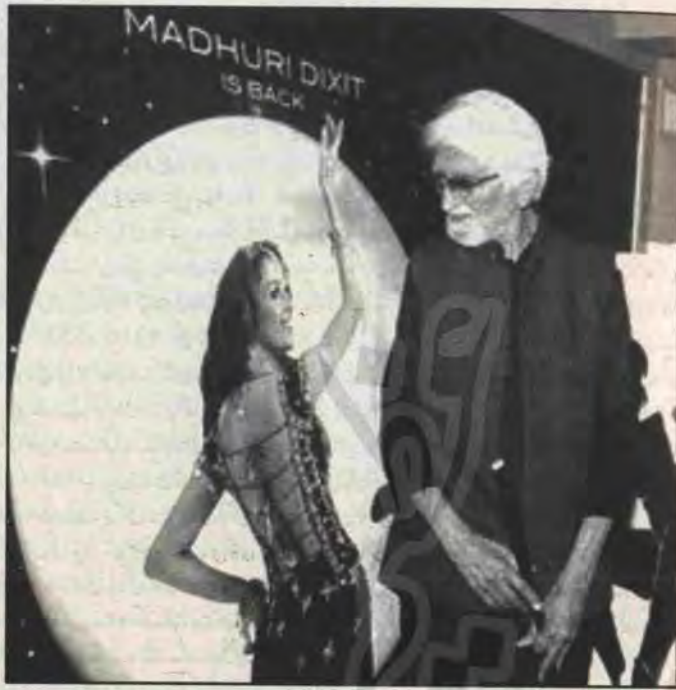
1890ء تک وہ ”جینا“ کے نفسیاتی اسپتال میں رہا۔ اس کی ماں نے بیٹے کے قریب رہنے کے لیے ایک گھر لے لیا تھا اور ٹھٹھے کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ جب مایوسی بہت بڑھ گئی تو وہ اسے لے کر نومبرگ چلی آئی اسی گھر میں جہاں وہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد ٹھٹھل ہوئی تھی جہاں ٹھٹھے نے بچپن کے دن گزارے تھے۔

نومبرگ پہنچتے ہی وہ خاموش ہو گیا تھا۔ ذہنی خرابی کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن اس کی ماں ایک واقعے سے چونک گئی اور اس کی مسلسل نگرانی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ عام طور پر جب چاب برآمدے میں بیٹھا رہتا تھا لیکن اس دن کئی میں نکل گیا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر جانے کے بعد وہ بندر کی طرح اچھلنے کودنے لگا۔ اس کی عجیب و غریب حرکات دیکھ کر بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھ کر کپڑے اتارنے شروع کر دیے، اتنی دیر میں پولیس آگئی۔ پولیس نے اسے حراست میں لے لیا لیکن جب معلوم ہوا کہ وہ کون ہے تو ایک سپاہی اسے اس کے گھر لے آیا۔ اتنی دیر میں وہ بالکل نارمل ہو چکا تھا۔ اس نے سپاہی کا شکر یہ ادا کیا اور ماں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس دن گھر سے اس کی کڑی نگرانی کرنی پڑی تھی۔

اس کی ماں اس صدمے سے دو چار تھی کہ ایک صدمہ اور اس پر پڑا۔ الزبتھ بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کے شوہر نے خودکشی کر لی تھی۔ وہ جنوبی امریکا سے واپس آ گئی۔

بھائی کی حالت دیکھی تو اپنا صدمہ بھول گئی۔ شکر ہے کہ ٹھٹھے کی ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اسے پہچان نہ سکتا ہو۔ الزبتھ کے چلے آنے کے بعد اس کی ماں کی فزیت داریوں میں کچھ کمی آگئی۔ دونوں عورتیں مل کر اس کی تیار داری کرتی گئیں۔

الزبتھ کے آنے سے یہ بھی ہوا کہ ٹھٹھے کی کتابیں اور وہ مسودات جو اپنی اشاعت کا منہ نہ دیکھ سکے تھے، محفوظ ہو گئے۔ اس کی وفات کے بعد الزبتھ نے ان مسودوں کو شائع بھی کروایا حالانکہ اس پر یہ الزام بھی آیا کہ چونکہ وہ یہود دشمن تھی اور اس کا شوہر یہود دشمن تحریک کا سرگرم رکن رہ چکا تھا، لہذا اس نے ٹھٹھے کے مسودات میں ردوبدل کر دیا تھا اور ایسی باتیں شامل کر دی تھیں جو یہود دشمنی اور جرمن قوم پرستی کی



عشق نگین

مریم کھ خان

اس نابغہ روزگار کی داستان جسے قدرت نے فنِ مصوری میں کمال عطا کیا تھا۔ وہ دنیا بھر میں اپنے کام کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ برصغیر میں اس کا ثانی نہ تھا۔ اس نے رنگوں کی ایسی حسین دنیا تخلیق کر لی تھی کہ لوگ اش اش کر اٹھتے تھے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویروں کی قیمت لاکھوں میں لگتی تھی لیکن وہ حسن کا شیدائی تھا۔ فطرت کا حسن ہوا حسین چہرے، وہ ان کو رنگ و روغن کے ذریعے زبان دے دیا کرتا تھا۔ مگر جب وہ لڑکی جس نے بالی ووڈ میں تہلکہ مچا رکھا تھا اس کے سامنے آئی تو وہ ”سدہ بدھ“ کہو بیٹھا۔ تقریباً 80 سال کی عمر میں اس کے لیے بھنورا بن گیا۔

برصغیر کی پہچان کبے جانے والے مصور کی داستان

یہ پہلی جنگ عظیم کا پُر آشوب دور تھا۔ اگرچہ ہندوستان اس جنگ سے بہت دور تھا اور جنگ یورپ میں لڑی جا رہی تھی لیکن بد قسمتی سے ہمارے آقا انگریز اس جنگ کے ایک فریق تھے اور انہوں نے ہندوستان کے وسائل اور لوگوں کو جنگ کی اس جہتی کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ جوانوں کو بھرتی کر کے محاذ پر بھیجا جا رہا تھا اور تمام ہی اشیائے ضروریہ کی راشن بندی کر دی گئی تھی کیونکہ یہ چیزیں بھی بحری جہازوں میں بھر کر یورپ

عشق ناکام
نمبر

ماہنامہ سرگشت

طرف لوٹ چکا تھا۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے کیا کھ دیا۔ الزبتھ اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے روئے گی۔

”طشے، پھر کو تم نے ابھی کیا کہا تھا؟ ہاں، مجھے یاد ہے تم بہت خوبصورت تھے۔ تم تو اب بھی خوبصورت ہو، کسی معصوم بچے کی طرح۔ کتنی مدت بعد میں تمہاری آواز سنی ہے۔ تمہاری آواز بھی کتنی خوبصورت ہے۔“

طشے یوں لاقطع تھا جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔ اس کی اس دیوانی کو سات سال گزر چکے تھے۔ پچھلے دو سالوں میں وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا جیسے اپنے ٹھکرانے جانے کے خلاف احتجاج کر رہا ہو۔

اس کی ماں فرانسسکا اس کی دیکھ بھال کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ اس انتظار میں کہ اس کا لاڈلا اکلوتا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر کی بن گئی تھی۔ ہر رات اس امید میں سونے کے لیے لیٹی تھی کہ صبح اس کا بیٹا اس سے باتیں کرے گا۔ ایک رات وہ ایسی مایوس ہوئی کہ اس نے اٹھنے سے ہی انکار کر دیا۔ 120 اپریل 1897ء کو فوت ہو گئی۔

طشے نہ زندہ تھا نہ مردہ۔ اس پر اس حادثے کا اثر کیا ہوتا۔

فرانسسکا کے انتقال کے بعد طشے کو ”دیوار“ منتقل کر دیا گیا جہاں اس کی ایک مداح خاتون نے اپنا گھر ”طشے آرکائیو“ کے لیے دے دیا تھا۔

طشے کو دیوار لایا گیا تو یوں لگے جیسے کوئی باغی لیڈر جلا وطنی کاٹ کر اپنے وطن واپس آتا ہے۔ قوم پرستوں نے اسے ولی کا درجہ دے رکھا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کی زیارت کو آ رہے تھے۔

طشے نے کبھی کہا تھا ”مجھے ڈر ہے کہ روز مجھے ولی قرار دے دیا جائے گا۔“ اس کی پیش گوئی سچ ثابت ہو رہی تھی۔

اس کی دیوانگی کی گیارہ سالہ سزا ختم ہوئی۔ 56 سال کا ہوا تھا کہ اپنی سالگرہ سے چند ہفتے قبل 25 اگست 1900ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

اسے روکنے کے قصبے میں اس کے باپ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

وہ جانے بغیر ہی مر گیا کہ وہ مشہور شخصیت بن چکا ہے۔ اس کی محبوبہ سلوی اس کی وفات کے 35 سال تک زندہ رہی۔

ماخوذ: فریڈرک طشے، حیات و افکار ایک مطالعہ از قاضی جاوید

الزبتھ نے طشے کا ”آرکائیو“ بھی قائم کر دیا جس میں طشے کی زراستہ اشیا کتابیں وغیرہ محفوظ کر دی گئیں۔ طشے کی ذہنی حالت روز بہ روز خراب ہوتی جا رہی تھی۔

سر جھکائے گھر کے برآمدے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اب اس سے کوئی یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ خود اس کا یہ حال تھا کہ اس نے بولنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ابھی اگر کسی بات پر بول اٹھتا تو گھر والے خوشی سے جھج اٹھتے۔ الزبتھ زور زور سے ماں کو آوازیں دینے لگتی۔

”ماں، ذرا آ کر تو دیکھو، بھائی نے ابھی بات کی تھی۔“ اس کی یہ کیفیت بھی اس کی بیماری کے پانچ سال تک رہی۔ اس کے بعد تو اس نے کسی کو پہچاننا ہی چھوڑ دیا۔ ایک دن گھر سے نکل گیا۔ بہ مشکل گلی کے کونے تک پہنچا تھا کہ لوگوں سے اپنے گھر کا پتہ پوچھنے لگا۔

”ہمارا گھر کہاں ہے؟“ اس کا ایک بچانا دوست اس سے ملے آیا تو طشے اس بچانے دوست کو نہ پہچان سکا۔ اس کا دوست اس کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگا۔ طشے پر اس کے آنسوؤں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ کسی کی موجودگی سے بے نیاز بیٹھا رہا۔ وہ رخ اور مسرت کی حدوں سے آگے نکل گیا تھا۔

”آپ آداس نہ ہوں۔“ طشے کے اس دوست نے الزبتھ سے کہا تھا ”کچھ دنوں سے ان کی یہی حالت ہو گئی ہے۔ میرے اور ماں کے سوا کسی کو بھی نہیں پہچانتے۔ ایک سال پہلے تک اکیلے نہیں تو کسی کے ساتھ گھومنے جاتے تھے لیکن اب تو کمرے میں کسی زنجی جانور کی طرح لیٹے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے جیسے کہہ رہے ہوں، میرے پاس کوئی نہ آئے۔ آنکھوں سے گہری نفرت چمکتی رہتی ہے۔“

دو پھر کا وقت تھا۔ کوئی سہیلی الزبتھ سے ملنے آئی۔ طشے ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تو پوچھا، بیٹا تو بے کیل رہا تھا۔ جی ہاں، اب وہ کیل ہی سکتا تھا ورنہ ایک زمانہ وہ تھا جب وہ دشمن تخلیق کرتا تھا بلکہ موسیقار بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ بے شک، اگر وہ قلعہ بنی نہ ہوتا تو عظیم موسیقار ہوتا۔

دونوں سہیلیاں کسی مرد کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں کہ وہ کتنا خوبصورت ہے۔ طشے قریب ہی تو بیٹھا تھا۔ اس نے یہ بات سن لی۔ اس نے بیٹا تو بے ہاتھ ہٹائے اور الزبتھ کی طرف دیکھ کر کہا ”جیتا تو، کیا میں کبھی خوبصورت نہیں تھا؟“

الزبتھ نے ایسی ہوش مند کی بات اس کی زبان سے سنی تو لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی۔

بھیجی جا رہی تھیں۔ دولت مندوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن عام ہندوستانی بہت مشکل میں تھے۔ ان ہی دنوں یوپی (آئر بریش) کے ایک چھوٹے سے قصبے پندر پور کے ایک عام گھرانے میں فدا حسین اور نذیب کے گھرا ایک بچہ پیدا ہوا۔ ماں باپ اس بچے کو دیکھ کر نہال ہو گئے تھے۔ اس گورے چنے اور گول منوں سے بچے نے ان کی زندگی میں ایک نیا رنگ بھر دیا تھا لیکن اس وقت وہ بے خبر تھا کہ ایک وقت آئے گا جب رنگ اس بچے کی زندگی بن جائیں گے اور یہ رنگوں سے اس طرح کھیلے گا جیسے کوئی ماں اپنے بچے سے کھیلتی ہے۔

17 ستمبر 1915ء کی تاریخ کو پیدا ہونے والے اس بچے کا نام مقبول فدا حسین رکھا گیا۔ کاتب تقدیر نے اس بچے کے لیے انوکھا فیصلہ کیا تھا، عورت اس کا مرکز خیال تھی لیکن اسے زندگی کے ابتدائی دور میں عورت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ انسان کی زندگی میں آنے والی اولین ہستی اس کی ماں ہوتی ہے۔ بد قسمتی سے مقبول ابھی صرف تین برس کا تھا کہ اس کی یہ اولین ہستی اس سے چھن گئی۔ نذیب چند دن بیمار رہ کر زندگی ہار گئی اور مقبول کو بے ماں کا کر گئی۔ اس وقت وہ دکھ سے ناواقف تھا البتہ بہت دن تک اس بات پر روتا رہا کہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی نہ چھوڑنے والی ماں اجا تک اسے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی اور واپس کیوں نہیں آئی تھی؟

فدا حسین مرد تھے، کام کرتے تھے۔ انہیں اپنے گھر اور بچوں کو سنبھالنے کے لیے ایک عورت کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے پھر شادی کی اور اپنے خاندان کو لے کر اندور منتقل ہو گئے۔ اس وقت تک مقبول کسی قدر بوش سنبھال چکا تھا اور اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ اب اس کی ماں اسے بھی واپس نہیں ملے گی۔ فدا حسین نے اسے اسکول میں داخل کر دیا۔ اس نے ابتدائی تعلیم اسی اسکول میں حاصل کی تھی۔ مروجہ تعلیم سے ہٹ کر مقبول کو کاغذ پر یوٹی لکیریں بنانے سے دلچسپی تھی۔ فدا حسین مغربی تعلیم کے خلاف نہیں تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ بچوں کو اپنے ماضی اور اقدار سے متعلق بھی کوئی نہ کوئی علم سکھانا چاہیے۔ اس لیے مقبول کے شوق کو تیز نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اسے خطاطی سیکھنے کی طرف مائل کیا۔ تاکہ اس کا شوق صحیح سمت اختیار کر سکے۔ مسلمان عام طور سے مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ سے رشتہ نہیں رکھتے تھے۔ البتہ خطاطی کو اسلامی آرٹ تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے شرفا عام طور سے دینی اور دنیوی تعلیم

کے بعد اپنے بچوں کو کسی فن کی تعلیم دلاتے تھے تو وہ بھی فن خطاطی تھا۔ اس لیے فدا حسین نے اپنے کو خطاطی سکھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اندور میں خطاطی کے اساتذہ خاص نہیں تھے اس لیے مقبول ان سے رہنمائی حاصل نہ کر سکا اور اس نے انجی خنت سے خط کوئی کی ہندی اور ریاضیاتی اشکال پر عبور حاصل کر لیا۔ بعد میں بھی اس کی خطاطی سے دلچسپی برقرار رہی تھی اور والد کے اصرار پر اس نے اس شعبے میں کچھ کام بھی کیا لیکن اس کی اصل دلچسپی مصوری سے تھی۔ سادہ کاغذ پر صرف پنسل کی مدد سے وہ ایسے اشکال بناتا کہ اس کے استاد بھی حیران رہ جاتے تھے۔ اس میں مصوری کا قدرتی شعور تھا اور اس کی بنائے ہوئے اسکیچز میں تناسب ہوتا تھا۔ یعنی وہ انسانوں اور جانوروں کے اسکیچز بناتے ہوئے ان کے جسمانی تناسب کا خیال رکھتا تھا۔ یہ پیر عام طور سے مصوری کے طلباء کو آرٹ اسکول میں سکھائی جاتی ہے لیکن مقبول میں فطری طور پر موجود تھی۔

ابتدائی دور میں اس کی مصوری کی صلاحیت دینی ہی رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ والد فدا حسین کا مذہبی ہونا تھا اور ظاہر ہے وہ تصویر کشی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اسکول کی تعلیم کی حد تک مقبول کا زیادہ زور خطاطی کی طرف رہا تھا اور اگر اس نے مصوری کی تھی تو یہ دھکی چھپی ہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ادب اور تعلیم ایک ہی معنوں میں لیے جاتے تھے۔ ہر تعلیم یافتہ شخص کے لیے ادب کے کسی نہ کسی شعبے سے منسلک ہونا ضروری تھا اگر کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا نہیں کرتا تھا تو وہ اپنے ماحول سے کٹ جاتا تھا۔ یہ ضرورت مقبول نے بھی محسوس کی اور اس نے شاعری کا انتخاب کیا۔ فدا حسین نے بھی اس معاملے میں اس کی حوصلہ افزائی کی۔ کیونکہ یوپی کے شرفا میں شاعری زندگی کا لازمی جزو تھی۔ وہاں کسی ان پڑھ کا شاعر ہونا اتنا انوکھا نہیں سمجھا جاتا تھا جتنا کہ ایک تعلیم یافتہ شخص کا شاعر نہ ہونا۔

مقبول فدا حسین نے باپ کی حوصلہ افزائی یا کر شاعری کی طرف بھرپور توجہ دی لیکن جلد اس نے محسوس کر لیا کہ اس کا اصل میدان شاعری نہیں ہے بلکہ مصوری ہے۔ اندور سے اسکول کی تعلیم مکمل کر کے جب کالج میں داخلہ کا وقت آیا تو خلاف توقع مقبول نے شمالی ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے مقابلے میں جنوبی ہند کو ترجیح دی۔ اس وقت ہر مسلم نوجوان کا خواب علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھنا ہوتا

تھا۔ مگر مقبول جو پڑھنا چاہتا تھا اس کے اصل تعلیمی مراکز جنوب میں تھے۔ وہ کچھ آزدویں اور کچھ خواب لے کر بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی اس کے لیے ابھی شہر تھا۔ لیکن برصغیر کے دو شہروں کا حراج ایسا ہے کہ یہ اپنے پاس آنے والے ہر شخص کے لیے دامن کشادہ رکھتے ہیں اور ہر شخص یہاں یوں رجسٹر ہو جاتا ہے جیسے ہمیشہ سے یہیں کا باشندہ ہو۔ ان میں ایک بمبئی ہے اور دوسرا شہر کراچی ہے۔ بمبئی بھی زیادہ دن مقبول کے لیے ابھی نہیں رہا تھا۔ یہاں اسے دوست اور ہم نشین مل گئے جن کی دلچسپی مشترک تھیں۔

بمبئی میں آرٹ سکھانے والے بے شمار تعلیمی ادارے تھے لیکن جو حیثیت سرے بے اسکول آف آرٹ کو حاصل تھی وہ کسی اور تعلیمی ادارے کو حاصل نہیں تھی۔ اس اسکول میں فنون لطیفہ کے تمام شعبوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مقبول نے اسکول آف آرٹ میں مصوری کے شعبے میں ایک سال کے لیے داخلہ لیا۔ اس وقت اس کالج میں معدودے چند مسلمان طلباء پڑھتے تھے۔ زیادہ تر پارسی اور ہندو طالب علم تھے مسلمانوں میں مقبول فدا حسین کے علاوہ ایک اور طالب علم تھے جنہوں نے بعد میں اردو کو کمپیوٹر کی زبان بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ یہ احمد جیل مرزا تھے۔ ان کا تعلق دہلی سے تھا اور اتفاق سے مقبول فدا حسین کی طرح انہوں نے خطاطی سے آغاز کیا تھا اور پھر گھر والوں کی مرضی کے بغیر فنون کی طرف آگئے تھے۔ مگر دونوں میں کوئی رابطہ نہیں رہا اور نہ ہی کوئی قدر مشترک تھی سوائے اس کے کہ دونوں اپنے اپنے شعبوں میں اعلیٰ ترین مقام پر پہنچے۔

بے اسکول آف آرٹ میں آکر مقبول فدا حسین کو اندازہ ہوا کہ اس کا اصل میدان پینٹنگ ہے۔ خام رنگوں سے بے جان کاغذ کو جاندار تصویروں میں بدلنا اس کا مقصد حیات تھا۔ اس لیے اس نے انجی ساری توجہ اس کی طرف مبذول کر دی۔ جب وہ جوش سے کیٹوں پر اسٹروک لگا تو یہ رنگ کی لکیر نہیں رہتی تھی بلکہ کچھ بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ پینٹنگ بنانا مقبول فدا حسین کے لیے پیش نہیں بلکہ کام تھا۔ مگر بے اسکول آف آرٹ ایک ایسا ادارہ تھا جو معاشرے میں آرٹ کی پیشہ ورانہ کمی پوری کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ یہاں تعلیم کا نصاب کچھ اس طرح کا تھا کہ آدمی لازمی اسے پیشے کی حیثیت سے سیکھتا تھا۔ اس وقت ہندوستان میں آرٹ کے حوالے سے انڈسٹری ترقی کر رہی تھی۔ جس میں فلمی صنعت نمایاں تھی۔ اسکول آف آرٹ

سے فارغ ہونے والے تقریباً تمام ہی طلباء اور طالبات فلم انڈسٹری سے منسلک ہو رہے تھے اس لیے جب مقبول فدا حسین کے ہاتھ میں ڈگری آئی تو اس نے گزراوقات کے لیے بمبئی کی فلمی صنعت کا رخ کیا تھا۔ دوران تعلیم اس کا گزارا اس رقم سے ہوتا تھا جو فدا حسین اسے بھیجتے تھے یا کوئی چھوٹا موٹا کام لیا جاتا تھا۔ یہ دور کثافت شعاری کا تھا اگر ایک وقت پینٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا تو اس کی کوشش ہوتی کہ ایک وقت فاقے سے گزار لے۔

کیونکہ مقبول نے مصوری کی تعلیم حاصل کی تھی اس لیے پہلا کام سنیما ہو رڈنگز کا ملا تھا۔ اس زمانے میں بلکہ آنے والی نصف صدی تک سنیما ہو رڈنگز ہاتھ سے ہی پینٹ کیے جاتے تھے اور یہ کام زیادہ تر نوآموز اور شوقیہ مصوروں سے لیا جاتا تھا لیکن چالیس کی دہائی میں برصغیر میں نوآموز اور شوقیہ مصوروں نے ہونے کے برابر تھے اس لیے یہ کام تربیت یافتہ مصوروں سے لیا گیا تھا۔ 1935ء میں بمبئی آنے کے بعد مقبول نے پہلی کمائی 1937ء میں حاصل کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دو سال اس نے کتنی مشکل اور تنگ دستی میں گزارے ہوں گے۔ آغاز میں آمدنی اتنی نہیں تھی۔ اسے کام زیادہ نہیں ملتا تھا کیونکہ اسے کام لینے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ پیشہ ور کاموں میں فن کارانہ مزاج نہیں چلتا ہے لیکن اس میں شروع سے فن کارانہ ناک مزاجی کوٹ کوٹ کھڑی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہترین مصور ہوتے ہوئے بھی اس کے پاس زیادہ کام نہیں ہوتا تھا اور وہ جتنا کماتا تھا اس سے بہ مشکل ہی اس کا گزارا ہوتا تھا۔

چند سال بعد وہ اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ اس کے کام کو کرسی سے سہا جا جانے لگا تب اسے اتنی فراغت ملی کہ وہ اپنے اصل فن کی طرف توجہ دے سکے۔ اپنے کام کے دوران اسے لیڈا اسکپ پر کام کرنے کا موقع ملا تھا اور یہ کام اسے اتنا بھایا کہ جب اس کے پاس کچھ رقم آتی تو سورت، بڑودا اور احمد آباد کے فطری علاقوں کی طرف نکل جاتا تھا اور وہاں لیڈا اسکپ پینٹ کرتا تھا۔ جب رقم ختم ہو جاتی تو واپس آکر سنیما ہو رڈنگز پینٹ کرنا شروع کر دیتا۔ جلد اسے محسوس ہوا کہ وہ اگر سنیما ہو رڈنگز ہی پینٹ کرتا رہا تو اسے اپنے اصل کام کے لیے وقت بہت کم ملے گا۔ اس شعبے میں مقابلہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور اسی لحاظ سے آمدنی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس لیے اس نے کوئی دوسرا کام تلاش کرنا شروع کر دیا۔

ہم جس عطیہ کو جانتے ہیں وہ 1877ء میں استنبول میں پیدا ہوئی۔ باپ بہت مال دار تاجر، سلطنت عثمانیہ اور یمن میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ 19 زبانیوں روانی سے بولتے تھے۔ لڑکیوں کو لڑکوں کی طرح پرورش کیا۔ جب ہی ان کی تینویں بیٹیوں زہرہ، نازی اور عطیہ نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں پردہ ترک کیا۔ ان کے خاندان کی لڑکیاں 1880ء سے انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ عطیہ فیضی کی نانی درۃ الاولیٰ ایک پریمی لکھی خاتون تھیں، ان کی والدہ امیر النساء بیگم نے ایک ناول ”نادر بیان“ لکھا جو پہلی جنگ عظیم شروع ہونے سے چند مہینوں پہلے شائع ہوا۔ عطیہ وہ پہلی مسلمان لڑکی تھیں جسے سرکاری وظیفہ ملا کہ وہ لندن جاکر تعلیم حاصل کریں۔ 1906ء کا یہی وہ سفر تھا جس کا روزنامہ عطیہ فیضی نے پابندی سے لکھا اور لاہور سے چھپنے والے ماہنامے ”تہذیب نسواں“ میں باقاعدگی سے شائع ہوا۔ 1921ء میں یہ روزنامہ چھپنے سے سرفراز ہو گیا تھا جسے ”زمانہ تحصیل“ کے عنوان سے مطبع مفید عام آگرہ نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ 2010ء میں ادارہ یادگار غالب نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ اور عطیہ کی زندگی کا احوال آکسفورڈ پریس انڈیا نے چھاپا ہے۔ یہ کام یوشن یونیورسٹی میں فارسی کے سینئر لیکچرار ڈاکٹر سٹیل شرام اور S. Lambert Hurley نے مشترک طور پر کیا ہے۔ اس کتاب کا نام Atiay's Joneyey: A Muslim Woman from Clonial Bombay to Edwardian Briton.

عطیہ فیضی جنہیں علامہ شبلی نعمانی کی وجہ سے مشہور ہونے کا الزام دیا جاتا ہے ان کے بارے میں یہ لکھنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوئی کہ یہ عطیہ تھیں جنہوں نے بیگم جموں پال سے سفارت کر کے ”سیرۃ النبیؐ“ کی اشاعت کے لیے خطیر رقم کا اہتمام

کیا تھا اور یہ بھی وہی تھیں جن کے بارے میں مولانا نے ان کی بہن ہرماں کی نس جیمہ نازی بیگم کو ایک خط میں لکھا ”آپ اور عطیہ جی اردو لکھ لیتی ہیں کاش ہمارے صوبے بھر میں کوئی خاتون لکھ سکتی۔“ بھی شبلی اپنے خطوں میں انہیں فارسی پڑھانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، بھی انہیں پاری اور ہندو خاتون کی طرح لیکچر دینے پر اسکا تے ہیں اور حوالہ یہ ہے کہ موسیقی سے عطیہ کی محبت دیکھ کر انہیں منشی نول کشوری چھانی ہوئی کتاب ”قانون موسیقی“ بھجواتے ہیں۔ شبلی اپنی کسی کتاب کو عطیہ کے نام معنون کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ موسیقی کے حوالے سے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”گراموفون میں پیارے صاحب کے جوگانے بند ہیں، ان کو سنو، پلیٹوں پر گانوں کے نام بھی ہوتے ہیں۔ جیسے دادار اور دوسرے راگ۔ ایک خط میں مولانا شبلی لکھتے ہیں ”میری لڑکی تمہارے خط پڑھ کر خست حیرت زدہ ہوئی ہے کہ اس قابلیت کی بھی عورتیں ہوتی ہیں۔ میں نے اس کا بھی یہی جواب دیا کہ وہ عورت کب ہیں۔“

شبلی، عطیہ سے بیس برس بڑے تھے لیکن اپنی ایک پرانی تصویر میں برس کی عمر کی تھی، بھیجتے ہیں جس کے بعد عطیہ نے اپنے مشہور مصور شوہر رحمن سے ایک پورٹریٹ ہوائی۔ فرانس میں 1913ء میں ایک نمائش ہوئی جس میں یہ بھی گئی۔ رحمن کی اس پورٹریٹ کو بعض فرانسیسی قدردان مہنگے داموں خریدنا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے عطیہ راضی نہیں ہوئیں۔ انہیں سب باتوں کی وجہ سے جھوٹی چکی باتیں مشہور ہوئیں۔

اقتباس: عطیہ فیضی از زاہدہ حنا
مرسلہ: خالق، بیٹی، اللہ آباد، رحیم یار خان

جس کام میں اسے سب سے اچھی آمدنی کی پیش کش ہوئی وہ ایک کھلونا ساز فیکٹری کی تھی۔ مقبول فدا حسین کو یہاں کھلونے ڈیزائن کرنے تھے اور ان کو بنانے والے آرٹ فریم بھی تیار کرتے تھے۔ اس کام سے اسے اتنی اچھی آمدنی ہونے لگی کہ اس نے شادی کا فیصلہ کیا۔ 1941ء میں فیصلہ نامی خاتون سے شادی کی اور بعد میں ان کے پانچ بچے بھی ہوئے۔ دو بیٹیاں رائیہ اور عقیلا اور تین بیٹے مصطفیٰ جو ایک ہوئی کا مالک ہے، شمشاد اور اویس ہیں۔ یہ دونوں مصور ہیں۔ تقسیم کے ہنگامے شروع ہونے سے پہلے مقبول فدا حسین ایک پُر سکون خاندان کا مالک بن چکا تھا۔ اس کی فنکارانہ زندگی بھی آسودہ تھی۔ اس کا نام بن گیا تھا اور اب اس کے پاس کام کی کمی نہیں تھی۔

گزشتہ ایک دہائی میں اس نے آرٹ میں کام تو بہت کیا تھا لیکن اس کا یہ کام ابھی منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ 1947ء کا سال جہاں برصغیر میں بسنے والی قوموں کے لیے قیامت خیز تبدیلیاں لایا وہیں یہ سال مقبول فدا حسین کے لیے بھی تبدیلی لایا۔ اس برس بھی آرٹ سوسائٹی کے زیر اہتمام ہونے والی مصوری کی نمائش میں اس کی تصویر ”سنہرا سنسار“ نے پہلا انعام حاصل کیا اور پہلی بار مقبول فدا حسین ایم ایف حسین کے نام سے فنون کی دنیا میں جانا گیا اور پھر اسے حسین کہا جانے لگا۔ آنے والے دنوں میں یہ نام

سے الگ ہو گیا اور نئے فیصد سے بھی زیادہ مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالا تھا لیکن دس فیصد اس کے مخالف بھی تھے۔ یہ مخالف پاکستان ہجرت کر کے نہیں گئے اور انہوں نے انڈیا میں رہنے کو ترجیح دی۔ حسین بھی انڈیا میں رہا اور اس نے بھی پاکستان جانے کا نہیں سوچا حالانکہ بعد میں اس کے بہت سارے دوست احباب اور جاننے والے پاکستان چلے گئے تھے۔ وہ لوگ بھی چلے گئے جنہوں نے دل و جان سے پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ مگر حسین انڈیا کو اپنا گھر سمجھتا تھا اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ مرتے دم تک انڈیا میں ہی رہے گا لیکن انیسویں اس کا یہ فیصلہ بعد میں بدل گیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اپنی چند مشہور پینٹنگز منظر عام پر آنے کے بعد حسین دہلی کے دورے پر گیا اور وہاں اس نے قدیم انڈین آرٹ کا مطالعہ کیا جن میں مہاراجہ کے جسمے اور مٹی پینٹنگز نمایاں تھیں۔ یہاں سے اس نے قدیم انڈین آرٹ کو جدید مغربی آرٹ سے ملانے کا کام شروع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر قسم کے آرٹ کی اصل ایک ہی تھی۔ پانچ فنون لطیفہ اپنی ظاہری صورت کے فرق کے ساتھ دنیا بھر میں ایک ہی وقت میں اور ایک ہی انداز میں رواج پائے تھے۔ قدیم آرٹ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مذہب سے بڑا ہوا تھا۔ خاص طور سے

غیر الہامی مذاہب میں آرٹ کو بہت زیادہ فروغ ملا اور مجسمہ تراشی سے لے کر پینٹنگز تک کا رواج ان ہی مذاہب میں پایا گیا جن کی اصل بت پرستی اور مظاہر پرستی تھی۔ ایشیا میں بھارت، چین اور قدیم ایران آرٹ کے مراکز رہے۔ جبکہ مغرب میں یونان اور روم آرٹ کے مراکز تھے۔ ان کے علاوہ افریقا اور شمالی و جنوبی امریکا میں بھی مقامی قسم کے آرٹ فروغ پائے اور ان سب کا تعلق مذہب سے تھا۔ اس سے بھی پہلے جب انسان نے متدن ہونا شروع کیا تو اس وقت آرٹ کو ذریعہ اظہار بنایا گیا تھا۔ جب فنون لطیفہ نے مزید ترقی کی ان میں لطافت اور نزاکت پیدا ہوئی تو اسے مذہب کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ الہامی مذاہب میں آرٹ کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں تھی لیکن یہاں مخصوص قیود و حدود کی وجہ سے آرٹ کی نئی اشکال سامنے آئیں جیسے مصوری اور مجسمہ سازی کے بجائے کئی گرائی اور آرائی اشیا کا فن سامنے آیا۔

قدیم سادہ عیسائیت جب روم میں داخل ہوئی تو اس نے قدیم دیوی دیوتاؤں کی بہت ساری چیزوں کو اپنا لیا جن میں سرفہرست فنون لطیفہ تھے۔ وہ روایات آج بھی عیسائیت کا ایک حصہ ہیں اگرچہ ابتدائی عیسائیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ میں بہت جلد آرٹ مذہب سے الگ ہو کر ایک علاحدہ حیثیت اختیار کر گیا۔ آرٹ کے

اسکول وجود میں آگئے اور ان کے زیر اثر آرٹ کی نئی اقسام تجربات کیے جانے لگے۔ دہلی میں اپنے قیام کے دوران حسین نے آرٹ کی قدیم اور جدید تاریخ کو پڑھا اور یہاں سے اس کے فن میں ایک نیا کھار آگیا وہ فن کاروں کے اس گروہ میں شامل ہو گیا جس نے سب سے پہلے اپنے فن میں مشرق اور مغرب کو یکجا کیا۔ مگر یہ یکجائی دونوں طرف سے تھی عام طور سے مشرق کے فنکار اپنے فن میں مغرب کی آمیزش اس طرح کرتے ہیں کہ یہ ظاہر وہ مغربی طرز کے ہیرو کار لگتے لگتے ہیں مگر حسین کا رنگ ان سب سے جدا تھا۔ اس نے اپنا جداگانہ انداز برقرار رکھا اور اپنے فن میں شرقی انداز کو نمایاں رکھا۔

آزادی کے بعد حسین کا نام تیزی سے اُبھرا اور 1950ء تک وہ اپنی متعدد تصویری نمائشوں سے ملک گیر شہرت حاصل کر چکا تھا۔ شروع میں اسے مالی لحاظ سے اتنا فائدہ نہیں ہوا تھا لیکن چند سالوں میں وہ انڈیا کا سب سے زیادہ مالدار مصور بن گیا۔ اس کی تصویر ایک لاکھ روپے تک میں فروخت ہونے لگی تھی۔ مگر اس وقت حسین کو مالی منفعت کی اتنی پروا نہیں تھی۔ جب وہ روزگار کے لیے جدوجہد کر رہا تھا تو اس کے پاس دو ہی لباس ہوتے تھے جنہیں وہ بدل بدل کر پہنتا تھا اور اکثر اوقات چپل یا جوتی نہ ہونے کی وجہ سے اسے ننگے پاؤں گھومنا پڑتا تھا۔ دولت آنے کے بعد بھی اس کی قطع و منقطع اس طرح برقرار رہی تھی۔ وہ سادہ لباس اور ننگے پاؤں ہر جگہ بے تکلفی سے گھومتا تھا۔ اس نے کبھی کوئی ذاتی اسٹوڈیو نہیں بنایا تھا۔ جہاں اس کا موڈ ہوتا وہ پینٹ کرنے لگتا۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ وہ جن ہوٹلوں میں رکا تھا ان کی دیواروں اور فرش کو مصوری سے سجادیا۔ یہ اور بات تھی کہ فن تا آشنا ہوئی انتقامیہ نے اس سے نقصان کا ہر جانہ وصول کر لیا اور اس کی مصوری کے بہت سارے شاہکار اسی طرح ایک دودن کے لیے وجود میں آکر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ بعد میں وہ لوگ بہت پچھتاتے ہوں گے جنہوں نے ان فن پاروں کو ختم کر دیا تھا۔

حسین کے پینٹ کرنے کا انداز نالا تھا۔ اگر اسے کیٹوئس میسنر نہ آتا اور اس کے پاس رنگ نہیں ہوتے تھے تو وہ سادہ کلر مار کر لے کر کسی بھی کاغذ، چمڑے کے ٹکڑے یا محض دیوار پر مصوری شروع کر دیتا تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اس نے ایک دن میں دو رجن سے زیادہ فن پارے بنائے اور آج ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس کا صرف

وہی کام محفوظ ہے جو اس نے باقاعدہ کیٹوئس پر کیا اور یہ بھی اتنا ہے کہ چار آرٹ میوزیم صرف اس کے فن پاروں پر مشتمل ہیں جو حسین نے خود قائم کیے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے زندگی میں ساٹھ ہزار تصویریں بنائی ہیں۔ اگرچہ یہ دعویٰ مبالغہ آمیز لگتا ہے۔ لیکن اگر اس کی پوسٹ کارڈ ساز مٹی ایچر بھی شامل کی جائیں تو یہ دعویٰ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے۔ حسین کی مصوری کا دورانیہ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک محیط رہا۔ بلکہ یہ سفر کوئی ستر برس تک جاری رہا۔ اس نے ستر برس پہلے بے آرٹ اسکول میں داخلہ لیا تھا اور مصوری کی صلاحیتیں یقیناً اس وقت بھی اس میں موجود تھیں۔ جس طرح بعض لکھنے والے زود نویس ہوتے ہیں اسی طرح بعض مصور بھی بہت زیادہ کام کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ساری بات آئیڈیاز کی ہوتی ہے اور حسین کے پاس آئیڈیاز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ فن نام ہی آئیڈیے کو سجا ستوار کر پیش کرنے کا ہے۔ آئیڈیاز اس وقت آتے ہیں جب فنکار اپنے شعبے سے بہت کر دوسرے شعبوں کے بارے میں بھی جانتا ہے۔ دوسرے مصوروں کے برعکس حسین نے نہ صرف فن کے دوسرے شعبوں میں طبع آزمائی کی تھی جیسے رقص اور فلم سازی، وہ شاعر بھی بہت اچھا تھا اور برصغیر کی شاعری پر اس کی گہری نظر تھی۔ مصوری کی تاریخ کے ساتھ اس نے ہندو پاک کی تاریخ بھی پڑھ رکھی تھی۔

ساتھ کی دہائی کے آغاز میں حسین ملک گیر شہرت حاصل کر چکا تھا اور عوام میں بھی اس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ 1952ء میں بمبئی میں اس نے اپنے کام کی پہلی مکمل ٹیکنائٹس کی۔ اس نمائش میں صرف حسین کی پینٹنگز تھیں اور اس نمائش کو غیر معمولی کامیابی ملی۔ اس کی کئی تصاویر ریکارڈ قیمت میں فروخت ہوئیں اور پہلی بار اس نے خود کو دولت مند محسوس کیا۔ مگر یہ ساری رقم خرچ ہو گئی اس کا ایک روپیہ بھی کسی بینک اکاؤنٹ میں نہیں گیا تھا۔ اس نے ساری عمر پسپا کسی بینک میں نہیں رکھا اس کے پاس رقم آجاتی اور مختلف مدات میں بٹ کر خرچ ہو جاتی تھی۔ دو برس بعد اس نے ٹھکانے میں اپنے فن پاروں کی نمائش کی اور اس بار اسے صرف مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ دہلی کی للٹ کالا اکیڈمی کی جانب سے اسے اعزازی ممبر شپ بھی دی گئی یہ اعزاز بہت کم فنکاروں کو حاصل ہوا ہے۔ اسے سال کے غیر معمولی مصور کا ایوارڈ ملا۔

ایم ایف حسین انڈیا کی سطح پر جانا پہچانا نام بن گیا تھا

لیکن ابھی بین الاقوامی سطح پر اس کی شناخت ہونا باقی تھی۔ ساتھ کی دہائی کے آخر میں لندن رائل اکیڈمی آف آرٹس نے ائین آرٹ کے زیر اہتمام ایک نمائش کی جس میں حسین کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ اس کے فن نے مغربی مصوروں اور نقادوں کو چونکا دیا تھا۔ ابھی تک وہ ائین آرٹسوں کی جانب سے مخصوص ائین آرٹ ہی دیکھتے آئے تھے، یہ پہلا موقع تھا جب کسی ائین آرٹس پینٹر نے مغربی تحریکوں کا اثر اپنے فن پاروں میں جدید اور قدیم کی آمیزش کے ساتھ دکھایا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اکیلے اپنی پڑائی ملی جتنی ملا کر باقی تمام آرٹسٹوں کو بھی نہیں مل سکتی تھی جو اس انگریزیشن میں شامل تھے۔ حسین اس پڑائی سے بے حد خوش تھا۔ لندن دنیا میں آرٹ کا ایک بڑا مرکز ہے اور یہاں کسی آرٹسٹ کو سراہا جانے کا مطلب ہے کہ وہ واقعی فنکار ہے۔

آنے والی تین دہائیوں میں لگا تار حسین کو مغرب میں بے پناہ سراہا گیا۔ لندن، پیرس، فریگفرٹ، ماسکو، جینوا اور روم سمیت فنون کے تمام ہی مراکز میں اس کی تصویروں کی نمائش ہوئی۔ پیرس کی ایک نمائش میں اس کی تصویر آسمان اور انسان ایک لاکھ ڈالر میں فروخت ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ برصغیر سے تعلق رکھنے والے کسی مصور کی زندگی میں اس کی تصویر ایک لاکھ ڈالر میں فروخت ہوئی ہو۔ اس وقت یہ خبر انڈیا میں شریخیوں میں شائع ہوئی تھی اور لوگوں کا خیال تھا کہ اب اس سے زیادہ قیمت کسی تصویر کی نہیں ملے گی۔ مگر آنے والے وقتوں میں حسین نے لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا۔ نوے کی دہائی میں وہ واحد زندہ مصور تھا جس کی ایک تصویر دو ملین ڈالر میں فروخت ہوئی تھی اور یہ صرف ایک کیٹوئس پر بنائی گئی تصویر تھی۔ مغرب میں بھی چند ہی مصوروں کو یہ اعزاز حاصل ہے شاید اسی لیے اسے انڈیا کا پکا سوبر اڈیا گیا۔

ابتداء میں روایتی انداز میں پینٹ کرنے والے حسین نے بعد میں کئی تجربات کیے۔ اس نے دھات کے کیٹوئس پر پینٹ کیا۔ دیواروں پر میوئل بنائے اور شیشے پر اپنی مصوری کے جوہر دکھائے۔ مغرب کے سفر کے دوران ایم ایف حسین نے وہاں کیٹوئس دیکھے تھے۔ یہ پتھر کے چھوٹے سنگتراشی کے نمونے تھے جن پر رنگوں کی مدد سے نقوش اُبھارے گئے تھے۔ انڈیا میں اجمتے کے غاروں میں دیواروں پر بنائے گئے مصوری کے نمونے ساری دنیا میں شہرت رکھتے تھے۔ انہیں

دیکھ کر اسے نیا خیال آیا اور اس نے واپسی پر پتھر کی قد آدم بیلوں پر مصوری کا تجربہ کیا۔ مگر اس کی توقع کے خلاف ایک تو یہ کام بہت مشکل ثابت ہوا۔ قد آدم اور کئی فٹ لمبے پتھر کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ اسے اپنی جگہ سے ہلانا بھی دشوار تھا پھر پتھر پر رنگ بھی ایسے طریقے سے نہیں جستے تھے اور کچھ عرصے بعد یہ کھڑنے لگتے۔ بعد میں اس نے ہموار پالش کیے ہوئے پتھر پر مصوری کے تجربات کیے یہ نسبتاً زیادہ کامیاب رہے لیکن یہ صرف آرٹ کا تجربہ تھے ان سے کوئی مالی منفعت حاصل نہیں کی جاسکتی تھی جبکہ لاگت بھی بہت زیادہ آ رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر پتھر پر بنائی گئی تصویر پائیدار نہیں تھی۔ ماربل اور بسالت پر کیے گئے تجربات کو زیادہ پڑائی نہیں ملی تھی۔

عجب بات ہے کہ کاغذ سب سے کمزور چیز ہے اور یہ ساخت کے لحاظ سے باپو لو جیکل ہے یعنی زندہ مادے سے بننا ہے اس لیے بہت تیزی سے فنا پذیر ہے مگر مصوری کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ یہی استعمال ہوتا ہے اور یہ بہت پائیدار بھی ثابت ہوتا ہے۔ دیواروں پر بنائے گئے میوئل پانچ صدی سے زیادہ وقت نہیں گزرا سکتے ہیں لیکن کاغذ پر بنائے گئے مصوری کے نمونے ہزار سال گزرنے کے بعد بھی صحیح سلامت ہیں اور ان کے رنگوں کی آب و تاب برقرار ہے۔ تقریباً یہی معاملہ کپڑے کے ساتھ ہے۔ پرانے زمانے میں تقریباً تمام ہی اقسام کے کپڑے حیاتیاتی مادوں سے بنائے جاتے تھے جیسے کپاس، اون، ریشم اور لینن وغیرہ۔ اس میں ریشم مصوری کے لیے نہایت موزوں تھا اس پر رنگ بہت آسانی سے آجاتا ہے اور بہت پائیدار ثابت ہوتا ہے۔ چین میں ریشم کے کیٹوئس مصوری کے نمونے دو ہزار سال سے زیادہ پرانے ہیں اور ان کے رنگوں کی تانیا کی آج بھی برقرار ہے۔ حسین نے کپڑے پر بھی رنگ بکھیرے۔ اس کے بنائے اس طرح کی کئی سوچیں گنگر خامے مہکتے داموں شائقین نے خریدی ہیں۔

☆☆☆ عام مصوروں کے برعکس حسین نے فن کے کئی شعبوں میں طبع آزمائی کی جیسے رقص اور مجسمہ سازی۔ پھر اس نے ان آرٹ کا مجموعہ یعنی فلم کی طرف بھی توجہ دی۔ انڈیا میں فلم ایک گریز ہے اور کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والی مشہور شخصیت کا کسی نہ کسی طور فلم سے تعلق بن ہی جاتا ہے چاہے اسپورٹس سے ہو یا سیاست سے۔ حسین نے تو کیریئر ہی فلم



سے شروع کیا تھا جب اس نے سنیما ہورڈنگز بنانا شروع کیے۔ بعد میں وہ دوسری طرف نکل گیا تاہم فلم سے اس کی توجہ ہٹ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے باقاعدہ فلم سازی کی تکنیک سیکھی۔ فلم اسٹوڈیوز میں اس کا آنا جانا تھا۔ پروڈیوسرز اور فلمی ہدایت کاروں سے اس کے تعلقات تھے۔ اس نے ان سے فلم سازی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔

1967ء میں اس نے اپنی پہلی فلم بنائی جس کا نام تھا۔ ”تھرو دی آئز آف اے پیٹرن“ اس فلم نے برلن میں ہونے والے فلم فیسٹول میں گولڈن بیئر ایوارڈ حاصل کیا۔ اسے میلے کی بہترین مختصر فلم قرار دیا گیا تھا۔ اس کا میاں کی بعد ایم ایف حسین کی صلاحیتوں کا ایک نیا پہلو سامنے آیا۔ اس کے بعد اس نے متعدد مختصر فلمیں بنائیں۔ 2000ء میں حسین نے پہلی مکمل فلم بنائی۔ گھاگمٹی نام کی اس فلم کا مرکزی موضوع عورت تھی اور اس کا مرکزی کردار مادھوری نے ادا کیا۔ مادھوری حسین کی فیورٹ عورت تھی۔ وہ اس پر تصویروں کی ایک پوری سیریز بنانا چاہتا تھا۔ مزے کی بات ہے کہ وہ اپنی دوسری تصویروں پر ایم ایف حسین کے سائن کرتا تھا لیکن مادھوری کی سیریز پر اس نے صرف فدا لکھا ہے۔ شاید وہ بتانا چاہتا ہو کہ میں اس پر فدا ہو چکا ہوں۔

گھاگمٹی میں حسین نے مادھوری کو عورتوں کے مختلف سمبل بنا کر پیش کیا، جیسے کالی داس کی شکلتا، مونالیزا، ایک دہقانی عورت اور قاصد کے کرداروں میں پیش کیا۔ یہ فلم اصل میں مادھوری کی فکٹ کے فن اور حسن کو خارج حسین تھی۔ مادھوری کی ایک فلم ”محبت“ میں ایم ایف حسین ایک سین میں آیا جب وہ مادھوری کی تصویر بنا رہا تھا اور یہ منظر حقیقی تھا جب وہ مادھوری کی تصویروں کی سیریز بنا رہا تھا۔ کئی سال بعد اس نے ایک اور فلم ”اے ٹیوٹل فہری شیئر“ بنائی اس میں تو نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ ان فلموں کو تاقین نے بہت سراہا اور کئی فلمی میلوں میں اس کی بنائی ہوئی فلموں نے ایوارڈ بھی حاصل کیے۔

ایم ایف حسین فلمیں اپنے شوق کی خاطر بناتا تھا اس نے ان سے بھی مالی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ تمام ہی فلموں پر اس نے سو فیصد سرمایہ خود لگایا اور اسے بھی اس کا نفع حاصل نہ ہوا کہ آرٹ فلموں سے ویسے بھی کسی فلم ساز نے نفع نہیں کمایا، یہ سراسر نقصان کا سودا ہوتا ہے۔ اسے نفع کی پروا بھی نہیں تھی۔ فلم بنانا اس کے نزدیک ایک بار نہیں بلکہ شوق تھا۔

آخر تک اس کا یہ شوق برقرار رہا۔ فلموں کے علاوہ اس نے ایچ کے ڈریلے اپنے اندر کے فنکار کو پیش کیا۔ ان ڈراموں کا موضوع بھی مصوری رہی تھی۔ مصوری ایم ایف حسین کی اصل تھی اور اس کے علاوہ وہ فنون کے جن شعبوں میں طبع آزمائی کرتا تھا وہاں بھی اس کا مقصد اپنے فن کو اجاگر کرنا ہوتا تھا۔ فلم ہو یا ایچ مرکزی موضوع ہمیشہ مصوری ہی رہی۔

آزادی تک حسین ملک کی سطح پر جانا پہنچانا نام بن گیا تھا۔ آغاز میں وہ فرانس ٹیوٹن سوزا کے پروڈیوسر آرٹسٹ گروپ کے ساتھ رہا بعد میں اس گروپ نے بنگال اسکول آف آرٹ قائم کیا اور مقامی فنون کو بین الاقوامی فنون کے تابع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں سے حسین اور گروپ میں اختلاف ہوا۔ اس کے خیال میں مقامی فن مصوری اور دوسرے فنون کی طرح بین الاقوامی معیار سے کم نہیں ہیں اس لیے انہیں کسی کے تابع نہیں ہونا چاہیے بلکہ دوسروں کے ساتھ اشتراک کرتے ہوئے اپنی راہ خود الگ بنانی چاہیے۔ جیسا کہ خود حسین نے کیا۔ اس اختلاف کے بعد ان کی راہیں جدا ہو گئیں۔ دوسرے پروڈیوسر گروپ مقامی روایات اور معاشرے کو نظر انداز کرتے ہوئے آرٹ کو ایک مخصوص نقطہ نظر سے پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ آرٹ کو محدود کرنے کا مخالف تھا۔ حسین اس بات کا مخالف تھا کہ آرٹ کو ایک مخصوص نقطہ نظر سے تخلیق کیا جائے لیکن اسے فروخت اور نمائش کے لیے مخالف کب میں پیش کیا جائے۔ یہ تو خود اپنے نظریے کی نفی کرنے والی بات تھی۔

اپنی راہ الگ کرنے سے یہ ہوا کہ ایم ایف حسین خود ایک اسکول آف آرٹ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ نوجوان فنکار جو خود پر مخصوص چھاپ نہیں لگوانا چاہتے تھے اس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس نے انڈیا میں آرٹسٹوں کی ایک پوری کمیونٹی کو سٹار کیا ساتھ ہی اس نے بین الاقوامی سطح پر بھی خود کو منوالیا۔ اس نے جدید بین الاقوامی آرٹ کے اثرات قبول کیے مگر انہیں مقامی آرٹ پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اس نے اپنی مصوری میں مقامی چھاپ کو برقرار رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تمام دوسرے انڈین مصوروں سے الگ حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اس نے اپنی راہ بنائی اور ساری دنیا اس کے پیچھے چل پڑی۔

ساتھ کی دہائی تک ایم ایف حسین مغرب میں ایک جانا پہنچانا نام بن گیا تھا۔ نقاد اس کے فن کو سراہا رہے تھے اور

آرٹ میکر یا اس کے فن پاروں کو منہ مانگی قیمت پر لینے کا تیار رہتے تھے۔ اس پر اعزازات کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ 1955ء میں اسے بھارتی حکومت کی جانب سے پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس وقت تک اسے آرٹ سے تعلق رکھنے والے ایک درجن قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ مل چکے تھے۔ 1971ء میں اسے چیلو پاسکوکے ساتھ ساڈاپولو میں مشترکہ طور پر مدعو کیا گیا اور ساڈاپولو پیٹل سے نوازا گیا۔ 1973ء میں اسے پدم بھوشن اور 1991ء میں پدم ماوی بھوشن کے سرکاری اعزاز سے نوازا گیا۔ وہ واحد فنکار ہے جسے بھارتی حکومت نے اپنے تینوں اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا۔

پچھتر برس کی عمر میں عام طور سے لوگ رٹائر ہونے اور اپنی کمائی دولت سے لطف اندوز ہونے کا سوچتے ہیں۔ گزشتہ پچھتر برس میں حسین بے شمار کام کر چکا تھا اور اب وہ کچھ نہ کرتا تب بھی اس کا نام ہمیشہ کے لیے فن کی دنیا میں کندہ ہو چکا تھا۔ لیکن بے شمار اعزازات پانے والے اور بے شمار دولت کمانے والے اس فنکار میں انجمنی فن کی جھوک ختم نہیں ہوئی تھی۔ دولت اور شہرت اس کے لیے جلاوی چیز بن گئی تھی۔ اصل اہمیت کام کی تھی۔ کام اور مزید کام کے آئیڈیاز کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے بچے بڑے ہو گئے تھے اور خود بچوں والے بن چکے تھے۔ ان کے اپنے خاندان تھے۔ بیوی دنیا سے گزر گئی تھی اور ایم ایف حسین اب اکیلا تھا۔ اکیلے آدمی کے پاس کرنے کے لیے سوائے اپنے کام کے اور کچھ نہیں ہوتا ہے اس لیے حسین کام میں لگ گیا تھا۔

مصوری کی حیثیت سے اس کا حسین خواتین اور شو بزنس سے تعلق رکھنے والی عورتوں سے تعلق رہا تاہم لیکن یہ تعلق صرف اپنے کام کی حد تک تھا۔ اپنے طویل کیریئر میں بھی اس کا کوئی اسکیٹل سائے نہیں آیا تھا مگر جب اس نے مادھوری کو دیکھا تو بس دیکھتا رہ گیا۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھا جب مصنف مخالف کی کشش دم توڑ دیتی ہے مگر اس وقت مادھوری اسے اپنا الگ رہی تھی۔ وہ اس کے خدو خال، نشیب و فراز کی تعریف میں رطب اللسان نظر آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اور مادھوری کے بارے میں اخبارات خبریں دینے لگے۔ بعض عزم راز سمجھے جانے والے صحافیوں نے تو یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ مغربیابی ووڈ کی جان مادھوری ڈکھت اور ایم ایف حسین ایک ہو جائیں گے۔ حالانکہ

دونوں میں ظاہری فرق زمین آسمان کا تھا۔ صرف عمر کا فرق ہی نصف صدی کے برابر تھا۔ جب ان افواہوں کے بارے میں حسین سے پوچھا گیا تو اس کا جواب یہ تھا۔ ”مادھوری میرے نزدیک ایک مکمل عورت ہے اور میں اسی حیثیت سے اسے پسند کرتا ہوں۔“ ایک صحافی نے پوچھا۔ ”اگر وہ آپ سے شادی کرنا چاہے تو...؟“

اس سوال کا جواب حسین نے ایک زوردار تھپتھپ کی صورت میں دیا تھا۔ البتہ مادھوری کے بارے میں وہ اپنے بیان پر قائم رہا تھا۔ دوسری طرف مادھوری اس قسم کے کسی تعلق کی تردید کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ایم ایف حسین کے فن کی پرستار ہے اور بس۔ مگر حسین کی طرف سے بس نہیں ہوا تھا۔ مادھوری کے لیے اس کا والہانہ پن بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کی سنگل کینوس تصویر دو ملین ڈالرز میں بک رہی تھی۔ مگر اس نے کہا کہ اگر مادھوری چاہے تو وہ اسے معاوضہ ادا کرنے کو بھی تیار ہے۔ حسین کی اس پیش کش کے بعد مادھوری اس کی پیشکش کے لیے ماڈل بننے پر تیار ہو گئی۔ حالانکہ اس وقت وہ ٹاپ کلاس بہرؤں تھی اور فلم انڈسٹری پر راج کر رہی تھی۔ کیا مادھوری نے منہ مانگی رقم کے عوض حسین کے لیے ماڈل بننا قبول کر لیا تھا؟

ماڈل بننا آسان کام نہیں ہوتا ہے، ماڈل کو روزانہ گھنٹوں اور پھر ہفتوں یا مہینوں کے حساب سے مصور کے سامنے ایک ہی پوز میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ مادھوری اس وقت سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ بن چکی تھی اور اس کا ایک ایک گھنٹا لاکھوں کی مالیت رکھتا تھا۔ اگر معاوضے والے بات درست ہے تو حسین نے اسے یقیناً بہت بڑی رقم ادا کی ہوگی لیکن دونوں کی جانب سے کسی معاوضے کی تردید کی گئی۔ مادھوری کا بیان ہے اس نے تصویروں کے بدلے ایک روپیہ معاوضہ نہیں لیا اور حسین کا کہنا تھا کہ یہ تصاویر اس نے صرف اپنے لیے بنائی ہیں اور یہ بھی برائے فروخت نہیں ہوں گی۔ بعد میں اس نے مادھوری کے پرستاروں کو منہ مانگی قیمت کے عوض بھی یہ تصاویر فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ جہاں تک حسین کا معاملہ ہے۔ یہ بات کچھ میں آتی ہے کہ وہ مادھوری کو پسند کرنے لگا تھا۔ اپنے عروج کے دنوں میں وہ مہر انگریز حسن کی مالک تھی اور کسی کو بھی انا دیا نہ بنانے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔ چہرے کے دلکش ترین نقوش اور تراشے ہوئے جسم کی مالک مادھوری ناز و ادا میں بھی کم

بھارتی میگزین "چھار ماہانہ" نے اپنی 1996ء کی ایک اشاعت میں ان تصویروں کو ایک مضمون میں اس عنوان سے شائع کیا۔ "ایم ایف حسین اے پیٹرن اور اسے بوڑھے" تو بھارت میں شور مچا گیا اور ایم ایف حسین کو دیوی دیوتاؤں کی بے حرمتی کا مرتکب قرار دے دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد اس پر آٹھ مختلف الزامات کے تحت کیس کر دیے گئے اور اس بوڑھے فنکار کو عدالتوں میں کھینچا جاتا رہا۔ آٹھ سال بعد دہلی ہائی کورٹ نے ان کیسز کو خارج کر دیا۔ ہائی کورٹ نے اپنے فیصلے میں لکھا۔ "گروپوں کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے۔ جہاں تک درگا اور سوسنی کو اس طرح پیش کرنے کا تعلق ہے تو ہندو پہلے ہی اسے قبول کر چکے ہیں۔"

بجربگ دل کے کارکنوں کے حملے میں ایم ایف حسین کا گھر ہی تباہ نہیں ہوا بلکہ اس کی کئی پیٹنٹنگ اور آرٹ کی چیزیں کو نقصان ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا بلکہ لندن میں ہونے والی ایک انگریزی ٹیوشن میں گیا ہوا تھا۔ اس لیے وہ بچ گیا ورنہ نہ ممکن ہے اسے جسمانی نقصان ہوتا یا یہ انتہا پسند اسے قتل کر دیتے۔ شیو سینا کی قیادت نے اس حملے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن پولیس نے بجربگ دل کے چھپیس کارکنوں کو گرفتار کر کے ان کے خلاف حملے کا کیس بنا دیا۔ اس کے بعد یہ معاملہ دب گیا اور ایم ایف حسین نے مہا بھارت پر اپنا کام جاری رکھا لیکن احتیاطاً اس نے یہ سارا کام انڈیا سے باہر منتقل کر دیا۔ جہاں اسے یہ خطرہ نہیں تھا کہ کوئی حملہ کرے اس کا کام تباہ کر دے گا۔

آنے والے آٹھ سال معاملہ دبا ہی رہا لیکن 2006ء میں ویلکی انڈیا ٹوڈے کی ایک اشاعت میں فلم مشن کشمیر کے لیے ایک اشتہار دیا گیا اور اس میں ایم ایف حسین کی ایک تصویر بڑا انڈیا کو استعمال کیا گیا۔ یہ ایک عورت کی عریاں تصویر تھی جس کے جسم کے مختلف حصوں کو انڈیا کی ریاستوں کے نام دیے گئے تھے۔ ظاہر ہے اصل تصویر میں ایسا نہیں تھا یہ صرف اشتہاری حربہ تھا۔ اس اشتہار بازی کا انتظام ایک این جی او ایکشن انڈیا اور پارا آڈٹ گیلری نے مل کر کیا تھا۔ فوراً ہی ہندو تنظیمیں جیسے جاگرتی سمیتی اور دھوا ہندو پریشد میدان میں آگئیں اور انہوں نے ایم ایف حسین کی ویب سائٹ اور شاہی یورپ میں اس تصویر کی نمائش کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ اس پر ایم ایف حسین نے عوام سے معذرت کی اور اس تصویر کو واپس لے لیا۔

دے دیا جہاں بعد میں یہ اتنی لاکھ بھارتی روپے میں فروخت ہوئی تھی۔ البتہ ویب سائٹ پر یہ تصویر آویزاں رہی تھی۔ اس کے بعد ایم ایف حسین کے خلاف عدالتوں میں کیسز کی بھرمار ہو گئی تھی جن میں اس کے خلاف ہندو دیوی دیوتاؤں کی توہین کا الزام لگایا گیا تھا۔ وہ ملک سے باہر تھا اور جب اس نے کسی سکن کی ٹیبل نہیں کی تو اس کے ناقابل ضمانت وارنٹ گرفتاری نکل آئے تھے۔ ساتھ ہی اسے وطن واپسی پر قتل کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ 2006ء کے آخر میں اس وقت ایم ایف حسین نے جلا وطنی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جب اس نے دیکھا کہ اس کے خلاف کیس چھپدی اختیار کرتے جا رہے تھے اور اس کے وکلائے اسے وطن واپس نہ آنے کا مشورہ دیا۔ مگر ساتھ ہی اس نے واپس آنے کی شدید خواہش کا اظہار کیا تھا چاہے اس کے لیے اسے گرفتاری کا خطرہ کیوں نہ مول لینا پڑے۔ کچھ عرصے بعد سپریم کورٹ نے اس کے وارنٹ گرفتاری منسوخ کر دیے کیونکہ ایم ایف حسین کے پاس کسی اور ملک کی شہریت نہیں تھی اور اسے وطن واپسی کا حق تھا۔ اس وقت کے سرکاری داخلہ جی کے ملائی نے بیان دیا کہ ایم ایف حسین وطن واپس آنے یا دنیا میں کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہیں اور انہیں تحفظ بھی فراہم کیا جاسکتا ہے۔

یہ خوش آئند بات تھی لیکن ایم ایف حسین ان طاقتور ہندو تنظیموں کو فراموش نہیں کر سکتا تھا جو اس کی جان کی دشمن بن گئی تھیں اور کسی قیمت پر اسے وطن واپسی کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ان کی طاقت کے سامنے حکومت بھی بے بس تھی اور اگر وہ ایم ایف حسین کے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ کر لیتیں تو اس کے لیے جان بچانا مشکل ہو جاتا اس لیے اس نے ملک سے باہر ہی رہنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ ملک سے باہر اس کا زیادہ وقت یورپ میں گزرتا تھا۔ ان ہی دنوں اس کے سامنے ایک نئی پیشکش آئی۔ ایم ایف حسین کی تصاویر کی نمائش قطر میں بھی ہوئی تھی جہاں شاہی خاندان آرٹ کا بہت بڑا قدر دان اور ایم ایف حسین کا پرستار تھا۔ قطر نے اسے اپنے ملک کی شہریت دینے کی پیشکش کی۔ حالانکہ قطر سمیت مڈل ایسٹ کا کوئی عرب ملک کسی غیر ملکی کو شہریت دینے کے معاملے میں نہایت سخت ہے حد یہ کہ یہاں پیدا ہونے والا غیر ملکیوں کا بچہ بھی شہریت کا حق دار نہیں ہوتا ہے اور اسی طرح شادی کے ذریعے بھی شہریت حاصل نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس لیے قطر کی یہ پیشکش حیران کن تھی۔

ایم ایف حسین نے یہ پیشکش قبول کر لی اور قطر کا شہری بن گیا لیکن اس کی انڈین شہریت بھی برقرار رہی تھی۔ یہ پیشکش قبول کرنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو قطر کا شاہی خاندان اور خاص طور خاتون اول شیخا موزاہ بنت ناصر المسند جو قطر کے حکمران شیخ حمد بن الخلیفہ بن ثانی کی بیگم ہیں۔ وہ ایم ایف حسین کی پرستار ہیں اور ان کی ذاتی کلبی میں اس کی سو سے زائد تصاویر موجود ہیں جو خاتون اول نے بھارتی معاوضے کے عوض حاصل کی ہیں۔ دوسری وجہ وہاں اسے کام کرنے کی سہولت تھی۔ انڈین شہری ہونے کے ناطے اسے انڈیا کی تاریخ کو کیسوں پر لانے میں دھچکی تھی۔ تو دوسری طرف ایک مسلمان ہونے کے ناطے اسے عرب تاریخ کو بھی کیسوں پر منتقل کرنے میں دھچکی تھی۔ قطر میں رہائش رکھتے ہوئے وہ دونوں کام کر سکتا تھا۔

قطر کی شہریت اختیار کرنے کے بعد اس کا زیادہ وقت وہاں میں گزرنے لگا جہاں وہ فیصل میوزیم کے ایک حصے میں اپنے کام میں مگن رہتا تھا اور اس کی گرمیاں لندن میں گزرتی تھیں جو دنیا میں اس کا پسندیدہ ترین شہر تھا۔ مگر یہ پھٹیاں بھی نمائشوں اور سیٹائز میں گزر جاتی تھیں اور اسے اپنے لیے وقت ملتا تھا۔ چار میونسپل لندن میں گزار کر وہ واپس دوبارہ قطر کرکام میں لگ جاتا تھا۔ اس نے باؤے برس کی عمر میں یہ کام شروع کیا تھا۔ جو بچے خود حیرت انگیز امر ہے۔ پینٹ کرنا آسان کام نہیں ہے کھٹوں کیسوں پر بچے رہتا اور ہاتھ کو اتنا معمولی سا حرکت دینا کہ فرش کی میٹر سے زیادہ نہ بچے یقیناً بہت مشکل کام ہے۔ اس میں جسم کے پٹھے اکڑ جاتے ہیں اور اکثر مصور عمر کے آخری حصے میں کرا اور جوڑوں کے درد کا شکار ہو جاتے ہیں پھر وہ جس عمر میں تھا اس عمر میں اتنا بڑا کام زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

مگر ایم ایف حسین نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ شاید اس کی چھٹی جس نے بتا دیا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور جلد وہ دنیا کے تمام جمیلیوں اور مجذوبوں سے آزاد ہو جائے گا اس لیے وہ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی اپنے یہ دونوں پروجیکٹ مکمل کرنا چاہتا تھا۔ سن تین تک آٹھ مہینے دن رات کی محنت کے بعد اس نے بالآخر اپنے یہ دونوں پروجیکٹ مکمل کر لیے۔ جو آج دوہا کے اس میوزیم میں شاہین فن کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ فن کے ایک فرانسیسی نقاد کے جے سیلنگ کا کہنا ہے۔ "مصور کی بہت مشکل کام ہے اور بہت بڑے اور اچھے

مصور بھی اپنی ساری زندگی میں ایک دو ہی بڑے کام کر کے گئے ہیں لیکن جب ہم ایم ایف حسین کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس کے ناتواں جسم میں ناتوانی کا تجربہ کران نظر آتا ہے جو اس عمر میں بھی اسے تھکنے نہیں دیتا۔ اس نے ایک دو تیس کم سے کم نصف درجن بڑے کام کیے ہیں جن میں سے کوئی ایک ہی اس کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔"

یہی ایم ایف حسین جسے انڈیا کا فخر کہا جاتا تھا۔ اچانک ہی متوہن ٹھہرایا گیا۔ عوام، لیڈر اور فن کار تک اس کے خلاف ہو گئے۔ اس کی حمایت میں بولنے والے بہت کم تھے اور اس کے ساتھ تو کوئی کھڑا نہیں ہوا تھا۔ اسے بے درپے مقدمات میں لکھایا گیا جن میں پہلے ہی کوئی جان نہیں تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ ان مقدمات کو بالآخر خارج کر دیا جائے گا۔ ایسا ہی ہوا لیکن آٹھ سال اس بوڑھے مصور کو عدالتوں میں دھکے کھلوانے کے بعد مقدمات ختم ہوئے تھے۔ 2006ء میں جب دوسری بار اسے انہی الزامات کے ساتھ عدالتوں میں کھینچا گیا تو وہ ملک سے باہر چلا گیا اور بالآخر جلا وطنی اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔

جس وقت وہ جلا وطنی اختیار کرنے پر مجبور ہوا اور عدالتوں میں اس کے خلاف کیس چل رہے تھے اس وقت بھارت میں اسے مختلف اعزازات سے نوازنے کا سلسلہ جاری تھا۔ کیرالہ کی حکومت نے اسے راج روی و ماہیوارڈ دینے کا فیصلہ کیا لیکن عدالت کا فیصلہ آنے تک اسے ملتی کر دیا۔ بعد میں ایم ایف حسین نے خود اس ایوارڈ کو لینے سے انکار کر دیا۔ ایک طرف ملک میں اس کے پٹے چلائے جا رہے تھے اور انتہا پسند ہندو رہنما اس کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ عوام اسے گالیاں دے رہی تھی۔ بلکہ فن کی دنیا سے تعلق رکھنے والے فن کاروں کا رویہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

جب ایم ایف حسین نے ہندو ماتھے کو کیسوں کے پردے پر منتقل کرنے کا سوچا تو یہ کام اس نے قوی فریضہ سمجھ کر انجام دیا اور اس نے انہیں اسی طرح کیسوں پر پیش کر دیا جس طرح تاریخ انہیں بیان کرتی تھی اور خود ہندو اپنے مندروں میں انہیں پیش کرتے آئے تھے۔ جب اس کا شدید رد عمل آیا تو وہ حیران ہوا تھا۔ یہ تصویریں اس کا خیال نہیں تھیں بلکہ ان کی اصل پہلے سے موجود تھیں۔ خود ہندو مصوروں نے اس سے پہلے بارہا اسی طرح کی تصاویر بنائی

تھیں۔ پھر صرف اسے کیوں مورد الزام ٹھہرایا جا رہا تھا؟ مگر اس کی نیت اور اس کے کام کو فراموش کر کے ہندو لیڈر اور ہندو میڈیا اس کے پیچھے پڑ گیا۔ انہوں نے ایم ایف حسین کو ہندو دیوی دیوتاؤں کی تذلیل کا مرتکب قرار دیا۔ حد یہ کہ اس کے قریبی دوست اور واقف کار مصوروں کا رد عمل بھی حیران کن تھا۔ ایک سینئر ہندو مصور اور بمبئی آرٹ سوسائٹی کے سابق صدر گوپال اڈیویر نے اس بارے میں کہا۔

”اس سے زیادہ برا آرٹ آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ انسانی جذبات کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔“

آرٹ کے ایک نقاد چندن مڑا نے لکھا۔ ”حسین نے جو کیا اس کے بعد لوگوں کا اس کے خلاف کورٹ جانا درست تھا۔ اگرچہ سب کو معلوم تھا کہ کورٹ اس کے خلاف کیمر کو خارج کر دے گا مگر اس سے یہ تو واضح ہو گیا کہ حسین کا کام ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہے۔“

مزے کی بات ہے پورے بھارت میں انتہا پسند ہندوؤں نے ایم ایف حسین کے خلاف احتجاج کیا لیکن کسی ایک انتہا پسند ہندو لیڈر نے اس کے بارے میں ایک لفظ مذمت کا نہیں کہا۔ شیو سینا کے لیڈر بال ٹھاکرے نے ایم ایف حسین کی وفات پر اپنے بیان میں کہا۔ ”اس سے واحد غلطی ہندو دیوی دیوتاؤں کے بارے میں ہوئی اس نے انہیں غلط اعزاز میں پیش کیا۔ لیکن اس سے ہٹ کر وہ اپنے میدان کا ایک کامیاب اور خوش نصیب شخص تھا۔ اس کی موت جدید آرٹ کے لیے ایک بڑا نقصان ہے۔ ممکن ہے اس کا اللہ اسے سکون دے۔“

ہندو انتہا پسند لیڈروں کے مقابلے میں حسین کے ساتھی مصوروں کا انداز کہیں زیادہ متح تھا۔ معروف ہندو مصور آر کے شرما نے بہت سخت الفاظ استعمال کیے اور کہا۔ ”حسین نے جو کیا وہ کسی صورت قابل قبول نہیں ہے۔ اس نے ہندوؤں کے جذبات کی توہین کی ہے اور ان کے احساسات کو ناقابل تلافی صدمہ پہنچایا ہے۔ اسے کسی صورت آرٹ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر یہ آرٹ ہے تو کیا وہ مسلمانوں کی مقدس شخصیات کو تصویروں میں اس طرح پیش کر سکتا ہے۔“

آر کے شرما یہ کہتے ہوئے کفر مہاسائی دکھا دیا اور اس نے یہ بات بالکل فراموش کر دی کہ ہندومت اور اسلام میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہندومت میں تصاویر بنانا اور عریاں تصاویر بنونوع نہیں ہے بلکہ یہ ان کے مذہب کا حصہ

ہے اور کوئی دشمنی چھپی بات نہیں ہے۔ اس لیے اگر ایم ایف حسین نے دیوی دیوتاؤں کی ایسی تصاویر بنائیں تو اس نے کوئی نیا کام نہیں کیا تھا جس کی مذمت کی جانی اس کے برعکس اسلام میں سرے سے تصویر بنانا ہی ممنوع ہے۔ افسوسناک... بات یہ ہے کہ ایم ایف حسین کو صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ سب سننا اور برداشت کرنا پڑا۔

جہاں سب ایم ایف حسین کی مخالفت کر رہے تھے وہیں کچھ آوازیں اس کی حمایت میں بھی اٹھی تھیں۔ ہندو مصور تری باجھی کہتا ہے۔ ”یہ بہت ہی افسوسناک ہے کہ ہم حسین کی فنکارانہ آزادی سلب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے یہ حقیقت شرمناک ہے کہ ہم سیکولرزم کا دعویٰ کرتے ہیں اور ہندو نیشنلسٹ حسین کو سزا دلوانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ انڈیا کے فخر کی نہیں شرم کی بات ہے۔“

بے پناہ کام کے باوجود ایم ایف حسین ابھی تک نہیں تھا۔ اس کا برٹش بدستور رنگوں سے کھیل رہا تھا لیکن قدرت کی طرف سے وہ مہلت ختم ہو گئی جو ہر شخص کو عطا کی جاتی ہے اور اس کے بعد اس شخص کو اپنے اعمال کے ساتھ اپنے خدا کے حضور پیش ہونا پڑتا ہے۔ گزشتہ سال مارچ کے آغاز میں اس کی طبیعت گری گری رہنے لگی تھی مگر اس نے کام ترک نہیں کیا۔ ڈاکٹروں نے دل کی بیماری تشخیص کی تھی اور اسے کام ترک کرنے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے لیے کام زندگی سے زیادہ اہم تھا اس لیے اس نے ڈاکٹروں کا مشورہ ایک کان سے کن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔ 6 جون 2011ء کے روشن دن لندن رائل برڈین ہسپتال میں اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ تقریباً چھانوے برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا اور اسے چار دن بعد بروک ووڈ کے قبرستان میں دفن دیا گیا۔ اس کے ساتھ ایک ناکام عشق کی داستان بھی دفن ہو گئی۔

بھارتی وزیر اعظم من موہن سنگھ نے اپنے تعزیتی پیغام میں ایم ایف حسین کی موت کو قومی نقصان قرار دیا جبکہ بھارتی صدر پرانیا پٹیل نے اس کی موت کو ”فن کی دنیا میں ہمیشہ رہ جانے والا خلا“ کہا۔ مگر کسی نے اس سلسلے میں معذرت نہیں کی کہ با نوے سال تک انڈیا میں رہنے والے اور ساری دنیا میں اس کا نام روشن کرنے والا شخص دوسرے ملک کا شہری بن کر دنیا سے رخصت ہوا۔

آخری منزل

مختار آزاد

صدیوں پہلے ترکستان سے کالی بھیزوں والے قبیلے کے لوگ غلجہ الدین باہر کے ساتھ ہندوستان آ کر مراد آباد میں قیام پزیر ہوئے تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو کہ انہوں نے ہندوستان میں وہ جنم لے گا جس کے نام کا علم و ادب کی دنیا میں شہرہ ہوگا۔

محمود علی کی آنکھ دلا دلوں میں عید اللہ بیگ جیسے نمبر تھے۔ یکم اکتوبر 1936ء کو مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ عید اللہ بیگ کی زندگی کتاب، فکر اور قلم کے تین خانوں میں ایسی تھی کہ ان سے ملنے کے لیے جسے دروازے سے داخل ہوں، سامنے کتاب آ جاتی تھی۔ خود ان کے بھولے بچپن میں کتاب کو ہاتھوں میں لیا تو اس نے پھر اپنا ہاتھ تھا کہ زندگی کا کوئی بھی حصہ ہو، کوئی بھی مشکل مرحلہ درپیش ہو، سکون کی تلاش ہو یا شہرت کی بات کی جائے، وقتی آسوی کا ذکر ہو یا صحت مند دماغ کے لیے ورزش... زندگی کتاب سے ہی عبارت رہی۔

تین سال پہلے پاکستان ملی ڈن کے گرد بیٹا بنا رکھا تھا۔ اس کے روح رواں عید اللہ انہوں نے کراچی میں صحافت سے عملی سولین خدمات سر انجام دیں۔ ریڈیو پاکستان خبریں بنائیں۔ ایڈیٹر ننگ کی دنیا میں کچھ وقت ایک ذیلی ادارے میں ملازمت کی۔ پی ٹی وی سے



کے دوران میں سواتین سو سے زائد دستاویزی سربراہی کانفرنسیں براہ راست نشریات میں بطور کردہ کی دستاویزی فلموں کو عالمی اعزازات سے انگلستان، امریکا، جرمنی، ترکی اور اپنے کی سیاحت کی۔ ترکستان کے اُس وقت کے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ ”میرے ہم وطن عید اللہ بیگ شہریت کا پر داں قرار دیتے تھے۔ ترکمان ہونے پر فخر کرنے والے بیگ صاحب دل کی گہرائیوں سے صرف پاکستانی تھے۔

پی ٹی وی کی ملازمت کے بعد ماحولیات کے حوالے سے عالمی انجمن آئی یو این سے وابستگی اختیار کی اور ماہی رسالے ”جریدہ“ کا اجرا کیا۔ راقم کو بھی بیگ صاحب کے بعد اس پرچے کی ادارت کا شرف ملا۔ اسی وابستگی کے دوران میں انہوں نے ملک کے ماحولیات کی مسائل کے حوالے سے کی دستاویزی فلمیں تیار کیں۔

”اور انسانی زندہ ہے“ ان کا پہلا اور خیم ناول ہے جو 60ء کی دہائی میں شائع ہوا۔ ایک اور ناول ”راجستھان“ 2010ء میں پیش تک قاطع پیش، اسلام آباد نے شائع کیا۔ تیسرا ناول ”کاؤ“ لکھنے کا ارادہ تھا کہ زندگی نے وفا نہ کی۔ سوئے جوڑو کے پس منظر میں ایک ناول سنا گیا، لکھ رہے تھے کہ وہ ادھورا تھا کہ مسودہ غائب ہو گیا۔ زندگی کے آخری چند منٹوں تک وہ بڑے تانت سے اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ اردو زبان پر قدرت اپنی جگہ فکری، عمرانی اور گہری زبانوں پر بھی مضبوط دھڑکتے تھے۔

2008ء میں حکومت پاکستان نے ٹیلی ڈن کے حوالے سے مگران قدر خدمات سر انجام دینے پر انہیں مخدوم حسن کار کوئی کے اعزاز سے نوازا۔ بیگ صاحب کی زندگی کے کسی بھی پہلو کا جائزہ لیں کتاب ہر جگہ چمکتی ہے۔ کتاب اور عید اللہ بیگ کا تعلق کیا ہے؟ انہوں نے اپنے ہاتھ سے کاغذ پر جواب لکھ کر مجھے دیا تھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ انہوں نے لکھا تھا ”کسٹمیری میری زندگی ہیں۔ میری پوری زندگی کتابوں سے عبارت ہے۔ اگر کتابیں نہ ہوتیں تو آپ مجھ سے واقف نہ ہوتے اور خود میں؟ اپنے آپ سے ناواقف رہتا۔“

زندگی کے آخری ایام میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہہ رہے تھے ”میاں آزاد... بیٹھیں ہو گئے، طبیعت کے باعث نہ کچھ کھانے پڑا، جب بے کلمی ہے۔“ یہ سب کلمی بائیس جان، بن و بزار بارہ کی صبح سورج طلوع ہونے پر ختم ہوئی۔

خانمان والوں اور لڑکھن کے ساتھیوں کا صبیح بے تکلف دوستوں کا صبح OB۔ فکارات کا جہ جوئیر۔ تاریخ اور ماحولیات کا طفل ترکمان... بھائی سلطی کا بادشاہ سلامت۔ تین بیٹیوں کا شفیق باپ، واری دیتوں کا آخری منزل۔ ساتھ کام کرنے والوں کا بیگ صاحب۔ عمر میں چھوٹے دوستوں اور بے شمار ہستاروں کا عید اللہ بیگ۔ اور مجھے اپنا دوست کہنے مجھے والا، دکھ کھانے والا، دکھوں میں ہمت بخشنے والا، خوشی میں خوش ہونے والا، کلامی رازوں کا مہراں۔ گئی تہذیب کا نشان۔ فخر سے خود کو آخری منزل کہتا تھا۔ دوستوں کا آخری منزل تاج دار کراچی کے گدڑی قبرستان کی پہاڑی چوٹی پر سب سے اونچی جگہ پر آرام فرما ہے۔ آخری منزل جو تھا۔ یوں ادب، ثقافت اور شہرت کے آسمان کا ایک اور درخشاں ستارہ ڈوب گیا۔

اس کی آواز میں ایسا سوز تھا، ایسا درد تھا کہ آنکھیں بھر آئیں۔ یہی وجہ تھی کہ اسے ابھرنے کے لیے فلمی پردے، ٹی وی یا ریڈیو کا سہارا لینا نہیں پڑا۔ خود بخود نجی محفلوں کے سہارے اس کی شہرت پھیلتی رہی اور ایک دنیا اس کی آواز کے جادو کی اسیر بن گئی لیکن اب تک کسی نے اس کے دکھی دل میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ یہ درد کس کی محبت کا عطیہ ہے۔

پاکستان کے اس مشہور گلوکار کی روداد زندگی جسے عشق ناکام نے کمال بخشا

عشق ناکام
نمبر

محبت اور نفرت کا وجود انسان کے خمیر سے اُٹتا ہے۔ جب سے یہ دنیا آباد ہوئی اور حضرت انسان نے زمین پر قدم رکھا۔ تب سے ہی یہ دونوں جذبے اس کی ذات سے جڑے نظر آتے ہیں۔ نفرت پر تو اوصاف جیلہ کی مدد سے قابو پایا جاسکتا ہے لیکن محبت کے سرکش اور منہ زور جذبے کو لگام دینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ دنیا کے سبھی مذاہب، اپنے ماننے والوں کو نفرتیں پالنے سے روکتے ہیں لیکن کوئی محبت کرنے سے منع نہیں کرتا۔ محبت کا سودا میں ساجائے تو انسان عقل و خرد سے بے گانہ ہو جاتا ہے پھر لیلیٰ بجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا اور سسی پنوں جیسی داستانیں جنم لیتی ہیں۔ اگر ان خیالی داستانوں پر یقین نہیں تو ماضی میں ہونے والے تاریخی واقعات کو کس طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے جن میں کہیں ایک کبیر، شہزادے سے محبت کرنے کے جرم میں دیوار میں زندہ

چنوا دی جاتی ہے تو کہیں ایک بادشاہ اپنی چیتنی ملکہ کی یاد میں تاج محل جیسی حسین یادگار تعمیر کرواتا ہے۔ کہیں ایڈورڈ ہشتم اپنی محبوبہ کی خاطر تاج برطانیہ کو ٹھوکر مار دیتا ہے تو کہیں شہنشاہ ایران اپنی چیتنی ملکہ ثریا کو جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا، وزیروں اور پارلیمنٹ کے دباؤ میں آکر صرف اس لیے طلاق دینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اسے تخت کا وارث دینے میں ناکام رہی تھی۔

اس کے علاوہ بھی بے شمار ناکام عشق کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند بالخصوص فلمی دنیا میں ایسی کئی کہانیوں نے جنم لیا جن کے کردار اپنی منزل کو نہ پاسکے۔ ان میں سے کچھ کہانیاں امر ہو گئیں اور کچھ کو وقت کی گرد نے ڈھانپ لیا اگر پاک و ہند کی فلم انڈسٹری پر نظر دوڑائیں تو زیادہ تر اداکار اور اداکارائیں بیماری عشق کا مزہ لوٹ چکے ہیں۔ ان میں دلپ کمار، اجیتا بھنجن، راجیش



کھنہ، بدھو بالا، ثریا، مینا شم اور ریکھا وغیرہ شامل ہیں۔ بلیک ہنڈلٹا منگلشکر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ساری عمر دلپ کمار سے خاموش محبت کرتی رہیں اور ٹریجڈی کنگ کی شادی کے موقع پر انہوں نے ٹھیک ٹھاک سوگ بھی منایا تھا۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جسے دبا نامکن نہیں اگر ایسی کوئی کوشش کی جائے تو کسی نہ کسی رنگ میں جذبہ عیاں ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر ناکام عاشق ایک بڑا اور تپتا فنکار ہوتا ہے۔ دل پر چوٹ لگی ہو تو درد کی یہ لہر اس کے ہر فن پارے میں موجیں مارتی نظر آتی ہے اور اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ تپتا عاشق، محبوب سے جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کر پاتا۔ دنیا اس کے لیے بے معنی ہو جاتی ہے اور وہ اپنی ذات کے حصار میں قید ہو کر تنہا دھن سے فن کی آبیاری میں

لگ جاتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی بڑے فنکار شاعر، ادیب، گلوکار، مصور کے شاہکار ملاحظہ فرمائیے تو ان میں درد کا عکس پوری تپائی کے ساتھ جھلکتا نظر آتا ہے اور جب ہم ان نامور فنکاروں یا نامور ادعاشقوں کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں تو کہیں نہ کہیں وہ ہر اہل ہی جاتا ہے جس کے سہارے ہم اس فنکار کی داستان حیات کے ان پوشیدہ گوشوں تک پہنچ جاتے ہیں جس کی آگ میں جل کر وہ خود بھی امر ہوا اور اس لا زوال دکھ نے اس کے فن کو بھی کند بنادیا۔

بھرے گیتوں اور غزلوں کے خالق عطاء اللہ خاں عسلی خیلوی کی شخصیت کی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ گزشتہ چالیس سال سے کیسٹ کے ذریعے کروڑوں شائقین کے دلوں پر راج کر رہے ہیں۔ ان کی آواز میں جو سوز اور درد پنہاں ہے اگر اسے قدرت کا عطیہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا لیکن عشق کی ناکامی نے ان کی آواز کو جلا بخشی اور جب یہ درد بھرے گیت فضا میں گونجے تو سننے والوں نے انہیں اپنے دل کی آواز جانا، ہر صاحب دل نے اس درد کی کک محسوس کی اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے عطاء اللہ عسلی خیلوی ہر خاص و عام کی پسند بننے چلے گئے۔ یہ اعزاز بہت کم گلوکاروں کے حصے میں آیا ہے کہ وہ جو کچھ بھی گائیں، اسے قبولیت عام اور شہرت دوام حاصل ہو جائے اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ گانے اور سننے والا درد کے ایک ایسے رشتے سے منسلک ہو جو انہیں کو آپس میں جوڑے رکھتا ہے۔ درد کے اس رشتے کو احساس، دوستی، محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ عطاء اللہ عسلی خیلوی ایک ایسے فنکار کا نام ہے جس کے دل میں اپنے لوگوں کے لیے پیار، دوستی اور محبت کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے گیتوں میں اس کا اظہار مکمل طور پر نظر آتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ فنکار کی زندگی پبلک پر ابھرتی ہوتی ہے اور اس کی شخصیت کا کوئی پہلو عوام کی نظروں سے ہوجھل نہیں ہوتا لیکن عطاء اللہ عسلی خیلوی کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ وہ کیسٹ کنگ کہلاتے ہیں۔ دنیا بھر میں ان کی آواز کی گونج سنا دی جاتی ہے۔ لوگ ان کی گائیکی پر سر دھنتے اور مغللوں میں انہیں سننے کے لیے جوق در جوق پہنچتے ہیں لیکن کسی کو ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں علم نہیں۔ وہ میڈیا سے دور رہتے ہیں اور ان کی شخصیت پر اسراریت کے پردوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ Low پروفائل میں رہے اور ان کے بہت کم انٹرویوز اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔ شاید یہ وجہ ہے کہ عطاء اللہ عسلی خیلوی کی شخصیت ایک افسانوی کردار کے رنگ میں ڈھل چکی ہے۔ لوگ ان کے فن سے پیار کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس سوز اور درد کے پیچھے عشق میں ناکامی کا دکھ پنہاں ہے لیکن اس سے زیادہ کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ کوئی نہیں جانتا کہ عطاء اللہ عسلی خیلوی کے دل پر پہلی چوٹ کب لگی؟ کب سے وہ عشق میں ناکامی کا دکھ لیے آبلہ پانی کا سفر طے کر رہے ہیں کسی سایہ دار جھاڑ کی تلاش میں بھگ کر رہے ہیں۔ جس طرح صحرائیں بھٹکتے مسافر کو پانی کی تلاش میں ہر بار سراپا کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسی طرح انہوں نے بھی سکون حاصل

کرنے کی خاطر پانچ شاہدادیں کیں لیکن بے سکونی سے نجات حاصل نہ کر سکے۔۔۔۔۔ محبت ان کے دل کا روگ بن گئی ہے۔ اس واردات قلبی کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے عطاء اللہ عسلی خیلوی کے خاندانی پس منظر اور ابتدائی زندگی کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔

عطاء اللہ عسلی خیلوی 19 اگست 1951ء کو میانوالی کے علاقے عسلی خیل میں پیدا ہوئے۔ تین بہن بھائیوں میں ان کا نمبر دوسرا ہے۔ انہیں بچپن سے ہی گانے کا شوق تھا لیکن گھر میں اس پر پابندی تھی۔ ان کا گھر انارکرا قبائلی اور مذہبی رجحانات کا حامل تھا، لہذا وہ گھر میں اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس فن کو اپنانے کے بعد تو وہ گھر اور خاندان دونوں سے ہی فارغ ہو گئے۔ کافی عرصے تک اپنے دوستوں میں گاتے رہے اور وہ سننے رہے لیکن اس پابندی کے باوجود عطاء اللہ کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ چپکے چپکے موسیقی کے بارے میں سیکھتے رہے البتہ ان کے اسکول سمیچر نے بڑی حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے اسے محمد رفیع اور ملکیش کے گانے سننے کے لیے دیے اور تاکید کی کہ وہ بھی کبھی موسیقی سے کنارہ کشی اختیار نہیں کریں گے۔ عطاء اللہ نے اپنے گھر والوں کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی اور چاہا کہ انہیں گانے کی اجازت مل جائے لیکن ناکام رہے۔ مجبور ہو کر انہوں نے گھر چھوڑ دیا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ گھر سے نکلنے کے بعد انہوں نے زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مختلف کام کیے جن میں ٹرک ڈرائیوری سے لے کر ہیرا کیری تک شامل ہے۔

انہوں نے باقاعدہ کسی استاد سے موسیقی کی تربیت حاصل نہیں کی۔ ان کے بقول اساتذہ سے کچھ سیکھنے کے لیے کچھ ہونا ضروری تھا جو بد قسمتی سے ان کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے وہ باقاعدہ موسیقی کی تربیت حاصل نہ کر سکے۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں انہوں نے امتیاز خاں سے کچھ سیکھنے کی کوشش کی لیکن ان کے والد صاحب کو اس کا علم ہو گیا اور انہوں نے امتیاز خاں کو منع کر دیا۔ جس کے بعد امتیاز نے معذرت کر لی۔ جب عطاء اللہ خاں عسلی خیلوی کو کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو انہوں نے اپنے لیے لوک موسیقی کا انتخاب کیا۔ وہ اپنے کام میں انفرادیت چاہتے تھے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسے کلام کا انتخاب کیا جائے جو براہ راست عام آدمی کے دل تک پہنچے۔ چنانچہ اپنے علاقے اور چاروں صوبوں سے علاقائی گیت اکٹھے کرنا شروع کر دیے۔ ان گیتوں میں بول کم ہوتے

ہیں چنانچہ انہوں نے ایسے شعراء سے رابطہ کیا جو اچھے شعر کہنے کے باوجود گمان کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے ان شعراء سے مل کر اپنی ضرورت سے آگاہ کیا یعنی خاکہ دہ دیتے اور شعراء ان کے جذبات کو گیت کے قالب میں ڈھال دیتے پھر انہوں نے اسی کلام کو اپنے انداز میں گایا تو اسے سن کر ساجھن ششدر رہ گئے۔ ان گیتوں کا کچھ نہیں تھا۔ شاعری، نفسی، درد، دل کو چھو لینے والے جذبات اور سب سے بڑھ کر عطاء اللہ عسلی خیلوی کی درد و سوز میں ڈوبی ہوئی آواز، دیکھتے ہی دیکھتے وہ مقبولیت اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔

عطاء اللہ خاں عسلی خیلوی کو شاعری سے گہرا شغف ہے اور وہ گائیکی کے لیے بہت دیکھ بھال کر کلام کا انتخاب کرتے ہیں۔ انہوں نے جن شعراء کا کلام گایا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ کبھی کبھی کوک گانے میں ایک آدھ شعر کا اضافہ کر لیتے ہیں یا کھڑے پسند نہ آئے تو اسے تبدیل کر لیتے ہیں لیکن کبھی باقاعدہ شاعری نہیں کی۔ ان کی شروع سے ہی کوشش رہی ہے کہ کسی صاحب دیوان اور مشہور شاعر کو نہ چھڑا جائے لیکن بعد میں انہوں نے احمد فراز، سائرہ لدھیانوی اور فیض احمد فیض کا کلام بھی گایا البتہ ان کی گائیکی زیادہ دیکھی پس منظر سے

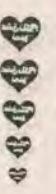
آزادی کے یادگار لمحات سے وابستہ ماہ اگست 2012ء کے شمارے کی پہلے

پانچواں آدمی
طبقاتی اتصال کا ذمہ حساس دلوں کو اس قدر گھاس کر دیتا ہے کہ۔۔۔۔۔ منزل کا حاصل، کار لا حاصل ٹھہرتا ہے۔ **ایہ اقبال** اور آخری صفحات کا خوب صورت سنگم

فیصلے فقیروں کے
ہندوستان کی سرزمین پرویلیوں اور مشائخ کا قتل عام۔۔۔۔۔ ”ہنوز دلی دور است“ ایک ولی کا تاریخی جملہ۔۔۔۔۔ ایک یادگار داستان۔ **ڈاکٹر ساجد امجد کی قریبی**

کشکول
حالات و واقعات کے تنبیہ و فراز۔۔۔۔۔ ایک سنسنی خیز طویل داستان
انوار صدیقی کے قلم کا جادو

مسافر
جذبات کے تلاطم۔۔۔۔۔ حالات کی سازشیں۔۔۔۔۔ اور چاہتوں کی ریشمی ڈوریوں میں گرفتار ایک مسافر کی ہنگامہ خیزیاں۔ **ناصر ملک کا دلکش انداز بیان**
حضرت سلیمانؑ کی درگاہ حیات و ملامت و حیات کا
سکھنا نامہ۔ محفل شعر و سخن اور آپ کی خط



اپنے دوستوں کی محفل میں گارہے تھے۔ وہیں ایک دینی پلیٹ بھی موجود تھا۔ اس نے عطاء اللہ صلی خیلوی کا گانا اپنے ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کر لیا۔ پھر نہ جانے کس طرح یہ کیسٹ فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے رحمت گراموفون ہاؤس کمپنی کے مالک چوہدری رحمت علی تک پہنچی۔ انہوں نے عطاء اللہ صلی خیلوی سے رابطہ کیا اور اس طرح ادھر ادھر بھٹکی آواز و ایک سمت لگی۔

چوہدری صاحب نے اپنی کمپنی سے بیک وقت ان کے چار اہم ریلیز کر ڈالے اور یہ چاروں ہی سال کے سب سے زیادہ فروخت ہونے والے اہم قرار پائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آواز ملک کے کونے کونے میں گونجنے لگی۔ برہلی، مٹلہ، ٹیکسی، ٹرک، رکشا، یہاں تک کہ کراچی کی سڑکوں پر گدھا گاڑی چلانے والے بھی اپنے ساتھ ٹیپ ریکارڈر رکھ کر عطاء اللہ صلی خیلوی کی پرسوز آواز کے سحر میں کھوتے چلے گئے۔ مارکیٹ میں میوزک شاپس، عطاء اللہ صلی خیلوی کی گیسٹوں سے بھری ہوئی تھیں اور وہاں کسی دوسری اہم کے لیے گنجائش موجود نہیں تھی۔ ان کی یہ شہرت و مقبولیت اس لحاظ سے بے مثال تھی کہ اس وقت تک انہیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اپنے فن کے جوہر دکھانے کا زیادہ موقع نہیں مل سکا تھا گوکہ انہوں نے 1972ء میں ریڈیو پاکستان بہاولپور سے گلوکاری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن ان کی آواز بہت زیادہ سامعین تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ویسے بھی ٹیلی ویژن کے آنے کے بعد ریڈیو سنسنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی اور ریڈیو کا دائرہ صرف ان جگہوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا جہاں ٹیلی ویژن کی پہنچ نہیں تھی۔

اسی سال انہوں نے میانوالی کے ایک کنسرٹ میں اپنی گانگی کے جوہر دکھائے۔ یہ ان کی پہلی پبلک پرفارمنس تھی۔ اس وقت تک ان کا کوئی اہم ریلیز نہیں ہوا تھا اور لوگ ان کی غزلیں و گیت کیسٹ پر ریکارڈ کر کے دوستوں کو سنواتے تھے۔ اس کنسرٹ کے بعد عطاء اللہ صلی خیلوی کی شہرت میانوالی کے گھروں اور گلی کوچوں میں پھیل گئی پھر اس کی گونج ان کے اپنے گھر تک کیوں نہ پہنچی؟ جس کا نتیجہ ایک ہنگامے کی صورت میں برپا ہوا۔ ان کے والد نے صاف کہہ دیا کہ عطاء اللہ کو گھر اور موسیقی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ عطاء اللہ گانگی سے رشتہ نہیں توڑ سکتے تھے کیونکہ یہ ان کے درد کے اظہار کا ایک ذریعہ تھا۔ وہ درد جو کسی بے وقا کے طفیل ان کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اس چہرے

کو نہ بھلا سکے جس نے انہیں عشق کی کک اور درد کی لذت سے آشنا کیا تھا۔ اگر وہ گانا چھوڑ دیتے تو ان کی آواز سینے میں گھٹ کر رہ جاتی اور ادھر زندگی کا جنازہ اٹھنے لگتا جیسا کہ آفاق گیت تخلیق نہ ہو پاتا۔ چنانچہ انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور اپنے درد کو سینے میں دبائے اس پر چل دیے جس کی منزل انہیں کوئی علم نہیں تھا۔

1973ء میں وہ پہلی بار چھوٹے پردے پر نمودار ہوئے۔ انہیں طارق عزیز نے اپنے شویام گھر میں مدعو کیا تھا۔ اس طرح پہلی بار بی بی وی کے ناظرین عطاء اللہ صلی خیلوی کے فن اور شخصیت سے روشناس ہوئے۔ اس وقت تک بھی ٹیلی ویژن نشریات کا دائرہ بہت محدود تھا اور سیٹلائٹ نہ ہونے کی وجہ سے یہ چند شہروں میں ہی دیکھی جاسکتی تھی۔

تاہم موسیقی سے شدہ رکھنے والے جان گئے کہ عطاء اللہ خاں کی شکل میں ایک ہونہار گلوکار جنم لے چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ عزم پختہ اور ارادہ نیک ہو تو راستے کی دشواریاں خود بہ خود دور ہو جاتی ہیں۔ عطاء اللہ صلی خیلوی گھر سے تو چلے آئے لیکن ان کے سامنے کوئی واضح منزل نہ تھی۔ ناز فہم میں زندگی گزارنے والا یہ جوان اپنی گزارشات کے لیے چھوٹے چھوٹے کام کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی دوران میں ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ تعلیم کے بغیر زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنا ممکن نہیں چنانچہ انہوں نے پہلے فیصل آباد سے ایف اے اور پھر میانوالی سے بی اے کیا۔ آخر کار ان کی دعائیں اور ان کی جدوجہد رنگ لائی۔ اس وقت تک عطاء اللہ صلی خیلوی کی گلوکاری کیسٹ تک محدود تھی۔ انہوں نے ریڈیو اور بی بی وی کے ذریعے عوام تک اپنا فن پہنچانے کی کوشش کی لیکن انہیں اس کا موقع نہیں ملا۔ اس وقت تک انہیں موسیقی کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ بس گلے میں سوز تھجے وہ اللہ کی نعمت قرار دیتے ہیں۔ ریڈیو اور بی بی وی کی باری تو اس وقت آئی جب عوام نے ٹیلیوٹ کی سند دے دی۔

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ کسی بھی فنکار کو مقبولیت و شہرت حاصل کرنے کے لیے ریڈیو، ٹیلی ویژن یا فلم کا سہارا لینا پڑتا ہے اور اس کے لیے انہیں موسیقاروں، شاعروں اور پروڈیوسروں کی جوتیاں سیدھی کرنا پڑتی ہیں۔ عطاء اللہ صلی خیلوی جیسا خود دار اور غیر متد انسان یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا چنانچہ انہوں نے کیسٹ کے ذریعے لوگوں تک اپنی آواز پہنچائی اور اس میں کامیاب رہے۔ انہوں نے کیسٹ کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آواز

پاکستان اور بیرون ملک میں گونجنے لگی۔ پودیس میں بسنے والے پاکستانیوں کے لیے یہ ایک اونٹنی اور مزدور آواز تھی۔ اس سے پہلے کیسٹ کی دنیا میں کسی گلوکار نے اپنا رنگ نہیں جمایا تھا۔ صرف مہدی حسن، غلام علی اور شوکت علی کی غزلیں اور گیت شوق سے سنے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ گلوکار سلیم جاوید بھی پاپ سنگل کے حوالے سے اپنا نام بنا رہے تھے۔ لیکن عطاء اللہ صلی خیلوی ان سب سے آگے نکل چکے تھے اور صحیح معنوں میں انہوں نے کیسٹ کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا، جس کی نظیر گزشتہ کئی دہائیوں میں نہیں ملتی۔ انہیں ریڈیو، بی بی وی کے کسی پروڈیوسر نے دریافت نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ 80 کی دہائی تک لوگوں کی آنکھ کا تارہ بن چکے تھے۔

رحمت گراموفون ہاؤس کمپنی نے ان کے بیک وقت چار اہم ریلیز کیے تو قسمت کی دیوی ان پر مہربان ہو گئی۔ یہ اہم فروخت کے اعتبار سے اس سال سرفہرست رہے۔ اس کے بعد عطاء اللہ صلی خیلوی نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ شہرت کی دیوی ان پر مہربان ہوئی چلی گئی اور صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ بیرون ملک بھی وہ شوق کے لیے بلائے جانے لگے۔ پڑوسی ملک بھارت میں بھی ان کی شہرت کے ڈنکے بجنے لگے جب ایک بھارتی فلم بے وفائے صوفیوں کو، انور احسا پوڈوال اور ادت نرائن نے ان کے مقبول نغموں کو اپنی آواز میں گایا۔

عطاء اللہ صلی خیلوی نے پاکستانی فلموں میں کام کیا اور گلوکاری بھی کی، انہوں نے آٹھ فلموں کے لیے پس پردہ گلوکاری کی اور تین فلموں دل لگی، زندگی اور سناٹوں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ فلم دل لگی میں انہوں نے سلطان راہی کے چھوٹے بھائی کارول پلے کیا تھا جس میں ان کا مشہور گانا دل لگا دیا تھا دل لگی کے لیے بھی شامل کیا گیا۔ دراصل یہ فلم انہوں نے سلطان راہی مرحوم کے کہنے پر ہی کی تھی۔ اس کے علاوہ فلم عجب بدعا میں ان کا مشہور گانا بیس تیری کاٹی..... بھی انہی پر عکس بند کیا گیا کیونکہ اس زمانے میں زیادہ تر پنجابی فلموں میں سلطان راہی مرکزی کردار ادا کیا کرتے تھے اور ان پر گانا بیکچرا کرتے تھے انہوں نے عطاء اللہ صلی خیلوی کو فلموں میں زیادہ گانے کا موقع نہ مل سکا۔

عطاء اللہ صلی خیلوی کو عوامی یا غریبوں کا گلوکار کہا جاتا ہے اور وہ اسے اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔ انہیں فخر ہے کہ ان کے گانوں نے لوگوں کے جذبات کو زبان دی اور ان کے گیت کن کن کر ہر کس و ناکس اپنے غموں کی کک محسوس کرنے میں زیادہ گانے کا موقع نہ مل سکا۔

ماہنامہ سرگوشی

لگتا ہے۔ ویسے تو انہیں عالمی شان کوٹھیوں کے ڈرائنگ روم میں بھی سنا جاتا ہے لیکن غریبوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں تکلف سے کام نہیں لیتا جبکہ امراء کے لیے ایسا کرنا مشکل ہے ورنہ دکھ سکھ تو سب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ کیا امیروں کو عشق نہیں ہوتا، کیا وہ اس آگ میں نہیں جلتے لیکن اپنے رکھ رکھاؤ اور سماجی حیثیت کے پیش نظر اس کا اظہار نہیں کر پاتے جبکہ عام آدمی عطاء اللہ صلی خیلوی کے کیسٹ کن کن کر خود بھی درد کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ یہی اس کے دل کی آواز ہے۔

انہیں حکومت اور سرکاری اداروں سے کوئی شکایت نہیں اور وہ مطمئن ہیں کہ عوام نے انہیں بہت محبت دی ہے۔ البتہ ان کا کہنا ہے کہ جو تو میں اپنے سینئر زکوچوں جاتی ہیں اور انہیں جائز مقام نہیں دیتیں وہ دراصل ان کی ناقدری کر رہی ہوتی ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ سینئرز کے تجربہ سے استفادہ کرنے کے لیے ان کی خدمات کی ادارے کے سپرد کر دی جائیں تاکہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں نئے آنے والوں کی راہنمائی کر سکیں۔ چاہے ان کا تعلق فنون لطیفہ کی کسی بھی شاخ سے ہو۔

عطاء اللہ صلی خیلوی کو شکوہ ہے کہ سرکاری دفاتر میں چڑھ اسی کو بھی ریٹائر ہونے کے پیش نظر ملتی ہے لیکن فن کاروں کا کوئی پُرسان حال نہیں۔ انہوں نے چالیس برس کی خدمت کی اور زندگی بھر حکومت کو ٹیکس دیتے رہے۔ آج بھی وہ کسی کے محتاج نہیں ہیں۔ تاہم وہ چاہتے ہیں کہ سرکاری سرپرستی میں انہیں فن کی خدمت کرنے کا موقع ملے اور اس کے لیے وہ بی بی وی پر پروگرام کرنے کے لیے تیار ہیں۔

انہوں نے بھی کسی موسیقار یا گلوکار کی شاگردی نہیں کی اور نہ ہی ان کا کوئی شاگرد ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو صاحب علم نہیں بلکہ لوگ گلوکار سمجھتے ہیں اور بقول ان کے فوک تو جی کو آتا ہے، ماں اپنے بچے کو جو لوری سنانی ہے وہ بھی فوک ہے اگر میں نے خود باقاعدہ کسی استاد سے سیکھا ہوتا اور موسیقی کے حروف ابجد سے واقف ہوتا تو ضرور شاگرد بناتا۔ میں تو خود ابھی تک سیکھ رہا ہوں۔

عطاء اللہ صلی خیلوی کو اپنے بھی گانے پسند ہیں۔ البتہ سب مایا ہے..... ان کے اپنے تجربات کی عکاسی اور زندگی کی کہانی ہے۔ وہ اس کیفیت سے ذاتی طور پر گزرنے چکے ہیں، جب گانا گانے کی پاداش میں انہیں گھر سے گھٹا پڑا اور انہوں نے اپنی الگ دنیا بسائی۔ وہ اب بھی اپنے گھر سے دور ہیں۔ گھر



اور خاندان والوں نے ابھی تک انہیں تسلیم نہیں کیا۔ یہ گانا گاتے ہوئے ان کے اپنے جذبات اس میں شامل ہوتے ہیں۔

شہرت اور مقبولیت کی بلندی پر پہنچنے کے باوجود انہوں نے ہمیشہ فن کی آبرو کا خیال رکھا اور یہی گوش کی کہیں ایسا کام نہ ہو جائے جس سے ان کی قوم، قبیلہ یا ذات پر کوئی حرف آئے۔ انہوں نے فن کی بے لوث خدمت کی ہے اور ایک بحر پر زندگی گزارنے پر مطمئن ہیں۔ یہی وجہ کہ ان کا حلقہ احباب بے حد وسیع ہے، عوام کے علاوہ سول بیورو کیسی اور فوج میں بھی انہیں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ انہوں نے فوج کے بہت سے کنسرٹ کیے ہیں۔

1982ء میں انہیں ترقی حسن کارکردگی اور دوسرے بی بی وی ایوارڈ مل چکا ہے لیکن اصل ایوارڈ تو عوام کی پسندیدگی ہوتا ہے اور اس حوالے سے وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ انہیں اندرون ملک اور بیرون ملک بہت محبت اور شوق سے سنا جاتا ہے۔ بلوچستان میں بھی ان کے سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور انہیں سب میں ہونے والے سالانہ میلے میں ہر سال بلایا جاتا ہے۔ انہیں وہاں بھی بہت زیادہ پیار اور محبت ملی۔

انہوں نے موسیقی کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل، گیت، نظم، مایہا، مپہ، آزاد بولیاں سب کچھ گایا ہے۔ انہیں بڑے بڑے موسیقاروں اور گلوکاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے باباجی اے جیسی سے لے کر آج تک جتنے بھی بڑے موسیقار ہیں، ان کے ساتھ کام کیا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھتے ہیں۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی چاہتے ہیں کہ میڈیا نے گلوکاروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ سینئر زکوچی نظر انداز نہ کرے۔ اگر انہیں فی وی پر نہیں بلایا جائے گا تو فی سل ان کے بارے میں کیسے جان پائے گی؟ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ریشماں، مہدی حسن، اے نیر، شوکت علی اور غلام علی کائن موسیقی میں کیا کردار ہے؟

وہ نئے نئے کاروں کو اس لحاظ سے خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ بہت سارے چھٹو کی وجہ سے میڈیا تک ان کی رسائی آسان ہوگئی ہے؟ ورنہ وہ خود ریڈیو اور ٹی وی تک کیسے پہنچے؟ اس پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ البتہ وہ ان کی گائیگی کے معیار سے مطمئن نہیں۔ ان کے خیال میں محنت اور جتن کی کمی ہے۔ لہذا اس اچھل کود پر توجہ دی جارہی ہے۔ اگر موسیقی کے

شاہقین کو یہی پسند ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ ٹھیک ہے۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو بھی زندگی میں کوئی چھٹاوا نہیں ہوا لیکن عشق کی ناکامی نے انہیں اس حد تک بنادیا ہے کہ وہ ارچ میرج اور لوریج دونوں کو ہی فضول سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ضروری نہیں جو غلطی انہوں نے کی وہ دوسرے بھی کریں، غلط فیصلوں کا انجام ہمیشہ سہا پڑتا ہے اور وہ بھی آج تک اس غلط فیصلے کی جھپٹ محسوس کر رہے ہیں۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے اپنی گائیگی کی بدولت بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ دنیا بھر میں ان کے لاکھوں پرستار ہیں۔ وہ کیسٹ کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ان کے چار سو سے زیادہ البم ریلیز ہو چکے ہیں۔ انہیں حکومت پاکستان کی جانب سے پرائڈ آف پرفارمنس مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ کینیڈا سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور امریکا سے بھی متعدد اعزازات مل چکے ہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تمام کامیابی اور شہرت کے باوجود ان کی ذاتی زندگی میں کتنی کیوں پائی جاتی ہے؟ وہ کیا بھی جس نے انہیں پانچ شادیوں پر مجبور کیا؟ پہلی شادی برادری میں ہوئی جو جلد ہی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد ایک شادی کینیڈا میں کی۔ وہ بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ تیسری شادی فلم اشارہ باز سے ہوئی جس سے ان کے تین بچے ہیں۔ بیٹیوں بچہ اپنی ماں باز سے ساتھ کینیڈا ہی میں مقیم ہیں۔ اسی دوران پاکستان میں دو شادیاں اور کیں۔ جن میں سے ایک جلد ہی ختم ہوگئی۔ دوسری ان کے ساتھ لاہور میں ہی مقیم ہے۔ حال ہی میں ایک انٹرویو کے دوران جب ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا۔

”جان بوجھ کر اپنے آپ کو بر بادو کی نہیں کرتا۔ گھر بنانا بڑا مشکل ہے اور اس کا ٹوٹنا کسی قدر مہنگا ہوتا ہے۔ یہ تو وہی جانتا ہے جس پر گزرتی ہے۔“

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی ذاتی زندگی میں عشق کی ناکامی کا بھی اہم کردار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں اوائل نو جوانی میں کسی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا لیکن بغض و جہالت کی بنا پر اس میں ناکامی ہوئی۔ اس بارے میں بہت سی سن گھڑت کہانیاں بھی پھیلا دی گئی ہیں جن پر کسی طرح بھی یقین نہیں کیا جاسکتا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ انٹرنیٹ پر موجود ان گمراہ کن کہانیوں پر بالکل توجہ نہ دیں جن پر ہرگز ہرگز یقین نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل اس لڑکی کا تعلق دوسری فیملی سے تھا اور گھر والوں کا کہنا تھا کہ وہ خاندان سے باہر اس فیملی میں رشتہ مانگنے نہیں جائیں گے جبکہ لڑکی والے انہیں اکیلا قبول کرنے پر

تیار نہ تھے۔ اس طرح بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اس لڑکی کی شادی دوسری جگہ ہوئی اور عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی اس درد کو لے کر گھر سے چل دیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی گلوکاری میں جو درد اور سوز نظر آتا ہے، اس کی بڑی وجہ عشق کی ناکامی ہے۔ اس کا اعتراف انہوں نے ایک حالیہ انٹرویو میں خود کیا ہے۔

”گلوکاری کے جراثیم تو روح میں موجود تھے، ہاں البتہ عشق کی ناکامی نے اس سوز کو جو میری گلوکاری میں تھا، درد سے بھر دیا۔“

اس سوز میں ذاتی زندگی کی تلخیاں بھی شامل ہیں۔ جب انہوں نے گانا شروع کیا تو خاندان والوں نے بڑی مخالفت کی اور ان پر زور دیا کہ وہ گلوکاری چھوڑ دیں۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے گلوکاری کو تو نہیں چھوڑی البتہ گھر چھوڑ دیا۔ اپنی آواز کے دروازوں کے بارے میں ان کا کہنا ہے۔

”صلاحیت تو اللہ تعالیٰ کی دین ہے لیکن اس کے اظہار کے لیے شریک کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے جب آپ اپنے فن سے عشق کریں۔ عشق کی بھی مختلف اقسام یا شکلیں ہیں۔ میرے گاؤں میں آج بھی قبائلی نظام رائج ہے۔ اس نظام کے خلاف بغاوت کرنا اور یہاں تک پہنچنا عشق کے بغیر ممکن نہیں۔ میرے خاندان میں کئی لڑکے گاتے ہیں لیکن انہوں نے اپنے شوق کو دوستوں کی محفل تک محدود کر رکھا ہے۔ جبکہ میری تسکین اس سے نہیں ہوتی تھی۔ جوانی میں کون عشق نہیں کرتا، میں نے بھی عشق کیا کیونکہ عشق کے بغیر زندگی مکمل نہیں ہوتی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے عشق میں چوٹ کھا کر اپنے محبوب کے لیے گانا شروع کیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ گانا تو میں پہلے ہی شروع کر چکا تھا۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے نہ پانے کا تم میرے دل کا روگ بن گیا جس کی کک آواز میں در آئی اور آج بھی مجھے چین نہیں لینے دیتی۔“

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے ناکام عشق کے بارے میں انٹرنیٹ پر انتہائی گمراہ کن کہانیاں پھیلا دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کے بدخواہوں اور حاسدوں کا ہی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ بولی ووڈ کی فلم بے وقاصم، میں بھارتی گلوکاروں نے ان کے غمے گائے تو کہہ دیا گیا کہ اس فلم کی کہانی عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی زندگی کے گروہ کو تھی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس فلم کا مرکزی کردار سندھ سبھل اپنے باپ کی طرح بڑا کٹر بیٹا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں شیش باغی لڑکی داخل ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ سندھ کی ماں بھی اس رشتے پر رضامند ہو جاتی ہے۔ سندھ جلد ہی

ایک مشہور کرکٹر بن جاتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے بہت سے دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن میں گوتم بھی شامل ہے۔ وہ سندھ کو تباہ کرنے کے لیے شیش کے ساتھ لے کر ایک منصوبہ بناتا ہے۔ شیش اس کی امارت اور چنگی چڑی باتوں سے متاثر ہو کر اس منصوبے میں شریک ہو جاتا ہے۔ وہ اسے سبق سکھانے کے لیے غنڈے بھیجتے ہیں لیکن سندھ انہیں مار پیٹ کر بھاگ دیتا ہے جس کے نتیجے میں اسے جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ یہیں اسے معلوم ہوتا ہے کہ شیش وہ نہیں جیسی کہ نظر آتی ہے۔ جیل سے رہا ہو کر آتا ہے تو اسے شیش اور گوتم کی شادی کی خبر ملتی ہے۔ وہ غصے کے عالم میں بھرا ہوا پتوٹل لے کر شادی کے منڈپ میں پہنچ جاتا ہے اور پھر بے جمع میں شیش پر فائر کر کے اسے قتل کر دیتا ہے۔

اس کہانی کا عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی ذاتی زندگی یا ناکام عشق سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا کوئی رقیب تھا اور نہ ہی انہوں نے کسی کو قتل کیا۔ اس سلسلے میں قارئین کی توجہ کے لیے ایک اہم نکتہ کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے۔ دراصل بھارت میں فلم کی ریلیز سے پہلے اس کی پروموشن پر پھر پور توجہ دی جاتی ہے۔ اس طرح کئی کمزور فلمیں بھی کامیاب پروموشن کے نتیجے میں ہٹ ہو جاتی ہیں بلکہ کچھ ہوشیار فیکٹر فلم کی شوٹنگ کے دوران ہی کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے عام فلم بیٹوں کی دلچسپی مذکورہ فلم میں بڑھ جاتی ہے اور وہ بے چینی سے اس کی ریلیز کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ یہی فلم کے ہیرو اور ہیروئن کے درمیان اسیکینڈل بنادیا جاتا ہے اور اس حوالے سے اخبارات کو چنگی خبریں جاری کی جاتی ہیں۔ اس طرح ہیرو، ہیروئن کے ساتھ فلم کو بھی مفت کی چمپلی کٹی رہتی ہے۔ اس سلسلے کی تازہ مثال فلم راک اشارہ کے ہیرو رنبیر کپور اور ہیروئن زکس فخری کا اسیکینڈل ہے جو فلم کی شوٹنگ کے دوران میڈیا کی زینت بن رہا لیکن فلم کی ریلیز کے بعد ان دونوں ستاروں کی راہیں جدا ہو گئیں۔

یہ معاملہ اسیکینڈل تک ہی محدود نہیں بلکہ بھارتی فلم ساز بعض اوقات کسی اہم واقعہ یا شخصیت کو لے کر اس کا تعلق اپنی فلم سے جوڑ دیتے ہیں۔ یہی کچھ بے وقاصم کے فلم ساز نے بھی کیا۔ ان دنوں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی پاکستان میں ہی نہیں بلکہ بھارت اور مشرق وسطیٰ میں بھی تیزی سے مقبولیت اور شہرت کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ بھارت کے طول و عرض میں ان کے کیسٹ بڑے ذوق و شوق سے سنے جا رہے تھے اور انہوں نے مقبولیت کے اعتبار سے بھارت کے چوٹی کے غزل نگر



عشق بے چین

منظر امام

اس دنیا میں عجب عجب کھیل کھیل جاتے ہیں اور ہم سب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہماری نظروں کے سامنے ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو با اختیار ہوتے ہوئے بھی بے اختیاری کا کرب جھیل رہے ہوتے ہیں۔ عزت، دولت، شہرت ان کا مقدر ہوتی ہے مگر وہ دل کی دنیا آباد نہیں کر سکتے۔ صنم خانہ دل ویران کا ویران رہتا ہے۔ کبھی کوئی آکر دردل پر دستک بھی نہیں دیتا لیکن جب یہ اپنی چیختی تنہائی کا مداوا نہیں کر سکتے تو یہ ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں مدھوبالا کا نام آتا ہے۔ پردہ سیمیں کسی یہ نامور اداکارہ کس طرح محبت کی منزل پر پہنچ کر بھی ناکام رہی۔

ماضی کی ایک نامور اداکارہ کا قصہ مآل، غم عشق کا احوال

نا کام محبت کی ملکہ اگر کسی کو کہا جاسکتا ہے تو بلاشبہ ای کو کہا جاسکتا ہے۔
کر دوزوں دلوں پر وہ راج کرنے والی تھی، اس کے پاس سب کچھ تھا۔ دولت، شہرت لیکن اس کے پاس محبت نہیں تھی۔ جب وہ دو تین ای سال کی تھی تو ایک پر دہا سکرین پر اس کی ایک جھلک دیکھ کر لوگ پاگل ہو جاتے تھے۔ اس کی دل فریب مسکراہٹ نے لاکھوں کو دیوانہ کر رکھا تھا۔

عشق ناکام
نمبر

ماہنامہ سرگشت

نجیت سنگھ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ بے وقاصم، کے فلم ساز نے عطا اللہ سیٹی خیلوی کی شہرت کو پیش کر کے اسے اپنی فلم میں ان کے مقبول گانے سونو نگم وغیرہ کی آواز میں ریکارڈ کروائے اور ساتھ ہی یہ پروپیگنڈا بھی شروع کر دیا کہ یہ فلم عطا اللہ سیٹی خیلوی کے ناکام عشق کی کہانی پر مبنی ہے۔ بس پھر کیا تھا بھارت کے لاکھوں کروڑوں فلم بینوں کے لیے یہ فلم پرکشش ہو گئی اور وہ بے چینی سے اس فلم کی ریلیز کا انتظار کرنے لگے۔

یہ فلم فی سیریز کے فنکار نے بنائی تھی اور اس نے اپنے چھوٹے بھائی کرشن کمار کو بطور ہیرو کا سٹ کیا تھا۔ وہ اس فلم کو ہر قیمت پر کامیاب دیکھنا چاہتا تھا تا کہ کرشن کمار کے لیے بولی ووڈ میں قدم جمانا آسان ہو جائے۔ عطا اللہ سیٹی خیلوی کا نام استعمال کر کے وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب رہا۔ اس کی فلم کمزور کہانی اور نا کارہ ڈائریکشن کے باوجود غیر متوقع طور پر ہٹ رہی جس کا سارا کریڈٹ عطا اللہ سیٹی خیلوی کو جاتا ہے البتہ فلم کی ریلیز کے بعد لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ یہ ایک سنگری نہیں بلکہ کرشن کی کہانی تھی اور اس کا پاکستانی لوگ سنگری ذاتی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ گھٹن کمار نے فلم بینوں کے ساتھ دھوکا کیا اور جھوٹ بول کر اپنی فلم کامیاب کر دالی۔ اصولاً تو اس فلم کو فلاپ ہو جانا چاہیے تھا لیکن بھارت بہت بڑا ملک ہے اور وہاں ہر فلم بیک وقت ہزاروں سینما گھروں میں ریلیز ہوتی ہے۔ اس لیے اگر اچھی چلبلی کی جائے تو کم بجٹ کی فلمیں بہ آسانی ایک یا دو ہفتے میں اپنی لاگت پوری کر لیتی ہیں۔ یہ فلم تو عطا اللہ سیٹی خیلوی کے نام پر کامیاب ہو گئی لیکن اس کے بعد کرشن کمار کو کسی نے نہیں پوچھا، بے وقاصم اس کے کیریئر کی پہلی اور آخری ہٹ فلم تھی۔

بھارتی گلوکاروں نے بھی دل کھول کر عطاء اللہ سیٹی خیلوی کے گانوں پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا ”جی ہاں، بہت زیادہ گانے چوری ہوئے ہیں۔ فلم بے وقاصم، میں تو سارے کے سارے گانے میرے ہی تھے بلکہ اس فلم کے بارے میں تو یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ اس فلم کی کہانی میری زندگی کے گرد و خیم ہے حالانکہ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ بہت سے بھارتی گلوکاروں نے میرے گانے گائے۔ سونو نگم نے تو تسلیم بھی کیا کہ وہ میرے ہی گانے گام کر مشہور ہوئے۔

اس فلم کے بارے میں تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ قارئین، عطا اللہ سیٹی خیلوی کے بارے میں پچھلائی جانے والی گمراہ کن کہانیوں کی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں۔

بابا نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی آگے چل کر بہت نامور ہوگی۔ بہت پیسے والی ہوگی لیکن اس کے ساتھ ہی بہت بد قسمت بھی ہوگی۔

اس بابا کو کشمیر والے بابا کہا جاتا تھا اور وہ بچی تھی ممتاز جہاں بیگم! جو 14 فروری 1933ء کو ایک پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئی۔

اس تاریخ کو ویلفائن ڈے کہا جاتا ہے اور شاید اسی لیے اس تاریخ کو پیدا ہونے والے یا تو محبت کو ترستے رہتے ہیں یا پھر محبت ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔

بہر حال جو بھی ہو، اس تاریخ کو پیدا ہونے والے محبت سے ضرور وابستہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی کہانیاں ہفتی ہیں اور وہ خود بھی کہانی کا کردار بن کر رہ جاتے ہیں۔

ممتاز جہاں بیگم اپنے ماں باپ کی اولادوں میں گیارہ میں سے بائیسویں نمبر پر تھیں۔ دیکھنے والے اسے دیکھتے اور خدا کی منائی کی تعریف کرنے لگتے۔

وہ گلاب کے پھول کی طرح خوبصورت تھی لیکن بد قسمتی یہ تھی کہ اس بچی کے دل میں سوراخ تھا۔ یہ مرض تو آج کے دور میں بھی پریشان کن ہوا کرتا ہے جبکہ اس دور میں سرجری وغیرہ کی اتنی سہولیات بھی نہیں تھیں۔

اس کے باپ کا نام عطا اللہ تھا۔ ایک سخت گیر لیکن پیسوں کی ہوس رکھنے والا انسان۔ اس نے اپنی بچی کو فلم سازوں اور ڈائریکٹرز میں تو متعارف کروا دیا لیکن کسی کو یہ نہیں بتایا کہ یہ دل کی مرلیضہ ہے۔ کیونکہ یہ بات کھلتی تو ممتاز جہاں بیگم کو کام نہیں ملتا۔ جس کو آگے چل کر مدھوبالا کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی فلمی تاریخ میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں ہو سکی ہے اور نہ ہی کسی نے مدھوبالا جیسی مسکراہٹ پائی۔

کسی حد تک ماحوری، مدھوبالا جیسی خوبصورتی کی مالک تھی۔

مدھوبالا نے لاکھوں دلوں پر راج کیا تھا۔ کشمیر والے بابا کا کہا ہوا بیچ ثابت ہو رہا تھا۔ مدھوبالا کو عزت، دولت اور شہرت تو مل چکی تھی لیکن محبت کے معاملے میں وہ بد قسمت ہی رہی۔ اس کی خوبصورت مسکراہٹ کے پیچھے ایک روتا، کراہتا اور سسکتا بوا دل تھا۔

دل کی بیماری ظاہری بھی تھی اور اندرونی بھی۔ اس نے کبھی کسی سے بچی محبت نہیں پائی۔ اس کا باپ کسی کو اس سے زیادہ نہیں ملنے دیتا تھا۔

اسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ سونے کی چڑیا کہیں کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

1960ء میں مدھوبالا کے دل کا عارضہ جب شدید ہو گیا تو وہ آپریشن کے لیے انگلینڈ چلی گئی لیکن ڈاکٹرز نے اس لیے آپریشن سے انکار کر دیا کہ اس کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا تھا۔

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔ دل کا یہی مرض اس کے لیے موت کا سبب بن گیا۔ اس نے صرف 28 سال میں بیماری کی وجہ سے کام ترک کر دیا تھا۔

اس کا دل کام کی زیادتی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے آخری عمر میں وقتی سہارے کے لیے کشمیر سے شادی کی تھی جو ایک فنسول سی شادی تھی اور صرف ایک سال برقرار رہی۔

مدھوبالا کی زندگی کے نہ جانے کتنے دکھ بھرے تھے۔ اس کی گھر بیلو زندگی کے حوالے سے، اس کی ناکامی کے حوالے سے، اس کی محبتوں کے حوالے سے، اس کی جذبات، احساسات، اس کی امیدیں، اس کی خواہشات یہ سب سامنے نہیں آ سکیں۔

اسے روزانہ ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ اس ڈائری میں وہ دن بھر گزرنے والے واقعات تحریر کر دیا کرتی۔ اس ڈائری کی حیثیت مدھوبالا کی زندگی پر ایک دستاویز کی تھی لیکن افسوس، اس کی موت کے بعد اس کے باپ اس ڈائری کو بھی اس کی قبر میں دفن کر دیا تھا۔ اس طرح اس کی زندگی کے نہ جانے کتنے گوشے گم نام ہو گئے اور شا گم نام ہی رہیں گے۔

مدھوبالا ایک بے چین روح کی طرح تھی۔ نہ جانے کس کو تلاش کرتی تھی، محبتوں کا سفر اسے بھی سکون نہیں دے سکا۔

مدھوبالا کی پہلی محبت اس کے بچپن کا دوست لطیف تھا۔ دونوں دہلی میں رہا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے پڑوسی تھے اور بچپن کی محبتوں کی ہزاروں لاکھوں کہانیوں کی طرح ان کی بھی کہانیاں تھیں۔

دونوں ایک ساتھ کھیلا کرتے، ایک دوسرے سے جھگڑتے بھی تھے، پھر ایک دوسرے کو ممانے کے جتن کیے جاتے۔

مدھوبالا لطیف سے بہت جھگڑنے لگتی تھی۔ جبکہ لطیف

اس کی ہر بات کو ہنس کر ٹال دیا کرتا۔ یہ محبت شاید مدھوبالا کی جانب سے ہو یا نہ ہو لیکن لطیف کی جانب سے ضرور تھی۔

لطیف اس کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ اسکول سے آتے ہی وہ سیدھے مدھوبالا کے گھر آ جاتا۔ پھر دونوں بچپن کی بچپنوں اور شرارتوں میں مصروف ہو جاتے۔

لطیف کے لیے وہ دن قیامت کا تھا جب مدھوبالا اس سے الگ ہو رہی تھی۔ مدھوبالا کا باپ قسمت آزمائی کے لیے بچی بچی کو بھی لے جا رہا تھا۔

مدھوبالا نے جاتے وقت لطیف کو سرخ گلاب کا ایک پھول پیش کیا تھا۔ لطیف نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے اسے رخصت کیا تھا۔

لطیف کی محبت کی انتہا یہ تھی کہ گرچہ مدھوبالا اسے کبھی نہیں مل سکی لیکن اس گلاب کے پھول کو اس نے ایک چھوٹے سے شے کے کس میں محفوظ کر دیا تھا۔

اور جب اسے مدھوبالا کی موت کی خبر ملی تو اس نے قبرستان آ کر وہی پھول اس کی قبر پر رکھ دیا۔ لطیف ایک بڑے آفیسر کی زندگی گزار کر اب ریٹائر ہو چکا ہے لیکن مدھوبالا کی بری کے دن وہ خاص طور پر دہلی سے بمبئی آتا ہے اور اس کی قبر پر سرخ گلاب کا ایک پھول رکھ دیتا ہے۔

تو محبت ایسی بھی ہوتی ہے۔ یہ مدھوبالا کی زندگی کا ایک پوشیدہ گوشہ ہے جس کا انکشاف اتفاقاً ہوا کیونکہ تھا۔

کیدار شرما

بہت بڑا قلم ڈائریکٹر، اس نے بہت شاندار فلمیں بنائیں۔ مدھوبالا کو پہلا موقع اسی نے دیا تھا۔ اس وقت مدھوبالا کی عمر بہت کم تھی اور جب اس کا اسکرین ٹیسٹ ہوا تو اس کو دیکھتے ہی کیدار شرما اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔

یہ پہلی نظر کی محبت تھی۔ کیدار شرما، مدھوبالا کے لیے جنونی سا ہو گیا تھا۔ وہ شونگ سے فارغ ہو کر مدھوبالا کے ساتھ بیٹھ جاتا اور رومانوی باتیں کیا کرتا۔ اس کی باتوں میں ادب کی چائیت بھی ہوا کرتی۔

ہندوستان میں اس قسم کے ڈائریکٹر، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوا کرتے تھے۔ اگر انہوں نے ڈگری حاصل نہیں بھی کی ہوتی تو بھی ان کا ادبی ذوق بہت اعلیٰ ہوا کرتا۔

کیدار شرما کو گفتگو کا سلیقہ آتا تھا۔ مدھوبالا اس زمانے میں اتنی کم عمر اور اتنی کم سمجھی کم شرما کی بہت سی باتیں اس

کے لیے نہیں پڑتیں۔ وہ محبت کے مفہوم سے نا آشنا لڑکی تھی۔ وہ شرما کے پاس اس لیے بیٹھ جاتی کہ اسے شرما کی باتیں بہت اچھی لگتیں۔

اس کی باتیں مدھوبالا کو نہ جانے خوابوں کے کون سے جزیرے میں لے جاتیں؟ اس نے ایک بار بتایا تھا "میں نے اس زمانے کے احساسات کو اپنی ڈائری میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ (یہ وہی ڈائری ہے، جس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ جس ڈائری کو اس کے باپ نے اس کی لاش کے ساتھ دفن کروا دیا تھا)

مدھوبالا کیدار شرما کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ گرچہ اس کے باپ کو یہ میل جول بہت برا لگتا تھا لیکن وہ اس لیے خاموش رہتا کہ کیدار شرما کے ذریعے مدھوبالا کو اور فلمیں ملنے والی تھیں۔

پھر کچھ لوگوں نے مدھوبالا کو سمجھایا "دیکھو لڑکی! تم ابھی بہت کم عمر اور نا سمجھ ہو۔ تمہارے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔ تمہیں ابھی بہت آگے جانا ہے۔ اگر تم ابھی سے ان چکرلوں میں پڑ گئیں تو تمہارا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔"

"لیکن شرما تو مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ کہا کرتی۔

"بس اسی حد تک رہو کہ وہ تمہیں اچھے لگتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہیں، آئندہ تمہیں اور بھی اچھے لوگ مل جائیں گے۔"

مدھوبالا کو یہ مشورہ اچھا لگا اور وہ آہستہ آہستہ کیدار شرما سے دور ہوتی چلی گئی۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا کہ یہ کہانی ہی ختم ہو گئی۔

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں یہ وہ نعمت ہے جو ہر سار پر گایا نہیں جاتا مدھوبالا نے کسی محبتیں کیں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ یہ اس کی محبتیں تھیں یا وہ اپنا اظہار جاتی تھی۔ ہر ایک اسے اپنی طرف کھینچتے۔ پھر وہ نہ جانے کیوں اس سے یا تو خود دور ہو جاتی، یا حالات اسے دور کر دیتے۔

پریم ناتھ

یہ ایک ہانکا بھلا نوجوان تھا۔ خوبصورت اداکاری کرنے والا۔ پریم ناتھ کی اداکاری آن میں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔



یہ وہ زمانہ تھا جب پریم ناتھ کی فلم باولی بن رہی تھی۔
مدھوبالا اس میں ہیروئن کا کردار ادا کر رہی تھی۔ بے چارہ
پریم ناتھ اس کو دیکھ کر کہتے ہی میں رہ جا کر تھا۔
مدھوبالا کا حسن ہی ایسا تھا کہ اس کو دیکھنے والے مہبوت
ہو جایا کرتے۔

پریم ناتھ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن
ایسا بھی آئے گا۔

وہ اس وقت میک اپ روم میں بیٹھا تھا جب مدھوبالا
اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خط اور گلاب کا ایک پھول
تھا۔

اس نے وہ پھول پریم ناتھ کو دیتے ہوئے کہا ”میں
آپ کو یہ خط بھی دے رہی ہوں، میرے میک اپ روم سے
جانے کے بعد پڑھ لیجئے گا۔“

پریم ناتھ تو ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس نے گلاب کا پھول اور
خط لے لیا۔ مدھوبالا میک اپ روم سے باہر چلی گئی تھی۔ اس
کے جاتے ہی پریم ناتھ نے بے تاب سے وہ خط کھولا۔ اس
میں صرف ایک جملہ لکھا تھا ”میں آپ سے محبت کرنے لگی
ہوں۔ کیا آپ کو میری محبت قبول ہے۔“

”قبول ہے، قبول ہے۔“ پریم ناتھ خوشی سے چلانے
لگا تھا۔ شاید ہندوستان کی سب سے خوبصورت لڑکی نے اس
سے محبت کا اظہار کیا تھا اسے اور کیا چاہیے تھا؟

پھر وہ دونوں ایک ساتھ دینے جانے لگے۔ آہستہ
آہستہ ان دونوں کے لیے کہانیاں بننے لگیں۔ اور ایک دن
پریم ناتھ نے یہ دیکھ لیا کہ مدھوبالا اشوک کمار کو گلاب کا
پھول اور ایک خط دے رہی ہے۔

یہ عجیب بات تھی۔
لیکن اس کا سبب جاننا کوئی اتنا دشوار نہیں ہے۔

مدھوبالا کو اس کے باپ نے دبا کر رکھا تھا۔ اس کے
نزدیک وہ صرف پیسا کمانے کی مشین تھی۔ اور چونکہ مشین
کے کوئی جذبات نہیں ہوتے اس لیے مدھوبالا کے بھی
جذبات نہیں ہونے چاہئیں۔

باپ کے اس رویے نے مدھوبالا میں ضد کی کیفیت
پیدا کر دی تھی۔ وہ جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہرٹ کرنے
کے لیے یہ سب کیا کرتی۔

اسی لیے اس نے کئی لوگوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر
خود کو ان سے الگ بھی کر لیا۔ چاہے لطیف ہو، کیدار شرما ہو یا
پریم ناتھ اور اشوک کمار۔ مدھوبالا نے ان میں سے کسی سے

کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکن خود کو مزید اُداس اور
کرتی چلی گئی۔

وہ ایک بے چین روح کی طرح تھی اور کوئی نہیں
کہے بے چین روحوں کو کس کی تلاش ہوتی ہے۔ اس نے
ناتھ کو گلاب کا پھول دیا اور ویسا ہی پھول اشوک کمار کو
دے دیا۔ پریم ناتھ نے اسی دن اس سے علیحدگی اختیار کر
چکا۔ اشوک کمار سے بھی اس کی دوستی زیادہ دنوں نہیں چل
سکتی تھی۔

پھر ایک اور بڑا نام اس کی زندگی میں شامل ہوا۔
شاید پہلی بار معاملات اتنے آگے تک چلے گئے تھے اور
وہ نام تھا کمال امر وہو کی کا۔

کمال امر وہو فلمی دنیا کا ایک بڑا نام تھا۔ اس نے
اپنی فلم محل کے لیے مدھوبالا کو کاسٹ کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ
محل ہی نے مدھوبالا کو مدھوبالا بنایا تھا۔

فلم محل ایک سپر ہٹ فلم تھی۔ اس فلم کی کہانی پراسرار
ماحول کے گرد گھومتی ہے۔ اس فلم میں مدھوبالا کے ساتھ
اشوک کمار بھی تھا۔

اس سسپنس فلم کے سسپنس کو مزید بڑھانے کے لیے
کمال امر وہو نے فلم کے ٹائٹل میں مدھوبالا کا نام نہیں
بلکہ ہیروئن کی جگہ صرف ایک لڑکی لکھا گیا تھا۔

یہ انداز بہت کامیاب ہوا۔ لوگ اس حسین لڑکی کے
لیے پاگل ہو گئے جس کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس فلم میں
مدھوبالا پر قلمبایا ہوا یہ گانا شاید ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا ہے۔
”آئے گا، آئے گا، آئے گا، آئے گا.....“

محل اپنی تکنیک، کہانی اور کردار نگاری کی وجہ سے ایک
لاجواب فلم تھی۔ مدھوبالا کے حسن نے صرف فلم بینوں کو ہی
متاثر نہیں کیا تھا بلکہ خود کمال امر وہو بھی اس کی زلفوں اور
مسکراہٹ کا اسیر ہو گیا تھا۔

یہ فلم 1949ء میں ریلیز ہوئی تھی اور آج تک پُرانے
لوگوں میں اس فلم کے چرچے ہیں۔ کمال امر وہو نے
ہدایت کاری کا کمال دکھادیا تھا۔

مدھوبالا کا کہنا ہے کہ اس کی زندگی کے سب سے
خوشگوار لمحات وہی تھے جو اس نے کمال کے ساتھ گزارے۔
دونوں نہر کنارے جا کر بیٹھ جایا کرتے۔

یا کہیں ایسی جگہ چلے جاتے جہاں سے شہر کی روشنیاں
جھلملاتی دکھائی دیتیں۔ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کے
ساتھ بیٹھے رہتے۔ اس زمانے میں زندگی ان کے بہت

قرب آگئی تھی۔

یہ حیرت کی بات ہے کہ مدھو بالا کے باپ کو اس عشق پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ یہ کہا کرتا کہ اگر دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو وہ رکاوٹ نہیں بنے گا۔

لیکن کمال کے ساتھ شادی پر خود مدھو بالا کو اعتراض تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ کمال امر دھوی شادی شدہ تھے۔ ایک بیوی پہلے سے موجود تھی اور مدھو بالا اپنی فطرت کے مطابق کسی اور کے ساتھ شراکت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

کمال اسے سمجھایا کرتے ”دیکھو مدھو۔ ہماری یہاں چار شادیوں کی اجازت ہے اور جب میں دونوں کو انورڈ کر سکتا ہوں، دونوں کے درمیان انصاف بھی کر سکتا ہوں تو پھر تمہیں کیا اعتراض ہے؟ اگر کہو تو میں تمہیں لکھ کر دے دوں؟“

ان سب کے باوجود مدھو بالا کی یہ ضد رہی کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دے۔ کمال امر دھوی نے اس کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح دونوں کے درمیان دوریاں بڑھتی چلی گئیں۔

مدھو بالا ایک بار پھر تنہا ہو چکی تھی۔

اسی باعث تو قتل عاشقان سے منع کرتے تھے اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر ممتاز جہاں بیگم کو تو شاید کسی کی دیر پا محبت حاصل بھی ہو جاتی لیکن مدھو بالا اکیلی ہی رہی۔ اس کے بعد مدھو بالا کی زندگی میں ایک اور محبت شامل ہوئی۔

یہ شاید اس کی زندگی کی سب سے شاندار اور سب سے یادگار محبت تھی۔

یہ محبت بذات خود ایک خوبصورت کہانی کی طرح خوبصورت اور پُر جوش تھی۔ رومانس، قرب اور وصال کے لمحات سے بھری ہوئی۔

اس محبت نے مدھو بالا کے دل کے کئی دروازے کھول دیے۔ اس کے کئی مجید سامنے آ گئے اور پتا چلا کہ وہ کتنی بھرپور اور شدید محبت کرنے والی لڑکی تھی۔

اور وہ کسی مشہور اور عظیم اداکار دیپ کمار سے محبت۔ مدھو بالا اس کے عشق میں اسی وقت سے گرفتار ہو گئی تھی جب وہ صرف سترہ سال کی تھی لیکن اسے بھی دیپ کے

قرب ہونے یا اظہار کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ شاید دیپ کی ہی محبت کو اس نے اپنے تصور میں رکھ کر اوروں سے محبت کی تھی۔

تمام عمر تیرا انتظار ہم نے کیا اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا پھر جب دونوں ایک دوسرے سے ملے تو مدھو بالا دیپ کے قدموں میں اپنی محبت رکھ دی۔ یہ ایک لازوال محبت تھی۔ جس پر کئی کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں، کئی فلمیں بنا سکتی ہیں۔

دیپ اور مدھو بالا بہت تیزی اور بہت شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے تھے لیکن غلام ان کی راہ میں دیوار بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اور وہ ظالم سانحہ تھا مدھو بالا لاچی باپ جس کے لیے سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ اگر مدھو بالا دیپ کی ہوگئی تو اس کا کیا بنے گا؟ اس کی عیاشیاں تو مدھو بالا کی وجہ سے تھیں۔ وہ یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا کہ سونے کی چڑیا اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔

اس نے ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی کیں۔ وہ ان دونوں کے ایک ساتھ دیکھنا گوارا بھی نہیں کرتا تھا۔ مدھو بالا کے لیے سختی سے حکم تھا کہ وہ دیپ سے صرف کام کی بات کرے اور وہ بھی فلم کے سیٹ پر۔

شوٹنگ کے خاتمے کے بعد دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔

نہ جانے کیوں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مدھو بالا اپنے باپ سے بہت خوف زدہ رہتی تھی؟ وہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دیپ کمار کو اسی لیے مدھو بالا کا باپ سخت ناپسند تھا کہ وہ خزانے کے کسی سانپ کی طرح اس کی نگرانی کیا کرتا۔ شوٹنگ کے دوران بھی اس کی آنکھیں اپنی بیٹی پر جمی رہتیں کہ وہ کہیں اور تو نہیں ہو رہی یا محبت کے مکالمے بولنے ہوئے کہیں حقیقت کا رنگ تو نہیں آ رہا ہے۔

ان دونوں کا یہ عشق بہت دنوں تک چلتا رہا لیکن دونوں کل کر کسی کے سامنے نہیں آ سکے تھے۔ اس کی وجہ مدھو بالا کا باپ تھا۔ وہ اتنا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔

بالا خراس عشق کا ڈراما سین 1957ء میں اس وقت ہوا جب بی آ آر چو پڑہ اپنی لازوال فلم ”نیادور“ بنا رہا تھا۔ اس فلم میں دیپ کمار اور مدھو بالا دونوں کو سائن کیا

گیا تھا۔ جن لوگوں نے یہ فلم دیکھ رکھی ہے، انہیں اچھی طرح یاد ہوگا کہ اس فلم کی شوٹنگ میدانوں اور دور افتادہ علاقوں میں کی گئی تھی۔

چالیس دن کا کام تھا۔ چالیس دنوں تک دیپ کمار اور مدھو بالا کو بمبئی سے دور رہنا تھا اور یہ بات مدھو بالا کے باپ سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی اور دیپ کمار ایک ساتھ شہر سے باہر جائیں۔ اس نے بی آ آر چو پڑہ کو مشورہ بھی دیا کہ وہ فلم کی شوٹنگ بمبئی کے کسی اسٹوڈیو میں کر لے۔

لیکن اس فلم کی کہانی ایسی نہیں تھی کہ اسٹوڈیو میں فلمائی جاسکتی۔ اسی لیے چو پڑہ نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

مدھو بالا کے باپ نے آخری حربے کے طور پر مدھو بالا کو اس فلم میں کام کرنے سے منع کر دیا۔ نہ جانے اس نے مدھو بالا کو کیسی دھمکی دی ہوگی یا کیا کہا ہوگا کہ اس بے چاری نے وہی کیا جو اس کے باپ نے کہا تھا۔

بی آ آر چو پڑہ کے لیے یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ اس نے فوری طور پر عدالت میں ان دونوں کے خلاف مقدمہ درج کر دیا۔ کیس چلنے لگا۔ اور اسی کیس کے دوران مدھو بالا اور دیپ کے عشق کی کہانی بھی سامنے آ گئی۔

عدالت نے جب مدھو بالا کے باپ سے سوال کیا کہ وہ اس فلم سے مدھو بالا کو کیوں الگ کر رہا ہے تو اس نے بتایا کہ وہ دیپ کمار کی وجہ سے کر رہا تھا۔

اس پر پتا چلا کہ دیپ اور مدھو کے درمیان کیسے تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

دیپ کمار بدنام ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے مدھو بالا کے باپ سے زیادہ مدھو بالا پر غصہ تھا کہ وہ اس دوران بالکل خاموش رہی۔ اس نے دیپ کمار کے حق میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

بالا خراس مدھو بالا کو پورے پیسے واپس کرنے پڑے تھے۔ بی آ آر چو پڑہ نے اس فلم میں مدھو بالا کی جگہ جیتی ملا کر لے لیا اور جانے دے جاتے ہیں یہ ایک کامیاب ترین فلم تھی۔

اس فلم کی کہانی، مکالمے، گانے، اداکاری، ہدایت کاری غرضیکہ فلم کا ہر شعبہ اپنی مثال آپ تھا۔ فلم تو۔۔۔

ڈراما عاشق

ماسی کی بیرونیوں میں ایک مشہور نام تھا۔ بڑے آن بان کی تھی، بالکل شہزادوں جیسا وقار تھا۔ اس کا ایک بھائی تھا شہزادہ افتخار۔ اس کی شکل صورت بھی اچھی تھی۔ اسے ثریا سے عشق ہو گیا۔ گوکہ یہ عشق یکطرفہ تھا مگر اس نے پورے برصغیر میں بالچل پیادی۔ اس نے ثریا کے گھر کے سامنے دھونی رانی۔ ٹاٹ بچھا کر بیٹھ گیا اور یہ اعلان کر دیا کہ جب تک ثریا اس سے شادی کا اعلان نہیں کرے گی وہ یہیں بیٹھا رہے گا۔ یہ خبر لاہور سے نکلی اور بمبئی فلم انڈسٹری تک پھیل گئی۔ اخباروں رسالوں میں تصویریں لگنے لگیں۔ صبح سے شام تک ثریا کے دروازے پر بھیڑ لگ رہتی۔ ثریا کے ماموں نے اسے ڈرایا دھمکایا۔ مگر شہزادہ افتخار بارسوخ آدمی تھا۔ رعب میں نہیں آیا۔ دیگر افراد نے بھی سمجھا یا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ثریا شادی کے لیے ہاں کر دے۔ ثریا کے گھر والوں نے مجبور ہو کر جدن بانی سے فریادی۔ جدن بانی کا بمبئی فلم نگری پر راج تھا۔ بڑے بڑے لوگ ان سے دیتے تھے۔ وہ فوراً مدد کے لیے پہنچ گئیں۔ انہوں نے شہزادہ افتخار کو بلوایا اور بے نقط سامنے پھر اس کی بہن کو بلوا کر کہا کہ اگر افتخار نے روش نہ بدلی تو اسے بہت بُرا دن دیکھنا پڑے گا۔ شہزادہ افتخار نے اپنی داستان محبت کو ناکامی کے قفل میں بند کیا اور گھر لوٹ گیا۔ مگر مرتے دم تک وہ ثریا کے نام کا درد کرتا رہا۔

اقتباس: اون ثریا از آشنا
مرسلہ: محمد ایاز رانی، مانسہرہ

سراپ عشق

نسرین منصور



اپنے حسن جہاں خیز سے اس نے پردہ سیمیں پر تہلکہ مچا دیا تھا۔ بالی ووڈ کی سپراسٹار کہلانے لگی تھی۔ اس کا تعلق مقبوضہ جونا گڑھ سے تھا جسے پاکستان کا حصہ قرار دیا گیا تھا مگر ہندوستان نے اس پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا اور نواب آف جونا گڑھ پاکستان ہجرت کر آئے تھے۔ نواب کی ہجرت نے اہلکاروں کو بے یار و مددگار کر دیا تھا۔ وہ بھی مصاحبین کے خاندان سے تھی اس لیے اعلیٰ تعلیم کے لیے بمبئی آئی تھی کہ بمبئی نگریا نے اس کا شکار کر لیا۔ وہ فلموں کی جان کہلانے لگی، خوب شہرت حاصل کی لیکن دل کی دنیا ویران رہی۔

ایک ٹوٹے دل کی اداکارہ کی روداد پڑھئے

محبت کامیاب ہو جائے تو کہانی نہیں بنتی، ناکام ہو جائے تو اس کا چرچا زمانوں تک رہتا ہے۔ ویسے تو محبت ہو جانا اس کی کامیابی کی دلیل ہے لیکن عام معنوں میں کامیاب محبت وہی کہلائی جاتی ہے جہاں فریقین کو وصل کی راحت نصیب ہو جائے اور انہیں فراق کی اذیت سے نہ گزرنا پڑے۔ اس مفہوم میں اگر دیکھا جائے تو تاریخ کا سبز کامیاب محبت کی داستانوں سے خالی ہے لیکن ناکام عشق کے افسانے قدم



بجائے کہ کامیاب ہوئی لیکن ان دونوں کی محبت ناکام ہو گئی تھی۔ اس کے بعد دلپ کمار مدھوبالا سے دور ہوتا چلا گیا۔ دونوں کے درمیان گہری فوج حائل ہو گئی۔ لیکن ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔ ان دونوں نے کے آصف کی لازوال فلم مغل اعظم سائن کر رکھی تھی جس کی شوٹنگ کا دورانیہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بالاخر یہ فلم دس برسوں میں جا کر مکمل ہوئی۔ اب اندازہ کر لیں کہ اس دوران میں دونوں کے درمیان دوریاں تھیں، تلخیاں تھیں، لیکن اسکرین پر آپ کو کہیں بھی اس کا احساس نہیں ہو پائے گا۔ دونوں نے محبت کے مناظر میں ڈوب کر اداکاری کی تھی۔ ان کی آنکھیں، حرکات، سکناات سب کے سب یہ گواہی دے رہے تھے کہ شہزادہ سلیم اور انارکلی ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں جبکہ دلپ اور مدھوبالا دونوں ایک دوسرے سے دور تھے۔ تو یہ ہے فن اور ایسے تھے فنکار کہ انہوں نے یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ ان کے درمیان کیا چل رہا ہے؟ انہیں اداکاری کرنی تھی، شہزادہ سلیم اور انارکلی کی محبت کو لازوال کرنا تھا اور وہ کر دکھایا۔ مدھوبالانے اس فلم میں جذبات نگاری کا کمال دکھا دیا ہے۔ اس فلم کا ہر فریم موتیوں کی طرح سجا ہوا ہے۔ اب نہ تو ایسے فنکار ہیں اور نہ ہی ایسی فلمیں بنتی ہیں۔ اس کے بعد مدھوبالا کو ایک اور بانکا جیلا شخص پسند آ گیا تھا۔ وہ ایک دولت مند، پڑا لکھا، خوبصورت اور ذہین انسان تھا۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ عزت، دولت، شہرت۔ وہ جب باتیں کرتا تو مدھوبالا حیرت زدہ ہی ہو کر اس کی باتیں سنتی رہتی۔ وہ شروع سے ایک بڑا آدمی تھا اور اس کی موت نے اسے اور بھی بڑا بنا دیا ہے۔ اور وہ آدمی تھا، ذوا لفقلا علی بھٹو۔ جی ہاں، وہی بھٹو جسے آگے چل کر پاکستان کا وزیراعظم بننا تھا۔ مدھوبالا ان کی متناہی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ 1950ء تک بھٹو صاحب پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ رہتے تھے۔ لازوالانہ میں ان کے آباؤ اجداد کی وسیع و عریض زمینیں تھیں



قدم پر بکھرے پڑے ہیں۔ جب خداوند عالم نے انسان کو زمین پر بھیجا تو ساتھ ہی اسے زندگی گزارنے کے اسلوب سے بھی آگاہی دی اور ان جذلوں سے بھی آشنا کیا جو اس کے دل کی گہرائیوں سے جنم لیتے ہیں۔ انہی میں ایک جذبہ محبت کا ہے جو دوسرے جذبات کے مقابلے میں زیادہ قوی، زیادہ مضبوط اور زیادہ گہرا سمجھا جاتا ہے، جس کی شدت کو ناپنے کے لیے کوئی آلہ ایجاد نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود روئے زمین پر بسنے والا ہر انسان اس جذبے کی شدت کو سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے بالخصوص ناکام عشق کی داستانیں اس کے دل کے تاروں پر حزن پر حزن ساز چیمپزدیتی ہیں اور اس کی لکھ تار پڑھ مضطرب کیے رکھتی ہے۔

شوہرئیں کو ایک معنوی دنیا سمجھا جاتا ہے جہاں کے باسیوں کا طرز زندگی، ان کا اوڑھنا پچھنا، جذبات، تعلقات، ملنا ملنا سب کچھ بناوٹی ہے۔ وہ کسرے کے سامنے جھوٹی محبت کا نایک رچا پڑا، آنکھوں میں گیسرین بھر کر پٹپٹ آنسو بہاتے اور جذباتی مکالے بولتے بولتے فنکاری کے اس درجے پر فائز ہو جاتے ہیں جہاں نقل پر اصل کا گماں ہونے لگے۔ وہ پردے پر جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں، اسی کے حوالے سے عام فلم بین ان کی شخصیت کے بارے میں ایک تصور قائم کر لیتا ہے مثلاً ایک ولن کے بارے میں یہ سمجھا لیا جاتا ہے کہ وہ جیسا پردے پر نظر آتا ہے، عام زندگی میں بھی ویسا ہی ہوگا۔ اسی طرح ایک فلمی اداکارہ کو بھی ہر فلم میں مختلف اداکاروں کے ساتھ جوڑی بنانا پڑتی ہے۔ اگر کوئی جوڑی ہٹ ہو جائے اور فلم ساز انہیں اپنی فلموں میں مسلسل کاسٹ کرنے لگیں تو ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں منظر عام پر آنے لگتی ہیں۔ یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا کہ ان لوگوں کی بھی اپنی کوئی ذاتی زندگی ہے جو اسکرین ورلڈ سے بالکل مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ ان کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے جو محبت کا جھوٹا نایک کرتے کرتے بھی سچ کی بجائے کھوکھلا ہو سکتا ہے۔

فلمی دنیا میں محبت کی ایسی کئی داستانوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کی یاد آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ فلمی دنیا کے لہجہ دیپ کمار کے بارے میں مشہور ہے کہ ساتھ کام کرنے والی ہر بیرونی ان پر فریفتہ ہو جاتی تھی۔ کامنی کوشل کے ساتھ دیپ کمار کا تعلق کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی نے ان دونوں کے منہ زور عشق کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ

آرزو کے سیٹ پر ہاتھوں میں ہاتھ دیے بیٹھے رہتے۔ کامنی کوشل شادی شدہ تھی اور اس کے شوہر مسٹر سودھن پوری ٹرسٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ایک بار کامنی بھائی بھرا ہوا پھوتلے کلم کے سیٹ پر پہنچ گیا اور اس نے کامنی کو دھمکی دی کہ اگر اس نے دیپ کمار سے ترک تعلق نہ کیا تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور دیپ کمار کا پہلا عشق اپنی موت آپ مر گیا۔

دیپ کمار کی زندگی میں آنے والی دوسری بیرونی مدھو بالا تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی اسکرین پر آج تک اس سے زیادہ خوبصورت اداکارہ نہیں آئی۔ ویسے تو مدھو بالا سرے پاؤں تک حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی لیکن اس کی قیامت خیز مسکراہٹ دیکھنے والے کا قرار لوٹ لیا کرتی تھی۔ دیپ کمار بھی اسی مسکراہٹ کا اسیر ہوا۔ فلم نذرانہ کی شوٹنگ کے دوران ان کا عشق زوروں پر تھا اور لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ دونوں جلد ہی شادی کر لیں گے لیکن شاید مدھو بالا پوری طرح دیپ کمار سے تعلق نہیں تھی۔ ایک طرف وہ اپنے شہزادہ سلیم سے پیار کی پتلیں بڑھا رہی تھی تو دوسری جانب اس نے اداکار پریم ناتھ کو بھی امید کی ڈور سے باندھ رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دیپ کمار سے تعلق استوار ہونے سے پہلے وہ پریم ناتھ کی محبت کا دم بھرتی تھی لیکن اس شادی میں اصل رکاوٹ مدھو بالا کا باپ عطا اللہ خاں تھا جو کسی قیمت پر سونے کی چڑیا سے ہاتھ دھوٹا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بیٹی کو دیپ کمار سے بدظن کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح دیپ صاحب کا یہ عشق بھی ناکام محبت کی داستانوں میں شامل ہو گیا۔

اس کے علاوہ فلمی دنیا میں جن جوڑوں کے عشق کی داستان عام ہوئی ان میں ریکھا، اجیتا بھجین، وجیدہ رحمان، گوردوت، نینا شم، راجیش کھنہ، دیو آنند، راج کپور، نرگس، سری دیوی، ہمن چکرورتی، اشوک کمار، ثنی جیوت، دھرمیندر، مینا کمار، سنی دیول، ڈیمل، سمیتا پائل، راج بھر، عامر خان، پوجا بھٹ۔ مامووری، سنجے دت۔ پاپا شاہ، سو، جان ابراہام وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ان کے عشق کی ناکامی کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر تعلقات وقتی مصلحتوں، کاروباری ضرورتوں اور نفسانی خواہشات پوری کرنے کی غرض سے استوار کیے گئے تھے۔ اوزان میں خلوص و جذبے کا فقدان تھا۔ اس سلسلے میں صرف ایک مثال کا حوالہ دینا کافی ہوگا۔ ایک زمانے میں

مادھوری اور سنجے دت کا فیئر زوروں پر تھا اور بہت سے لوگ یقین کر بیٹھے تھے کہ عشق پر یہ دونوں ستارے شادی کر لیں گے لیکن اس غبارے میں سے ہوا بہت جلد نکل گئی اور بظاہر بے حد مضبوط نظر آنے والا تعلق ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ جب سنجے دت کو غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے الزام میں جیل جانا پڑا تو مبینگی کی پوری فلم انڈسٹری نے اس کے ساتھ اظہارِ ہمت کی لیکن مادھوری اس سے ملنے ایک مرتبہ بھی جیل نہیں گئی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اس تعلق میں غرض پنہاں تھی اور مادھوری نے محض اپنے کیریئر کو آگے بڑھانے کے لیے سنجے کے ساتھ محبت کا ڈھونگ رچایا تھا۔

بے وقافی اور خود غرضی پر مبنی ان داستانوں میں سے ایک کا مرکزی کردار رونی بونی بھی ہے۔ اس بے مثال اداکارہ نے ستر کی دہائی میں اپنے شاہانہ طرز زندگی، کھلے ڈلے اور بے باک انداز اور لا جواب اداکاری سے بولی ووڈ میں دھوم مچا دی۔ بہت سے اداکار اسی طرح کا خاندانی پس منظر رکھتے ہیں۔ ان کی اکثریت متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے جو طویل جدوجہد کے بعد خوش حالی کے دور میں داخل ہوتے ہیں۔ پروین بونی کا تعلق جونا گڑھ کے نواب خاندان سے تھا۔ یہ افواہ بھی ایک عرصہ تک گردش کرتی رہی کہ وہ نواب آف جونا گڑھ کی ناجائز اولاد ہے اور اس کی ماں نواب کے محل کی ملازمہ تھی۔ ان شبہات کو اس وجہ سے بھی تقویت ملتی ہے کہ پروین نے اپنے کسی انٹرویو میں بھی باپ کا ذکر نہیں کیا اور کئی محفلوں میں اس کے لیے نازیبا کلمات ہی استعمال کیے۔ البتہ پروین کی ماں جمال بخت بابی کے مطابق وہ وہی محمد خان کی بیٹی تھی جو نواب کے محل میں ملازم تھا اور نواب صاحب اس پر بے حد مہربان کیا کرتے تھے۔ اس کی خدمات کے اعتراف میں نواب صاحب نے ایک محل نما حویلی اس کے نام کر دی تھی جہاں جمال بخت شہزادیوں کی سی زندگی گزارتی تھی۔ پروین بونی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی جس کی پرورش بڑے ناز و نعم میں ہوئی۔ اس محل نما حویلی میں اسے زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔ وہ اچھا کھاتی، اچھا پہنتی اور اس کی خدمت کے لیے اس محل نما حویلی میں ملازمین اور خادماؤں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جن صحافیوں کو یہ حویلی دیکھنے اور پروین بونی کی ماں سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان کا کہنا ہے کہ نواب کے کسی ملازم کے لیے یہ شان و شوکت اور طرز رہائش اختیار کرنا ناممکن نہیں اور یہ سب کچھ نواب آف جونا گڑھ سے تعلق کے بنا بخت بیگم کو

ساحر لہریا نوئی اور امرتا پریتم کی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ساحر شعر و ادب کی چمکند یوں پرکھٹ بھاگ رہا تھا۔ امرتا شادی شدہ تھی۔ چند نقیصں لکھ چکی تھی اور لاہور ریڈیو پبلیکیشن پر بھی پروگرام کرنے جایا کرتی تھی۔ ساحر کا کلام ساحر سے سننے ہی فدا ہوگئی۔ وہ ہندی اور گورکھی میں ناولیں، کہانیاں، نقیصں، غزلیں، گیت لکھا کرتی تھی۔ اس نے ساحر کو اپنے گھر بلایا۔ ساحر میں یہ ہمت و حوصلہ کہاں تھا کہ ایک نوجوان اور خوبصورت عورت سے ملاقات کے لیے تنہا چلا جاتا۔ اس لیے وہ دوستوں میں سے کسی کو ساتھ لے جاتا جبکہ امرتا کا عالم یہ تھا کہ وہ ساحر سے اپنے پیار کو کسی سے پوشیدہ نہیں رکھتی۔ اپنے شوہر اور گھر والوں کے سامنے بھی اپنے پیار کا اقرار کرتی جس کا ذکر اس نے "رسیدی لکٹ" میں بھی کیا ہے۔ مگر یہ محبت پروان نہ چڑھ سکی۔ آدمی مادھوری رہ گئی۔

اقتباس: ساحر اور فن شاعری
از مجرا اقبال مظفر پوری
مرسلہ: ڈاکٹر روبینہ نقیص انصاری، بمبکر

حاصل نہیں تھا۔ اس ماحول میں پرورش پانے والی پروین عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ثابت ہوئی۔ ماں کے لاڈ پیار نے اسے خوبصورت، باغی، ضدی اور مغرور بنا دیا تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی اور ذرا اسی بات پر لوگوں کی بے عزتی کر دیتی، جو چیز پسند آ جاتی، اسے حاصل کیے بنا نہ رہتی۔ ایک مرتبہ وہ ماں کے ساتھ بازار گئی تو اس کی نظر ایک خوبصورت فراک پر پڑی، اس وقت تو اس نے کچھ دھیان نہ دیا لیکن رات کے پچھلے پہر کسی وقت اس کی آنکھ کھلی تو اسے وہ فراک یاد آئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ ماں نے بہت سمجھا یا صبح دکان کھلے پر اس کی فرمائش پوری کر دی جائے گی لیکن وہ

بہنہ جی کہ اسے وہ فراک اسی وقت چاہیے۔ مجبوراً تو کروں کو دوڑایا گیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح دکان دار کے گھر پہنچے، اسے گہری نیند سے جگا کر دکان کھلوائی اور مطلوبہ فراک لے کر واپس آگئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پروین نے اس فراک کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور ماں سے کہا کہ وہ اسے کپڑوں کی الماری میں ٹانگ دے۔

وہ فطری طور پر بلاک ڈین اور تیز تھی۔ اس کا تعلیمی ریکارڈ ہمیشہ بہتر رہا اور اپنے سماجی طالب علموں سے ہمیشہ آگے رہی، گھریلو خوش حالی اور کسی قسم کی ذہنی پریشانی نہ ہونے کے سبب اس کے اندر خاصا اعتماد آ گیا تھا۔ وہ بے فکری کی زندگی گزار رہی تھی اور نو عمری میں ہی لڑکوں سے فلیٹ اور دوستیاں کرنے لگی تھی۔ پروین کی ماں کا کہنا تھا کہ اس جیسی حسین اور ذہین لڑکی کو جتنا گڑھ میں نہیں بھی۔ اسکول کے لڑکے اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے۔ یہیں سے اس کے ذہن میں یہ سوچ پروان چڑھنے لگی کہ وہ ایک پرنسپل لڑکی ہے جو مردوں کو دیوانہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ ٹین ایج میں ہی آزاد خیال اور اپنے پروں پڑاؤنے کے قابل ہو گئی تھی۔

پروین کی بہتی کھلتی زندگی کو پہلا بریک اس وقت لگا جب اس کے والد کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ تکلیف نے انہیں بے حال کر رکھا تھا اور وہ کئی راتوں تک سکون سے نہ سو سکے جس کی وجہ سے پورا گھر پریشان تھا۔ پروین ویسے بھی بہت حساس طبیعت تھی۔ اس لیے باپ کی بیماری نے اس کے ذہن پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ پروین کے والد اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکے اور بیوی و بیٹی کو روتا ہوا ہلکا چھوڑ کر آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس حادثے نے شعوری طور پر پانچتہ پروین کے ذہن پر منفی اثرات مرتب کیے۔ اسے اپنے باپ سے شکوہ تھا کہ وہ بہت جلد اسے تنہا کر کے چلے گئے۔ حالانکہ پروین کی ماں نے اسے کسی بھی مرحلے پر باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا اور پہلے سے زیادہ اس کے ناز و نگرہ اٹھاتی رہی۔

باپ کے مرنے کے بعد اسے اور زیادہ آزادی مل گئی۔ وہ جوتا گڑھ جیسی چھوٹی جگہ میں رہ کر اپنے آپ کو ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ لہذا اس نے اورنگ آباد میں اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سینٹ زیور کا کالج، احمد آباد میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی وہ اپنی ذہانت، خوبصورتی اور خدا داد صلاحیت کی بدولت لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس

کی آزاد خیالی نے لڑکوں کو بہت متاثر کیا اور وہ سب اس سے قریب رہنے کے بھانے ڈھونڈنے لگے۔ انہی دنوں فلم سازی آ رہا تھا۔ اپنی فلم جتھر کے لیے ایک بولڈ لڑکی کی تلاش میں تھے۔ انہیں کسی نہ پروین کے بارے میں بتایا تو وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے کالج تک آگئے اور پروین کو اپنی فلم میں کام کرنے کی پیشکش کردی۔ اسے وہ مشہور کرکٹر سلیم درانی کے بالمقابل ہیروئن کا سٹ کرنا چاہ رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ کئی لڑکیوں کے آڈیشن کر چکے تھے لیکن انہیں کوئی بھی اس کردار کے لیے موزوں نظر نہیں آئی۔ پروین سے ملنے کے بعد انہیں لگا کہ یہی وہ لڑکی ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔ اس طرح پروین کے فلمی سفر کا آغاز ہوا۔

ممبئی آنے کے بعد پروین کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ یہاں جوتا گڑھ جیسی آسائشیں تو نہ تھیں لیکن نوابی ماحول سے آگاہی ہوئی آزاد خیال لڑکی کے لیے یہ شہر خوابوں کا نگر ثابت ہوا جہاں وہ کسی روک ٹوک کی بنا اپنی خواہشات پوری کر سکتی تھی۔ اس شہر نے اسے اس بری طرح اپنے سحر میں جکڑا کہ پھر اس کے لیے جوتا گڑھ واپس جانا ممکن نہ رہا۔ بڑے شہر انسانوں کو اسی طرح نگل لیتے ہیں۔ پروین نے بھی اپنی رہائش کے لیے جوہر کا علاقہ ہی منتخب کیا۔ یہ جگہ پروین کو اپنے مزاج کے مطابق لگی اور اس نے ایک گھڑی فلیٹ لے کر ممبئی کو اپنا مستقل ٹھکانا بنالیا۔ اس زمانے میں پروین اور زینت امان ہی ایسی لڑکیاں تھیں جو غیر فلمی اور قدامت پرست ماحول سے آکر ممبئی کی تیز رفتار زندگی میں اس طرح بس سکتی تھیں ان کا جنم ہی اس شہر میں ہوا ہو۔ ممبئی میں رہنا اور یہاں کے آئینوں کو فوڈ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں لیکن پروین کو بھی یہ خوف نہیں رہا کہ وہ تنہا لڑکی ہونے کی وجہ سے اس ماحول میں نہیں رہ سکے گی۔

پروین کی پہلی فلم کامیاب نہ ہو سکی لیکن اپنے لیے قد، سکی ایجنج اور بولڈ سین کی وجہ سے وہ فلم سازوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ان دنوں ایجنجہ کا لمبا قد فلم سازوں کے لیے مسئلہ بنا ہوا تھا اور انہیں اس کے مقابل کام کرنے کے لیے مناسب قد کی لڑکی نہیں مل رہی تھی۔ پروین بولی کے آجانے سے یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ ایجنجہ بچن کے ساتھ آٹھ فلموں میں کام کیا جو سب پیرہٹ باہت ثابت ہوئیں۔ اس کی دوسری کامیاب فلموں میں سہاگ، کالا پتھر، نمک حلال، کلا سونا اور جانی دوست وغیرہ شامل ہیں۔ وہ بھارت کی پہلی

اداکارہ ہے جس کی تصویر ٹائم میگزین کے سرورق پر شائع ہوئی۔

لیش چو پڑہ کی فلم دیوار، سے پروین بولی کا ایک نیا ایجنج سامنے آیا پھر اسے اسی قسم کے کرداروں کی پیشکش ہونے لگی۔ ایک ایسی لڑکی جو مردوں کے معاشرے میں اپنے اصولوں کے ساتھ جیتی ہے۔ شراب پیتی اور اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہوئے نہیں ڈرتی۔ اس نے بولڈ اور شارپ ایجنج کے ساتھ پہلی عیادی اور وہ راتوں رات اسٹار کے درجے پر فائز ہو گئی۔ ٹائم میگزین نے اس کی جو ٹائٹل اسٹوری شائع کی، اس کی سرخی تھی ”پروین بانی نے بولی ووڈ کا چہرہ اور ایکٹریس کی ایجنج بدل ڈالنے کی روایت قائم کی۔“

پروین بانی کا شمار ان چند ہیروز میں ہوتا ہے جن کے نام پر فلم بین سنبھال کا رخ کیا کرتے تھے۔ ایک ایسے دور میں جبکہ پروین کا کیریئر تیزی سے مستحکم ہو رہا تھا کہ وہ عشق کے بخار میں مبتلا ہو گئی اور اس نے اپنے عروج کے دور میں پہلے بوائے ٹائپ کبیر بیدی سے دل لگالیا۔ اس کی خاطر ممبئی چھوڑنا گوارہ کیا اور اس کے ساتھ اٹلی چلی گئی جس کے نتیجے میں اس کا کیریئر متاثر ہوا لیکن پروین کو اس وقت صرف کبیر ہی نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ وہ کبیر بیدی کے ساتھ اٹلی اور سوئٹزر لینڈ میں اس طرح گھومتی رہی جیسے نئی مومن پرگتی ہو۔

کبیر بیدی اور پروین بولی کے عشق کی داستان کو آگے بڑھانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کبیر کے پس منظر بر تعویسی روٹی ڈال دی جائے۔ اس کا تعلق ایک غیر فلمی گھرانے سے ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت اختیار کر لی اور صرف پانچ سال بعد ہی فلم کے شعبے کا سربراہ بن گیا۔ ابتدا میں اسے ہدایت کاری کے شعبے سے دلچسپی تھی لیکن تقدیر کی مہربانی سے اداکار بن گیا۔ وہ بیک وقت فلم، تھیٹر اور ٹیلی وژن کا اداکار ہے اور اس نے بھارت کے علاوہ امریکا اور یورپ میں بھی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

عورتوں کے معاملے میں اس کی شہرت بھی اچھی نہیں رہی۔ وہ اب تک تین شادیوں کر چکا ہے۔ پہلی شادی پرہتما سے ہوئی جو ایک رفاقت تھی۔ اس سے اس کے دو بیٹے پوجا بیدی اور سدھارتھ ہوئے۔ پوجا بیدی ہندی فلموں کی اداکارہ ہے اور ان دنوں اخبارات میں کالم لکھ رہی ہے۔ مینا

سدا جارتھ، امریکا کی بیوٹوشی میں بڑھ رہا تھا کہ تیز رفتاری کے مرض میں مبتلا ہو گیا اور اس نے پچیس سال کی عمر میں خودکشی کر لی۔ پرہتما سے طویل اختیار کرنے کے بعد کبیر بیدی نے پروین بانی سے تعلق استوار کر لیا اور وہ اس کی محبت میں ایسی باکل ہوئی کہ اپنا کیریئر داؤ پر لگا کر اس کے ساتھ اٹلی چلی گئی۔ گو کہ ان دنوں کی شادی نہیں ہوئی لیکن وہ اٹلی اور سوئٹزر لینڈ میں ہی مومن مانتے رہے۔ بہت جلد کبیر نے اپنی فطرت کے مطابق پروین بولی سے بے رحمی اختیار کرنا شروع کر دی اور بہانہ یہ بنایا کہ ہالی ووڈ اور یورپ میں اس کی مقبولیت دیکھ کر پروین بولی عدم تحفظ کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کبیر بیدی نے برطانوی فیشن ڈیزائنر سون ہنر سے شادی رچائی۔ اس کے کٹن سے ایک بیٹا آدم بیدی پیدا ہوا جو بین الاقوامی ماڈل ہے اور اس نے حال ہی میں بولی ووڈ کی فلم ہیلو کون ہے؟ سے اپنے ایکٹنگ کیریئر کا آغاز کیا ہے۔ یہ شادی بھی طلاق پر ختم ہوئی۔

1990ء کے آخر میں بیدی نے نی دی اور ریڈیو کی میزبان کی بیدی سے شادی کی۔ اس سے کوئی بچہ نہیں ہوا اور ان دنوں کے درمیان 2005ء میں طلاق ہوئی۔ اس کے بعد بیدی نے سماجی شخص پروین دوسانج سے تعلقات قائم کر لیے۔ اس کے علاوہ بھی اس کا نام مختلف عورتوں کے ساتھ آتا رہتا ہے جبکہ اس کا کہنا ہے کہ وہ عورتوں کا شکاری نہیں ہے بلکہ وہ خود اس کے پیچھے آتی ہیں۔

اس کا دعویٰ کسی حد تک مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ کم از کم پروین بانی کے معاملے میں تو ایسا ہی ہوا۔ وہ اسے اتنا چاہتی تھی کہ تعلق قائم ہوجانے کے بعد ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارہ نہ تھی چنانچہ جب کبیر بیدی اپنی فلم کی شوٹنگ کے لیے اٹلی جانے لگا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی روانہ ہو گئی اور یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی کہ اس طرح اس کے کیریئر کو کتنا نقصان پہنچے گا۔ واقعی جب انسان کی سر پر عشق کا بھوت سوار ہو تو اس کی عقل جواب دے جاتی ہے۔ کبیر بیدی کو اس کی محبت کی شدت کا احساس تھا۔ اس نے پروین کے ساتھ اپنے تعلق کو بڑے ہی جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔

”پروین میری زندگی میں اس وقت آئی جب پرہتما کے ساتھ میری ریلیشن شپ ختم ہو چکی تھی۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ ذہین بھی تھی۔ جب میں یورپ گیا تو وہ بھی میرے ساتھ تھی لیکن وہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ میں یورپ میں اس کے مقابلے میں بڑا اسٹار

تھا جس کے نتیجے میں وہ احساس کمتری کا شکار ہو گئی اور اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگی۔ چنانچہ اس نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سارے معاملے میں میرا کوئی کردار نہیں تھا۔ میں نے اس سے چلنے کے لیے کہا اور نہ ہی واپس بھیجے کی بات کی۔“

کبیر بیدی کی ان باتوں میں بڑا بھولا پن جھلکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یورپ میں اپنے کام کے حوالے سے وہ جوڑی بہت شہرت رکھتا ہو لیکن جب پروین بوبی سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تو وہ بوبی دوڑ میں دوسرے یا تیسرے درجے کا اداکار تھا اور اسے فلموں میں ثانوی رول ملا کرتے تھے گوکہ اس نے پچاس کے قریب فلموں میں کام کیا لیکن ان میں سے بیشتر نا کام رہیں، کبیر بیدی کو اپنا کیریئر آگے بڑھانے کے لیے ایک مضبوط سہارا کی ضرورت تھی اور جب پروین بوبی سے اس کی قربت پر وہی تو بیدی نے لک کر اس کا ہاتھ تمام لیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک مشہور ہیروئن کے ساتھ تھی ہو کر اس کے دن بھر جائیں گے لیکن اس کی یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ پروین اس سے محبت تو کر سکتی تھی لیکن اسے فلمیں نہیں دلا سکتی تھی۔

اسکرین پر اپنی اداؤں اور گھبر سے لاکھوں دلوں پر راج کرنے والی پروین عام زندگی میں بہت ہی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ کبیر بیدی کی چالوں کو نہ سمجھ سکی اور کچے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آن گری۔ اسے ایک ایسے مرد کی ضرورت تھی جو اس سے سچی محبت کر سکے۔ اس نے پورے غلوں اور بے غرضی سے اپنی زندگی میں آنے والے ہر مرد پر چاہت کے پھول پھار دیے لیکن بدلے میں اسے صرف دھوکا اور جھوٹے وعدے ہی ملے۔ کبیر بیدی سے مل کر اسے یوں لگا جیسے اس کی زندگی کا خلا پر ہو گیا ہے۔ کبیر بیدی نے کچھ اتنی ہوشیاری سے محبت کا چال پھینکا کہ وہ خود بھی اس کی کشش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور دونوں کا زوردار فیئر شروع ہو گیا گوکہ کبیر بیدی شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا لیکن اس کے باوجود پروین اس کی محبت میں آگے بڑھ گئی۔

پروین بوبی اور کبیر بیدی کا تعلق ٹوٹنے کی کوئی بھی وجہ رہی لیکن اس کے بعد بھی کبیر بیدی نے پروین بوبی کی کبھی بُرائی نہیں کی بلکہ اکثر مواقع پر اس کی کئی خوبوں کا فرائض دلی سے اعتراف کر لیا۔ پروین کے انتقال کے بعد ایک میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا ”میں اور پروین اس

گروپ میں شامل تھے جو تفریح کی غرض سے جوہو پر جایا کرتا تھا۔ اس طرح ہماری ملاقاتیں ہوتی گئیں۔ اس گروپ میں اس زمانے کے نوجوان اداکار مثلاً شیکھر کپور، ڈینی، پراگت سہتی، دیو آنند اور ان کا بھائی شامل تھے۔ دیو آنند گو میں نے نوجوان اس لیے لکھا ہے کہ انہوں نے اٹھاسی سال کی عمر میں بھی اپنے آپ کو بوڑھا نہیں سمجھا اور سرتے دم تک جوانوں کی طرح ایک کرتے رہے۔

پروین کے ساتھ میں نے صرف ایک فلم بلٹ میں کام کیا جو 1976ء میں ریلیز ہوئی تھی لیکن ہمارا ذاتی تعلق بہت مضبوط تھا۔ ہمارے بیچ محبت پر مبنی مٹی اور ہم تین سال تک ساتھ رہتے رہے۔ اس زمانے میں بھی لوگ ہمارے تعلق کے بارے میں جانتے تھے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ ہم دونوں ساتھ رہ رہے ہیں۔ وہ زندگی سے بھرپور عورت تھی اور دماغ سے زیادہ دل کی بات پر دھیان دیتی تھی۔ اس کی موت جن حالات میں ہوئی، اس کے بارے میں سوچ کر ہی انفس ہونے لگتا ہے۔ بوبی دوڑ میں ابتدائی کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود اس کی زندگی دکھوں سے عبارت تھی۔ جو ناگڑہ سے آنے والی یہ لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے بوبی دوڑ پر چھائی لیکن زندگی کے آخری ایام میں بیماری نے اس سے سب کچھ چھین لیا اور اس کی پوری کہانی ایک شہید میں بدل گئی۔

مہیش بھٹ نے مجھے بتایا کہ اسے شیزوفرینا ہو گیا تھا جو کہ انتہائی خطرناک قسم کی بیماری ہے۔ اس سے آخری ملاقات میری پہلی بوی پر۔ مہیش بیدی کی یاد میں ہونے والی ایک تقریب کے موقع پر ہوئی۔ وہ اسے خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے آئی تھی جو میری نظر میں اس کی عظمت کی دلیل ہے حالانکہ پرستار نے اسے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ اسے ایک ایسی عورت سمجھتی تھی جس نے مجھے اس سے چھین لیا۔ اس کے باوجود اس کی یاد میں ہونے والی تقریب میں پروین کا آنا ایک حیرت انگیز اقدام تھا۔

مجھے یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا کہ اس کے جنازے میں فلمی صنعت کے بہت کم لوگ شریک ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فلمی دنیا میں لوگوں کو وہی کچھ نظر آتا ہے جو سامنے ہوتا ہے۔ آنکھ اوچھل، پہاڑ اوچھل والا محاورہ اس اثر سڑی پر پوری طرح فٹ بیٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ پروین آخری دنوں میں کچھ نفسیاتی الجھنوں کا شکار بھی رہی اور اس نے فلمی صنعت کے کئی لوگوں پر مختلف نوعیت کے الزامات

عائد کیے تھے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں نے اسی ڈر سے جنازے میں شرکت نہ کی ہو کہ اس طرح وہ ان الزامات کو درست مان لیتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی، میں بھی میں ان میں شامل ہوں۔ کسی کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین لڑکی تھی۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع اور سوچ گہری تھی۔ عمر کے آخری حصے میں وہ نفسیاتی بیماری کا شکار ہو گئی تھی جس نے اس کی ذہانت کو بھی متاثر کیا۔ بولڈ ایج کی وجہ سے بھی اس کی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ وہ محبت کی بھوکھی تھی لیکن لوگوں نے اسے جسمانی تسکین کا ذریعہ جانا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا رہے۔ اسی لیے یورپ جانے سے پہلے میں نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ میرا پیچھا کرنے کی بجائے بوبی دوڑ میں رہ کر ہی اپنے کیریئر پر توجہ دے لیکن اس کی عقل میں میری بات نہیں آئی۔

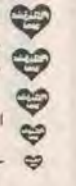
بہت سے لوگ مجھے بھی پروین کی زندگی پر یاد کرنے کا ذمہ دار سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے زندگی میں کسی عورت کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا جبکہ وہ مجھے اپنی ملکیت سمجھتی تھی اور مجھ پر اپنا قبضہ جمائے رکھنا چاہتی تھی۔ جب وہ میرے ساتھ یورپ گئی اور اس نے مجھے وہاں پرستاروں کے جھوم میں گھرے دیکھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا، اس نے مجھے دوسری عورتوں سے دور رکھنے کی کوشش کی اور جب کامیابی نہ ہوئی تو ناراض ہو کر واپس چلی آئی۔ مجھے اس سے بچھڑنے کا وقتی طور پر انفس تو ضرور ہوا لیکن عورت کو میں نے کبھی اپنے سر پر سوار نہیں کیا۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اس کی محبت کی قدر نہیں کی تو یہ بالکل غلط ہے۔ میری لغت میں محبت کا لفظ ہی نہیں ہے۔ میں عورتوں سے محبت نہیں کرتا بلکہ جو پسند آجائے، اسے ہم سفر بنالیتا ہوں جو مختصر یا طویل بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا انحصار وقت، حالات اور تعلقات کی نوعیت پر ہے۔“

یہ تو تصویر کا ایک رخ تھا جس میں کبیر بیدی نے اپنے آپ کو بڑا معصوم ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور سارا لمبا پروین بوبی پر ڈال دیا ہے لیکن حقائق اس کے برعکس ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے پروین بوبی کی آزاد خیالی اور کھلے ذلے طرز زندگی کو دیکھتے ہوئے اس سے جذباتی تعلق قائم کر لیا۔ وہ اس میدان کا نرانا کھلاڑی تھا اور اس نے پروین کی تعلقی دور کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کبیر بیدی کے

سدا ملبھوڑا آپس پر وہ آواز کا جادو جگانے آئی تھی۔ قدرت نے اسے دولت حسن سے بھی نوازا تھا۔ وہ گلوکارہ کم اور ہیروئن زیادہ کہہ سکتی تھی۔ ایسے وقت میں جب لائیکسٹر انڈینلی نے نئی گلوکاراؤں کے راستے بند کر رکھے تھے۔ سدا ملبھوڑا نے زبردستی اپنی جگہ بنائی۔ شریف اور قابل عزت گھرانے سے تعلق تھا اس لیے اسے مضبوط سہارا ملتا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ لائیکسٹر کی اجارہ داری کو توڑنے میں کامیاب رہی تھی۔ اس کے حسن جہاں خیر سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر وہ ہر ایک سے دامن بچا رہی تھی لیکن ایک مقام پر آ کر اس کے دل نے بغاوت کر دی۔ وہ نہایت دھبی چال سے ساحر لدھیانوی کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ مذہبی اعتبار سے دونوں دیا کے دو کنارے تھے مگر دل نہ پوچھتے ذات پات، وہ بھی ہر پابندی کو پھلانگ کر ساحر کی بن جانا چاہتی تھی لیکن ساحر پتھر کا بت بنا رہا۔ اس نے مایوس ہو کر ایک دوسرے شخص کو ہم سفر بنالیا۔ ساحر نے اس موقع پر وہ مشہور لکھی ”چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں۔“

بارے میں اس کی پہلی بیوی پرستار نے انکشاف کیا کہ وہ ایک درندہ ہے جسے اپنے جیسے جانور کی تلاش رہتی ہے۔ پرستار کے بقول پروین بھی ایسی ہی ایک عورت تھی اور مردوں کے معیار پر پوری اُترتی تھی جب کبیر بیدی کا دل بھر گیا تو اس نے اپنی عادت کے مطابق دوسری عورتوں سے راہ و رسم بڑھانا شروع کر دی۔ یہ رویہ پروین کے لیے ناقابل برداشت تھا اور یہی ان کی علیحدگی کا سبب بنا۔

کبیر بیدی سے تعلق ختم ہو جانے کے بعد پروین بری طرح ٹوٹ چھوٹ گئی تھی۔ اس نے کبیر کو بڑے خلوص سے چاہا تھا لیکن جواب میں اسے بے وفائی کا ذمہ سہا پڑا۔ وہ جو مردوں کی نفسیات سمجھنے کا دعویٰ کرتی تھی، کبیر بیدی کے معاملے میں ہار گئی۔ سگریٹ اور شراب سے اس کی پرانی شناسائی تھی۔ کبیر سے بچھڑنے کے بعد اس نے ایک بار پھر



ان چیزوں کا سہارا لیا۔ ایسے میں فلم ساز و ہدایت کار میٹھ بھٹ آگے بڑھا اور اس نے پروین کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ میٹھ بھٹ کے لیے مشہور ہے کہ پوری فلم انڈسٹری میں اس سے زیادہ چالاک اور شاطر شخص کوئی نہیں ہے۔ وہ کسی نقصان نہیں پہنچاتا لیکن اپنا کام نکالنے کے لیے دوسروں کو استعمال کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ اس نے پروین کی ذہنی اور قلبی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے اپنا جال بچھایا اور زخم خوردہ پروین ایک بار پھر محبت کے نام پر پٹنی چوٹ کھانے کے لیے تیار ہوئی۔

وہیے تو قلبی دنیا میں کوئی بھی شخص پارسائی اور شرافت کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن میٹھ بھٹ کے کیریئر پر نظر ڈالنے سے ہی اس کی شخصیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جسمانی عیاشی کو چھپایا جاسکتا ہے لیکن ذہنی عیاشی کسی نہ کسی انداز میں سامنے آ جاتی ہے۔ میٹھ بھٹ نے جتنی بھی فلمیں بنائیں ان میں سے بیشتر سیکس، تشدد اور جرائم پر مبنی ہیں۔ اس کی فلموں میں بولٹ منظر کی بہتات ہوتی ہے جس سے اس کی ذہنی عیاشی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب میٹھ بھٹ اور پروین بولی کی ملاقات ہوئی تو وہ پہلے سے شادی شدہ تھا اور اس نے صرف تیس سال کی عمر میں لورین برائن سے شادی کر لی تھی۔ بعد میں اس کا نام کرن بھٹ رکھ دیا گیا۔ کرن سے اس کے دو بچے پوچا بھٹ اور راہول ہیں۔ پروین بولی سے تعلق قائم ہو جانے کے بعد میٹھ بھٹ اور اس کی بیوی میں علیحدگی ہو گئی۔ پروین کے ساتھ اس کا افیئر بہ مشکل ڈھائی سال چل سکا پھر اس نے بھی پروین کی بیماری کا بہانہ بنا کر اس سے منہ موڑ لیا اور فلم ایکٹریس ہدایت کارہ سوانی رازداں سے شادی کر لی جس سے اس کی دو بیٹیاں شاپن بھٹ اور عالیہ بھٹ ہیں۔ عالیہ کو ہدایت کار کرن جوہر نے اپنی فلم اسٹوڈنٹ آف دی ائرز میں کاسٹ کر لیا ہے۔

پروین بانی سے اکتھار ہمدردی کے حوالے سے میٹھ بھٹ نے بھی بڑے بلند و بانگ دعوے کیے ہیں اور اس معاملے میں وہ کبیر بیدی سے کئی قدم آگے نظر آتا ہے۔ اس نے پروین بولی سے اپنے تعلق کو واضح کرنے کے لیے دو فلمیں ارچہ اور وہ لمحے بھی بنائیں۔ ارچہ کی کہانی کا مرکزی خیال یہی ہے کہ ایک فلم ڈائریکٹر، اداکارہ سے جنسی تعلق قائم کرنے کے بعد اپنی بیوی سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اس طرح گویا اس نے دنیا کے سامنے اپنے اور پروین

بولی کے تعلق کو واضح کر دیا۔ گویا وہ اس کی رکھیل تھی جسے وہ جب چاہتا بستر کی زینت بنالیتا تھا۔ ارچہ بنا کر بھی میٹھ بھٹ کی طبیعت سیر نہیں ہوئی تو اس نے 2006ء میں وہ لمحے کے نام سے ایک اور فلم نمائش کے لیے پیش کی جو پروین بولی کی زندگی اور میٹھ بھٹ کے ساتھ اس کے محاشے پر مبنی تھی۔ میٹھ بھٹ کا کہنا ہے کہ اس نے یہ فلم پروین بولی کو خراج تحسین پیش کرنے اور ان یادوں کا اعادہ کرنے کے لیے بنائی ہے جو اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس فلم میں پروین بولی کا کیریئر کتنا تناوت نے کیا تھا۔ نقادوں نے فلم کے اسکرین لے، ہدایت کاری اور کتنا تناوت کی اداکاری کی تعریف کی لیکن تجارتی اعتبار سے یہ فلم اوسط درجے کی کامیابی حاصل کر سکی۔

میٹھ بھٹ اور پروین بولی کا تعلق صرف ڈھائی سال قائم رہ سکا۔ اس تعلق کے قائم ہونے اور ٹوٹنے کی کہانی میٹھ بھٹ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے ”اس سے میری پہلی ملاقات 1970ء کے آخر میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہی جذباتی طور پر زخم خوردہ تھے۔ اس کی کبیر بیدی سے انہی دنوں علیحدگی ہوئی تھی اور وہ کافی دل شکستہ نظر آ رہی تھی، ادھر میری ازدواجی زندگی کی ناؤ بھی چنگو لے کھا رہی تھی اور کرن کے ساتھ میرے تعلقات بڑی حد تک کشیدہ ہو چکے تھے۔ یہ خوب گزرے گی جوں بیجیں گے دیوانے دو، جنسی صورت حال تھی۔ بلاشبہ اس میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو کسی بھی مرد کو دیوانہ بنا سکتی ہیں لیکن مجھے اس کی ذہانت، سمجھ داری اور مسکراہٹ نے بے حد متاثر کیا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسی یا کمال عورت نہیں دیکھی۔ وہ میری نظر میں ایک مکمل گلیمر گرل تھی جس نے اپنے طرز زندگی کے بارے میں کبھی شرم محسوس نہیں کی۔

ہم دونوں کے راستے اس وقت الگ ہوئے جب اسے شیئر فرینا کا عارضہ لاحق ہوا جبکہ میں اس کے ساتھ ایک فلم شروع کر چکا تھا لیکن گیارہ ریلیوں کے بعد مجھے اس فلم کو ڈیوں میں بند کرنا پڑا کیونکہ اس کی بیماری کے سبب فلم کی مزید شوٹنگ کرنا ممکن نہ رہا تھا، میں اسے کھانا پیپا چاہتا تھا لیکن ساتھ نباہ کرنے کی بھی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنی فلم وہ لمحے میں ان تمام یادوں کو یکجا کر دیا ہے جو پروین کے حوالے سے میرے ذہن میں زوردار آندھی کی مانند چلتی رہتی ہیں۔ میں ایڈیٹنگ روم میں اس فلم کا آخری

منظر دیکھ رہا تھا تب مجھے احساس ہوا کہ کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی ہماری یادوں میں زندہ رہتے ہیں۔ یہ فلم بھی پروین بولی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک کوشش ہے جس سے میں محبت کرتا تھا۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں صبح کے وقت اس کے گھر سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس روز وہ شوٹنگ نہ ہونے کی وجہ سے گھر پر ہی تھی۔ اس نے حسب عادت مجھے گرم جوش سے رخصت کیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے آخری بار ہوش کے عالم میں مل رہی ہے۔ میں وہ منظر کیسے بھول سکا ہوں جب شام کو گھر واپس آیا تو وہ فلمی کاسٹیم پہنے، فلم میک اپ کئے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت فیک رہی تھی۔ اس نے سر کوئی کے انداز میں مجھ سے کہا۔

”دروازہ بند کر دو میٹھ، وہ ہمیں مارنے کے لیے آ رہے ہیں۔ جلدی بند کر دو، دروازہ بند کر دو۔“ ان الفاظ کو سننے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ پروین کے ساتھ میری محبت، قربت، جوش و جذبہ کے دن ختم ہو گئے ہیں کیونکہ اس کی آنکھوں سے پاگل پن جھلک رہا تھا اور اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ جس پروین کو میں جانتا تھا، وہ مر چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہماری محبت نے دم توڑ دیا۔ میں اسے سمجھتا ہوا دیکھ رہا تھا لیکن اس کی مدد کرنے سے قاصر تھا۔

میں اس سے محبت کرتا تھا۔ اس سے بہت قریب تھا لیکن ایسی عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا جو اپنے ماضی کا سایہ بن کر رہ گئی ہو۔ پروین کی ماں کو اس کی بیماری کا علم ہوا تو وہ ممبئی وڈی چلی آئی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی بیٹی پر جن آگے ہیں جبکہ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اسے یہ بیماری باپ سے ورثے میں مل چکی تھی۔ وہ علاج کے سلسلے میں امریکا بھی گئی لیکن میرا اس سے رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا یہ باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا اور اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، ہم نے پندرہ سال ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ آخری بار اس سے ہالی ڈے ان کی ایک شاپ میں آنا سامنا ہوا تو ہمارے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل ہو چکی تھی اور وہ مجھے بالکل ایک مختلف شخصیت کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔ میرے نزدیک پروین کی موت دو دفعہ واقع ہوئی۔

پہلی بار اس وقت جب اس کا نرپس بریک ڈاؤن ہوا اور دوسری بار جب اس کی قلبی موت واقع ہوئی۔“ میٹھ بھٹ نے پروین بولی کے بارے میں جو کچھ کہا اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تب بھی یہ سوال اپنی جگہ رہتا ہے کہ اس نے ڈھائی سال ساتھ رہنے کے بعد پروین بولی کو بیماری کی حالت میں کیوں تنہا چھوڑ دیا، کیا اسے صرف صحت مند پروین سے غرض تھی اور بیمار پروین اس کے لیے ایک ناکارہ شے بن گئی تھی۔ اگر اس کی ایک پہلو کو لے کر میٹھ بھٹ کی شخصیت اور کردار کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں اس سے زیادہ منافق، جھوٹا، خود غرض اور لاپرواہی شخص نظر نہیں آتا۔ اس نے پروین کی زندگی پر جو دو فلمیں بنائیں، ان کا مقصد اسے خراج عقیدت پیش کرنا نہیں بلکہ اس کے نام کو پیش کروانا تھا۔ اس نے صرف اور صرف پروین کو جذباتی طور پر بلیک میل کیا اور اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی آڑ میں اپنی ہوس پوری کی اور جب وہ اس کے کام کی ندرتی تو اپنا راستہ بدل لیا۔ بے شک میٹھ بھٹ نے پروین کو چاقو، چھری، پتول یا بندوق سے نہیں مارا لیکن اسے قبر تک پہنچانے میں اس کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پروین کی زندگی میں آنے والا تیسرا شخص ایسا بھ بچن ہے جس نے اپنی جوانی کے دنوں میں بولی ووڈ کی ہر بیرونی کواپنے سحر میں گرفتار کر رکھا تھا اور تقریباً ہر چھوٹی بڑی اداکارہ کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ایسا بھ کے ساتھ کی فلم میں کام کرے۔ ایسا بھ کی نجی زندگی پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پورے کیریئر کے دوران ایسا بھ کا نام رومانی طور پر سین اداکاراؤں جیہ بہادری، ریکھا اور پروین بولی کے ساتھ رومانی طور پر جوڑا گیا۔ ایسا بھ اور جیہ بہادری کی شادی کے بعد اس پریم کہانی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ البتہ ریکھا اور پروین بولی کے ساتھ اس کے تعلق کی داستانیں کافی عرصہ تک بولی ووڈ کی فضاؤں میں گونجتی رہیں۔

جب پروین بولی نے بولی ووڈ میں قدم رکھا تو ایسا بھ کا طوطی بول رہا تھا۔ پروین اپنے خوبصورت چہرے اور لمبے قد کی وجہ سے فوری فلم سازوں کی نظروں میں آئی اور اسے ایسا بھ کے ساتھ کاسٹ کیا جانے لگا۔ ان دونوں کی پہلی فلم مجبور بنی سیرت ثابت ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے کئی فلموں میں ایک ساتھ کام کیا جن میں سے بیشتر کامیاب رہیں۔ دیوار، امرا کبر اتھوئی، نمک حلال، شان، کالیا، مہمان، دو اور دو پانچ اور کالا پتھر وغیرہ میں اس جوڑی کو بہت پسند کیا گیا اور اس کے

فلمی فلیڈ

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے ناد روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف
صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل
ہوں اور اپنے روزاں کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی
پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر
آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ
ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی
نشانی اس کی پیشانی پر ثبت کر دے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے
وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت
سے ملتے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید
اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل
رشتہ ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور
شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج
خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درواستال سرگزشت

206

دراصل محبت کی وہی داستانیں مشہور ہوئیں
جن کا انجام ناکامی پر ہوا اور آج بھی لوگ
ان داستانوں میں دلچسپی لیتے ہیں مثلاً لیلی
بجنوں، شیریں فرہاد، سوئی میمنوال، ہیرا رنجھا، سکی پھول، سہتی
مراد، وغیرہ وغیرہ۔ یہ دنیا کی وہ مشہور داستانیں ہیں جن میں
اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہیں عشق میں ناکامی ہوئی۔ ذرا
خود سوچئے کہ اگر لیلی بجنوں کو عشق میں ناکامی نہ ہوتی تو کوئی
آج ان کا نام تک نہ جانتا۔

عشق ناکام
نمبر

ساتھ ہی دونوں کے تعلق کی خبریں بھی اخبارات کی زینت
بننے لگیں۔ ایک بار پھر پروین بولی کی آنکھوں میں خواب
آئے۔ وہ دونوں اکٹرا پارٹیوں میں ساتھ دیکھے جانے لگے
پھر نہ جانے کیا ہوا کہ پروین اچانک ہی منظر سے غائب ہو گئی
اور کافی عرصہ تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔

چھ سال مہینے سے دور رہنے اور پراسرار انداز میں غائب
ہونے کے بعد اچانک ہی اس کی آمد نے ایک دھماکا کر دیا۔
ایک پریس کانفرنس میں اس نے ایسا بیجا پر الزام لگایا کہ اس
نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی کیونکہ اس نے
ایسا بیجے کے دائر کار برائے میں ملوث ہونے کا ثبوت تلاش
کر لیا تھا۔ انجی دھمکیوں سے ڈر کر وہ امریکا چلی گئی تھی۔ ان
انکشافات نے انڈسٹری میں پھیل چادی لیکن ایسا بیجے نے اس
پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی اختیار کیے رکھی کیونکہ وہ
جانتا تھا کہ پروین بولی محض اپنی ناکامی کا انتقام لے رہی ہے
اور اس کا مقصد ایسا بیجے کو بدنام کرنا اور میڈیا کی توجہ اپنی
جانب مبذول کروانا تھا۔ پروین بولی نے ایسا بیجے پر یہ الزام
بھی لگایا کہ اسے ایک فلم کے سیٹ پر حادثاتی موت مارنے کا
پروگرام بھی بنایا گیا تھا جس کا اسے بروقت پتا چل گیا اور وہ
مخاطب ہو گئی۔

پروین بولی کے اس طرز عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے
ماہرین نفسیات کا کہنا تھا کہ شیزوفرینا کا مریض اپنے علاوہ
ہر ایک پر شک کرنے لگتا ہے اور یہ مرض انتہائی ذہین
شخصیات کو لاحق ہوتا ہے۔ ایسا شخص اگر کسی سے اپنی ذہانت
شیزوفرینا کرے تو وہ محض محسوس کرنے لگتا ہے اور تنہائی اس کے
لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ بولی بھی اسی ذہانت کے
ساتھ برباد ہوئی کیونکہ کوئی دوسرا اس کی ذہانت اور
حساسیت کو شیزوفرینا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے جن
مردوں پر تنقید کیا، ان میں سے کسی نے بھی اس کے جذبات کو
سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اپنی غرض پوری کرنے کے بعد
ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے۔

امریکا سے واپس آنے کے بعد پروین نے اپنے
انتہائی قریبی دوستوں اور عزیزوں سے بھی ملنا چھوڑ دیا تھا۔
جس بلڈنگ میں رہتی تھی، اس کے کینوں سے بھی تعلقات نہ
تھے۔ کم ناکامی کی زندگی اس نے خود قبول کی تھی کیونکہ جو بھی
اس سے ملنے گیا۔ اسے بولی کی جانب سے انتہائی بدسلوکی کا
سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اپنے آخری ایام بے حد اذیت میں
گزارے۔ لوگوں سے ملنا بھجنا چھوڑ دیا۔ انڈسٹری کے لوگ

مثلاً ایک محبت کی کہانی یہ بھی ہے۔
ایک بار میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی بیٹھے ہوئے تھے۔
ماحول بہت رومانٹک تھا۔
لڑکے نے اس محبت بھرے ماحول میں لڑکی سے پوچھا
”کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“
لڑکی نے کہا ”ہاں۔“

اور دونوں آپس میں خوش خوش رہنے لگے۔
اس قسم کی کہانی کو بھلا کون یاد رکھے گا؟ ایسی ہزار
کہانیاں ہیں مگر ہمیں ان میں سے ایک کہانی بھی یاد نہیں
ہے۔ وجہ یہ کہ وہ ناکام عشق کی کہانی نہیں ہے۔ یوں بھی
عاشق وہی کہلاتا ہے جو عشق میں ناکام ہوا ہو ورنہ کون کسی کو
یاد رکھتا ہے؟

ہماری فلمی دنیا میں ناکام عاشقوں کی تعداد زیادہ نہیں
ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ جس نے بھی عشق کیا
کامیابی نے اس کے قدم چومے۔

ناکام عشق کی جب بات چلتی ہے تو میڈم نور جہاں کا
ذکر ضرور آتا ہے۔ انہوں نے شوکت حسین رضوی سے عشق
کیا مگر وہ عشق یہاں قابل ذکر نہیں ہے کیونکہ انہوں نے
شوکت حسین رضوی کو حاصل کر لیا لیکن جب انہوں نے
ادا کا راجاز سے عشق کیا تو قابل ذکر ٹھہرا..... کیوں؟ یہ میں
آگے بتاؤں گا۔

جہاں تک ہمارے علم میں ہے، میڈم نور جہاں نے اگر
دنیا میں کسی سے عشق کیا تو وہ ادا کا راجاز تھے۔

میڈم نور جہاں فلم ”خاندان“ کی نمائش کے بعد ملک
گیر شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے وقت
گزرتا گیا ان کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا۔
ایک دنیا ان کی پرستار تھی۔ ان کا یہ طور گلوکارہ اور اداکارہ
سارے ہندوستان میں شہرہ تھا۔ لاہور سے بمبئی جانے کے
بعد اس زمانے میں وہ ایک فلم کا معاوضہ ستر ستر روپے
وصول کرتی تھیں جو کہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔

فلم خاندان کی شوٹنگ کے دوران میں فلم کے ہدایت کار
شوکت حسین رضوی اور ہیروئن نور جہاں ایک دوسرے کی محبت
میں گرفتار ہو گئے۔ اگر میڈم کے گھر والے درمیان نہ آ جاتے
اور عدالت میں ان سے بیان نہ دلا دیتے تو یہ عشق کامیاب
ہو جاتا۔ نور جہاں اپنے خاندان والوں کے سامنے مجبور تھیں
اور شوکت حسین رضوی سخت غضبناک تھے۔ بمبئی کے ایک فلم
ساز نے مقتول رقم پر انہیں یہ طور ہدایت کار سناں کیا لیکن

شوکت صاحب یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی بے خبری میں
نور جہاں کو اس فلم کی ہیروئن منتخب کر لیا گیا ہے۔ بہر حال میڈم
نور جہاں ایک روز اپنے گھر سے نکل کر کھڑکی کے راستے
شوکت صاحب کی زندگی میں داخل ہوئیں اور ان کی شادی
ہو گئی۔ بمبئی میں اس زمانے میں شوکت حسین رضوی اور
نور جہاں خوبصورت ترین اور خوش لباس ترین جوڑا کہلاتا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد شوکت صاحب اور نور جہاں
پاکستان آ گئے جہاں میڈم کے خاندان والوں نے پھر انہیں
ٹھہر لیا۔ ان کے زیر اثر میڈم چوری چھپے وہ کام بھی کرنے
لگیں جو شوکت صاحب کو پسند نہ تھا۔ کرکٹرز رحمہ سے ملنا بھی
ان میں شامل ہے۔

کرکٹرز رحمہ اس زمانے میں انڈیا کے کامیاب دورے
سے واپس آئے تھے۔ لاہور میں ان کی ملاقاتیں نذر رحمہ کے
ساتھ شروع ہو گئیں۔ وہ نور جہاں سے ملنے ان کے گھر بھی
آئے لگے۔ شوکت صاحب کو ایک دن کسی نے مطلع کر دیا۔
وہ غصے میں بھرے ہوئے پہنچے تو نذر رحمہ کو پتا چلا گیا اور وہ
گھبرا کر بالکونی سے باہر کود گئے۔ اس طرح جان تو بچ گئی
لیکن وہ معذور ہو گئے اور کرکٹ کھیلنے کے قابل نہ رہے۔

اسے بھی ناکام عشق کہا جاسکتا ہے۔
پاکستان میں شوکت صاحب سے علیحدگی کے بعد کافی
واقعات گزرے۔ اسکیڈل تو بہت مشہور ہوئے مگر بالآخر
نور جہاں اور اعجاز کی شادی ہو گئی۔ میڈم نور جہاں نے اعجاز
کے مطابق خود کو ڈھال لیا۔ کچھ عرصہ سکون سے گزرا لیکن پھر
اعجاز، پنجابی کی مقبول ہیروئن فردوس کی محبت میں گرفتار
ہو گئے۔

ملکہ ترنم نے شادی کے وقت اعجاز سے کہا تھا کہ وہ ان
کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہیں۔ ان دنوں وہ گلوکاری کے
ساتھ اداکاری بھی کرتی تھیں لیکن اعجاز کی خوشنودی کی خاطر
انہوں نے اداکاری ترک کر دی اور ان سے کہا کہ گانا میری
زندگی ہے لیکن آپ نہیں گے تو میں گانا بھی چھوڑ دوں گی۔
اعجاز نے انہیں فلموں میں گلوکاری کی اجازت دے دی جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فلم ساز، خصوصاً پنجابی فلم ساز اپنی فلم میں
ان کے گانے شامل کرنا ضروری سمجھتا تھا جس کی وجہ سے
میڈم کے نفحات کے نرخ بھی بڑھتے گئے اور فلموں کی تعداد
میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ ایک
ایک دن میں تین تین گانے ریکارڈ کرائی تھیں۔ کثرت
استعمال کی وجہ سے ان کی آواز میں پہلے جیسی چمک اور دلکشی

باقی نہیں رہی تھی یہاں تک کہ خورشید انور جیسے عظیم موسیقار
نے اپنی زیر تکمیل فلم ”مائی“ (تان سین کی محبوبہ) کو بنانے کا
ارادہ ہی ملتوی کر دیا اور میڈم کے بجائے تابدید نیازی اور
دوسری گلوکاراؤں کی آواز استعمال کرنی شروع کر دی۔

میڈم نور جہاں اس سے بے نیاز تھیں کیونکہ جیسا بارش
کی طرح برس رہا تھا اور فلم ساز کئی نئی دن پہلے ان سے گانے
کی ریکارڈنگ کے لیے وقت لیا کرتے تھے۔ ان ہی دنوں وہ
ایک بار ایورینڈا اسٹوڈیو کے مالک آغا جی اے گل سے ناراض
ہو گئیں جس کا اسٹوڈیو کے کاروبار پر بہت اثر ہوا اور آغا گل
جسے فلم انڈسٹری کے ستون ان کی بات ماننے پر آمادہ ہو گئے۔

موسیقار سازندے اور گلوکار بھی میڈم نور جہاں کو
سربراہ قبول کر چکے تھے۔ اگر میڈم کسی موسیقار کا بائیکاٹ
کردیں تو اس کا مستقبل تباہ ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں فلم
”جنتی“ کا واقعہ بیان کیا جاسکتا ہے، جب میڈم کی رضا کے
مطابق پلے بیک ایسوسی ایشن نے غار بڑی جیسے تجربہ کار اور



نور جہاں لاٹنگیہ کے ساتھ

نامور موسیقار کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ بہر حال وہ ایک علیحدہ قصہ
ہے۔ مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ میڈم نور جہاں کی آواز کے بغیر
کوئی پنجابی فلم بنانا نہ تھا تو بعد بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس زمانے میں فردوس کی وجہ سے میڈم اور اعجاز کے
درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے، یہاں تک کہ میڈم نے
اعلان کر دیا تھا کہ جس فلم کی ہیروئن فردوس ہوں گی اس فلم
کے لیے وہ گانے نہیں گائیں گی۔ اس اعلان نے فلمی صنعت
میں ہینچل چادی کیونکہ میڈم کی آواز اور فردوس کی اداکاری
دونوں پنجابی فلموں کے لیے لازم و ملزوم سمجھی جاتی تھیں۔
میڈم نور جہاں نے پوری فلمی زندگی میں کبھی کسی سے بائیکاٹ
مانی نہیں لیکن اعجاز کی فلم ”بہر را نجا“ کا معاملہ تھا جس کے فلم
ساز اور ہیرو خورا اعجاز تھے۔



نور جہاں اپنے بیٹے اکبر رضوی اور پوتے پوتیوں کے ہمراہ
فلم کے پہلے گانے کی صدا باندی کے وقت تک ایک
کشکش کا سماں تھا۔ خواہر خورشید انور نے اسٹوڈیو میں گانے
ٹائٹل ریکارڈنگ کے لیے ریہرسل شروع کر دی تھی۔ یہ
طوفان کیا رنگ لانے کا کوئی نہیں جانتا تھا؟

عین اس وقت جب گانے کی صدا باندی شروع ہونے
والی تھی، میڈم نور جہاں کا فون آیا کہ وہ گانے کی ریکارڈنگ
کے لیے اسٹوڈیو پہنچ رہی ہیں۔ ماحول کا تناؤ اچانک کم
ہو گیا۔ میڈم اپنے مخصوص انداز میں ساڑی باندھے اسٹوڈیو
میں داخل ہوئیں اور ریکارڈنگ ہال میں پہنچ گئیں۔ اس کے
بعد فلم ”بہر را نجا“ کے تمام گانے میڈم نور جہاں نے گائے۔
اس لڑائی میں جیت کسی کی ہوئی اور ہار کسی کی؟ یہ ظاہر اداکارہ
فردوس کی جیت ہوئی تھی مگر درحقیقت اعجاز سے میڈم کی محبت
کی جیت تھی۔ وہ عورت جو بڑے بڑے سربراہان مملکت سے
اپنی ضد منوائی رہی تھی، عشق کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ یہ
اعجاز سے میڈم نور جہاں کے عشق کی انتہا کا ثبوت تھا۔

ہمیں میڈم کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کے
گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ مشاہدے اور تجربے کے بعد ہم
اس نتیجے پر پہنچے کہ دراصل میڈم نور جہاں اعجاز سے عشق کرتی
ہیں۔ اعجاز کی خاطر انہوں نے اپنی انا کو بھی قربان کر دیا تھا۔
ایک بار ایک ریسٹوران میں چند قریبی لوگ موجود
تھے۔ بات بگنی تو عشق تک پہنچ گئی۔ کئی لوگوں کا خیال تھا کہ
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
میڈم خاموشی سے بیٹھی سنتی رہیں، پھر ایک سر دہ آہ بھر کر
بولیں ”اللہ کسی کو عشق کا روگ نہ لگائے۔ یہ انسان کو کہیں کا
نہیں رہنے دیتا۔“
اس وقت میڈم اور اعجاز کی علیحدگی ہو چکی تھی۔ میڈم
نور جہاں نے جس انداز میں یہ فقرہ کہا، اس نے سارے

ماحول کو سوگوار کر دیا۔ کافی دیر تک سب خاموش سر جھکا کر بیٹھے رہے اور پھر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میڈم کے اس فقرے کے بعد کچھ اور کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ بھی ایک ناکام ختم تھا۔ اس میں ہر ایک ایسی ہستی کی ہوئی تھی جو ساری زندگی فتوحات حاصل کرتی رہی تھی۔ یہ واقعہ ہمیشہ ہمارے دل پر نقش رہے گا۔ ناکام محبت کی اس سے بڑی مثال ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ میڈم کو اپنی کوئی سے اٹھا کر اچانک فلم اسٹوڈیو تک لے جانے والی طاقت کون سی تھی؟ زندگی میں یہ میڈم کی پہلی ناکامی تھی۔

☆☆☆

پاکستان مزاحیہ اداکاروں کے اعتبار سے ہمیشہ ایک زرخیز خطہ رہا ہے۔ پاکستان کے مزاحیہ اداکاروں کو قدرت نے جو فطری خوبیاں عطا کی تھیں وہ انڈیا کے مزاحیہ اداکاروں کے حصے میں نہیں آئیں۔ ایک زمانے میں یعقوب بہت مشہور اداکار تھے۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ دن اور کامیڈین کا کردار یکساں مہارت سے ادا کرتے تھے۔ گوپ اپنے منانے اور حراتوں کے ذریعے کامیڈی کرتے تھے۔ انہیں کبھی اچھے مزاحیہ مکالمے بولنے کو نہیں ملے مگر ان کا منانا اور مزاحیہ حرکتیں فلم بینوں کو ہنسیا کرتی تھیں۔ سب سے زیادہ شہرت چارلی کو حاصل ہوئی۔ انہوں نے اپنے چہرے کا انداز بھی ایسا بنایا تھا کہ انہیں انڈیا کا چارلی چپلن کہا جاتا تھا۔ چارلی ایک بہت اچھے مزاحیہ اداکار تھے۔ مکالموں کے علاوہ وہ اپنی حرکات سے بھی کامیڈی پیدا کر دیا کرتے تھے۔ وہ غالباً ہندوستان کے پہلے مزاحیہ اداکار تھے جنہوں نے فلموں میں ہیرو کے کردار ادا کیے اور یہ فلمیں کامیاب بھی ہوئیں مثلاً ان کی فلم نیوگ کو دیکھنے والے کبھی نہیں بھول سکتے۔ انہی کے ہم عصر غوری بھی تھے۔ عام طور پر یہ دونوں فلموں میں سبکا کام کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد دونوں پاکستان آ گئے تھے۔ چارلی نے دونوں فلموں میں کام کیا جو ناکام ہوئیں۔ وہ دراصل پاکستانی فلمی صنعت کا ابتدائی دور تھا۔ فلموں، کہانیوں اور ہدایت کاری کا کوئی معیار نہ تھا اس لیے محض ایک کامیڈین فلم کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں نذر بہت مشہور اور کامیاب تھے۔ بعد میں دلچیت مرزا، سانی کا دور آئے مگر ان میں سے نذر کے سوا بے پناہ مقبولیت کسی کے حصے میں نہیں آئی۔

پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کا نیا دور لہری، منور ظریف، سلطان کھوسٹ، مرزا، رگیلا اور نٹھا کے زمانے

سے شروع ہوا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ محض مکالموں کی ادا جیگی پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ نذر اور رگیلا منہ بنا کر اور گرتے پڑتے بھی بندا دیتے تھے۔ رگیلا کا مخصوص انداز تھا مگر اس کے لیے مخصوص کردار ضروری تھے۔ لہری اپنے زمانے کے منفرد مزاحیہ اداکار تھے۔ وہ سیٹ پر گر کر یا ٹھوکر کیں کھا کر کامیڈی پیدا نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی فحشیں بگاڑتے تھے۔ سادہ اور سنجیدہ چہرے کی مدد سے وہ بہت اچھی کامیڈی کرتے تھے جس میں ہر مکالموں اور مکالموں کی ادا جیگی کا مخصوص انداز فلم بینوں کو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ علی اعجاز اچھے کردار اور مناسب مکالموں کے بغیر اچھی کامیڈی نہیں کر سکتے تھے۔

اسی زمانے میں ایک گول مٹول، موٹا تازہ، ہنس مکھ مزاحیہ اداکار پردے فلم پر نمودار ہوا۔ یہ تھا تھے۔ نٹھا کو شہرت دراصل فی وی ڈراما سیریل ”الف فون“ سے حاصل ہوئی تھی۔ بنیادی طور پر یہ ڈراما صرف دو اداکاروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ایک الف یعنی اُن (کمال احمد رضوی) اور دوسرے ٹون یعنی نٹھا۔ ٹون کا کردار ایک معصوم اور سیدھے سادے آدمی کا تھا جو اپنی حماقتوں کی وجہ سے بنانا یا کام بگاڑ دیتے تھے لیکن دیکھنے والوں کے لیے یہ ایک دلچسپ اور انوکھا تجربہ تھا۔ الف بہت چالاک، دھوکے باز، چرب زبان کردار تھا جبکہ نٹھا بھولا بھالا، سچا اور معصوم آدمی تھا جس کی سچائی کے باعث ہمیشہ بنانا یا کام بگاڑ جاتا تھا۔

الف ٹون جیسا پروگرام کبھی نہیں دیکھنے میں آیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس مقبول پروگرام کو بند کیوں کیا گیا اور دوبارہ کیوں شروع نہ کیا گیا ہے یہ آج کے زمانے میں پہلے سے زیادہ مقبول ہو سکتا ہے کیونکہ اب میڈیا کو زیادہ آزادی ہے اور اس مزاحیہ اور طنزیہ پروگرام کے تحت ان حالات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ یہ جوڑی اب ادھوری رہ گئی ہے۔ ڈرامے کا ایک اہم کردار نٹھا اب دنیا میں نہیں رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کمال احمد رضوی کے ٹکے ہوئے کرداروں میں نٹھا جان ڈال کر انہیں جیتا جاگتا انسان بنا دیتا تھا۔

رفیع خاور نٹھا کا تعلق ایک بہت اچھے اور مہذب گھرانے سے تھا جس کا اظہار ان کی بات چیت اور شائستگی سے بھی ہوتا تھا۔

الف ٹون کے ذریعے مقبولیت حاصل کر کے نٹھا نے فلموں میں بھی جگہ بنائی اور رفتہ رفتہ ایک مقبول مزاحیہ اداکار بن گیا۔ نٹھا مجسم کامیڈی اور خوشی کا پیغام بر تھا۔ عام زندگی

میں بھی اس کی آنکھوں میں شرارت جھلکتی تھی۔ اس کے بات کرنے کا انداز بھی دوسروں سے مختلف تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، ہمارے مزاحیہ اداکاروں کو قدرت نے فطری لطافت، حاضر جوابی اور شوخی عطا کی تھی اس لیے وہ فلم کی شوٹنگ کے دوران.... اپنی طرف سے بھی بہت خوبصورت فقروں کا اضافہ کر دیتے تھے۔ ظریف سے لے کر نٹھا تک یہ خوبی قدرت نے ہر ایک مزاحیہ کردار کو بخشی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اداکاری میں زندگی اور زندہ دلی تھی۔ نٹھا یہ طور خاص ہر وقت لوگوں کو ہنسا تارہتا تھا۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے واقعے سے خود بھی لطف اندوز ہوتا اور دوسروں کو بھی شاد کام کر دیتا تھا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ ایک بار پھر بیان کیا جا رہا ہے کہ فلم ”پلے بوائے“ کا پونٹ شوٹنگ کے لیے یورپ جا رہا تھا۔ پونٹ کے کئی افراد ایک دوسرے سے کبھی مذاق کر رہے تھے۔ ہماری بڑی بیٹی نادیہ کی عمر اس وقت پانچ سال کے قریب تھی۔ اس نے کبھی کوئی ایسا کھنکھ نہیں دیکھا تھا جو پگڑی کے ساتھ اپنی ڈاڑھی پر پٹی بھی باندھتا ہو۔

نادیہ سارے ہوائی جہاز میں گھومتی پھر رہی تھی۔ اپنی معصوم اور شیریں حرکتوں کی وجہ سے سب کی نظریں اسی پر لگی ہوئی تھیں۔ نادیہ گھومتی ہوئی عکاس کامران مرزا اور نٹھا تک پہنچ گئی۔ نٹھا کے ساتھ دوسری سیٹ پر ایک سردار جی بیٹھے تھے جنہوں نے اپنی ڈاڑھی کو بھی پگڑی کے پیچھے سے کس کر باندھا تھا۔ نادیہ نے یہ منظر دیکھا تو کچھ دیر تو حیران رہ گئی پھر بڑی معصومیت سے سردار جی کے پاس گئی۔ سردار جی نے بھی اس کو پیار سے اپنے پاس بٹھالیا۔ نادیہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

”مولوی صاحب، آپ نے اپنی ڈاڑھی پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟“

سردار جی تو مسکرانے لگے مگر نٹھا نے بہت زور سے قہقہہ لگایا اور کہا ”سردار جی، معاف کرنا اس نے بھی منہ پر پٹی باندھے ہوئے سردار جی نہیں دیکھے۔“

نادیہ ہمدردی سے بار بار پوچھ رہی تھی ”مولوی صاحب، کیا آپ کو چوٹ لگی ہے؟“

نٹھا کا ہنسی کے مارے بڑا حال تھا۔ وہ نادیہ کو گود میں لے کر ہر ایک کے پاس گئے اور یہ لطیفہ سنایا۔

اس کے بعد بھی جب بھی نٹھا سے ملاقات ہوتی، وہ یہ ضرور پوچھتے تھے کہ آپ کی پٹی کا کیا حال ہے جو مولوی



نور جہاں، شوکت رضوی بیٹی کے ہمراہ

صاحب کا علاج کر رہی تھی۔

نٹھا کو ہم نے کبھی پریشان یا اُداس نہیں دیکھا، ہنستے مسکراتے ہی دیکھا۔ سوچتے تھے کہ یہ کس قسم کا انسان ہے جو کبھی پریشان ہی نہیں ہوتا۔

ہاں، ایک بار وہ پریشان نظر آئے تھے۔ ہم نے فلم ”آس“ شروع کی تھی جس کے ہدایت کار بھی ہم خود تھے۔ نٹھا کے لیے ہم نے یہ طور خاص ایک کردار لکھا تھا۔

نٹھا کو ہم نے خاص طور پر بلایا اور فلم کا اسکرپٹ پڑھنے کو دیا جو انہیں بہت پسند آیا۔ وہ اس کردار سے بہت خوش تھے۔ یکا یک سوچ میں پڑ گئے پھر بولے ”آفاقی صاحب، آپ نے محمد علی صاحب کو اسکرپٹ پڑھایا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ اس کردار کے لیے آپ مجھے سائن کر رہے ہیں۔“

ہم نے حیران ہو کر پوچھا ”نٹھا صاحب، یہ ہماری فلم ہے۔ محمد علی صاحب کی نہیں اور یہ کردار ہم نے آپ ہی کے لیے لکھا ہے۔“

نٹھا نے بتایا کہ ان دنوں محمد علی ان سے ناراض تھے اور ان کی جگہ ایک اور کامیڈین کی سفارش کر رہے تھے۔ وہ آبدیدہ ہو کر بولے ”آفاقی صاحب، مجھے تو شباب صاحب نے بھی اپنی فلم سے کٹ کر دیا ہے۔“

ہم نے انہیں یقین دلایا کہ ہماری فلم میں ایسا نہیں ہوگا۔

دو روز بعد اسکرپٹ کے بارے میں محمد علی صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سرسری انداز میں پوچھا ”آفاقی، کیا یہ کردار تمہارے نزدیک نٹھا کے لیے موزوں ہے؟“

ہم واقعہ کا پس منظر جانتے تھے مگر سرسری طور پر کہا کہ یہ کردار ہم نے نٹھا کے لیے ہی لکھا ہے، پھر ہم نے اس کی

و جو بات انہیں سمجھا نہیں۔

وہ بولے ”سوچ لو، تم رائٹر اور ڈائریکٹر ہو۔“

اس کے بعد اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ سنٹوش رسل اور رضا کو ان کے کرداروں میں بہت پسند کیا گیا۔

سنٹوش رسل کراچی میں رہتی تھیں۔ لوگوں نے ہمیں



ادا کا رضا انٹرویو دیتے ہوئے

سمجھا یا کہ بلاوجہ اتنا خرچا برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا لاہور میں اس کردار کو کرنے والی ایکٹریوں کی کمی ہے۔

ہم نے کہا ”وہ سب اچھی ایکٹریں ہیں مگر اس قسم کے کردار کی بار کچلی ہیں۔ سنٹوش رسل کے لیے یہ ایک موزوں اور مختلف کردار ہے۔“

فلم کے کرداروں کے بارے میں ہم بہت حساس ہیں۔ عقلی جو اس زمانے میں کل ہمارے شوہر اور میڈم نور جہاں کے داماد تھے، انہوں نے کردار تو بہت پسند کیا مگر کہا کہ میڈم نے انہیں فلموں میں کام کرنے سے منع کیا ہے۔

ہم نے میڈم کو بھی اس پر آمادہ کر لیا۔ عقلی خود بھی مانتے ہیں کہ محمد علی جیسے اداکار کے سامنے انہوں نے بہت اچھا کردار کیا ہے۔

دیکھیے رضا سے بات کہاں پہنچ گئی۔

رضا ایک خوش باش اور ہنس مکھ انسان تھے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے۔ اس ہنسی ہنسی میں ہی انہوں نے ایک فلمی رقصہ نازلی سے دوستی کر لی۔ دوستوں کا خیال تھا، چند روز کی بات ہے، معاملہ ختم ہو جائے گا مگر رضا اس معاملے میں سنجیدہ ہو گئے یہاں تک کہ ان کے قریبی دوستوں کے علاوہ فلمی صنعت میں بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ گھر والوں نے بہت سمجھا مگر ان کے سر پر شق کا بھوت سوار تھا۔

فلم ”ہم اور تم“ کی شوٹنگ کے لیے ہم لندن گئے تو نازی بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ اگرچہ انہوں نے باقاعدہ طور

پر رشتے کا اعلان نہیں کیا تھا مگر ان کے بے تکلف دوست نازی کو بھائی کہتے تھے۔

لندن کے گرد و نواح میں ویلز کے خوبصورت مقام پر فلم کا ہونٹ بٹھرایا گیا۔ سلیٹی ستارہ کی اور ہوٹل میں بٹھری ہوئی تھیں مگر باقی سب ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ یہ بہت بے تکلف اور گھریلو ماحول تھا۔ باورچی پاکستان سے لے جایا گیا تھا۔ ہر ایک کے فلیٹ میں ہر طرح کی آسانیاں تھیں مگر رضا جانتے تھے کہ ہم چائے بنانا بھی نہیں جانتے۔ ہدایت کار حسن عسکری کی بیگم بھی یہ بات جانتی تھیں۔ صبح سویرے ہماری کھڑکی پر دستک ہوئی اور بیگم عسکری چائے کی پیالی کے ساتھ کھڑی نظر آئیں یا رضا صاحب موجود نظر آتے۔ رضا نے ہمیں اپنے ہاتھ سے بنا کر اور نازی سے پکوا کر انتہائی لذیذ مرغی بھی کھلائی۔

ہم نے ان دونوں کے مراسم کے بارے میں کبھی بات نہیں کی۔ انہوں اس موضوع پر روشنی ڈال لیکن حقیقت یہ ہے کہ رضا نازی کے عشق میں سرتاپا غرق ہو چکے تھے۔

ہم لوگ لاہور واپس آئے تو فلمی دنیا میں اس سے پہلے یہ خبریں پہنچ چکی تھیں، ان دنوں زندگی میں پہلی بار رضا کچھ پریشان اور الجھن میں نظر آئے، سنا تھا کہ وہ اپنی نئی تعمیر شدہ کوئی نازی کے نام کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گھر والوں کو یہ بات ہرگز منظور نہ تھی۔

ایک دن ہم وحدت روڈ سے اسٹوڈیو جا رہے تھے کہ رضا نے کہا ”آفاقی، راستے میں میرا غریب خانہ ہے، چائے کی ایک پیالی پی لیں۔“

ہم فوراً رضامند ہو گئے۔ وحدت روڈ پر انہوں نے بہت خوبصورت گھر بنایا تھا اور اس کی سجاوٹ بھی خوب کی تھی۔ جتنی دیر میں چائے آئی وہ ہم سے ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرتے رہے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ رضا ہے ہماری آخری ملاقات ہے۔

رمضان کا مبارک مہینا تھا، ایک روز علی الصباح یہ خبر ملی کہ رضا نے خودکشی کر لی ہے۔

فوراً ان کے گھر گئے۔ اور بھی لوگ فلمی لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب حیران تھے کہ رضا اور خودکشی! یہ کیسے ممکن ہے؟ گھر والوں نے بتایا کہ وہ کئی دن سے پریشان تھے اور اوپر کے حصے میں تنہا رہتے تھے۔ ان کے پاس ایک رائفل بھی تھی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ جس شخص کی دماغی کیفیت ایسی ہو اس کو تنہا کمرے میں رائفل کے ساتھ رہنے کیوں دیا گیا؟



ادا کا رضا

اور کچھ ان کی نانی اماں کو ناپسند کے باعث ان کی شادی کی توبہ نہ آ سکی۔ شیم آرا ایک کٹھن کی طرح اپنی ”ماں جی“ نانی کی تابع دار تھیں۔ ماں جی شیم کے عروج کے زمانے میں ایک سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔

شیم آرا بہت اچھے کردار کی سادہ سی لڑکی تھیں اور ان کی یہی خوبی سب کو پسند تھی۔ وہ شرمیلی اور بہت شائستہ لڑکی تھیں لیکن دل تو ہر ایک کے سینے میں ہوتا ہے۔

ادا کا رکمال نے ان سے بہت ہمدردی جتائی یہاں تک کہ وہ شادی پر بھی رضامند ہو گئے۔ شیم آرا کی چھوٹی بہن کے تعاون سے ایک رات انہوں نے رات کو بارہ بجے گھر سے نکلنے کا منصوبہ بنایا۔

شیم آرا نے اپنی بہن کے مشورے سے کچھ زیورات اور قیمتی سامان اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ جاڑوں کے دن تھے اور اندھیری رات۔ یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں گھر کا پڑا ناکتا بھوک کر سب کو نہ چکا دے یا کسی کی آنکھ نہ کھل جائے۔

ایک ایک لمحہ ماہ و سال کی طرح گزر رہا تھا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ سورج کی روشنی نے رات کے ختم ہونے کا اعلان کیا تو شیم آرا کی امیدوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ خدا جانے کمال نے کیا وجوہات پیش کیں مگر سید کمال شیم آرا کے دل سے اتر چکے تھے۔

شیم آرا کی پہلی فلم کا نام کنواری بیوہ تھا۔ یہ نام بہت منہوس ثابت ہوا اور شیم آرا جیسی ہیر و ن کا کافی عرصے تک ”کنواری“ ہی رہی۔

اب شیم آرا پہلے سے زیادہ سمجھ دار ہو گئی تھیں اور انہیں اچھے بُرے کی پہچان ہو چکی تھی۔ ان ہی دنوں اندرون خانہ شیم آرا کے گھر میں دو پارشاں بن گئیں۔ سردار ندو بلوچستان کے ایک رئیس زادے اور ندیم حجاز انساں تھے۔ وہ شیم آرا سے شادی کے خواہش مند تھے لیکن شیم آرا اور ان کے

گھر والوں کے بیان کے مطابق حری کے وقت بندوق چلنے کی آواز آئی۔ جب ان کے کمرے میں گئے تو وہ کمرے باجامہ اور گاؤں اپنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ خون کا کوئی قطرہ نہیں نظر نہ آیا۔ پولیس کو حیرت تھی کہ اگر انہوں نے خودکشی کی تو جسم سے خون کیوں نہ نکلا اور صوفے داغ کیوں تھا؟ اگر انہوں نے کسی اور صوفے پر خودکشی کی اور پھر صوفے پر آ کر بیٹھ گئے تو باقی خون کہاں گیا؟

پولیس نے بہت تحقیق کی، ان کے گھر والوں اور دوستوں نے مختلف تاویلیں پیش کیں مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ رضا تو دنیا میں نہیں رہے تھے، جنازے اور نماز کے وقت ایک جھوم مٹے مایوں کے نشاں کیسے کیسے

نازی صورت شکل میں کوئی قابل ذکر نہ تھیں پھر ساری لڑکیوں کو چھوڑ کر رضا ان پر عاشق ہو گئے۔ یہاں تک کہ گھر والوں سے اس بات پر اختلاف ہو گیا اور نتیجہ..... ایک بڑے فن کار کی موت۔

ایک ہفتے ہنساتے انسان کا یہ المناک انجام؟ شاید کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔

رضا جیسا مختلف کردار ادا کرنے والے اداکار بہت کم ہیں۔ کامیڈی تو خیر وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض ڈرامائی اور ٹریجڈی کرداروں میں بھی جان ڈال دی تھی۔ رضا کی موت آج تک ایک پراسرار معما بنی ہوئی ہے۔

☆☆☆

آئیے، اب ایک یکطرفہ عشق کی کہانی سنئے، عشق کرنے کے لیے دو کردار ہونے ضروری ہیں، ورنہ وہی معاملہ ہوتا ہے کہ ”کس بیری شادی میں پچاس فیصد کی کمی رہ گئی ہے۔“

”جی ہاں کیسے؟“

”میں تو رضامند ہوں مگر دوسرا فریق آمادہ نہیں ہے۔“

اس کہانی کو مختلف انداز میں بیان کیا جا چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ناکام عشق کی ایک ایسی داستان ہے جس پر خود ہمیں بھی یقین نہیں آتا۔

اس کہانی کے مرکزی کردار اداکارہ شیم آرا اور ہدایت کار فرید احمد ہیں۔

شیم آرا اپنے عروج پر تھیں جب فرید احمد ان کی محبت میں گرفتار ہوئے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ شیم آرا کی طرف سے ان کی دل شکنی کی کوئی نیکن حوصلہ افزائی بھی نہیں ہوئی۔ شیم آرا کے پرستاروں کی تعداد لاکھوں میں تھی لیکن کچھ تو ان کی پسند



اداکارہ شمیم آرا کی فلم لاکھوں میں کا پوسٹر

انہیں ذہنی طور پر بہت متاثر کیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید کسی پلٹ کر نہ دیکھتا مگر حقیقت میں فرید احمد کو شمیم آرا سے عشق تھا جس کا وہ اظہار بھی نہیں کرتے تھے، یہ ایک خاموش اور موسم کی طرح آپ ہی آپ پھٹنے والا عشق تھا۔

شمیم آرا کی شادیاں ہوتی رہیں مگر فرید احمد کے عشق میں کوئی فرق نہ آیا۔ حالات سے تنگ آ کر وہ اپنے دوست کے پاس کینیڈا چلے گئے۔ ہنز مند آ دی تھے۔ وہاں فلم سازی کے شعبے میں ملازمت مل گئی۔ انہوں نے ادارے کے لیے اعلیٰ معیاری فلمیں بنائیں کہ جتنے متاثر ہو کر انہیں ایک فلم پر بنانے کی عین کش کر دی۔ یہ فرید احمد کی پسند کا کام تھا۔

فلم کی تیاری، موضوع اور دوسرے معاملات میں مشورے لینے کے لیے وہ لاہور آئے اور اپنے والد ڈیوڈ بیوزیہ احمد کے ساتھ مشورے کیے۔ احمد صاحب نے انہیں موضوع اور فلم کی تیاری کے سلسلے میں بہت مفید مشورے دیے۔

فرید احمد دوبارہ کینیڈا چلے گئے اور فلم کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ لاہور میں احمد صاحب نے فلم کا اسکرپٹ لکھنا شروع کر دیا۔ فلم کے شوق اور دیوانگی نے انہیں وقتی طور پر بہت مصروف کر دیا۔

احمد صاحب نے فلم کا اسکرپٹ تیار کر لیا تھا جو شعبہ فلم کو پسند بھی آیا اور عملی طور پر فلم کی تیار کیا ہونے لگیں۔ اس اثنا میں یہ یوں ممکن نہیں کہ انہوں نے شمیم آرا کو بلا دیا ہو مگر کم از کم آکھ او جمل پہاڑ او جمل والی کیفیت ہو گئی۔

ہمیشہ اپنے رشتے داروں کی بہت زیادہ مدد کی۔ ماموں کے بچوں بچوں کو بہترین اسکولوں میں پڑھایا۔ ان کے لیے ایک کار الگ مخصوص تھی۔ ان کی شادیاں بھی کیں۔ ماں جی کی بہت خدمت اور تابع داری کی۔ خاندان کا کوئی شخص ایسا نہیں جس کی شمیم آرا نے ہر ممکن طریقے پر مدد نہ کی ہو۔ اخلاق ان کا ہمیشہ سے بہت اچھا تھا۔ ضرورت مندوں کی مدد کرنی تھیں۔ حیرت ہے کہ ایک ایسی ہستی کا یہ انجام ہو؟ دکھ کی بات تو یہ ہے کہ ان سے فیض پانے والے رشتے دار بھی ان کے خلاف باتیں کرنے لگے۔



اداکارہ شمیم آرا

غلطیاں، گناہ اور کوتاہیاں تو کبھی سے ہوتی ہیں جنہیں اللہ بخش بھی دیتا ہے۔ ان کی واحد خاکی یا غلطی تھی کہ انہوں نے ہمیشہ دوسروں کی رائے پر عمل کیا۔ جب تک شخص دوفا دار مشیر رہے فائدہ میں رہیں، اس کے بعد سب کچھ اڑ کر رہ گیا۔ اللہ سب کو معاف کرنے والا ہے۔

یہ تو شمیم آرا کی کہانی ہے لیکن بد قسمتی سے فرید احمد نے بھی صرف غم اور نا کامیاں ہی سمیٹیں۔ یہ ظاہر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر نعمت سے نوازا تھا۔ اعلیٰ خاندانی پس منظر، اعلیٰ تعلیم، ذہانت، جب ہدایت کا رہنے تو بہت کامیاب ہوئے اور ذہن ترین ہدایت کاروں میں ان کا نام شامل ہو گیا۔

فرید احمد سے ہماری گہری دوستی اور بے تکلفی تھی جو ہمیشہ رہی۔ ایک زمانے میں انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ شاید شمیم آرا کے معاملے میں ہم ان کے رقیبوں میں شامل ہیں مگر ایسی کوئی بات نہ تھی اور بہت جلد ان کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔

شمیم آرا سے شادی اور دونوں بعد طلاق کے واقعے نے

یہ اچھی خبر تھی۔ مگر دونوں بعد خبر آئی کہ فرید احمد اور شمیم آرا میں طلاق ہو گئی۔ یہ عجیب معاملہ تھا لیکن کیونکہ خالص ذاتی معاملہ تھا اس لیے کسی نے ان سے سوالات نہیں کیے۔ البتہ ایک بار جب ہم ان کے ساتھ بنکاک گئے تو ہوائی سفر کے دوران ذاتی قسم کی گفتگو میں ہم نے ان سے سوال کیا کہ کبھی آپ نے دونوں کے لیے شادی کیوں کی تھی اور پھر طلاق کیوں لے لی؟ انہوں نے بہت واضح جواب دیا تھا جو صرف ہمارے لیے تھا۔

پھر شمیم آرا نے اچانک ایک روز ایکٹو میوٹ کے چیئر مین مجید کریم سے شادی کر لی۔ یہ بھی ایک اچانک اور حیرت انگیز واقعہ تھا۔ شادی کے بعد پہلے بیٹے سلمان مجید کی پیدائش کے موقع پر وہ لندن چلی گئیں۔ اس طرح سلمان پیدا ہوئے۔

مجید کریم سے ان کی شادی ڈیڑھ دو سال سے زائد نہ چل سکی کیونکہ شمیم آرا کا اصرار تھا کہ شادی کا باقاعدہ اعلان کیا جائے مگر خاندانی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے مجید کریم ایسا نہ کر سکتے تھے اس لیے یہ رشتہ ختم ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد شمیم آرا نے کراچی کے دبیر الحسن سے شادی کر لی جو پہلے ہی شادی شدہ اور بڑی عمر کے بچوں کے باپ تھے۔ پھر رفتہ رفتہ دبیر صاحب نے شمیم آرا کے تمام معاملات سنبھال لیے کیونکہ شمیم آرا کی کبھی اپنی رائے نہیں رہی۔ انہوں نے کچھ جانے بغیر رائے مل خریدی اور اس سودے میں لاکھوں کا نقصان اٹھایا۔ پھر انہوں نے بڑے پیمانے پر ایک شاندار ایڈورٹائزنگ کمپنی قائم کی اور اس میں بھی لاکھوں کا نقصان ہوا اور بینکوں سے قرضے لینے پڑے۔ دبیر صاحب نے اپنے بیٹے کو ہیر وکاسٹ کر کے ایک فلم بنائی جو فلاپ ہو گئی۔ پھر انہوں نے شمیم آرا کو ایک ٹی وی ڈراما سیریل بنانے پر آمادہ کیا جو آج تک ریلیز نہیں ہو سکی، نہ ہی ہوگی۔ ان کی شوق سے بنائی ہوئی فیکٹی ٹوپی پر کرائے دار نے قبضہ کر لیا جس کی قیمت آج کل پانچ چھ کروڑ ہے مگر شمیم آرا اس سے محروم ہیں۔

شمیم آرا پر کچھ عرصہ قبل فوج کا حملہ ہوا تھا مگر وہ اس سے سنبھل گئی تھیں۔ کچھ عرصے بعد دوسرا شدید حملہ ہوا اور وہ ”کوما“ میں چلی گئیں۔ بیٹا انہیں اپنے ساتھ لندن لے گیا۔ ایک انتہائی شاندار اور کامیاب زندگی کا اختتام بہت دکھ کا باعث ہے۔

یہ تو شمیم آرا پر گزرنے والی قیامت ہے۔ شمیم آرا نے

ماموں اس شادی کے خلاف تھے۔ سردار رند نے ہر طرح سے دولت کی بارش کر دی تھی۔ ان کی قیمتی مرسید پر زکیم شمیم آرا کے استعمال میں رہتی تھی۔

ان ہی دنوں ان لوگوں نے بذریعہ کار لاہور سے کراچی جانے کا پروگرام بنایا۔ راستے میں سیون شریف میں رکتا تھا۔

اچانک خبر آئی کہ شمیم آرا نے سردار رند سے شادی کر لی جبکہ صورت حال یہ تھی کہ شمیم آرا اس شادی پر رضامند نہ تھیں۔ شمیم آرا کا بیان ہے کہ ان سے زبردستی نکاح ٹاٹے پر دستخط کرانے گئے اور وہ موقع پا کر سردار رند کی مرسید پر لے کر کراچی پہنچ گئیں۔

اخبارات میں بہت شور مچا۔ سردار رند کا دعویٰ تھا کہ ان کا باقاعدہ نکاح ہوا ہے لیکن شمیم آرا اسے جبر کہتی تھیں۔ شمیم آرا سردار رند سے طلاق کی خواہش مند تھیں مگر وہ انہیں طلاق دینے پر تیار نہ تھے۔ مقدمہ بازی پر آمادہ تھے۔ اتفاق سے ان ہی دنوں ایک حادثے میں سردار رند ہلاک ہو گئے اور یہ قصہ ختم ہو گیا۔

کچھ عرصہ گزر گیا۔ فرید احمد کا عشق بہ دستور جاری تھا بلکہ اس میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ وہ فیصل اور دوہیل دونوں طرف سے دولت مند ہیں۔ صورت شکل بھی اچھی تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پڑھ رہے ہوئے تھے۔ بہت بڑے اور شہرت یافتہ باپ کے بیٹے تھے لیکن یہ خوبیاں شمیم آرا کو پسند نہیں تھیں۔

فرید احمد نے شمیم احمد سے شادی کی تھی۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ دونوں میں خاصی ہم آہنگی تھی لیکن خدا جانے کیا بات ہوئی کہ دونوں میں علیحدگی ہو گئی لیکن مراسم بہ دستور قائم رہے۔ دراصل ایک زمانے میں فرید احمد بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ باہر جا کر علاج کرائیں۔ وہ علاج کے لیے کینیڈا گئے تو ٹیسٹ کرنے کے بعد پتا چلا کہ بیماری کا سبب یہ تھا کہ پاکستان میں ڈاکٹروں نے انہیں دودھ اور دہی کھانے کا مشورہ دیا حالانکہ یہی ان کی بیماری کا سبب تھا۔ کچھ عرصے بعد فرید احمد پاکستان واپس آ گئے لیکن شمیم آرا کے عشق کا بخاران کے سر سے نہیں اُترا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے ان کی ٹوپی کے چکر لگایا کرتے تھے۔ شمیم آرا ایک بار کراچی گئیں تو فرید احمد بھی وہیں چلے گئے۔ ایک دن اچانک اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ شمیم آرا نے فرید احمد سے شادی کر لی ہے۔ فرید احمد اور شمیم آرا کے دوستوں کے لیے



اداکارہ شمیم آرا

ایک طرف یہ کامیابیاں ان کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں اور دوسری طرف تقدیر مسکرا رہی تھی۔ ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ فرید احمد کو کینسر ہو گیا ہے۔ ان کے دوست اور ہمدرد یہ سن کر بہت پریشان ہوئے۔ سب کا خیال تھا کہ پہلے کی طرح اس بار بھی یہ خبر غلط ثابت ہوگی مگر ایسا نہ ہوا۔ ہم ڈبلیو یڈ احمد صاحب کے پاس جاتے رہتے تھے۔ یہ افواہ ہم نے بھی سنی تھی۔ ہمت کر کے احمد صاحب سے پوچھ لیا کہ کیا فرید احمد واقعی بیمار ہیں؟ احمد صاحب نے ان کی بیماری کی تفصیل بتائی اور بتایا کہ ڈاکٹروں نے اب ناامیدی ظاہر کر دی ہے اور کہا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تین ماہ زندہ رہ سکیں گے۔ یہ ایک انتہائی الناک خبر تھی۔

مجھ پوچھتے تو ہمیں فرید احمد کے ساتھ دوستی کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی پیدا ہوئی تھی۔ ان کے تمام حالات ہمارے سامنے تھے مگر تقدیر کے لکھے کو بدلنا کس کے بس کی بات ہے؟

احمد صاحب نے بتایا کہ فرید بہت جلد واپس آ رہے ہیں۔ ہم شام کو احمد صاحب کے گھر گئے تو احمد صاحب نے فرید کا بیڈ اپنے ڈرائنگ روم ہی میں لگوا لیا تھا جسے بھی خبر ملی ان سے ملنے گیا۔ سابقہ بیکر ٹھینہ احمد بھی بچوں کے ساتھ کئی بار ملنے گئیں۔ ٹھینہ نے علیحدگی کے بعد بھی اپنے نام کے ساتھ ”احمد“ شامل رکھا تھا۔

جب سب رخصت ہو گئے تو ہماری اور فرید احمد کی باتیں شروع ہوئیں۔ انہوں نے کینیڈا کے واقعات

سنائے۔ یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ جو چاہے کھائے اور پیو۔ کوئی پرہیز نہیں ہے۔ باتوں باتوں میں لاہور کی فلمی صنعت اور فلمی لوگوں کے بارے میں بات چیت ہوتی تو فرید احمد نے سرسری طور پر دوسروں کے تذکرے کے ساتھ شمیم آرا کے بارے میں بھی پوچھا۔

ہمیں معلوم تھا کہ شمیم آرا ان دنوں لاہور ہی میں تھیں۔ چند روز کے بعد شوٹنگ کے لیے بنگاک جانے والی ہیں مگر ہم نے مصلحت جھوٹ بول دیا اور کہا کہ آج کل وہ انڈیا فلم کی ایڈیٹنگ میں مصروف ہیں۔ مختلف ملکوں میں شوٹنگ کے لیے جاتی رہتی ہیں اس لیے لاہور میں کم ہی رہتی ہیں۔ فرید احمد سمجھ گئے کہ شمیم آرا جان بوجھ کر ان سے ملنے نہیں آئیں۔ شمیم آرا کے بارے میں ان سے ہماری آخری گفتگو تھی۔ اس کے بعد وہ کبھی شمیم آرا کا نام زبان پر نہ لائے۔

یہ ظاہر وہ معمولی سے کنزروں نظر آتے تھے اور حسب معمول ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے تھے مگر احمد صاحب نے ہمیں بتایا کہ ساری رات وہ گردن میں درد کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ احمد صاحب سے کہتے تھے کہ میری گردن ٹوٹا دیتے۔

ایک نیک آکوچنگر والے ڈاکٹر اقبال عباس کو ہم نے یہ حالات بتائے تو وہ بذات خود علاج کے لیے پہنچ گئے۔ ان کے علاج سے اتفاقاً فائدہ ہوا کہ ان کے درد اور تکلیف میں کمی ہوگئی۔ رفتہ رفتہ انہیں درد سے نجات مل گئی، یہ بہت بڑا فائدہ تھا۔

ڈاکٹر عباس بلانے پر آتے تھے، یہ سب دوستی میں ہو رہا تھا۔ احمد صاحب مطمئن تھے کہ کم از کم فرید کو تکلیف سے نجات مل گئی تھی۔

ایک دن صبح سویرے احمد صاحب کا فون آیا کہ فرید کا انتقال ہو گیا۔ ہم فوراً پہنچے۔ بیڈ پر سفید چادر اوڑھے فرید احمد خاموش لیٹے تھے۔

احمد صاحب نے بتایا کہ وہ اسی کمرے میں سر ہائے بیڈ کر قرآن شریف کی تلاوت کرتے تھے۔ صبح ملازمہ کافی لے کر آئی تو احمد صاحب نے کہا کہ سنی سے بھی پوچھا اور کافی دے دو۔ ملازمہ نے پکارا مگر جواب نہ ملا۔ احمد صاحب نے دیکھا تو رات کو سوئے ہوئے ہی فرید احمد کی وقت چیک سے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر اقبال عباس نے ان کے لیے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔

حساب لگایا تو کینیڈا کے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق وہ ٹھیک تین ماہ بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ فرید احمد جو دردِ عشق اپنے ساتھ لے گئے اس کا صرف ہم ہی کو اندازہ تھا۔ وہ بہت وضع دار اور صابر انسان تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

ہمیں اس بات پر بہت غصہ تھا کہ شمیم آرا سب کچھ جاننے کے باوجود آخری دنوں میں بھی ان سے ملنے نہیں گئیں۔ ایک بار ملاقات ہوئی اور فرید احمد کی وفات کا تذکرہ نکلا۔

ہم نے کہا ”شمیم، کم از کم انسانی ہمدردی کے تحت ہی تمہیں فرید کو دیکھنے جانا چاہیے تھا۔“

بولیں ”آفاقی صاحب! میں تو اس لیے نہیں گئی کہ وہ لوگ پسند نہیں کریں گے۔ اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے جاتے تو میں ضرور جاتی۔“

ہم نے صرف اتنا کہا ”شمیم! تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔“ اور بات ختم ہو گئی۔ لیکن عشق کی ایک داستان اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔

☆☆☆

یہ تو سب جانتے ہیں کہ بابره شریف ٹی وی کے اشتہاروں کے ذریعے فلمی دنیا میں داخل ہوئیں۔ ہم نے پہلی بار شباب اسٹوڈیوز میں فلم ”انسان اور دی“ کے سٹ پر دیکھا تھا۔ ان کی بڑی بین اس فلم میں قص کر رہی تھیں۔ بابره شریف دیکھنے میں اس وقت بارہ تیرہ سال کی نظر آتی تھیں۔ وہ آج بھی اتنی ہی بڑی نظر آتی ہیں جتنی کہ پہلی بار ہمیں نظر آتی تھیں۔

ٹی وی اشتہاروں میں مقبولیت حاصل کرنے کے بعد انہیں فلم نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے یہ سید سلیمان کی فلم ”بھول“ تھی۔ ندیم اور شبنم اس فلم میں مرکزی کردار تھے۔ منور ظریف اور بابره شریف معاون کردار ادا کر رہے تھے۔

منور ظریف اس وقت تک مقبول ہو چکے تھے لیکن بابره کی یہ فلم میں پہلی جلوہ گری تھی۔ اداکاری وہ اس وقت بھی بہت اچھی کرتی تھیں لیکن منور ظریف جیسے حاضر جواب اور اپنا طرف سے فقرے چست کرنے والے اداکار کے سامنے ایک نووارد اداکارہ کتنا مقابلہ کر سکتی ہے؟ اس کے باوجود انہوں نے بہت خود اعتمادی سے کام کیا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران... منور ظریف کی بے



اداکار منور ظریف

تکلف اور شوخ مزاجی کے باعث وہ دونوں جلد ہی کھل مل گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ محبت کا آغاز تھا لیکن یہ محبت درحقیقت یکطرفہ تھی کیونکہ منور ظریف تو سنجیدہ ہو گئے تھے مگر شادی بابره کے لیے یہ محض وقت گزاری تھی۔

لیکن ایک ایسا راز تھا جو منظور ظریف نے اپنے آپ تک ہی رکھا، کسی اور کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ ان کے قریب ترین دوستوں کے سامنے بھی انہوں نے اظہار نہیں کیا۔ یہ ظاہر وہ بہت ہنس مکھ اور خوش و خرم انسان تھے اور کیوں نہ ہوتے، دنیا کی ہر نعمت اللہ نے انہیں دے دی تھی صرف ایک ایسی آرزو کہ جسے انہوں نے ہمیشہ اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھا۔

منور ظریف کا دل کا ایک آپریشن ہو چکا تھا۔ وہ کسی قسم کا پرہیز نہیں کرتے تھے بلکہ جان بوجھ کر زیادہ ہی بد پرہیزی کرنے لگے تھے۔

ایک بار ہم برصغیر میں عابد شاہ کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ منور ظریف بھی ان کے مہمان تھے۔ عابد شاہ کا مکان دراصل دوستوں کے لیے وقف تھا۔ اس وقت تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

ایک روشن اور خوبصورت صبح ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ عابد شاہ صاحب اپنے کام سے چلے گئے تھے۔ اب گھر میں ہم اور منور ظریف تھے۔ کچھ دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ منور ظریف سوٹ پہنے، ٹائی لگائے اور سر پر فلیٹ ہیٹ پہن کر چلے آ رہے ہیں۔

”کہاں کا ارادہ ہے؟“ ہم نے پوچھا۔
”یہ..... بالکل نزدیک ہی جاتا ہے اور آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔“
”کون سی جگہ ہے؟“
”بولے“ آفاقی صاحب، دیکھئے ج بتائیے، کیا آپ کبھی بپ میں گئے ہیں؟“

”نہیں، مگر اس کے بارے میں سنا ہے کہ وہاں لوگ شراب پینے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔“
”نہیں یہی تو فرق ہے شراب خانے میں انجانے لوگ بھی شراب پیتے آ جاتے ہیں اور تنہا بیٹھے شراب پیتے رہتے ہیں مگر بپ میں وہ لوگ آتے ہیں جو ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور وہ محض شراب پینے کے لیے نہیں بلکہ آپس میں بات چیت کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہاں ہر موضوع پر بات ہو سکتی ہے۔ یہاں کا ماحول ہی بالکل اٹکھا ہوتا ہے۔ آج میں آپ کو بپ لے جا رہا ہوں۔ یہ سانسے والی عمارت میں بپ ہے، دو منٹ میں پہنچ جائیں گے۔“
”مگر ہم تو شراب نہیں پیتے۔“ ہم نے کہا۔
”وہ تو میں جانتا ہوں، آپ کو کوک یا جوس پلا دیں گے۔“

ہم بھی انگریزوں کے روایتی بپ کا ماحول دیکھنے کے لیے ان کے ساتھ چل پڑے۔
وہاں گئے تو معلوم ہوا کہ کبھی انہیں جانتے ہیں۔ بارگرل، جس کا نام غالباً لائی تھا فوراً ان کی طرف آئی اور مسکرا کر استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ ان کی یہاں روزانہ آمدورفت ہے۔
”یہ ہمارے مہمان ہیں۔ پہلی بار اس بپ میں آئے ہیں۔“

اس نے مسکرا کر ہمیں بھی ہاؤڈوڈوڈو کہا۔
”کیا لیں گے؟“ لائی نے آ کر پوچھا۔
”میرے لیے وہی اور ان کے لیے کوئی جوس یا کوک۔“

ہم نے دیکھا کہ شفاف شیشے کے ایک بہت بڑے گلوب نمائیک میں ایک صاحب سرخ رنگ کی شراب پی رہے تھے۔ اتنے بڑے گلوب کے پینے میں یہ مختصر سرخ چیز بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔
ہم نے کہا ”ہم اس گلوب میں کوک پیئیں گے۔“
لائی یہ سن کر حیران ہو گئی مگر گلوب کے پینے میں

سرخ رنگ کا کوک لے کر آ گئی جو دیکھنے میں بہت خوش رنگ لگ رہا تھا۔ ہم نے اس بڑے سے پیالے سے کوک ایک ٹھونک لیا۔ دیکھنے والے یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ وہ کسی وغیرہ پی رہے ہیں۔
ہم نے تو ایک ہی کوک پر اکتفا کیا مگر منور ظریف دیکھتے ہی دیکھتے تین پیگ پی گئے۔

ہم نے کہا ”منور، آپ کو ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے اور آپ یوں بد پرہیزی کر رہے ہیں؟“
وہ اداسی مسکراہٹ سے بولے ”آفاقی صاحب، ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ چاہے آپ بد پرہیزی کریں یا بد پرہیزی۔“
”مگر تم کوئے نوشی کی ضرورت کیا ہے، شکر کرو اللہ نے سب کچھ تمہیں دیا ہے۔“
وہ اداسی سے مسکرائے ”اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔ اس نے مجھے جو کچھ دیا ہے میں اس کے قائل نہیں ہوں، مگر پھر بھی کسی ایک چیز کی تو رہ جاتی ہے۔“
”تم آپریشن کرانے امریکا جانے والے ہو اور اتنی بد پرہیزی کر رہے ہو۔“
”آفاقی صاحب، جو ہونا ہے وہ تو ہونا ہی ہے۔“
ایک آہ بھر کر رہ گئے۔

اس کے بعد اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ ہم خود نہیں جانتے کہ منور ظریف زندگی میں کس چیز کی محسوس کرتے تھے۔ ہم ہی کیا، یہ راز کسی پر بھی ظاہر نہیں ہوا تھا اور آج تک راز ہی ہے۔
لیکن اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ منور ظریف نے عشق میں ناکامی کا منہ دیکھا تھا۔ مگر وہ چہرہ کس کا تھا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔

☆☆☆

اب لوک کہانیوں کا سلسلہ چل نکلا ہے تو ایک اور تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔ ”انارکلی“ کو برصغیر میں ناکام محبت کی مشہور داستان کہا جاتا ہے۔ اس کو لکھا گیا، اس کو اچھا کیا گیا، یہاں تک کہ قلمیابی بھی گیا۔
کے آصف نے تو اپنی فلم مغل اعظم میں مصلحتاً انارکلی کو زندہ دیواروں میں چنوائے کے بجائے اس کو ایک خنجر راستے سے رہائی دلا دی لیکن سوال یہ ہے کہ انارکلی جو شہزادہ سلیم کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی محض اپنی جان بچانے کے لیے اپنے محبوب کو چھوڑ کر او

اپنی جان بچا کر کیوں اور کیسے چلی گئی؟
سید امتیاز علی تاج نے اس کہانی کو برصغیر میں مشہور کر دیا۔ دراصل یہ ایک بنگالی کہانی سے خیال لیا گیا تھا۔ تاج صاحب نے اسے ہانسوار کر ایک کلاسیکی ڈرامے کی حیثیت دے دی اور اس کا اتنا چرچا ہوا کہ لوگ اسے بالکل بچی کہانی سمجھنے لگے۔

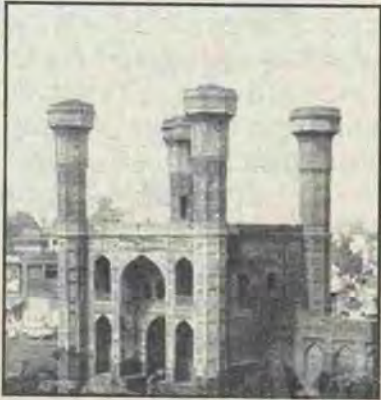
آئے، اب یہ جانتے ہیں کہ کیا انارکلی کی داستان میں واقعی حقیقت ہے؟

کہانی کی بنیاد یہ ہے کہ ہندوستان کا ولی عہد شہزادہ سلیم ایک حسین کنیز کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے جسے انارکلی کا خطاب دیا گیا ہے۔ مغل بادشاہوں نے کنیزوں اور غیر مسلم خواتین سے بھی شادیاں کی تھیں مگر کبھی اس کو مستثنیٰ بنایا گیا تو پھر انارکلی سے شہزادہ سلیم کی شادی اگر ہو جاتی تو کون سی قیامت آ جاتی؟ مغلوں کی خصوصاً اکبری آزاد خیالی کا تو یہ عالم تھا کہ اس نے ایک راجپوتانی سے شادی کی جو سلیم کی ماں تھیں۔ تاریخ کہیں نہیں بتاتی کہ جو دھاپائی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مطلب یہ کہ سلیم کا خالص مسلمان ہونا بھی مشتبہ ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ دراصل اکبری ذات خود انارکلی میں دلچسپی لینے لگا تھا لیکن جب بیٹے نے اس سے عشق کیا تو بادشاہ کو رقابت ہو گئی۔

فلم مغل اعظم کے بعض مناظر میں خصوصاً شیش محل کے رقص کے دوران سلیم اور انارکلی کے مابین محبت بھرے جذبات کو دیکھ کر اکبری کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔
انارکلی کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ درحقیقت اس کا مقبرہ کہاں ہے؟ لاہور کے سول میئر ٹریٹ میں ایک عمارت انارکلی سے منسوب ہے۔ مگر انارکلی کا واقعہ دہلی یا آگرہ میں پیش آیا تھا تو پھر لاہور میں اس کا مقبرہ کیسے تعمیر ہوا؟

بہر حال، کہانی جو بھی ہو، انارکلی اور شہزادہ سلیم کے عشق کو بھی ایک ناکام کلاسیکی داستان کہا جاتا ہے۔ انارکلی کی خاطر شہزادہ سلیم نے اپنے باپ سے بغاوت کی اور بادشاہ سے بغاوت کے جرم میں شہزادے کو قوت پ سے اڑا دیئے کی سزا دی لیکن عین وقت پر شہزادے کی جاں بخشی کر دی گئی۔

تو کیا انارکلی بھی دنیا کی معروف رومانی داستانوں کی طرح مشہور ہو گئی ہے؟
مگر مصنفوں اور فلم سازوں نے اس کو ایک حقیقی



انارکلی کا مقبرہ

داستان کا رنگ دے دیا ہے۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے کوئی نہیں جانتا مگر برصغیر کی ناکام عشق کی داستانوں میں انارکلی کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ویسے بھی ایسی بہت سی داستانیں انسانوں کی بنائی ہوئی ہیں۔

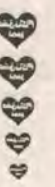
☆☆☆

پاکستان کی فلمی صنعت کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت ہندوستان سے ایس ایم یوسف، بابو صادق راہمن جیسے کہنے مشق ہدایت کار بھی پاکستان آ کر فلمیں بنارہے تھے۔

اسی زمانے میں ایک نوجوان فلم ساز ایم اکرم نے ایک اردو فلم بنائی۔ فلم ریلیز ہوئی تو اس نے اودھم مچا دیا۔ ہر طرف فلم قسمت کا چرچا تھا۔ لیکن بہت کم لوگوں کو یاد تھا کہ بیمنی ٹائیز کی فلم ”قسمت“ نے بھی کئی لوگوں کی تقدیر بنادی تھی۔ اس زمانے میں بیمنی ٹائیز کے مالک ایس مگر جی کا نام ہی کسی فلم کے معیار اور کامیابی کی سند سمجھا جاسکتا تھا۔ اس فلم میں بیمنی ٹائیز کے بہترین کارکن شامل تھے۔ فلم کے ہدایت کار ایس مگر جی تھے۔ امیر بانی کرنگائی، ارون کمار اور خان مستانہ نے بے پیکار گائے گائے تھے۔

اس فلم کے اداکاروں میں اشوک کمار اور ممتاز شانتی نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ یہ دونوں اس وقت بھی معروف اداکار تھے۔

”قسمت“ کی ریلیز سے پہلے دس بارہ ہفتے چلنے والی فلم کامیاب سمجھی جاتی تھی لیکن قسمت وہ پہلی فلم تھی جس نے 25 ہفتے ایک ہی سنیما میں چل کر رولر جو بی منائی۔ بعد میں



پچاس ہفتے بعد اس کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ کسی ایک ہی سنیما میں فلم کی کامیابی کا یہ ایک ریکارڈ تھا لیکن قسمت نے نئے ریکارڈ قائم کرنے پر ہی ہوئی تھی۔ جب کلکتہ کے ایک ہی سنیما میں قسمت نے ایک سو ہفتے چلنے کا ریکارڈ قائم کیا اور یہ ہندوستان کی پہلی ڈائمنڈ جوبلی کہلائی۔ یہ اعزاز بعد میں بھی بہت فلموں نے حاصل کیا۔

”قسمت“ کی کہانی پر آج نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس فلم کی دو خوبیاں نمایاں تھیں۔ ایک اشوک کمار کی اداکاری اور دوسرے موسیقار انیل بسواس کی موسیقی۔ انیل بسواس کافی عرصے تک ہندوستانی فلموں میں رہے اور ایک سے بڑھ کر ایک کامیاب فلموں کی موسیقی دیتے رہے۔ قسمت کی کامیابی کا سبب ابھی انیل بسواس کے سر تھا۔ انہیں ہندوستانی فلمی موسیقی کا گرو بھی کہا جاتا ہے۔

پہلے تو اس فلم کی کہانی سنئے۔ ایک بچہ ماں باپ کی غربت اور استادوں کی سختیوں سے گھبرا کر گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ چٹانہ چلا کہ یہ بچہ کہاں گیا اور کس حال میں رہا؟ ہدایت کار نے بتایا کہ بیس سال گزرنے کے بعد یہ ایک بچہ ایک جرائم پیشہ نوجوان بن چکا ہے جس کا نام سن کر ہی لوگ تھرا جاتے ہیں۔ سب اس کو شکمیر یا بوکھا کرتے تھے۔ بڑے بڑے غنڈے اور بدعاش اس سے خوف کھاتے تھے۔

شکمیر کی ملاقات فلم کی ہیروئن رانی سے اس طرح ہوئی کہ رانی بے سہارا لڑکی تھی۔ اس کا سہارا صرف ایک مکان تھا جو سیٹھ کے پاس گروی رکھا ہوا تھا۔ وہ گھر کے ایک حصے میں اپنی بہن کے ساتھ رہتی تھی۔ شکمیر ان کا کرایہ دار بن گیا تو آمدنی کا ایک ذریعہ مل گیا۔ جب ملاقاتیں بڑھیں تو دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔

سیٹھ کا نوجوان گڑا ہوا بیٹا یہ برداشت نہ کر سکا۔ وہ رانی کی چھوٹی بہن نینا کو پسند کرتا تھا۔ اور وہ بھی اس کو پسند کرتی تھی۔

فلم کی ہیروئن رانی (ممتاز شامتی) ایک ٹانگ سے معذور تھی اس کے باوجود اسٹیج پر رقص کر کے گزارہ کرتی تھی۔ سیٹھ کا منشی اس پر بہرہ بان تھا لیکن شکمیر کی وجہ سے اس سے دور رہتا تھا۔ سیٹھ نے کرائے کا قضا کیا اور نہ گروی گھر فروخت کر کے قرض آتارنے کی شرط پیش کی۔ ایک روز چٹا چلا کہ شکمیر دراصل سیٹھ کا گمشدہ بیٹا تھا۔ اس طرح وہ اپنے

والدین سے مل گئے اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اس زمانے میں کیونکہ تمام فن کار سحر اردو نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے ایک مکالمہ سکھانے والا بھی یونٹ شامل ہوتا تھا جس کی بہت زیادہ قدر کی جاتی تھی۔ یہ ظاہر اتنے برس یعنی تک بھگ 67 سال پہلے ہوئی اس فلم میں کوئی نمایاں خوبی نہیں، پرنٹ بھی سیاہ ہے۔

اس فلم کی سب سے بڑی خوبی انیل بسواس کی موسیقی تھی۔ فلم میں دس گانے تھے جو سب کے سب لوگوں کی زبان پر تھے۔ وہ آزادی کی تحریک کا زمانہ تھا اس لیے میں باغیانہ ترانے بھی شامل تھے۔ گانوں کی تفصیل ذیل ہے۔

- 1- دور ہواے دنیا والو، ہندوستان ہمارا ہے
 - 2- دھیرے دھیرے آرے بادل دھیرے دھیرے آ میرا ساجن سو رہا ہے شور وغل نہ چا۔
 - 3- اب تیرے سوا کون میرا (امیر بائی کرنا تھی) دھیرے دھیرے آ بادل والا گا نا امیر بائی کرنا تھی
 - 4- اب تیرے سوا کون میرا (امیر بائی)
 - 5- ایک دن ہنسائے اک دن رلا۔ (گلوکار، امیر بائی، ارون کمار)
 - 6- گھر گھر میں دیوالی ہے، میرے گھر میں اندھیرا
 - 7- گت گئے تیرے دکھ کے دن۔ (ارون کمار)
 - 8- اے دنیا تیا ہم نے لگاڑا تیرا کیا؟
 - 9- پیارے میرے پیار کیسے کیا جائے
 - 10- اے دنیا تیا، ہم نے لگاڑا کیا تیرا؟
- یہ سچ تو یہ ہے کہ اس فلم کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ اس کی موسیقی تھی جو آج بھی زندہ ہے۔ فلم کے موسیقار انیل بسواس نے خاموش فلموں سے کام شروع کیا تھا اور آخر دم تک انہیں موسیقاروں میں بہت ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ اس فن کے جاننے والوں کا کہنا ہے کہ انیل بسواس اور نوشاد سے بڑھ کر موسیقار ہندوستانی فلموں میں نظر نہیں آئے۔
- اشوک کمار اس زمانے میں مقبول ترین ہیرو تھے اور

دش بھی حیثیت ممتاز شامتی کو بھی حاصل تھی۔ لیکن کسی ایک سنیما میں ڈھائی سال ایک فلم کی نمائش ایسا ریکارڈ ہے جسے آج بھی کوئی فلم تو نہیں کر سکی۔

☆☆☆

بھارت کی فلمی دنیا میں ناکام عشق کی کئی داستانیں مشہور ہیں۔ مثلاً دلپ کمار اور کامنی کوشل کا عشق، کامنی کوشل ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خاندانی فنکارہ تھیں۔ ان کی زندگی بجائے خود ایک کہانی ہے۔

ان کی بڑی بہن کی شادی مشرودے ہوئی تھی۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں تو بچوں کی محبت اور نگرانی کی خاطر ان کی شادی اپنے بہنوئی مشرودے سے ہو گئی۔ مشرودے کا فلمی دنیا سے براہ راست کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں بھی وہ پس پردہ رہنا پسند کرتے تھے۔ اس لیے ان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

کامنی کوشل شادی سے پہلے بھی لاہور ٹیڈی اور اسٹیج پر نمایاں تھیں۔ بمبئی کی فلم میں کام کرنے کا موقع ملا تو ان کے بہنوئی دلپ کمار بنے۔ فلم ”شہید“ تقسیم کے پس منظر میں بنائی جانے والی ایک رومانی اور حب الوطنی سے بھرپور فلم تھی۔ اس پر دلپ کمار اور کامنی کوشل کی بے ساختہ اداکاری نے حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد ان دونوں نے ندیا کے پار، اور آرزو میں کام کیا۔ آرزو دراصل ان کے عشق کی ناکامی کی داستان تھی جس میں ان دونوں کی زندگی کے صحیح واقعات پیش کیے گئے تھے۔ عصمت چغتائی اس کی مصنفہ اور ان کے شوہر شاہد لطیف اس فلم کے ہدایت کار تھے۔

ایک طرف تو فلمی دنیا میں ان کے پیار کی داستان کا چھچھوٹا اور دوسری طرف کامنی کوشل کا خاندان اس ملاپ کا سخت مخالف تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کامنی کا فوجی بھائی پتول نے کر اس کے گھر پہنچ گیا اور کہا کہ اگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوا تو وہ خود کو گولی مارے گا۔ اس پر کامنی کوشل نے نارمان لی اور پھر دلپ کمار اور کامنی کوشل نے ایک ساتھ کی فلم میں کام نہ کیا۔

اگرچہ بعد میں مدھو بالا کے ساتھ دلپ کمار کی محبت کی داستانیں عام ہو گئیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دلپ کمار کی محبت اور آخری محبت کامنی کوشل ہی تھی۔ اس طرح حالات سننے والوں کو جدا کر دیا۔ کامنی کوشل کی اداکاری میں وہ بے ساختگی اور دہانہ پن نہ رہا لیکن دلپ کمار کے ٹوٹے

ہوئے دل نے انہیں انڈین فلموں کا ٹریڈ مارک بنا دیا۔ دلپ کمار کی دوسری ناکام محبت مدھو بالا سے ہوئی تھی اور دلپ نے مدھو بالا کو فلمنگ کی انگوٹھی بھی پہنا دی تھی مگر مدھو بالا کے والد خان عطا اس رشتے کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ فلم ”نیادور“ میں یہ تعلق ہمیش کے لیے ختم ہو گیا۔ مدھو بالا جو پہلے ہی دل میں سوراخ کی مریضہ تھی، اس ناکامی کے بعد مزید مر جھا گئی۔ اس نے اداکار و گلوکار کشور کمار سے شادی کر لی تھی لیکن یہ شادی نہیں ایک سمجھوتا تھا۔ بیماری، تنہائی اور محبت سے محرومی کے باعث مدھو بالا کی زندگی کے آخری دن بہت تکلیف میں گزرے، یہاں تک کہ وہ جوانی ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ مدھو بالا کو مشرق کی دینش کا لقب دیا گیا تھا۔

دلپ کمار کی زبان سے پھر بھی کسی نے مدھو بالا کا نام نہیں سنا۔ اس کا سبب بے وفائی تھا یا نفرت؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ دلپ کمار نے کافی عرصے تک شادی نہیں کی حالانکہ انڈیا کی ہر ہیروئن خواہش مند تھی، متوسط عمر میں پہنچ کر انہوں نے بعض مصلحتوں اور مجبور یوں کی وجہ سے سارہ بانو سے شادی کر لی مگر یہ دلپ کے لیے کبھی ایک رسم کی ادائیگی تھی۔ یوں تو جتنی مالا اور دلپ کمار کی داستانیں بھی بہت مشہور ہوئی تھیں۔ وحیدہ رمن بھی امیدواروں میں شامل تھیں مگر سب کو مایوسی ہوئی۔

☆☆☆

ریکھانے کئی سال تک انڈین فلموں پر راج کیا ہے۔ وہ مدراس کے ایک اداکار کی بیٹی تھیں۔ بمبئی میں انہیں بہت کامیابیاں حاصل ہوئیں مگر محبت میں وہ ناکام ہی رہیں۔

اس وقت ریکھا کو بالی ووڈ میں کام کرتے ہوئے 43 سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وہ مدراس کی معروف فن کار جننی اور اداکارہ پوشپال کی بیٹی ہیں مگر کامیابی انہوں نے والدین کے حوالے سے حاصل نہیں کی۔ وہ غضب کی رقاصہ اور بہت اچھی اداکارہ ثابت ہوئیں۔

یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ ریکھا کی سات بہنیں اور بھائی بے مکران میں سے کسی نے کامیابی اور شہرت حاصل نہیں کی۔

ریکھا نے تیرہ سال کی عمر میں فلموں میں اداکاری کا آغاز کیا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ تال فلم تھی۔ فلم ”رنگو ستم“ اتنی کامیابی حاصل کی کہ اس کو اردو میں بھی قلمباز کیا گیا۔ اردو میں اس کا نام ”رنگیلا رتن“ تھا۔





عشق کم نصیب

صائمہ اقبال

شادی ہوجانا عشق کا حاصل نہیں، عشاق کے لیے دل کا ملنا بھی ضروری ہے۔ وہ امریکا کی خاتون اول تھی۔ امریکی صدر کی شریک حیات تھی۔ اس نے جس سے عشق کیا اسے پالیا پھر بھی عشق اس سے روٹھا رہا۔ وہ زندگی کے آخری لمحے تک محبت پانے کی حسرت کو دل میں پالتی رہی۔ اس نے محبت سے محروم زندگی کو بھگتا مگر تاریخ دان اسے منفی کردار لکھتے رہے۔

ایک دھمی دل والی خاتون کے عشق ناکام کی پتا

مُنفا مقام پر واقع اُس بورڈنگ ہاؤس کی باخلاق مالکہ انجیلیٹا نے نوے جوڑے کی خاطر میں ملی تھی جو اُس کے ہاں چھپنا گزرنے آیا ہوا تھا۔ انجیلیٹا کے سامنے والی کرسی پر اُس کا کم گوشہ رہ بیٹھا تھا جس کے ساتھ والی نشست پر ایک دراز قد آدمی براجمان تھا جو وکالت کے پیشے سے وابستہ تھا۔ انجیلیٹا کے دائیں جانب وکیل کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ وکیل کے نزدیک انجیلیٹا کی تجربہ کار ملازمہ جانے کی کیتلی لیے کھڑی تھی۔ وکیل کی موضوع پر اُس سے ہنس ہنس کر بات کر رہا تھا۔

امریکی ریاست الی ٹوئے کے شہر اسپرنگ فیلڈ کے مضافات میں موسم بہار اپنے جلوے بکھیر رہا تھا۔ سورج کی شیشی کرنوں نے سرسبز و شاداب درختوں کا حسن دو بالا کر دیا تھا، مشرق کی سمت سے چلنے والی ہوا کے لمس نے پھولوں کو شکرابھٹ کا استعارہ بنا دیا تھا۔ الغرض ہر سمت مسرت دمک رہی تھی۔ کھنے درختوں میں گھرے بورڈنگ ہاؤس کے ڈانٹنگ ہال میں بھی چائے کی چمکیوں کے ساتھ ہلکے ہلکے خوشگوار فطرت پس کر رہے تھے۔ ہال کی کھڑی مشرق کی سمت کھلی تھی جس سے شفاف صحت بخش روشنی چمن کرا رہی تھی۔



باری وڈکا ایک اور مشہور ناکام عشق شریا اور دیو آدھو کا عشق ہے۔ دیو آدھو شریا کے لیے مسلمان ہونے کو بھی تھا مگر شریا کے ماموں، ماں اور تانی کو یہ ساتھ پسند نہ آیا۔ دیو آدھو تو خیر مرد ہیں، انہوں نے شادی کر لی اگرچہ کامیاب نہیں ہوئی مگر شریا نے ماں اور تانی سے چھپا ہانے کے بعد بھی شادی نہیں کی۔ شریا کو ہالی وڈ کے اداکار گریگوری پیک بہت پسند تھے۔ ایک بار وہ بمبئی آئے تو ان کے گھر بھی گئے۔ ان کی شہادت دیو آدھو سے ملتی ہے۔ گلوکارہ اور اداکارہ تھیں۔ دیو آدھو بعد میں فلم ساز، ہدایت کار بھی بن گئے۔ شریا نے بین عروج کے زمانے میں فلم صنعت کو خیر باد کہا اور پھر بھی انہیں کسی نے نہیں دیکھا زندگی کے بہترین سال انہوں نے تنہائی میں گزار دیے کسی فلم والے نے اس کے بعد انہیں نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی تقریب میں شریک ہوئیں۔ انہوں نے ایک طرح بن باس لے لیا ہے۔

☆☆☆

ایک غمزہ کہانی جو بہت مشہور ہے وہ گوردوت اور اداکارہ وحیدہ رحمن کی داستان عشق ہے۔ گوردوت ایک تعلیم یافتہ، خوبصورت اور کامیاب فلم ساز و ہدایت کار تھے۔ وحیدہ رحمن ایک کامیاب ہیروئن تھیں۔ فلم گائیڈ اور پیاسا میں انہوں نے ایک ساتھ کام کیا۔ دونوں فلمیں یادگار بھی جاتی ہیں۔

وحیدہ رحمن کے عشق کی وجہ سے گوردوت کے گھر کی تعلقات بھی خراب ہو گئے۔ آخری دنوں میں وہ ایک قلب میں رہا کرتے تھے اور اسی فلیٹ میں انہوں نے خود کر کے جوانی میں بھارتی فلمی صنعت کو ایک بے مثال فلم ساز اور ہدایت کار سے محروم کر دیا۔ جب دیپ کمار نے پیاسا کی کہانی ناپسند کر دی تو گوردوت نے بذات خود کردار ادا کیا۔ یہ فلم بالی وڈ کی یادگار فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ بعد میں دیپ کمار نے کہا کہ پیاسا میں کام نہ کرنے انہوں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ عشق نے ہندوستانی فلمی صنعت کو ایک بے مثال فن کار سے محروم کر دیا۔

وحیدہ رحمن پر ظاہر اس خوشگوشی کا کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آیا۔ دراصل انہیں گوردوت سے کبھی محبت نہیں تھی بہر حال، یہ ناکام عشق کی کہانی ہمیشہ فلمی دنیا میں یادگار رہے گی۔ یہ تمام واقعات بہت تفصیل سے پہلے بھی بیان کیے جاتے ہیں۔

اردو فلموں میں بھی انہیں بے حد کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک زمانے میں وہ صوبہ اول کی ہیروئن تھیں۔ آج 60 برس سے اوپر کی عمر میں بھی انہوں نے خود کو اسماٹ اور فٹ رکھا ہے۔

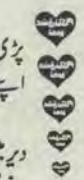
ریکھا ایک دل چپکے فنکارہ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ کئی فن کاروں کے ساتھ ان کے اسکیٹل بے جن میں جیتندر، کرن کمار، ونود مہرا اور ایسا بھ چن شامل ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ اصلی محبت انہیں ایسا بھ چن سے تھی جس کی رتی آج بھی باقی ہے۔

ریکھا نے دو شادیاں کیں مگر دونوں ناکام رہیں۔ پہلی شادی ونود مہرا سے کی جو زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اس کے کمار کے ساتھ بھی ان کا نام منسوب ہوتا رہا۔ ایسا بھ اور جیتندر کے ساتھ بھی کافی عرصے ان کے مراسم رہے جن کا پوری انڈسٹری کو علم تھا اور ریکھا نے بھی کبھی انہیں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ اصلی محبت انہوں نے ایسا بھ چن سے کی اور یہ ناکام ہی رہی۔

ونود مہرہ سے طلاق لے کر انہوں نے دوسری شادی ایک صنعت کار ملیش اگر وال سے کی تھی۔ یہ ایک کامیاب شادی تھی مگر قدرت کو منظور نہ تھا۔ صرف دو ماہ بعد ملیش کا قتل ہو گیا۔ اس کے بعد ریکھا نے صرف محبت اور اسکیٹل پر گزارہ کرنے کی ٹھان لی۔ کچھ عرصے بعد اس کے کمار کے ساتھ ان کا اسکیٹل مشہور ہوا۔ لیکن اس کے نوٹسکل کھنڈ سے شادی کر کے ریکھا کا دل توڑ دیا۔

وہ محبت میں ناکام رہیں مگر فن کارہ کی حیثیت سے بہت کامیابیاں میٹیں۔ بمبئی میں 1970ء میں انہوں نے اردو فلموں میں کام شروع کیا۔ اس وقت وہ نیو ہندی اردو ٹھیک طرح بول سکتی تھیں اور نہ ہی اسماٹ تھیں بلکہ موٹی کہلاتی تھیں۔ اس تنقید سے تنگ آ کر انہوں نے چھ سال تک اداکاری نہیں کی۔ 6 سال بعد فلم ناگن نے ریکھا کو ایک دم عروج پر پہنچا دیا۔ یہاں سے فلموں میں ریکھا کی کامیابیوں کا سفر شروع ہوا۔ ریکھا کی فلمیں بے درپے کامیاب ہوئیں جن میں مسٹر نور لال، مقدس کاسندر، امراؤ جان اور خوبصورت اور خون بھری مانگ شامل ہیں۔

اب تک وہ 170 سے زائد فلموں میں کام کر چکی ہیں۔ آج بھی وہ بعض فلموں میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔ اب وہ تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کو دنیا میں سب کچھ نہیں مل جاتا۔



اچانک نہ جانے کیا ہوا... وکیل کی بیوی یکدم چٹ پڑی۔ اُس نے سامنے پڑی گرم چائے کی پیالی اٹھائی اور اپنے شوہر کے منہ پر دے ماری۔

یہ سب اتنا آغا نا ہوا کہ انجیلیا ششدر رہ گئی۔ جتنی دیر میں وہ کچھ سمجھ پائی، یہ اسو سنا کہ واقعہ رومنا ہو چکا تھا جس نے اُس حسین صبح کو غارت کر ڈالا۔

غمے میں پھری ہوئی وہ عورت کچھ دیر وہیں کھڑی کلف اڑاتی رہی پھر دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اُس پورے عرصے میں اُس کے شوہر نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا، اپنی بیوی کے کسی تلخ سوال کا جواب نہیں دیا، لعنت ملاحت بھی نہیں کی۔ بس یونہی خاموش بیٹھا رہا۔

بالآخر بورڈنگ ہاؤس کی مالک نے اُنھ کو ایک کپڑے سے اُس شریف انٹس آڈی کا چہرہ صاف کیا۔

ڈاننگ ہال میں مکمل خاموشی چھائی تھی...

بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا۔ ایسا واقعہ جس کا میاں بیوی کے درمیان پیش آتا حیرت کی بات نہیں۔ محافل میں بھی اس کے رومنا ہونے کے امکانات ہیں، جیسے اُس خوشگوار صبح بورڈنگ ہاؤس کی مالک کے سامنے یہ پیش آیا۔

اُس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ آنے والے چند برسوں میں یہ معمولی واقعہ خصوصی اہمیت اختیار کر جائے گا کیونکہ اُس کا مرکزی کردار صدر امریکا کے منصب پر فائز ہوگا اور اُس کی بیوی خاتون اول کہلائے گی اور پھر یہ واقعہ اوتارے ڈھرایا جائے گا۔ مورخین اس کا ذکر کریں گے، محققین اس پر بحث کریں گے۔

حیرت انگیز طور پر اس واقعے کو رومنا ہوئے ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی اس پر بحث جاری ہے۔ اس کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اور دلچسپ امر یہ ہے کہ ہر تجزیے کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے:

”وہ شخص کس قدر عظیم تھا جس کی بدھندیب، آداب سے عاری بیوی نے اُس پر گرم چائے اُٹھیل دی تھی، لیکن وہ خاموش رہا۔ اس میں کس قدر صبر تھا... بے شک وہ آدی قابل تہلیل تھا!“

بے شک معتبر دانشوروں کے یہ تجزیے قابل توجہ ہیں، انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن بد قسمتی سے کسی تجزیہ کار نے اُس عظیم انسان کی غم سے ٹھٹھا بیوی کے ذہنی دل میں جھانکنے کی کوشش کی نہیں جو اُس حسین صبح تکے میں سر دیے گھٹنوں آنسو بہاتی رہی تھی مگر کوئی اُس کی خبر گیری کے لیے

نہیں آیا تھا۔

مستقبل میں خاتون اول بننے والی محبت سے محروم عورت اپنے مقدر میں بد قسمتی کھو کر لائی تھی!

☆☆☆

13 مارچ 1818ء کی شام جب سپینے سے شری رابرٹ اسمتھ ٹوڈنہی سے اُتر، لیکن اس کے چہرے سے عیاں تھی اور پیاس سے اُس کا گلا جھج رہا تھا۔

امریکا کے بڑے حصے پر موسم بہار اپنے رنگ بکھیر رہا تھا تاہم ریاست کی جنگی میں حالات یکسر مختلف تھے، خصوصاً مشرقی شہر نیکنٹن کے آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

رابرٹ اپنی بائی وٹیلی کرتے ہوئے اسپتال میں داخل ہوا۔ عمارت کا اندرونی حصہ نسبتاً ٹھنڈا تھا جہاں اس نے خود آرام دہ محسوس کیا۔ تیزی سے زینہ عبور کرتے ہوئے وہ پہلا فلور پر پہنچا، جہاں اُس کی حسین بیوی الزبتھ پارک ٹوڈ ایڈم تھی جس نے چند گھنٹوں قبل ایک بچی کو جنم دیا تھا۔

باپ بننے کی خوشی سے سرشار رابرٹ اِس بات پر شرمندہ تھا کہ اسے نازک موقع پر اسے اپنی بیوی کو اسپتال میں چھوڑ کر جانا پڑا، لیکن وہ مجبور تھا۔

تیزی سے بدلنے والی حالات نے بینکاروں کی نیند پر اُڑا دی تھیں اور شہر کے ایک معروف بینکار کی حیثیت سے رابرٹ بھی ان دنوں خاصا پریشان تھا۔ اس کے کاندھوں پر بگڑے ہوئے کھاتوں کی ذمہ داری تھی، اسی وجہ سے اُسے غلت میں اپنی پیاری بیوی کو چھوڑ کر جانا پڑا، تاہم اسپتال واپسی پر جو بیوی رابرٹ کی نظر اپنی دلکش بیوی کے کھلے ہوئے چہرے پر پڑی، اُس کی لیکن غائب ہو گئی۔

اس نے الزبتھ کے ہونٹوں پر بوسہ دیا اور جمبولے میں لٹٹی اپنی بیٹی پر جھک گیا جس کے عین نقش اپنی خوبصورت ماں سے مشابہ تھا۔

بچی کو گود میں اٹھاتے ہی وہ موسم کی ستم ظریفی، سفر کی تھکان اور کھاتوں کے مسائل سب بھول گیا۔

تیک تیکناؤں کے ساتھ اُس نے اپنی بیٹی کا نام ”میری“ تجویز کیا، میری ٹوڈ!

☆☆☆

رابرٹ اور الزبتھ نے بڑے ناز و نعم سے اپنی بیٹی کی پرورش کی۔ کم سن میری کو ہر سہولت میسر تھی، چاہنے والے ماں باپ، پڑھا لکھا ماحول، اچھا خاندان... تاہم حالات کبھی ایک

سے نہیں رہتے۔ وقت بدلتا ہے اور زندگیوں پر ان مٹ نشانات چھوڑ جاتا ہے۔

جب وہ چھ برس کی تھی، اس کی پیاری شفیق ماں ہمیشہ کے لیے اُسے چھوڑ گئی، بہت دور، جہاں جانے والے کسی لوٹ کر نہیں آتے۔

اس سانحے نے رابرٹ کے خاندان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا، لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے خود کو سنبھال لیا، البتہ... نہی میری کی زندگی بے روح ہو گئی۔ وہ ماں جو ہر بل اپنی شفقت اس پر بچھاؤ کیا کرتی تھی جہاں فانی سے کوچ کر چکی تھی اور وہ ممتا کی گھٹی چھاؤں سے محروم ہو گئی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، دل میں کرب تھا پر وہ الفاظ کی صورت اپنے جذبات بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اور پھر... ایک اور ایک سناخروہ رومنا ہوا!

جب وہ آٹھ برس کی تھی، اُس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ میری کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ گھر کی دیرانی میں اپنی ماں کی یادوں کو حرکت کرتے ہو دیکھا کرتی تھی۔ دراصل اُس نے اپنی محرومیوں کی تلافی کے لیے یادوں میں اپنی ماں کو زندہ رکھا تھا۔ لیکن جس دن سوئیلا ماں نے گھر میں قدم رکھا، وہ اُن حسین یادوں سے محروم ہو گئی۔

جب رابرٹ نے اپنی نئی بیوی کو یہ کہتے ہوئے متعارف کروایا۔ ”پیاری میری، یہ تمہاری ماں ہے... نئی ماں!“

وہ بھڑکی۔ ”نہیں... یہ میری ماں نہیں ہے۔“ اور روتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”بچی ہے، سنبھل جائے گی۔“ رابرٹ نے اپنی نئی شریک حیات سے کہا جس کی آنکھوں میں بے عزتی کا احساس تھا۔ جس طرح میری نے اس عورت کو قبول نہیں کیا تھا، گھر کی نئی مالک کو کبھی یہ بچی پسند نہیں آئی تھی۔

جلدی ہی ماں نے سوئیلا ماں کا روپ اختیار کر لیا۔ اُسے میری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن رابرٹ کی وجہ سے وہ اپنے ہونٹ سی لٹکی۔ البتہ دونوں کے درمیان سرد مہری تیرتی رہتی جس کی وجہ سے گھر کا ماحول تناؤ کا شکار ہو گیا۔

1832ء میں یہ خاندان نیکنٹن کے متحول علاقے کی ایک شان دار گھٹی میں منتقل ہو گیا۔ گوکہ معاشی بحران کے اس زمانے میں پیش تر افرادی حالت خست تھی لیکن رابرٹ اس وقت بھی خاصا مستحکم تھا۔ اسی گھٹی میں میری نے حقیقی معنوں

میں شہواری آنکھ کھولی۔

اس کے گھر میں 14 کمرے تھے۔ وہ خاصا بڑا اور کشادہ تھا لیکن وہ دیران نہیں تھا۔ دراصل دونوں شادیوں سے رابرٹ کے چودہ بیٹے تھے، اسی باعث گھٹی میں ہمیشہ شور مگردش کرتا۔ شرارتوں کی فلقا ریاں گونجتیں، اشیاء بوقوتی رہتیں۔ میری ان سرگرمیوں سے دور رہی رہتی۔ البتہ وہ ان سے محفوظ ضرور ہوتی۔ وہ فاصلے سے بچوں کو شرارتیں کرتے ہوئے دیکھتی اور سن ہی من میں سکراتی۔

جب اُس کی سوئیلا ماں بچوں کو اگرم چانے سے روکتی، بھونڈے انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کرتی تو میری خاموشی سے اپنے کمرے میں آ جاتی جہاں کتابیں اُس کی منتظر ہوتیں۔ کتابوں ہی نے اُسے تہذیب سے روشناس کروایا، محافل کے آداب کی تربیت دی، گفتگو کا ہنر سکھایا۔ اِس ضمن میں اُس کی حقیقی ماں کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ گوکہ میری کو فقط چھ برس اُس با اخلاق عورت کا ساتھ میسر رہا لیکن اس مختصر سے عرصے ہی میں اُس نے میری کو اخلاقیات کی اہمیت و ضرورت سے آگاہ کر دیا۔

میری کے کمرے میں اُس کی ماں کا ایک خوبصورت پوٹریٹ آویزاں تھا جسے نینو یارک کے ایک معروف آرٹسٹ نے بنایا تھا۔ ایک دیوار پر اُس کے دادا ڈیوڈ ٹوڈ کی پینٹنگ بھی لگی تھی۔

مرحوم ماں الزبتھ اکثر میری کو اُس کے دادا کے قصے سنایا کرتی تھی ”وہ ایک تعلیم یافتہ اور محنتی انسان تھے۔ انہوں نے آئرلینڈ میں آنکھ کھولی پھر ہجرت کر کے کیٹیکلی آن بے۔ یہیں تمہارے والد کی پیدائش ہوئی اور یہیں تم پیدا ہو گئیں!“

اُس کے کانوں میں اکثر اپنی پیاری ماں کی آواز گونجا کرتی جسے اپنی یادوں میں زندہ رکھنا اُس کا کلوتا مقصد تھا۔

☆☆☆

رابرٹ کو میری کی بہت گھر تھی۔ وہ ایک شفیق باپ تھا اور جانتا تھا کہ اس کی بیٹی تا حال ایک سانحے کے زیر اثر ہے۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک فیصلہ کیا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ فیصلہ میری کی زندگی کو نیا رخ دے گا، اُس کی مصروفیات میں نئے رنگ بھر دے گا۔ سو وہ انتظامات میں مصروف ہو گیا اور جب انتظامات مکمل ہوئے، وہ اپنی بیٹی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”میری، کیا تم جانتی ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟“

”میرے علم میں ہے قادر!“ وہ مسکرائی۔ ”آپ نے ہمیشہ میرا خیال رکھا، ایسے فیصلے کئے جو میرے حق میں سودمند ثابت ہوئے۔ بے شک آپ کی محبت وہ قیمتی ترین شے ہے جو اس دنیا میں مجھے میسر ہے۔“

”شکریہ بٹی۔“ رابرٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”تمہارے الفاظ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ جانتی ہو، تم بالکل اپنی ماں کی طرح ہو، اسی کی طرح تہذیب یافتہ اور بااخلاق! میں چاہتا ہوں کہ تم اُس کے نقش قدم پر چلو۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے!“

”مجھے آپ کا ہر فیصلہ قبول ہے۔“ میری کے لہجے میں احترام کا عنصر تھا۔

چند روز بعد کم سن میری نے گھر چھوڑ دیا۔

آنے والے برس اُسے شہر کی سب سے معتبر درس گاہ کے ہاسٹل میں گزارنے آئے اور وہ بہت خوش تھی۔ کیونکہ اب وہ آزاد تھی، ہر وہ کام کرنے کے لیے جس کی وہ خواہش مند تھی۔

اس درس گاہ کا نصاب اور انتظام اس قدر اعلیٰ تھا کہ شہر کے بیشتر متمول خاندان خواہش کیا کرتے تھے کہ اُن کے گھرانے کی لڑکیاں یہاں تعلیم حاصل کریں۔ درس گاہ کی منتظمہ ایک تہذیب یافتہ فرانسیسی خاتون تھیں جن کی قربت اور شفقت میری کو اُس کی مرحوم ماں کی یاد دلاتی۔

اسکول کا علمی و ادبی ماحول اُس کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ شب و روز کی محنت سے چند ہی برسوں میں اُس نے فرانسیسی زبان پر عبور حاصل کر لیا۔ رقص بھی سیکھا۔ ساتھ ہی ڈرامے کے میدان بھی خاصی فعال رہی۔ یوں جب میری 20 برس کی ہوئی، وہ جس مزاج اور سیاسی شعور کی حامل ایک ایسی پراعتماد لڑکی کا روپ دھار چکی تھی، جو گروہی وادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا پسند کرتی تھی۔

تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ واپس گھر نہیں جائے گی جس کی ہر شے پر اس کی سوتیلی ماں کا قبضہ تھا۔ اس نے رہائش کے لیے اپنی بڑی بہن الزبتھ ایڈورڈ کے گھر کا چناؤ کیا، جو اسپرنگ فیلڈ (ریاست الی نوے) کے علاقے میں مقیم تھی۔ اکتوبر 1839ء میں وہ اسپرنگ فیلڈ منتقل ہو گئی جہاں ایک مکتوں میں اُس کا دوسرا جنم ہوا۔

میری کی بڑی بہن الزبتھ کی شادی ایک تعلیم یافتہ سیاسی گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کا شوہر نینا ایڈورڈ ریاست کے سابق گورنر کا بیٹا تھا اور سماجی و سیاسی حلقوں میں خاصا مقبول

تھا۔

آنے والے برسوں میں الزبتھ اور نینا کی سرپرستی حوصلہ افزائی نے میری کو بیکسر بدل دیا۔ وہ سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔

محافل میں وہ توجہ کا مرکز بنی رہتی۔ فرانسیسی زبان، رقص پر عبور کی وجہ سے اُس نے جلد ہی شہر کی اشرافیہ میں بیکس لے لی اور پھر وہ ایک بڑی جدیدی سے گزری!

☆☆☆

ہر دل عزیز میری بدل رہی تھی۔

وہ محبت کے حسین، لطیف احساس کے زیر اثر تھی جس نے اس کی زندگی کو خوش رنگوں سے بھر دیا تھا۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ اُس نے اسپرنگ فیلڈ کے باصلاحیت نوجوانوں کو اپنا گریڈ بنالیا تھا لیکن اُن میں سے ایک اُس کے خاصا قریب تھا۔ اس نوجوان کا نام اسٹیفن ڈگلس تھا جو ایک اُمیر تھا ہوا مکمل اور سیاست دان تھا۔

چند ہی دنوں میں اُن کے رابطے دوستی کے زنجیر میدان میں داخل ہو گئے جہاں سے محبت کی حسین وادی کی چاندنی جانے میں انہیں وقت نہیں لگا۔

وہ اکثر ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، ہر سبز درختوں کی گنجی چھانوں میں خوشگلوں! یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے ایک دوسرے کی جیون سانس کی طور پر قبول کر لیا ہے۔

وہ دن خوشیوں سے بھر پور تھے۔ میری پہلی بار عشق کے ذائقے سے روشناس ہوئی تھی جو بہت ہی شیریں تھا۔

اُس کی بڑی بہن الزبتھ بھی بہت سرور تھی۔ اسے یقین تھا کہ ماں سے محرومی کے سانچے نے میری کو جو زخم دیے تھے، وہ بھرنے کو ہیں، لیکن وہ غلط تھی۔

خوبرو اسٹیفن ایک عاشق مزاج نوجوان تھا۔ چند ماہ وہ میری پر اپنی محبت نچھاورتا رہا لیکن پھر وہ اُس کے دل سے اُتر گئی اور اس نے بڑی ہی خاموشی سے معصوم میری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ایک اور سانحہ... ایک بار پھر محرومی کا کرب... تاریکی اور تنہائی کے سامنے میری کا مقدر بن گئے۔ وہ قنوطیت کی شکار ہو گئی بھر گئی۔ عشق میں ناکامی کا ذائقہ چکھا تھا!

خوش قسمتی سے یاسیت کے اس زمانے میں اس نے سماجی حلقوں سے دوری اختیار نہیں کی جس کے فطیل دھیرے دھیرے ہی اکٹی، پر یہ زخم بھرنے لگا کیونکہ کئی اور نوجوان اُس

کے قریب کے متنبی تھے اور عشق میں ناکامی کے باوجود وہ شغلی لڑکی ہر دل عزیز تھی، توجہ کا مرکز تھی۔

دسمبر 1839ء میں ایک تہذیب یافتہ، دراز ذوق نوجوان نے اُس کے دل کو دھکی دیا کہ دروازے پر دستک دی۔ میری کے اندرون نے احتیاط برتنے کا مشورہ دیا کہ وہ ایک بار شوکر کھا چکی تھی، تاہم اس نوجوان کے اخلاق کے سامنے ہر تنبیہ بے کار ثابت ہوئی۔ میری اُس مکمل کو دل دے بیٹھی۔

جلد ہی اُن کے رشتے میں اتنی پچھلی آگئی کہ انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ البتہ اس معاملے میں کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ ایک دوسرے کے عشق میں جتلا اس جوڑے کی سماجی حیثیت میں خاصا فرق تھا۔

میری ریاست کی سب سے بڑی لکھی لڑکی تھی لیکن جس نوجوان سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی، وہ زمانہ طالب علمی میں ایک نالائق شاگرد کی شہرت رکھتا تھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ اکثر اسکول سے غیر حاضر رہتا تھا۔ میری فرانسیسی زبان اور تلفظ پر عبور رکھتی تھی جبکہ اُس کے محبوب کا معاملہ مختلف تھا۔ میری کا تعلق ایک بڑے خاندان سے تھا، اُس کی کئی رشتے دار فوج اور ریاستی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور اُسے اپنے خاندان پر فخر تھا جبکہ اُس کا محبوب اپنے شجرہ نسب کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔

انتاقتساد... دو انسانوں میں اتنا فرق پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ایک ہو جائے؟ لیکن وہ کہتے ہیں نا عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب!

مواخلافات، تضادات کے باوجود ایک دوسرے پر فریفتہ یہ جوڑا دسمبر 1840ء میں مکتبی کے بندھن میں بندھ گیا۔ شادی کے لیے یکم جنوری 1841ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔

شاید چند موصنین میری کو خوش قسمت تصور کرتے ہوں کیونکہ جس اُمیر سے ہونے والے اُس کی مکتبی ہوئی تھی وہ مستقبل قریب میں امریکا کے سولہویں صدر کی حیثیت سے حلقہ اٹھانے والا تھا، تاہم حقیقت یہ میری کی بدبختی کا آغاز تھا۔ اُس کے منگیتر کا نام ابراہام نکسن تھا!!!

☆☆☆

آج ہم جانتے ہیں کہ میری ٹوڈ اور ابراہام نکسن کی شادی اپنے عہد کا سب سے بڑا ازدواجی المیہ ثابت ہوئی۔ فیض تجویز کار اس معاملے میں میری ٹوڈ کو قصور وار نہیں کرتے ہیں۔ ایک مغرور اور زردی عورت کے طور پر پیش کرتے ہیں

جو نمود و نمائش کی شوقین اور شغلی خور تھی جس کی وجہ سے یہ رشتہ ناکامیوں کی علامت بن گیا لیکن کیا یہی سچ ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ ابراہام سے شادی کرنے کے فیصلے پر اُسے خاندان بھر میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا، خصوصاً سوتیلی ماں نے تو اُس پر طنز کے اتنے تیر برسائے، اتنے دل شکن تبصرے کئے کہ وہ زخمی ہو گئی۔

بے شک اُس کے اور ابراہام کے خاندان اور اُن کے طرز زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن میری دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی، اسی وجہ سے اُس نے ہر مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس سے مکتبی کر لی، لیکن مکتبی کے بعد کیا ہوا؟

انگوٹھیوں کے بتادلے کے چند روز بعد رونما ہونے والے ایک واقعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شادی کی ناکامی کا اصل ذمہ دار کون تھا!

مکتبی کے بعد ایک جانب جہاں میری خوشی سے لبریز تھی، وہیں ابراہام بدترین تذبذب کا شکار تھا۔ وہ مکتبوں اس بات سوچ بچار کرتا اور ہر بار مایوسی کے زیر اثر ریاست کی تاریکی میں ڈوب جاتا۔ بالآخر اس نے اپنی عکسیر کے نام ایک مجبوراً اخطا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے کانپتے ہاتھوں سے لکھا۔

”میری، میں تم سے اتنی محبت نہیں کرتا کہ تم سے شادی کر لو!“

وہ میری کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا، سو یہ خط اپنے ایک دوست کے حوالے کر دیا کہ وہ اُس کی منگیتر تک پہنچا دے۔ دوست نے جب خط پڑھا تو وہ مجھو چکا رہ گیا۔

”یہ سب کیا ہے؟ اس لڑکی نے تم سے شادی کرنے کے لیے خاندان بھر کی مخالفت مول لی اور تم اسے محبت کا یہ صلہ دے رہے ہو؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے وہ خط بچھا دیا اور متذبذب منگیتر کے ہونے ابراہام کا مشورہ دیا کہ وہ خود ہی اپنی منگیتر سے ملے۔

بہت سوچ بچار کے بعد ابراہام نے میری سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

جس شام وہ اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے گیا، آسمان پر دبیز بادل چھائے تھے۔

”اوہ ابراہام... صبح وقت پر آئے۔ دیکھو موسم کتنا خوشگوار ہے، آج بارش کی پیش گوئی ہے۔“ جو میری نے اسے دیکھا، اس کی ہاتھیں کھل گئیں۔ پھر سے پر خوشی کی لہر دوڑ

گئی جس نے ابراہام کو خوفزدہ کر دیا۔

میری اُس کے ارادوں سے لاعلم تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ ابراہام شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہے سو وہ کافی دیر تک بڑے ہی بڑے جوش انداز میں اسے تفصیلات سے آگاہ کرتی رہی۔ ابراہام نے کسی خاص گرم جوش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ پوری ملاقات کے دوران اُس نے دو تین جملے ہی کہے۔

میری کو اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے، اس کا منگیتر خاصا پریشان ہے۔ جب اس نے ابراہام کو گریدا تو اُس نے اعتراف کر لیا کہ وہ ایک خاص موضوع پر گفتگو کرنے کے ارادہ سے آیا ہے۔

”بولو میں سن رہی ہوں۔“ میری کی آنکھوں میں محبت تھی۔

”وہ میں...“ ابراہام ہکھلانے لگا۔ چند ساعت خاموش رہا، پھر ہمت مجتمع کی اور کہہ دیا۔ ”میں تم سے شادی نہیں کر سکتا!“

میری کو یوں لگا جیسے کمرے کی تمام روشنیاں یکدم بجھ گئی ہوں، ہر طرف تاریکی چھا گئی ہو، جیسے وقت ختم ہو گیا ہو... ایک بار پھر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا، ایک بار پھر کرب کے عفریت نے اُسے نگل لیا تھا،

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

پوچھلائے ہوئے ابراہام کے لیے یہ صورت حال بڑی ہی غیر متوقع تھی۔ وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ میری کو چپ کروانے لگا۔ اسے دلا سے دینے لگا۔

جب میری کے آنسو تھمنے لگے، اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ ”ابراہام... میں تم سے محبت کرتی ہوں... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

ابراہام پھل گیا۔ محبت بھرے آنسوؤں نے اُس کے سخت دل کو نرم کر دیا۔ اُس نے میری کو بانہوں میں بھرے ہوئے کہا۔ ”میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔“

کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی اور باہر آدھی برس رہی تھی۔

اُس رات میری اندیشوں کی پھوار میں بیٹھتی رہی۔

☆☆☆

اندیشے ڈرتے تھے۔ ابراہام کی طبیعت میں بہت زیادہ اضطراب اور تذبذب پایا جاتا تھا، گوکہ وہ متعدد بار اس

کے سامنے یہ اقرار کر چکا تھا کہ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ اس کی پوچھتاہٹ روز بروز نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اُس کے بارے میں میری کو عجیب و غریب خبریں مل رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ابراہام باغی میں ہی عشق لڑا چکا ہے، اسے یہ علم نہیں تھا کہ پرائی معاشرے میں تا حال اس کے راسخ میں ہیں۔

جب اس موضوع پر میری اور ابراہام کا مکالمہ ہوا، صورت حال مزید گڑبگڑ گئی۔ ابراہام اپنی وجوہات سے اسے مطمئن نہیں کر سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے تھے، اُن کے درمیان فاصلے بڑھ رہے تھے۔

شادی کی تاریخ یکم جنوری 1841ء مقرر ہوئی تھی اور یہ دن میری کی زندگی کا سب سے کرب ناک دن ثابت ہوا۔

تقریب والے روز میری بہت خوش تھی۔ اس کا پہلا شان دار تھا۔ اُسے خوب سجایا گیا تھا۔ ہر شخص مسرور تھا۔ چہرے پہ مسکراہٹ تھی لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا میزبان اور مہمانوں کی مسکراہٹیں وحشی پڑتی جا رہی تھیں کیونکہ دوبہا غائب تھا۔

ابراہام تا حال وہاں نہیں پہنچا تھا۔ وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے لاپتہ تھا اور تقریب میں موجود اس کے دوستوں کے چہروں سے فکر مندی عیاں تھی۔

”وہ پائل شخص کہاں چلا گیا؟“ بالآخر میری کی بڑی بہن نے اپنا غصہ دباتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

”میں نہیں جانتی۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں انتہائی کہہ سکی۔

بعد میں پتا چلا کہ جیسے شادی کے دن قریب آرہے تھے ابراہام لیکن اپنا ذاتی توازن کھوتا جا رہا تھا۔ وہ شدید صدمے کے زیر اثر تھا جس نے اُس کے اعصاب کو متلوں کر دیا تھا۔ دوستوں نے اُسے کافی سمجھایا لیکن اس نے یا سیت دامن نہیں چھوڑا۔ خود کو تنہا کر لیا اور مجلسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو گیا۔ ان ہی دنوں اس نے ایک قریبی دوست کو غم میں ڈوبا ایک خط لکھا جس میں کچھ یوں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

”میں قابلِ رحم اور بد قسمت ترین انسان ہوں... میری حالت کبھی بہتر نہیں ہوگی... مجھے مرجانا چاہیے، یہی میرے دل کا واحد علاج ہے!“

جب میلوں دور بیٹھے اُس کے دوست کو یہ خط موصول ہوا، اسے اندیشوں نے گھیر لیا۔

شادی والے روز ابراہام نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

اور یہ الفاظ دہرانے لگا ”میں مزید زندہ نہیں رہنا چاہتا!“ جب خیر خواہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اُس کے کمرے تک پہنچے، منتقل کا صدر بے بسی کی تصویر بنا اپنے بستر پر پڑا تھا۔ اس کے جب سے ایک چاقو بھی برآمد ہوا۔ قوی امکان تھا کہ اگر دوست وقت پر نہیں پہنچتے تو وہ کمزور شخص اپنی جان لے لیتا۔

☆☆☆

میری شاید بد نصیبی اپنے مقدر میں لکھوا کر لائی تھی کیونکہ جس شخص کو وہ ٹوٹ کر چاہتی تھی، وہ وحشت کے زیر اثر دیوانہ ہو گیا تھا۔

شادی کے روز رونما ہونے والے افسوس ناک واقعے کے بعد منگنی ٹوٹ گئی۔

میری کے لیے وہ دن اذیت ناک تھے۔ اس نے اپنے محبوب کے غم میں خود کو کمرے میں بند کر لیا، جہاں قوطیت کی تاریکی تھی، مگر یہ کاموسم تھا۔ عشق کے روگ نے اُسے تنہائی کی تصویر بنا دیا تھا۔

کئی روز تک بد بخت میری اس گھٹن زدہ کمرے میں بڑی اپنے محبوب کو پکارتی رہی لیکن وہ سخت دل شخص خبر گیری کے لیے نہیں آیا۔

آخر کار اس نے زندگی کی جانب لوٹنے کا فیصلہ کیا۔

گوکہ یہ ایک مشکل فیصلہ تھا، تاہم میری ایک باہمت لڑکی تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اپنی کھوئی ہوئی شادمانی حاصل کرنے کے لیے اس نے خوب زور مارا اور ایک بار پھر سماجی سرگرمیوں میں شرکت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

وہ مجلسوں میں خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرتی لیکن جونہی تنہائی اس پر سایہ پڑتی، وہ پھر اپنے محبوب کو یاد کرنے لگتی جو بے وفا نکلا، جس نے اس کی محبت کو حقیر جانتا اور اس کے جذبات کا ٹٹل کیا۔

غموں کی ماری میری زندگی میں واپس آگئی تھی لیکن شاید بد بختی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ایک روز، اچانک ایک غفلت میں اس کا ابراہام سے سامنا ہوا۔

اپنے محبوب کو سامنے دیکھ کر میری کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ اُس شام وہ بہت روئی۔ ابراہام اسے دلا سا دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی اور تاسف کے آثار تھے۔ اس ملاقات کے چند روز بعد وہ دونوں اتفاقاً ایک شادی کی تقریب میں پھر ملے۔ ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں نمی تیزی، ایک بار پھر ابراہام نے اسے دلا سادیا۔ دھیرے

اس وقت وکیل کی حیثیت سے ابراہام زیادہ معروف رہی تھی۔

دھیرے ان کی ملاقاتیں بڑھنے لگی۔ میری جو پہلے مشکل اس کے سحر سے لگتی تھی پھر اس کی گرفت میں آگئی کیونکہ وہ تا حال عشق کے مرض میں مبتلا تھی، تا حال ابراہام کی توجہ کی طالب تھی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، آنسیت کا جذبہ پھر پینے لگا۔ میری کے چہرے کی شادابی لوٹنے لگی۔ وہ پھر مسکراتے لگی۔

بالآخر 4 نومبر 1842ء کو بد بختی کا ستارہ عروج پر پہنچ گیا... اُس روز میری اور ابراہام شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

وہ بہت خوش تھی، اس کی آنکھوں میں سننے تھے، دل میں امید کے چراغ روشن تھے تاہم... آگے فطرتاریکی تھی! اس روز بھی ابراہام پر تنہائی کا دورہ پڑا۔ تقریب میں شرکت سے قبل وہ کافی دیر تک اپنے بستر پر بڑا رہا۔

جب وہ اپنی دلہن لینے جا رہا تھا، کسی نے سوال کیا ”کہاں جا رہے ہیں جناب؟“

”خانقاہ پنہن میں...“ اس نے جواب دیا۔

وہ اس معاملے میں درست تھا کیونکہ ایک ناکام شوہر کی حیثیت سے ابراہام اپنی امیر میری کی زندگی کو دوزخ ہی کی شکل دینے والا تھا۔

☆☆☆

جب میری اسپرنگ فیلڈ میں موجود اپنی بہن کی عالی شان نگہی سے جہاں درجنوں ملازم اس کے ایک اشارے کے منتظر رہتے تھے، اپنے سرال آئی، اُسے پہلا جھکا لگا۔

یہ ایک نئی دنیا تھی جہاں وہ آسائش نہیں جھول تک اسے میسر تھیں۔ یہ وہ جنت نہیں تھی، جس کا اس نے سنا دیکھا تھا۔ البتہ وہ خوش تھی کہ اب وہ اپنے محبوب کے پہلو میں تھی۔ اُس انسان کی قربت اسے میسر تھی جس کے حصول کے لیے اس نے آگ کا دریا پار کیا تھا۔

اس نے خود کو کبھی طور پر بدل لیا۔ گھریلو ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ باورچی خانے کی گرمی میں بھی خود کو خوش و خرم رکھنے کا طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کام کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا جوکل تک اس کے ملازمین کیا کرتے تھے۔

محبت نے اُسے یکسر بدل دیا تھا۔ اب وہ پہلی والی میری نہیں تھی۔ کل کی شہزادی آج حقیقی معنوں میں خود کو سکھڑ بیوی ثابت کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے جی جان سے محنت کر رہی تھی۔

اس وقت وکیل کی حیثیت سے ابراہام زیادہ معروف رہی تھی۔

نہیں تھا، اس کی آمدنی معمولی تھی لیکن میری نے بڑی مہارت سے گھر کا بجٹ ترتیب دیا۔ اپنی خواہشات کا گھٹا گھونٹ کر کم آمدنی میں گزارہ کرنے کے ذرائع تلاش کر لیے، خواہشات نہ دیں اور قناعت پسند ہو گئی۔

”میری خوشی، میرے شوہر کی خوشیوں سے وابستہ ہے۔“ وہ اکثر خود سے کہا کرتی۔
بے شک وہ مسرور تھی لیکن کبھی کبھار اُسے لگتا جیسے ابراہام اس کی محبت کا اس طرز پر جواب نہیں دیتا جیسے ایک شوہر کو دینا چاہیے۔ کسی کی موعظ پر تو وہ اُسے نظر انداز بھی کر دیتا تاہم وہ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔ اس بے چاری کے لیے تو یہی بہت تھا کہ اُسے ابراہام کا ساتھ میسر ہے۔
شادی کے اگلے ہی برس جب اُس نے ایک صحت مند بیٹے کو جنم دیا، تکمیل کے احساس نے اسے مدھوش کر دیا۔

”میں دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت ہوں۔“
اس نے خود سے کہا اور اپنے بیٹے کا ہاتھ چومنا ماسک کا نام رابرٹ رکھا گیا تھا۔ 1844ء میں ابراہام نے اسپرنگ فیلڈ میں اپنے دفتر کے قریب ایک مکان خرید لیا۔
کتنی خوشی کی وہ اس دن... حالانکہ جس کو بھی میں اس کا بچپن گزارا، یہ مکان رتنے کے لحاظ سے اس کے والوں سے بھی چھوٹا تھا لیکن وہ مطمئن تھی۔ وہ اس مکان کو گھر بنانا چاہتی تھی لیکن وہ کبھی گھر نہیں بن سکا، بلکہ جہنم بن گیا۔

☆☆☆

دھیرے دھیرے ابراہام کی شہرت میں اضافہ ہو رہا تھا، اس کی آمدنی بڑھ رہی تھی، حلقہ اثر وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ دوسری جانب کل تک محافل میں توجہ کا مرکز بنی رہنے والی میری نے خود کو ایک گھریلو عورت کے سانچے میں ڈھال لیا تھا اور یہ تبدیلی اس محبت کے طفیل آئی جو اس کے دل میں موجزن تھی۔

اس نے تمام تضادات کو قبول کر لیا تھا، خود کو سمجھا لیا تھا۔ ”کیا ہوا جو میرا شوہر کھانے کی میز پر چھری کاٹنے کے استعمال سے ناواقف ہے۔ یہ کوئی بڑی بات تو نہیں، ہزاروں لوگ اشرافیہ کی ضیافتوں کے اس طریق کے بارے میں علم نہیں رکھتے... کیا ہوا جو وہ لباس کے معاملے میں بے پروا ہے، وہ ایک مصروف شخص ہے جو عظیم مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہا ہے، ایسے میں لباس کی جانب کیوں کر دھیان دے سکتا ہے... کیا ہوا جو وہ میری طرح پڑھا لکھا نہیں، اس کی صلاحیتوں سے تو کسی کو انکار نہیں ہے...“ اس طرح کے جملوں سے وہ خود کو

دلا سے دیتی اور اپنے ذہن کو منفی باتوں سے پرے رکھنے چھن کرتی۔

جب شام میں تھا کہ ابراہام گھر لوٹا، وہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتی۔ فوراً گرما گرم کافی پیش کرتی، بچہ میں رہتے ہوئے اس کے لیے رات کا بہترین کھانا تیار کر کے... ابراہام نے بھی اس گرم جوش کا مظاہرہ نہیں کیا جس کی میری منتظر تھی۔

دراصل وہ زور زور غصے کا حال تذبذب کا شکار تھا جب اضطراب حد سے بڑھ جاتا تو وہ اپنے قریبی دوستوں کے سامنے یہ کہہ بیٹھتا کہ شادی کر کے اس نے بہت بڑی غلطی کر دی اور وہ اپنی ازدواجی زندگی سے فطری خوش نہیں۔
ایسا نہیں تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ وہ اپنی بیوی سے اکٹھا کیا تھا، یہ کیفیت تو ابتدائی سے اُس پر طاری تھی۔ شروع ہی سے وہ اپنی شادی کے بارے میں بات کرنے سے کتراتا تھا۔

اس رشتے میں بندھنے کے فطری ایک پہلے بعد اس نے ایک کاروباری خط اپنے دوست سیمول مارشل کو روانہ کیا تھا جس میں شادی کے متعلق فطری ایک سطح تھی۔
”میری شادی کے سوا اور کوئی قابل ذکر خبر نہیں اور یہ معاملہ میرے لیے کسی حیرت سے کم نہیں!“

☆☆☆

اب ابراہام خاصا مصروف رہنے لگا تھا۔ صبح گھر سے نکلتا، رات گئے لوٹتا۔ کئی کئی دنوں تک اُن کے درمیان محبت کے ایک جملے کا بھی تبادلہ نہیں ہوتا۔
ان ہی دنوں خدانے میری کو ایک اور بیٹے سے نوازا جس کا نام ایڈورڈ رکھا گیا۔

اب اس کے سر پر دو بیٹوں کی پرورش کی ذمہ داری تھی۔ گھر ایک سنبھلنا تھا، سچ تو یہ ہے کہ اسے سر سنبھانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

کبھی کبھار جب ابراہام مسکرا کر اس کی جانب دیکھ لیتا، اُس غمگین عورت کی تمام محنتیں اُتر جاتی۔ 1850ء میں اس کا تیسرا بیٹا ولیم پیدا ہوا جس کے تین برس بعد 1853ء اس نے چوتھے بیٹے تھامس کو جنم دیا۔

وہ سیاسی طور پر بہت ہی پُر آشوب دور تھا۔ غلامی کی رسم کے متعلق جاری کئے جانے والے نئے قوانین نے امریکا میں انتشار پھیلایا تھا۔

ہیئرٹ پچر اسٹوک غلامی کی قبیح رسم کے خلاف لکھا جانے

Uncle Tom's Cabin ناول والا شہرہ آفاق ناول جس نے خانہ جنگی کی چنگاری کو قاتی ہواد کی شعلے ہو چکا تھا، ”سول وار“ کی آگ بھڑک اُٹھی۔

اس وقت غلامی کی رسم کا مخالف ابراہام سیاست میں قدم رکھ رہا تھا جس کی وجہ سے اُس کی مصروفیت دو چند ہو گئی تھی۔ وہ اکثر طویل دوروں پر بیرون شہر چلا جاتا اور میری تنہائی کا شکار ہو جاتی۔ اگر کبھی قسمت مہربان ہوتی تو ابراہام چند ہی روز میں لوٹ آتا لیکن اکثر دوری کا یہ وقتی کمی ہفتوں پر محیط ہوتا۔

ایک طرح سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب اُس کا شوہر عظمت کے حصول کے لیے کوشاں تھا، میری ایک مخلص بیوی کی طرح گھر سنبھال رہی تھی، شفیق ماں کی طرح بچوں کی پرورش کر رہی تھی اور ایک تپتے جیون سانچی کے مانند اپنے شوہر کا ساتھ دینے کی بے باک بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

بد قسمتی سے میری کی یہ کوششیں لاحقہ حاصل ثابت ہوئیں کیونکہ جس شخص سے محبت وہ کرتی تھی، اس نے خود کو مصروفیت کے جال میں اتنا الجھا لیا تھا کہ اسے اپنی بیوی نظر ہی نہیں آتی تھی۔ جب بھی ابراہام گھر آتا، وہ بچوں کو گود میں لے کر بیٹھ جاتا، انہیں خوب پیار کرتا لیکن میری کی جانب توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

کبھی کبھار وہ سوچتی ”کیا میں نے ابراہام سے شادی کر کے غلطی کی؟ کل تک میں شہزادی سیسی زندگی گزار رہی تھی اور آج میں ایک معمولی گھریلو عورت ہوں!“

وہ اپنا سر جھٹک دیتی لیکن سوالات پیچھا نہیں چھوڑتے، اندیشے کا ٹوں میں سرگوشیاں کرتے:

”کیا تمہارا شوہر واقعی تم سے محبت کرتا ہے؟ وہ کبھی اپنی محبت کا اظہار کیوں نہیں کرتا؟ ایسا تو نہیں کہ وہ کسی اور کے عشق میں مبتلا ہے؟“

وہ سرگوشیوں کو نظر انداز کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتی لیکن تنہائی کے سوگ میں ڈوبی راتوں میں خدشات بہت قوی ہو جاتے، اس کے دل میں جگہ بنا لیتے، اس کا سکون تہہ بالا گر دیتے۔

پھر 1858ء میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

سیاسی سطح پر ایک شخص ابراہام کے مد مقابل آ گیا۔ ایک ابراہام جسے میری پر خوبی جانتی تھی کیونکہ اس کا نام اسٹیفن ڈیکس تھا۔ میری کی پہلی محبت!

ریاست الی ٹوئے میں اس وقت دو ہی آدمیوں کی

بات خبریں شائع ہوتی تھیں، ایک ابراہام، دوسرا ڈیکس... وہ امریکی سینیٹ میں ایک دوسرے کے مد مقابل تھے اور ان کے درمیان جاری مباحثے نے الی ٹوئے سمیت ملک بھر میں توجہ حاصل کر لی تھی۔

ان دنوں جب ریاست میں ایک عظیم سیاسی مکالمہ جاری تھا، میری اکثر غرضی میں پہنچ جاتی۔ سوچ بچار کے دوران اُس کے سامنے اس کا شوہر اور اس کا گھرانہ محبوب آن کھڑے ہوتے۔ وہ ان دونوں کا سیاسی موازنہ کرتی، سماجی رتے کے پلڑے میں انہیں تولتی، علیحدگی کی بنیاد پر حکم لگانے کی کوشش کرتی... اور ہر بار ڈیکس فاتح ٹھہرتا۔

وہ جھٹلا جاتی، سر جھٹک دیتی۔ زیر لب دعائیں پڑھتی کہ ابراہام، اُس کا شوہر اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود یہ مقابلہ جیت جائے اور ڈیکس اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود خاک میں مل جائے۔

اس سوچ کا محرک عشق میں ناکامی کا تلخ تجربہ تھا۔ کبھی وہ ڈیکس سے عشق کیا کرتی تھی لیکن پھر وہ شخص کسی اور کی زلف کا اسیر ہو گیا اور اسے بھلا بیٹھا جس کی وجہ سے کئی روز تک غم میری کا جسم کھاتا رہا۔ اب وہ چاہتی تھی کہ ابراہام الیکشن میں اُسے شکست دے۔

اس کا شوہر غلامی کی رسم کے خلاف تھا۔ وہ ایسی قانونی ترمیم کا خواہش مند تھا جس سے غلامی کو ممنوع قرار دے دیا جائے اور میری کے لیے یہ نظریہ کسی طور قابل قبول نہیں تھا۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہاں غلامی عام تھی۔ اس کے خاندان کے تجویز میں کی غلام تھے۔

اس نظر یابی اختلاف کے باوجود وہ چاہتی تھی کہ اُس کا شوہر فاتح ٹھہرے۔ ایک طرح وہ ڈیکس سے خود کو رد کیے جانے کا انتقام لینا چاہتی تھی، لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ ابراہام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس واقعے نے میری کو توڑ دیا!

☆☆☆

معروف مصنف ڈیل کارنگی نے ایک جگہ لکھا ہے: ”ابراہام لیکن کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ اُس کی شادی تھی!“

ایسی طرح میں برس تک وکالت میں ابراہام کے شریک کار رہنے والے ولیم، ایچ برڈن نے کہا تھا: ”اپنی ازدواجی زندگی میں اگر وہ کسی روز خوش رہا ہو، تو مجھے اس کا علم نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی شادی ہی اُس کے

غموں کی سب سے بڑی وجہ تھی!"

اس شخص میں مورخین کی کتابوں سے سیکڑوں اقتباسات پیش کئے جاسکتے ہیں، جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ابراہام کی میری سے شادی ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا خمیازہ اسے ہمکنار پرائیگن وہ عظیم شخص بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ہر شخص ابراہام کو مظلوم بنا کر پیش کرتا ہے، مگر یہ بھی بد نصیب میری کی جانب توجہ نہیں دی جس نے اپنا سب کچھ بیک کر ایک ایسے انسان سے شادی کی، جو نہ تو سماجی حیثیت میں اُس کے برابر تھا، نہ ہی اس کی طرح تعلیم یافتہ تھا۔ اس کے باوجود اُس نے اپنے شوہر کو ٹھٹھ کر چاہا اور اسی چاہت نے اسے توڑ دیا۔

اس کا شوہر بھی تبدیل نہیں ہوا، اس نے ہمیشہ اپنی بیوی کو نظر انداز کیا۔ اسی وجہ سے ان کے درمیان جھگڑوں کا آغاز ہوا جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اتنی شدت آگئی کہ ان کی زندگی اجیرن ہو گئی۔

ایک بار میری نے اپنی سہیلی سے کہا۔
"وہ مجھے درخور اعتنائیں جانتا۔ جب میں سوال کرتی ہوں تو مجھے نظر انداز کر دیتا ہے۔ جب میں جھگڑا کرتی ہوں، وہ خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ وہ مجھے اہمیت ہی نہیں دیتا لیکن اس کے باوجود میں اُس سے شدید محبت کرتی ہوں، نہ جانے کیوں؟"

میری کو یہ اطلاعات بھی مل رہی تھیں کہ اُس کا شوہر سماجی حلقوں میں فعال خواتین کا منظور نظر ہے جو تقریبات میں اُسے گھیرے رکھتی ہیں۔ ان خواتین میں چند ایسی بھی تھیں، جن سے ابراہام کا ماسی میں بھی تعلق رہا تھا۔

جب ایک شام اس نے اس بابت ابراہام سے سوال کیا، اس نے جواب دینے کے بجائے ایک سردا بھری اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میری چلائی "میں تمہاری بیوی ہوں، مجھے پوچھنے کا حق ہے۔ مجھے جواب دو؟" لیکن وہ چاہتا تھا۔

چند مورخین کہتے ہیں کہ میری ایک حاسد عورت تھی۔ شاید انہوں نے ایک مرد کی حیثیت سے سوچا ہو کیونکہ اگر وہ خود کو خاتون کی شکار، توجہ کی منتظر میری کی جگہ رکھ کر سوچتے تو بھی ایسا کہنے کی ہمت نہیں کرتے!!

مگر کی ماری میری جب محافل میں یہ دیکھتی کہ ابراہام دیگر خواتین سے ہنس کر بات کر رہا ہے، اُن کی گفتگو کو

سن کر رہا ہے، وہ آگ بگولا ہو جاتی۔ اور وہ غصہ میں آنے پر حق بجانب تھی۔ شادی کے اتنے برسوں میں بھی اُس کے شوہر نے اُس سے تو ہنس کر بات نہیں کی، کبھی اس کی گفتگو توجہ سے نہ کی، نہ ہی اس کی محبت کا گرم جوش سے جواب نہیں دیا، کبھی اس کی کاوشوں کو نہیں سراہا۔

جلدی ہی گھر کے باہر بھی اُن کے جھگڑوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ محافل کے دوران بھی ان کے درمیان چند جھڑپیں ہوئیں۔ ان ہی میں ابراہام کے فیلڈ کے بورڈ ہاؤس میں رد و نما ہونے والا واقعہ بھی شامل ہے، جب میری نے چائے کی گرم پیالی اُس کے منہ پر دے ماری تھی۔

ابراہام ہر بار اپنے روایتی طریق کے مطابق خاموش رہا۔

انہی جھڑپوں کو بنیاد بنا کر تاریخ کے صفحات پر میری کی ایک منفی تصویر پیش کی گئی۔

دراصل میری پوری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ شادی کے ابتدائی زمانے میں جن اندیشوں کو وہ سر جھٹک کر نظر انداز کر دیا کرتی تھی، وہ اب اتنے قوی ہو گئے تھے کہ اُن سے کتراتا تقریباً ناممکن تھا۔

جب خدشات اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتے۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی۔ اور جب تنہائی اس پر حملہ آور ہوتی وہ اپنا دفاع کرنے میں ناکام رہتی۔

واضح رہے کہ اس کا دوسرا بیٹا ایڈورڈ فقط چار برس کی عمر میں (1850ء میں) فوت ہو گیا تھا۔ اس سانحے نے بھی میری پر انتہائی منفی اثرات مرتب کئے، البتہ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن جب ابراہام اُسے تو اتار کے ساتھ نظر انداز کرنے لگا، یہ دُخم پھر تازہ ہو گیا اور وہ اپنے بیٹے کو یاد کر کے آنسو بہانے لگی۔

اسے صحت کے مسائل نے بھی گھیر رکھا تھا۔ کم سنی ہی سے اسے سردرد کی شکایت تھی۔ ڈپریشن کے دورے بھی بڑا کرتے تھے۔ پہلے پہل تو وہ خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھال لیتی تھی لیکن شادی کے بعد ابراہام کے منفی رویے نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اسی باعث ڈپریشن کے دورے تو اتار سے آنے لگے۔ بد قسمتی سے بیماری کے دنوں میں بھی شوہر اُس کی خبر گیری کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ وہ کسی سیاسی محاذ پر ملک کو متحد رکھنے کی جنگ میں مصروف ہوتا، ایسی جنگ جسے جیتنے کی خواہش میں وہ اپنے گھر کو بھلا بیٹھا تھا۔

☆☆☆

1860ء میں میری کو اپنی رہائش گاہ بدلتی پڑی۔ اسے اپنا گھر چھوڑنا پڑا، جس کی بنیادی وجہ اُس کے شوہر کا صدر امریکا منتخب ہونا تھا۔ اب اس جوڑے کو وائٹ ہاؤس میں ڈیرا ڈالنا تھا۔

میری اب دنیا کے سب سے طاقتور شخص کی بیوی تھی، جو اندر سے بہت کمزور تھی، کیونکہ وہ محبت سے محروم تھی اور یہ محرومی اُس کی روح کو بے چین رکھتی تھی۔

مارچ 1860ء میں میری نے وائٹ ہاؤس میں قدم رکھا۔ مشہور مقولہ ہے کہ آب و ہوا کی تبدیلی صحت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے لیکن میری کا معاملہ مختلف تھا کیونکہ وائٹ ہاؤس میں رہائش اختیار کرنے کے بعد اُس کے غموں میں اضافہ ہی ہوا۔

اُس وقت امریکی خانہ جنگی عروج پر تھی اور صدر انتہائی مشکلات کا شکار تھا لیکن وہ تنہا مصائب برداشت نہیں کر رہا تھا، امریکی خاتون اول بھی ایک عذاب میں مبتلا تھی۔

ازدواجی محاذ پر اُسے سخت مشکلات کا سامنا تھا جس کا بنیادی سبب بدلتے ہوئے سیاسی حالات تھے۔

میری کے خاندان کا تعلق امریکا کے سرحدی علاقے سے تھا، جہاں بھی غلامی کو قانونی حیثیت حاصل تھی۔ اُس کے خاندان کے بھی کئی غلام تھے لیکن اب ابراہام لیکن اور اُس کے حواری غلامی کی رسم کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ اِس تضاد کی وجہ سے میری شدید ذہنی اذیت کا شکار رہی۔

ایک جانب وہ اپنے شوہر کی حمایت کر رہی تھی، وہیں اپنے خاندان کو درپیش مسائل پر بھی اُس کی نظر تھی جن میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔

جب غلامی کے قوانین میں تبدیلی کی گئی، تو کینیکسی کے روساء میں شاید یہ کوئی نوؤ خاندان جتنا متاثر ہوا ہو۔ حالانکہ اِس خاندان کے باصلاحیت افراد نے امریکا کے لیے کئی قربانیاں دیں لیکن صدر کے قلم کی ایک جھٹ سے اُن قربانیوں کو بے حیثیت کر دیا۔ جائیدادیں ضبط کی گئیں، عہدے ختم کئے گئے۔

حق تو یہ ہے کہ خاتون اول کے خاندان کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں برتی گئی، بلکہ وہ کینیکسی کے دیگر خاندانوں کے برعکس پہلے زبردست آئے۔

چند حلقوں کا خیال ہے کہ ابراہام لیکن کے اِس اقدامات کا مقصد یہ پیغام دینا تھا کہ اگر وہ اپنے سربراہوں کے خلاف فیصلہ کن اقدام کر سکتا ہے، تو دوسروں کو بھی نہیں

بچنے گا۔ تاہم چند تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ یہ میری سے انتقام لینے کی بیوقوفی کو شش کی تھی۔

وجہ جو بھی رہی ہو، نئے قوانین نے میری کے خاندان کو شدید متاثر کیا، جس کی وجہ سے وہ ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگی۔ اس موضوع پر اُس سے کئی سوالات بھی کیے گئے لیکن اس نے ہر بار اپنے محبوب، اپنے شوہر کی حمایت کی، حالانکہ یہ کسی طور آسان نہیں تھا۔

ابراہام لیکن کے مخالفین جانتے تھے کہ میری کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جس کی تحویل میں کئی غلام ہیں اور جو غلامی کی رسم کے تعلق سے بننے والے قوانین کا مخالف ہے۔ اِس بات کو جواز بنا کر اس مظلوم عورت پر خاصی تنقید کی گئی اور خاتون اول کا عہدہ اس کے لیے عذاب بن گیا۔

اُس کا تعلق مغربی علاقے سے تھا، جب کہ اِس زمانے میں امریکی سیاست میں مشرقی اور جنوبی علاقے کے افراد کا رسوخ زیادہ تھا، جن کے لیے یہ تہذیب یافتہ خاتون کی طور قابل قبول نہیں تھی۔ ان مشکل حالات میں اُسے امید تھی کہ ابراہام اُس کا ساتھ دے گا لیکن اِس شخص کے پاس تو فرصت ہی نہیں تھی۔

وائٹ ہاؤس میں قیام کے زمانے میں اخبارات میں میری کی بہت منفی شہیدیں پیش کی گئی۔ اس کی بابت یہ نیک لکھا گیا کہ اُسے محافل کے آداب کا لفظی علم نہیں ہے۔ دوسری جانب اخبارات نے ابراہام کو ایک ایسے جری انسان کے طور پر پیش کیا، جسے نہ صرف سیاسی بلکہ ازدواجی محاذ پر بھی مشکلات کا سامنا ہے۔

اُن برسوں میں اُسے صحت کے مسائل نے بھی گھیرے رکھا۔ ڈپریشن کے دورے تو اتار سے پڑنے لگے تھے۔ وہ اکثر سردرد کی شکایت کیا کرتی تھی۔ تکلیف کے ایام میں بھی وہ اپنے شوہر کی توجہ کو ترستی رہتی۔ طبی دستاویز بتاتی ہیں کہ وہ Bipolar disorder نامی مرض میں مبتلا ہو گئی تھی، جس میں انسان جذباتی ترتیب کھو بیٹھتا ہے اور اُس کا رویہ غیر معمولی تبدیلیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

وائٹ ہاؤس میں قدم رکھنے کے بعد اُسے اپنے تیسرے بیٹے ولیم سے محرومی کا کرب بھی سہنانا پڑا تھا، جس نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ وہ عدم تحفظ کا شکار ہو گئی تھی اور وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ وحشت کے کھنبے میں کستی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ایک جانب بیماری اور دوسری جانب غافل شوہر، جس

نے عدم توجہی اپنی عادت بنائی تھی۔

مظلوم میری کو وہ بیٹوں کی جدائی کا بھی غم تھا، ایسے میں اس نے اپنی توجہ مثبت باتوں پر مرکوز کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

وہ باقاعدگی سے اسپتالوں کا دورہ کرنے لگی جہاں وہ مریضوں میں پھل اور پھول تقسیم کرتی۔ وہ زخمی نوجوان سپاہیوں سے خاصی شفقت سے پیش آتی جن میں اسے اپنے مرحوم بیٹے نظر آتے تھے۔

شوہر کی توجہ سے محرومی کے باوجود اس عظیم عورت نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ باقاعدگی سے ابراہام کے ساتھ جنگی محاذوں کے دورے کیا کرتی تھی۔ وائٹ ہاؤس میں سماجی تقریبات بھی منعقد کروائی۔ گوکہ اس عمل کو چند حلقوں کی جانب سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن آج کے تجربہ نگار تسلیم کرتے ہیں کہ اس سرگرمی سے ابراہام لیکن کے ایجنٹ کو فائدہ پہنچا۔

بالآخر اپریل 1865ء میں خانہ جنگی اختتام کو پہنچی۔ اس کا دور شروع ہوا، جس کا سہرا ابراہام لیکن کے سر جاتا تھا۔ جب دیرے دیر سے سیاسی تناؤ ختم ہونے لگا، تو میری کے دل میں یہ امید جاگ اٹھی کہ شاید اب شوہر اس کی جانب توجہ دے گا، اُسے التفات سے نوازے گا، اس کی زخموں پر مرہم رکھے گا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ برسوں بعد موسم سرما کی ایک خوشگوار شام ابراہام نے اُس کے تیار کردہ شوربے کی تعریف کی اور اس کے لباس کی بات اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ مظلوم عورت مسرت سے ہنسی۔ برسوں سے وہ منتظر تھی کہ شوہر اسے محبت سے مخاطب کرے۔

عشاقیہ کے اختتام پر جب وہ خواب گاہ کی جانب جا رہی تھی، اس نے خود سے سوال کیا۔ ”کیا اذیت کے دن تمام ہو گئے؟ کیا محبت سے محرومی کے البے نے ناکامیوں نے میرا چہچہا چھوڑ دیا؟“ اس لمحے تذبذب کی شکار میری کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اگلے روز جب ایک بار پھر امریکا کے صدر نے اُسے مسکرا کر دیکھا، اُس کے زخمی دل میں خوشی کے پھول کھل اُٹھے۔ اُس روز وہ برسوں بعد ہشاش بشاش نظر آئی۔ وہ واقعی خوش تھی اور پرانے دکھوں کو یاد کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”میں ایک ناکام بیوی نہیں ہوں۔ میرا شوہر مجھ سے

محبت کرتا ہے!“ اُس نے خود سے کہا۔

گوکہ اگلے چند دنوں میں ابراہام کی مصروفیات نے اسے گھیرے رکھا، تاہم کوئی دل شکنی والی بات نہیں ہوئی۔ میری نے بھی اُس کی خوشنودی کے لیے ہر وہ کام کیا جسے ابراہام پسند کرتا تھا۔

ابھی اس کا پیاسا دل محبت کی پھوار میں پوری طرح پیچا بھی نہیں تھا کہ 14 اپریل اپریل کا انھوں دن آن پہنچا، جس کا آغاز ایک انتہائی حسین صبح سے ہوا۔

وہ اُس صبح وائٹ ہاؤس سے ملحقہ پارک میں بیٹھی تھی، جب خادمہ نے اُسے صدر کا پیغام پہنچایا کہ آج رات وہ خاتون اول کے ساتھ فورڈز تھیٹر کا رخ کریں گے، جہاں Our American Cousin نامی کھیل پیش کیا جا رہا ہے۔

”ضرور، میں اُن کی شکر گزار ہوں۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

مقرر وقت پر تیار ہونے کے بعد اُس نے آئینے پر نظر ڈالی، جس سے ایک اوجھڑا عورت کا عکس جھلک رہا تھا جس کے چہرے پر دکھ کے باوجود مسکراہٹ تھی۔ اُس نے خود سے کہا ”میں نے برسوں کے تنگ انتظار کے بعد غموں سے، عدم توجہ سے نجات حاصل کر لی ہے۔“

وہ غلطی... مجرومیاں تا حال اس کے تعاقب میں تھیں کہ بدبختی اس کے مقدر میں لکھی تھی۔

اُس بیت ناک رات فورڈز تھیٹر ہال میں ڈراما دیکھنے ہوئے ایک نامور اداکار جون بوچھ نے پشت سے ابراہام لیکن پر فائر کیا۔ گولی سیدھی اُس کے سر میں اتر گئی۔

اُس دہشت ناک منظر کو دیکھنے والا ہر شخص سکے میں تھا لیکن میری جس کیفیت سے گزری، اُسے بیان کرنے کے لیے شاید ہزاروں حزنہ الفاظ بھی کم پڑ جائیں۔ اس کا محبوب، وہ شخص جس کے لیے اس نے اپنا سب کچھ دیا، جس کی محبت کے لیے وہ تڑپ رہی، اس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا۔

وہ زخمی ابراہام کے ساتھ گریہ کرتی ہوئی صدارتی محل لوٹی، جہاں اُس پر مسلسل ششی کے دورے پڑتے رہے۔

پوری رات ابراہام کا باز اپنا، رابرٹ باپ کے سر ہانے بیٹھا رہا، جس نے 15 اپریل کی صبح سات بجے دم توڑ دیا۔

اُس وقت میری غم سے اس قدر مفلج تھیں کہ بیکریٹری آف وار کے حکم پر اُسے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا۔

”خاتون اول کی حالت بہت خراب ہے، انہیں یہاں سے لے جائیں۔“ مضبوط اعصاب کے حامل اُس بوڑھے آدمی کی آنکھوں میں نمی تھی۔

میری کمرے سے باہر ضرور چلی گئی تاہم اُس کی چپٹیں اُس اُداس کمرے کی دیواروں سے ٹکرائی رہیں، جہاں ابراہام کی لاش رکھی تھی۔

وہ اُس شخص کے لیے گریہ کر رہی تھی، جس نے کبھی اُس سے محبت نہیں کی!

☆☆☆

اُس کے سامنے تقریبی پیغامات کا ڈھیر لگا تھا۔ ہزاروں خطوط تھے، جنہیں وہ پُریم آنکھوں کے ساتھ پڑھتی اور قلم لے کر پڑھ جاتی، تاکہ تقریر کرنے والوں کا شکریہ ادا کر سکے۔

ایک خط برطانیہ کی فرماں رواں ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے تھا، جس کے جواب میں میری نے لکھا:

”ملکہ عالیہ، مجھے آپ کا تقریبی خط موصول ہوا، جسے لکھنے کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں۔ میں آپ کی ہمدردی کے لیے شکر گزار ہوں، جو ایک ایسے دل میں پیدا ہوئی، جو اُس دکھ کو واضح طور پر محسوس کر سکتا ہے جس سے میں گزر رہی ہوں!“

واضح رہے کہ ابراہام لیکن کی موت سے چار برس قبل ملکہ وکٹوریہ کو اپنے شوہر شہزادہ البرٹ کی موت کا غم برداشت کرنا پڑا تھا، جس سے وہ شدید محبت کرتی تھی لیکن میری اور ملکہ وکٹوریہ کے غم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ملکہ کو اپنے محبوب شوہر کی محبت میسر تھی، اُس کا غم بجا تھا، تاہم جس کرب سے میری گزر رہی تھی، اُس کی توجہ جہش مشکل تھی کیونکہ ملکہ کے برعکس اُسے بھی اپنے شوہر کی محبت نصیب نہیں ہوئی۔

آنے والے برسوں میں بھی محرومیوں نے اس مظلوم عورت کا چہچہا چھوڑا۔ اپنے دو بیٹوں اور شوہر کی موت کا کرب سنبھالنے والی میری پر جولائی 1871ء میں اُس وقت غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، جب اُس کا بیٹا تھامس بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔

اس سانحے کے بعد وہ درد کی گہری کھائی میں اتر گئی جہاں تاریکی تھی، تنہائی تھی۔

اب فقط ایک پینا رابرٹ زندہ تھا، جس کے سلسلے میں وہ اکثر پریشان رہتی۔ وہ عدم تحفظ کا شکار ہو گئی تھی اور اُسے یہ غم پریشان رکھتا تھا کہ رابرٹ بھی جلد اُس سے جدا ہو جائے گا۔ وہ اپنی زندگی کے حوالے سے بھی اندیشوں کا

شکار تھی۔

شکار گو میں قیام کے دوران اُس نے کئی بار یہ بات ڈہرائی کر دی کہ سفر کے دوران ایک مٹھوک شخص نے اُسے زبردستی کی کوشش کی تھی۔

شوہر کے انتقال کے بعد اُس نے شوخ رنگ پہنے چھوڑ دیئے تھے، اب وہ فقط سیاہ رنگ کا ماتی لباس پہنتی جس میں اس کی بے چارگی کی گناہ بڑھ جاتی۔

غموں کے اُس زمانے میں اس نے کئی عجیب و غریب حرکات کیں۔ وہ بے تحاشہ شاپنگ کرنے لگی، کئی ایسی اشیاء خریدیں، جنہیں اس نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ اُسے غربت کے خوف نے بھی جکڑ رکھا تھا۔

اپنے شوہر کی جدائی کے غم سے ٹھہرا اس مظلوم عورت نے کئی بار بوڑھے ہی بیٹے کے انداز میں خودکشی کی بھی کوشش کی۔

ان ہی حرکات کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے رابرٹ کی توجہ سے بھی محروم ہو گئی اور یوں اُس کی زندگی کا البیہ دو چند ہو گیا۔ اس زمانے میں مختلف نوع کے مقدموں نے بھی اُسے پریشان رکھا۔ بالآخر وہ 1876ء میں اپنی بڑی بہن الزبتھ کی تحویل میں آ گئی۔ آخر کے چند برس وہ محبت کے گونا گوں مسائل میں گھری رہی۔ بڑی بہن نے اس کا خیال رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

الزبتھ اپنی چھوٹی بہن کے سر ہانے بیٹھ کر اُسے دلا سے دیتی، جس کے ذہن پر آج بھی ابراہام لیکن سے جدائی کا سانحہ سوار تھا۔ گوکہ میاں بیوی کی زندگی میں خوش گوار لمحات کم ہی آئے، لیکن اسپرنگ فیلڈ میں بستر مرگ پر میری نے اپنے شوہر، اپنے محبوب کو کئی بار پکارا۔ اپنی 23 سالہ شادی شدہ زندگی کے اُن ہشتے سکرانے پلوں کو یاد کرنے کی بساط بھر کوشش کی، جو کبھی آئے ہی نہیں!

جب مظلوم میری ابراہام کو پکارتے پکارتے نیند کی وادی میں اتر جاتی الزبتھ کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ وہ جانتی تھی کہ اب میری کی حالت میں سدا ہر ممکن نہیں!

بالآخر شفق سے محروم، توجہ کی طالب میری ٹوڈ لیکن 63 برس کی عمر میں 16 جولائی 1882ء کو جہان فانی سے کوچ کر گئی۔

اپنے عہد کی بد نصیب ترین خاتون اول کو اُس کے بے وفا شوہر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

شکست عشق

ابن کبیر

وہ میدان جنگ کا فاتح تھا، تاریخ اسے فاتح اعظم قرار دیتی ہے مگر محبت کے محاذ پر وہ مفتوح قرار پایا۔ شکست اس کا مقدر ٹھہری۔ عشق کی معراج پر پہنچ کر اس کا عشق ناکام ثابت ہوا۔ اس نے پہلے عشق کی ناکامی پر سوگ منایا مگر دوسرے عشق نے بھی چین لینے نہ دیا، جس وارث تخت کی خاطر اس نے پہلی محبت کو ٹھکرایا، اس نے بھی وفانہ کی اور وارث کو نگاہوں سے دور رکھا۔

ایک ایسے شہنشاہ کی ناکام محبت کا قصہ جس نے یورپی تاریخ پر اثرات مرتب کیے

عشق ناکام
نمبر

1933ء کی وہ صبح کچھ زیادہ ہی سرد تھی۔

لندن کے آسمان پر دبیز بادل چھائے تھے۔

درجہ حرارت نقطہ انجماد سے گر چکا تھا اور

برف باری کی پیشگوئی درست ہونے کے خدشات سر اٹھا

رہے تھے، اس کے باوجود اس صبح شہر کے محفلے ہاتھوں

کے رنگ و پے میں تجسس دوڑ رہا تھا کہ آج تاریخی اہمیت کے

حامل، شہت جذبات سے لبریز ایسے خطوط نیلائی کے لیے

پیش کئے جانے تھے، جن کی ہر سطر سے محبت چلتی تھی... ایسی

محبت جس نے تاریخ کے صفحات پر ایک حزن پہ داستان عشق کو

جہنم دیا۔

نیلائی کا وقت آن پہنچا۔ گوکہ پالا بڑھا تھا، ڈالہ

باری جاری تھی پھر بھی میوزیم کے سامنے کافی بھیڑ تھی۔ وہ

لاکھوں شہری جو میوزیم نہیں پہنچ سکے تھے، اُن کی توجہ بھی

نیلائی ہی پر مرکوز تھی۔ آخر کار وہ خبر آئی مگی جس کا انہیں

انتظار تھا۔ خطوط کو چار ہزار پوٹرز کے عوض خرید لیا گیا تھا!

کوئی حیران نہیں ہوا۔ یہ متوقع تھا۔ ہر شخص اُن

ادوار کے گراں نرخوں پر فروخت ہونے ہی کی توقع کر رہا

تھا۔

موسم سرما میں نیلائی کی غرض سے پیش کیے جانے

والے اُن محبت ناموں کو اٹھارویں صدی کے ادوار میں اٹلی

کے محاذ پر فراموشی مفادات کی جنگ لڑنے والے جذبات عشق

سے سرشار ایک سپہ سالار نے اپنی محبوبہ کے نام بھیجا تھا، جو

آنے والے برسوں میں بڑے ہی عجیب ڈھنگ سے فرانس

کا بادشاہ بن گیا اور اُس کی محبوبہ فرانس کی ملکہ... لیکن اس

منحوس عہدے نے اُس کے فسانہ محبت کو ایسے کی شکل دے

دی۔

وہ بد قسمت نیپولین بونا پارٹ تھا۔ تاریخ کا عظیم ترین

جنگجو، ایک سخت جان شخص۔ جسے دشمن تو دشمن، دوست بھی

”قصاب“ کہہ کر پکارتے تھے۔ اُس نے کئی محاذوں پر

حیرت انگیز کامیابی حاصل کی تھی لیکن محبت کے محاذ پر اُسے

بدترین ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے باوجود شکست کی فکار

اس عاشق کا سوختہ دل برسوں محبت کے مذبح خانے میں تڑپا

رہا۔ زندگی کی بازی ہارنے سے قبل اُس بد نصیب نے اپنی

محبوبہ ہی کو پکارا تھا۔ ”... جوزفین!“

☆☆☆

جولائی 1784ء کی اُس رات جیس کی ایک سیلن

زادہ، گرم کوٹھری میں قید روز کا ذہن اندیشوں میں الجھا

تھا جنہیں گزرتے سیاہ لمحات میسر کر رہے تھے۔

روز کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا

جائے گا تاہم وہ اس بات سے واقف تھی کہ حکومت اُس کے

شوہر الیکزینڈر ڈی بیو ہارن کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔

جوں جوں وہ اس بابت سوچتی، وحشت ناک

اندیشوں میں اضافہ ہوتا جاتا۔ اسے یوں لگتا جیسے کوئی اس

کے دل کو ٹھپی میں بھر کر بھیج رہا ہے۔

بالآخر شدت غم سے اُس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں

آنسو اتر آئے اور وہ غم حال ہو کر ادھر سے ہوئے فرش پر

ڈھیر ہو گئی۔ اب لعن زدہ کوٹھری میں سکیاں گونج رہی

تھیں!

اُس کا پورا نام ”ماری جوزف روز ٹاشلر بیکروی“ تھا

تاہم وہ روز کے نام سے معروف تھی۔ ہاں... آنے والے

برسوں میں اُسے فرانس کے سالار اعظم کی جانب سے نیا نام

ملنے والا تھا... جوزفین! اور اسی نام کے ساتھ اُسے شاہی

تخت پر بیٹھنا تھا لیکن یہ تو بعد کی بات تھی، اُس وقت وہ فقط

روز تھی۔ ایک بے سہارا عورت جس نے 23 جون

1723ء کو بحیرہ کیریبین کے ایک جزیرے مارٹینیک کی

ساحلی بستی میں آنکھ کھولی تھی۔

روز کی ابتدائی زندگی خاصی خوشگوار تھی۔ علاقے کے

دیگر خاندانوں کے برعکس اس کے گھرانے کو کئی ایسی

آسائشیں میسر تھیں جن سے استفادہ کرنے کا تصور بستی کی

نصف آبادی کے لیے محال تھا۔ بالائی متوسط طبقے سے تعلق

رکھنے والا اُس کا خاندان شکر سازی کے کاروبار سے وابستہ

تھا۔ اُس کا باپ جوزف اپنے اہل خانہ کے ساتھ کارخانے

کی اوپری منزل میں مقیم تھا۔ آئرش نسل اُس کی ماں کلیری

ایک تہذیب یافتہ عورت تھی جس نے اپنی اولاد کی تربیت پر

خصوصی توجہ دی۔

ماہنامہ سرگزشت

اگست 2012ء

120

www.pdfbooksfree.pk

ماہنامہ سرگزشت



روز نے علاقے کے کاؤنٹ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی جہاں اُسے اخلاقی اقدار و اطوار سے لیس کیا گیا۔ وہ محافل کے آداب سے بخوبی واقف تھی۔ لہجے میں ایک خاص قسم کی شائستگی تھی جو اُس زمانے میں متول گھرانوں کی لڑکیوں ہی میں نظر آتی۔ گوکہ اس کا شمار خوبصورت ترین لڑکیوں میں نہیں ہوتا تھا، تاہم وہ بلا کی پرکشش تھی۔ آنکھوں میں ذہانت دکھتی تھی۔ اور ان ہی آنکھوں میں روز نے ایک شان دار مستقبل کے سنے سجائے تھے ایک تہذیب یافتہ انسان سے شادی کرنے کا خواب دیکھا تھا۔

چھوٹی بہن کیتھرین بھی روز کے نقوش پا کا تعاقب کرتی۔ اُسی کے مانند سننے و دیکھتی، محافل میں اُس کے انداز کی نقل کرتی۔ وہ دونوں بہنیں خواب دیکھنے کا حق رکھتی تھیں کیونکہ خوبرو تھیں، تعلیم یافتہ، باشعور اور ذہین تھیں،

اگست 2012ء

www.pdfbooksfree.pk

121



لیکن... وقت کبھی ایک سائیں رہتا۔ وہ برس... اس گھرانے کے لئے انتہائی اذیت ناک ثابت ہوا۔ ماہی کیروں کی وہ بستی بدترین سمندری طوفان کی زد میں آگئی۔ ایسا طوفان جو خوشیاں لٹکے کا ارادہ کئے ہوا تھا۔ طوفان کا قہر کیا کم تھا کہ آسمان بھی پوری قوت سے برسنے لگا۔ کئی روز تک جاری رہنے والی بارشوں سے سیکڑوں جانوں کا ضیاع ہوا، مکانات ڈھے گئے، مواصلاتی نظام درہم برہم ہو گیا۔ اگلے چند ماہ تک پانی قصبے میں کھڑا رہا اور وہاں کے باسی بے بسی کی تصویر بنے رہے۔ جب پانی اترآ، آنکھوں کے سامنے فقط تباہی تھی۔

اس طوفان نے روز کے گھرانے کا کاروبار بار بار دوڑ دیا۔ انہیں توڑ دیا۔ اب معاشی بدحالی کا عفریت سامنے منہ کھولے کھڑا تھا۔ بڑے دنوں کا آغاز ہو گیا تھا۔ خوشیاں روٹھ گئی تھیں۔

شکر سازی کے کارخانے کی اوپری منزل میں جہاں کبھی قہقہے رقص کیا کرتے تھے، اب سناٹا رسنے لگا تھا۔ اس منزل کی کشادگی یکدم گھٹ گئی تھی۔ روشنی ماند پڑ گئی تھی۔

طوفان کا آسیب یوں اس گھرانے سے چٹ گیا تھا کہ روز اور کیتھرن کی آنکھوں سے جن میں حسین پنپے تھے، اب نقاب تھجھکنے لگی تھی۔ ان کے اطوار میں گہری یاسیت در آئی تھی اور وہ قنوطیت کے دریا میں اتر گئی تھیں۔

جب کبھی کلیری کی نظر اپنی دونوں خوبرو لیکن اداس بینوں پر پڑتی، اس کے دل میں غم کا سمندر ٹھانٹھیں مارنے لگتا اور وہ ڈھکی عورت، آنسو چھپاتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔ رات رات بھر دعائیں مانگتی کہ خدا اس کی بینوں کی کسی اچھے گھرانے میں شادی کروادے، تاکہ ان کی شادابی لوٹ آئے۔

کلیری ایسے رشتوں کی تلاش میں تھی جن کے طفیل اس کے خاندان کی معاشی حالت بھی سدھر جائے۔ اس ضمن میں اس نے چند کوششیں بھی کیں لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ وجہ بہت سادہ تھی، اب اس کا خاندان مقررہ تھا، کسمپرسی کا شکار تھا۔ ایسے میں کون اس کی بینوں سے رشتہ کرنے کی بامی بھرتا؟

خوش قسمت سے مشکل کی اس گھڑی میں روز کی خالہ ایدی نے اس خستہ حال گھرانے کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایدی نے فرانسسی اشراف سے تعلق رکھنے والے ایک بااثر شخص فریکوس کو اپنی زلف کا امیر بنا رکھا تھا۔ اس نے کلیری سے وعدہ کیا کہ جب تک وہ اپنی بھانجیوں کا کسی اچھے گھر

میں رشتہ نہیں کروادیتی سکون سے نہیں بیٹھتی۔ ایدی واقعی ارادوں کی پکی تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح فریکوس کو راضی کر لیا کہ وہ اس کی بارہ سالہ بھانجی کیتھرن کی شادی اپنے انیس سالہ بیٹے الیگزینڈر سے کر دے۔ جون ہی اس کے عاشق نے رشتے کے لیے ہامی بھری، اس نے خوشخبری کا تار مار ٹیک رواد کر دیا۔ اگلے روز جب ڈھکوں سے اچھٹی کلیری کو اپنی بہن کا تار موصول ہوا، وہ مسرت سے بھر گئی۔

”بڑے دن تمام ہونے!“ اس نے خود سے کہا۔ دوڑی دوڑی اپنے شوہر کے پاس پہنچی تاکہ اسے مطلع کر سکے کہ خوشحالی دروازے پر دستک دے رہی ہے۔

اگلے ہی روز سے شکر ساز کے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، جن میں روز نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ اس رشتے پر بہت خوش تھی۔ اپنی بہن کو عروسی جوڑے میں دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں ٹھانٹھیں مار رہی تھی، تاہم وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی!

فرانس روانہ ہونے سے فقط چند روز قبل اکتوبر 1777ء میں بارہ سالہ کیتھرن مختصر علالت کے بعد دنیا سے فانی سے کوچ کر گئی اور شادی کے گھر میں مصف ماتم بچھ گئی۔

یہ صدمہ بہت بھاری تھا۔ گھرانے پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اندیشے سر اٹھانے لگے کیونکہ اس سانحے سے ایدی کی کوششیں ضائع ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا، فریکوس اپنا فیصلہ بدل سکتا تھا اور قسمت میں شد حار کا یہ موقع ہاتھ سے نکل سکتا تھا۔

وقت تھا۔ میاں بیوی نے سوچ بچار میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی بڑی بیٹی روز کو کیتھرن کی جگہ اس سرزمین کی طرف روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا جس کی ملکہ بننا اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا۔

اکتوبر 1779ء میں اپنے باپ جوزف کے ساتھ روز فرانس پہنچ گئی اور اگلے ہی ماہ وہ ویرجیا الیگزینڈر کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھ گئی۔ نوجوان الیگزینڈر ایک فوجی افسر کی حیثیت سے تیزی سے ترقی کا زینہ عبور کر رہا تھا اور فرانس کی سیاست میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا تھا۔ روز کو یقین تھا کہ وہ اس تہذیب یافتہ نوجوان کی حیون ساتھی بننے کے بعد جمہوریت کے حسین وادی میں داخل ہو جائے گی جہاں مسرت کی نہریں بہہ رہی ہوں گی لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ بے شک وہ تعلیم یافتہ تھی، محافل کے آداب کی شد ب رکھتی تھی لیکن اس کی قابلیت کا الیگزینڈر سے کوئی موازنہ نہیں

تھا جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ بیس میں منعقد ہونے والی سماجی تقریبات کی جان تھا، بہترین رقص تھا جبکہ رقص کے فن میں روز ختم پہنچتی۔ یہ شادی خوش گوار ثابت نہیں ہوئی۔ اپنی ذہانت اور شائستگی کے باوجود روز الیگزینڈر کے دل میں جگہ نہیں بنا سکی۔ اسے نہیں جیت سکی اور اس صدمے نے اس کی روح کو اضطراب سے بھر دیا۔

ہاں، اسے ہر سہولت میسر تھی، آسائشوں کی کمی نہیں تھی، اس شادی کے طفیل مارٹینیک میں بیٹھا اس کا خاندان بھی معاشی طور پر سنبھل گیا تھا لیکن روز کی زندگی میں ایک خلا تھا۔ محبت سے محروم کا خلا!

وہ رات رات بھر اس نفسیاتی مسئلے سے اُچھٹی رہتی کہ کہیں اپنی مری ہوئی بہن کی جگہ لے کر اس نے غلطی تو نہیں کر دی۔ وہ اکثر دل سے یہ سوال کرتی جو جو اپنا خاموش رہتا۔

آنے والے برسوں میں اس نے ایک بیٹے ایوجن اور بیٹی مارٹین کو جنم دیا۔ لوگ کہنے لگے۔ ”روز کا خاندان مکمل ہو گیا... وہ کتنی خوش نصیب ہے!“

لیکن یہ تو وہی جاتی تھی کہ زندگی میں خوشیوں کی کسی قدر کمی ہے۔ شادی کے پہلے ہی سال شوہر نے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی تھی، بچوں کی پیدائش کے بعد تو وہ بالکل ہی بے گندہ ہو گیا۔ غیر عورتوں میں اس کی دلچسپی اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ کھلم کھلا اپنی بیوی سے بے وفائی کا مرتکب ہونے لگا۔

ان دنوں فرانس سے میلوں دور امریکی زمین پر آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی جس میں الیگزینڈر کو بھی حصہ لینا تھا۔ وہ سخت دل انسان بیوی کو ساتھ لے جانے کے بجائے اپنی محبوبہ کو بغل میں دبا لے امریکا پہنچ گیا جہاں اس عورت نے کئی نا جائز بچے پیدا کیے۔

دوسری جانب کرب میں ڈوبی روز بچوں کے ساتھ سامان اٹھائے کا نویت پہنچ گئی۔ بعد کے دن اسے نے ورجینا کو اسے۔ کا نویت میں اعلیٰ طبقے کی کئی ایسے خواتین پریم میں جن کے شوہر امریکی مفاد کی جنگ لڑنے میلوں دور چلے گئے تھے۔

وہ دورانہ اس کے لیے بہت سودمند ثابت ہوا۔ اس نے ان پرچی لکھی خواتین سے بہت کچھ سیکھا۔ دھیرے دھیرے سماجی حلقوں میں متحرک ہونے لگی، رقص کے فن پر بھی عبور حاصل کر لیا۔ اس دوران چند بااثر سیاسی شخصیات سے بھی تعلق قائم ہو گئے جن کی آنکھوں میں اس کے لیے نہ

صرف پسندیدگی بلکہ کئی اور مقامات بھی تھے جین اس کے اپنے دامن پر کوئی داغ نہیں لگنے دیا۔ وہ واقعی اپنے شوہر سے محبت کرتی تھی۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ وہ بہت شاہ خرچ ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے اس کا ہاتھ تنگ رہتا۔ 1788ء میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ اپنے میکے مارٹینیک چلی گئی جہاں وہ دو برس میسر رہی۔

جب وہ بیس لوٹی، الیگزینڈر امریکا سے واپس آ چکا تھا۔ گوکہ دونوں کے دل ایک دوسرے سے بہت دور جا چکے تھے لیکن انہوں نے اس رشتے کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا اور سماجی سرگرمیوں میں میاں بیوی کی حیثیت سے شرکت کرتے رہے۔ شاہ خرچیوں کی وجہ سے اس زمانے میں بھی روز پریشانیوں میں گھری رہی اور الیگزینڈر اس کی فضول خرچی کی عادت کو تنقید کا نشانہ بناتا رہا۔

بیزاری کے ان ہی دنوں فرانسیسی انقلاب اس خونی دور میں داخل ہو گیا جسے تاریخ میں ”رجن آف ٹیر“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حکومت فرانس نے مخالفین کو قنوت خانوں میں ڈال دیا، ان پر سپہا نہ تشدد کیا، کئی حکومت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس ضمن میں فیصلے صادر کرنے کا اختیار ”کیٹی آف پبلک سینیٹی“ نامی گروہ کے ہاتھ میں تھا جو حکومتی مفاد کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔

اسی کمیٹی کی جانب سے مارچ 1794ء میں مختلف الزامات کے تحت الیگزینڈر کو گرفتار کر کے قنوت خانے میں ڈال دیا گیا۔ وہ انقلاب کا پُر زور حامی تھا اور حکومت اسے اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگی تھی۔ کمیٹی نے اسی برس نہیں کیا۔ انہیں یقین تھا کہ اس عمل میں الیگزینڈر کی بیوی روز نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا ہے جو اس وقت انقلاب کے حامیوں میں خاصی سرگرم تھی۔ سو ماہ اپریل میں اس دل گرفتہ عورت کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیے گئے جو پہلے ہی اپنے شوہر کے ہاتھوں کا فی ظاب جھیل چکی تھی۔

بے نصیب روز کو ایک تاریک، گرم کوٹھری میں ڈال دیا گیا جہاں ہرگز رات کو اس کے اندیشوں کو ہمیز کرتا رہا، تا آن کہ تم کے بوجھ تلے سسکتی اس عورت کو نیند کے عفریت نے آ چکڑا!

☆☆☆
23 جولائی کی صبح اذیت کی بے قوت لہر روز کے ناتواں وجود سے یوں گرائی جیسے برسوں قبل ایک ہولناک سمندری طوفان ماہی کیروں کی بستی سے ٹکرایا تھا۔





اُسے ایک ہمدرد جنرل لوئس لیوری نے یہ خبر پہنچائی کہ اُس کے شوہر کو ملک دشمن قرار دیتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔
اُس منحوس اطلاع نے اُسے کرب کی کھائی میں دھکیل دیا۔

”وہ شخص جس سے میں محبت کرتی تھی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گیا! وہ دھماکے مار مار کر رونے لگی۔ گریہ کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی۔
جب ہوش آیا، سورج آسمان پر چمک رہا تھا اور موصوب کوٹھری میں داخل ہو رہی تھی۔

چند ساعتوں تک روز بکھیر ہی نہیں سکی کہ اُس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ لیکن جوں ہی اُسے یاد آیا کہ اُس کا شوہر موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے، ایک بار پھر اُس کی آنکھیں برسنیں لگیں۔ وہ پورا دن روز نے اُسے عیاش شخص کی یاد میں ماتم کرتے گزارا جس کی نظر کرم کے لیے وہ برسوں تو پتی رہی۔

پانچ روز تک سوگ منانے کے بعد اُسے جنرل لوئس لیوری نے یہ غیر متوقع خوشخبری سنائی کہ حکومت نے اُسے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اس خبر نے اسے تذبذب میں دھکیل دیا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ شوہر کی موت کے بعد اب وہ زندہ رہ کر کیا کرے گی؟

”مجھے بھی مر جانا چاہیے!“ اس نے خود سے کہا۔ وہ انہی خیالوں میں غلطیاں تھیں کہ اچانک اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ شاید اس کا ہمدرد جنرل خبر گیری کے لیے آیا ہو لیکن سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک جلا دھشت فوجی افسر کھڑا تھا۔
”اٹھو۔“ اس کی کرخٹ آواز کوٹھری میں گونجی۔
”جہیں آزاد کیا جاتا ہے!“

”آزاد...“ روز گھڑبائی۔ ”لیکن... اب میں کیا کروں گی؟ میرے لیے تو زندگی بے معنی ہے!“
”تو یہ بے معنی زندگی گزارو!“ اُس کے پھرے چہرے پر کدوہ مسکراہٹ تھی۔ چند ساعتوں بعد وہ اس بھیا تک قید خانے کے باہر کھڑی تھی جہاں انتہائی گرم دن اس کا منتظر تھا۔

چند لمحات تک یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد وہ لڑکھڑکتے ہوئے، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے

اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگی۔ اس عزم کے ساتھ کہ وہ زندہ رہے گی، ہر صورت میں... گوکہ وہ جانتی تھی کہ یہ آسان نہیں ہے!
بعد کی کہانی ایک غریب عورت کی کہانی ہے، جس کے شوہر کو غدار قرار دے کر قتل کر دیا گیا، جائیداد ضبط کر لی گئی اور مراعات سے محروم کر دیا گیا۔

اُس پر دو موصوم بچوں کی پرورش کی بھاری ذمے داری تھی اور حالات اتنے شخص تھے کہ وہ خود کو اس فرض کی ادائیگی میں مکمل طور پر ناتواں پاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کوڑی کوڑی کی محتاج ہو گئی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ قرضوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔
گوکہ غربت نے روز کو پائیت کی کھائی میں دھکیل دیا تھا، وہ تیس برس کی ہو گئی تھی لیکن تاحال حسین تھی اور کسی بھی مرد کا دل یہ آسانی جیت سکتی تھی۔

اذیت کے ان دنوں میں روز کو اپنی اس قابلیت کا چنداں احساس نہیں تھا، یہ تو اس کی شاطرہ بینی شازے تھی، جو اُسے یہ باور کروانے میں کامیاب رہی کہ اُسے دوبارہ سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیے، تاکہ ایک ایسا مرد تلاش کر سکے جو اُس کا سہارا بنے۔

بات روز کے سمجھ میں آ گئی۔ بادل ناخواست ہی آئی، اس نے اپنے حالات میں سدھار کے لیے شوہر کی تلاش شروع کر دی جو اُس کے بچوں کے سر پر دستِ شفقت رکھ سکے۔

اگرچہ ابتداً اس عمل کی انجام دہی میں اُسے سخت اذیت سے گزرنا پڑا کہ جب بھی وہ کسی مرد میں مستقبل کا شوہر تلاش کرنے کی کوشش کرتی، آنکھوں کے سامنے اپنے محبوب الیکزینڈر کا چہرہ محوم جاتا اور اُسے یوں لگتا جیسے وہ اپنے شوہر کی روح کو دھوکا دے رہی ہے۔

لیکن وقت بہت ظالم شے ہے، وہ انسانی قدروں کو تباہ کر ڈالتا ہے۔

مجبوری کی قوت کے زیر اثر ان برسوں میں روز نے کئی نوجوانوں سے عشق لڑایا۔ شروع میں تو اسے اس عمل سے کراہت محسوس ہوتی تھی لیکن دھیرے دھیرے وہ اس سے لطف اندوز ہونے لگی جس کا سبب واضح تھا۔ وہ ایک مرد کے مظالم سہہ چکی تھی اور اب کئی مردوں کو اپنے اشاروں پر نچا رہی تھی، جو اگر خوش ہوتے تو اُس پر تحائف کی بارش کر دیتے۔ الغرض یہ آزاد دی کا طاقتور احساس تھا جو روز کو بدل

رہا تھا۔
وہ ازدواجی زندگی کا گہرا تجربہ رکھتی تھی اور مردوں کو قابو کرنے کا فن بھی جانتی تھی جس کے طفیل اُس نے اشرافیہ کے طبقے میں رسائی حاصل کر لی۔

اس کی خواہش تو یہی تھی کہ کوئی باثر شخص اس سے شادی کر لے لیکن اس کی محبت کا دم بھرنے والے کسی بھی آدمی نے شادی کی ہامی نہیں بھری۔ وہ ایک تیس سالہ بیوہ کو اپنی شریک حیات بنانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسی باعث وہ تیزی سے اپنے عاشق بدلتی رہی اور آخر کار فرانس کی معروف و مضبوط ترین سیاسی شخصیت پال بیریس کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی جس کے بارے میں یہ رائے پائی جاتی تھی کہ وہی فرانس کا اگلا حکمران ہوگا، تاہم اس رشتے نے بھی اُسے سکون نہیں دیا!

☆☆☆

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب فرانس میں شہر تو لوں کا محاصرہ موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ فرانسیسی سوراہگر یوں کو شکست دینے کے بعد گھروٹ چکے تھے اور ہر محفل میں اپنی بہادری کی داستانیں سنارہے تھے۔

ایسی ہی ایک محفل میں جس کا انعقاد پال بیریس نے کیا تھا، روز نے جنگ کے لڑنے والے ایک نوجوان سپہ سالار کو دیکھا جس کا نام نیولین بوٹا یارٹ تھا۔

نیولین اُس وقت اتنا مشہور نہیں تھا۔ وہ تازہ تازہ تو لوں کے محاصرے سے لوٹا تھا جہاں وہ توپ خانے کا مگران تھا اور سر پر لگنے والے گہرے زخم کی وجہ سے اس نے سر منڈوا رکھا تھا۔ وہ روز سے جیسے برس چھوٹا تھا۔ اسی سبب وہ زیادہ متاثر نہیں ہوئی اور اُس سے بات کرنے سے احتراز برتا۔

نیولین کو نظر انداز کرنے کا بنیادی سبب پال کی قربت تھی، جس کا اثر و رسوخ فرانس میں پڑھتا جا رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شاطر پال نوجوان نیولین کو سیاسی سطح پر فعال بنانے کی کوششوں میں جتا ہے تاکہ اُنے والے برسوں میں اُس کے رسوخ سے فائدہ اٹھا سکے۔

اُس تقریب کے چند روز بعد جب اس کی سبیلی شازے نے اچانک اس کے سامنے نیولین کی ستائش شروع کر دی تو وہ تھوڑی حیران ہوئی۔

شازے نے ابھرتے ہوئے سپہ سالار کی تعریف کرتے ہوئے اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اُنے

والے برسوں میں وہ فرانس میں خاصا رسوخ حاصل کر لے گا۔

”جہیں اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔“ شازے کے چہرے پر ذومعنی مسکراہٹ تھی۔ ”اجابیو کے اس نوجوان نے فقط سولہ برس کی عمر میں فوج میں سینئر لیفٹیننٹ کا عہدہ حاصل کر لیا تھا۔ تو لوں سے لوٹنے کے بعد اُسے بریگیڈیر جنرل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی ہے!“
”کیا تمہیں یقین ہے کہ مجھے اس پر توجہ دینی چاہیے؟“ وہ طفل کتب معلوم ہوتا ہے۔ ”روز کے لہجے میں تذبذب تھا۔“ تم جانتی ہو کہ میں نے بڑی مشکل سے پال کی توجہ حاصل کی ہے ایسے میں...“

”میری عزیز سبیلی!“ شازے نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”پال کے مزاج سے ہم دونوں واقف ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اب وہ تم سے کمرانے لگا ہے۔ جہاں تک نیولین کا تعلق ہے، وہ نوجوان ہے، تا تجربہ کار ہے۔ تم بہ آسانی اُسے اپنے دامِ عشق میں پھنسا سکتی ہو اور یاد رکھو، اس کا مستقبل روشن ہے!“

موصوم کا خیال ہے کہ روز کو نیولین کی جانب متوجہ کرنے کا عمل ایک باقاعدہ منصوبہ تھا جس کا سرغنہ پال ہی تھا جواب روز سے اُوب چکا تھا۔ اور اس نے اپنے مقصد کے لیے روز کی قریبی سبیلی کو استعمال کیا۔

چند غیر مستند دستاویز کے مطابق پال نے بذات خود روز کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ نیولین کے قریب ہونے کی کوشش کرے۔ جب روز نے انکار کر دیا تو اُس نے دو ٹوک الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ اب وہ اُس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا بہتر ہے کہ وہ کوئی کارندہاؤ صوفٹ ہے۔

حقیقت جو بھی ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روز نے نوجوان سپہ سالار کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں نیولین کو اٹلی کے محاذ پر قیادت سونپنے کی خبریں بھی گردش میں تھیں۔

روز کو یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ پال اُسے اپنی زندگی سے بے دخل کرنے کی تیاریاں مکمل کر چکا ہے، ایسے میں اگر اُس نے فوراً کوئی سہارا تلاش نہیں کیا تو زندگی ایک بار پھر بے بسی کی تصویر بن جائے گی۔ سو اُس نے خاصی سوچ بچار کے بعد نیولین کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

جب اُس نے نوجوان سپہ سالار کو جیتنے کی کوششوں کا آغاز کیا تو پہلا جھکام اُسے یہ جان کر لگا کہ وہ اشرافیہ سے تعلق

رکھنے والی ایک دوشیزہ ڈیپیری کلیر سے بے مقصدی کر چکا ہے جو نیولین کے بڑے بھائی جوزف کی سالی ہے۔ وہ ڈیپیری کو جانتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اس معصوم حسینہ کی گرفت زیادہ مضبوط نہیں ہوگی اور اگر وہ کوشش کرے تو نیولین اس کا ہوسکا ہے۔

نیولین سے باقاعدہ ملاقات کے لیے روز کو ایک جواز کی ضرورت تھی۔ اور پھر قدرت نے اسے ایک جواز فراہم کر دیا۔

دراصل پیرس میں پھوٹ پڑنے والے فسادات کے بعد حکومت نے ایک قانون پاس کیا تھا کہ کوئی بھی شہری گھر میں ہتھیار نہیں رکھ سکتا۔ شہر کو اسلحے سے پاک کرنے کی ذمہ داری نیولین ہی کو سونپی گئی تھی۔ اس قہم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نیولین کے سپاہیوں نے روز کے دروازے پر بھی دستک دی تھی اور اس کے محروم شوہر کی خاندانی تلوار ساتھ لے گئے تھے۔

ذہن روز نے نیولین سے ملنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اپنے بیٹے کو اُس کے دفتر بھیج دیا جس نے نیولین سے درخواست کی کہ وہ اپنی خاندانی تلوار آخر بار دیکھنے کا آرزو مند ہے۔

نوجوان سپہ سالار نے بیچ کی معصوم خواہش کو قبول کر لیا۔ اگلے دن صبح ہی صبح روز بن سنور کر، آنکھوں میں تشکر کے آنسو لیے نیولین کے دفتر پہنچ گئی۔

جون ہی نقوشوں پر جھکے نیولین کے منتھوں سے بھیجی بھیجی خوشبو بکرائی، اس نے سر اٹھایا۔

وہ ایک قائل لمحہ تھا۔ روز کے حسن سے اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ سکتے میں تھا اور تجربہ کار حسینہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔

اس مختصر ملاقات میں جیسے روز نے نیولین پر جادو کر دیا۔ وہ اُس کا دیوانہ ہو گیا اور ایسا ہوتا متوقع تھا کہ اس کے پیچھے ایک گہری سازش تھی۔

پال اپنے منصوبے کے مطابق چند روز قبل نیولین کو بتا چکا تھا کہ پیرس کی کئی حسنائیں نیولین پر فریفتہ ہو گئی ہیں لیکن اگر کوئی اُس کی محبوبہ بننے کی حق دار ہے، تو فقط روز ہے!

پہلی ہی ملاقات میں ہتھیار ڈال دینے کا ایک سبب نیولین کی ناچنگی اور روز کی مہارت بھی تھی جو مردوں کو گرویدہ بنا لینے کے فن سے کا حق واقف تھی۔

دم رخصت روز نے اُسے جانے کی دعوت دے ڈالی

جس پر نیولین خوشی سے پھولے نہ آیا۔
”ضرور، یہ میرے لیے اعزاز ہوگا کہ آپ جیسی حسین اور تہذیب یافتہ خاتون کے ساتھ چائے نوش کروں!“ اُس نے جواباً کہا۔

دو دن بعد وہ روز کے مکان میں تھا جہاں اُس تجربہ کار عورت نے بڑی مہارت سے اُسے شیشے میں اُتار لیا۔ رخصتی کے وقت اُس نے نیولین کا ہاتھ تمام کر محبت سے تربہ تربیچے میں کہا۔ ”آپ جلد فرانس کے عظیم ترین جزل نہیں گئے۔ پیرس آپ سے محبت کرتا ہے۔ وہ لڑکی واقعی خوش نصیب ہوگی جسے آپ اپنی دہن بتائیں گے۔“

روز جانتی تھی کہ نیولین کی گفتگو ہو چکی ہے، تاہم اُس نے جان بوجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر وہ یہ جانتی تھی کہ اگر نیولین نے منشی کی بات چھپانے کی کوشش کی تو اس امر پر تصدیق کی ضرورت ہو جائے گی کہ وہ روز کے محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ نیولین نے اپنی منگیتر کا ذکر نہیں کیا۔

جب وہ گھر لوٹ رہا تھا، اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ ہوا میں اڑ رہا ہو۔

دوسری جانب اُسے الوداع کہنے کے بعد کھڑکی میں کھڑی روز کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔
نوجوان نیولین جال میں پھنس چکا تھا!

☆☆☆

سپہ سالار دیوانہ ہو گیا تھا۔ اُسے روز کے سوا کچھ نہ جھتا ہی نہیں تھا۔ ہر کپل اسی کی یاد میں کھویا رہتا۔ روز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

دعوت سے لوٹنے کے بعد اب وہ اُس حسینہ سے ملاقات کا بہانہ ڈھونڈنے لگا۔ بالآخر چند ہی روز بعد ایک دعوت میں اُس کا روز سے سامنا ہو گیا، جہاں وہ اپنے جذبات چھپانے میں کئی طور پر ناکام رہا۔ بے شک وہ بوکھلایا ہوا تھا اور روز اُس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اگلے ہی دن پیرس کے میوزیم میں پھر ملاقات ہو گئی جہاں منعقدہ تقریب میں اسے پال نے مدعو کیا تھا جو بڑی مہارت سے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب ہونے کا موقع مہیا کر رہا تھا۔

دھیرے دھیرے ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ سپہ سالار کا سفر منزل عشق کی جانب جاری و ساری تھا۔ شاطر روز نیولین

کے جذبات کو ہوا دیتی رہی، یہاں تک کہ اُس نے ایک ہتھ نشان کی شکل اختیار کر لی۔ اور پھر دسمبر کی ایک سرد رات روز کی خواب گاہ میں وہ آتش فشاں پھٹ پڑا اس کی اس شب روز نے نیولین پر محبت کے ایسے خطرناک وار کیے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے گناہ ہو گیا۔

منہ اندھیرے گھر لوٹتے وقت وہ سرت سے لبریز تھا۔ جیرمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ گہری دہلیز عبور کرتے ہی وہ روز کے نام ایک خط لکھنے بیٹھ گیا جو خوش قسمتی سے آج بھی تاریخ میں محفوظ ہے۔ نیولین نے اُس محبت نامے میں یوں اپنے جذبات بیان کئے:

”میں تمہاری خوشبو سے معطر ہوں۔ تمہارے عکس اور کل رات کے نقشے نے میرے حواس معطل کر دیے ہیں۔ نہ جانے تم نے کیا جادو کر دیا ہے!“

جب روز کو یہ خط موصول ہوا، وہ مسکرائی۔ نیولین اُس کے اشاروں پر تاپنے کے لیے تیار ہو چکا تھا لیکن وہ سرور نہیں تھی، قطعی نہیں... بلکہ تذبذب کا شکار تھی۔

دراصل اُسے نیم پختہ نیولین پسند نہیں آیا تھا۔ اُسی کی روح تو اب بھی پال میں اٹکی تھی۔ اور پھر ایک ایسے نوجوان کی شریک حیات بننے کا فیصلہ کرنا جو ابھی سیاسی و سماجی حلقوں میں زیادہ مقبول نہیں، خاصا مشکل تھا۔

روز نے اس بابت شازے سے بھی مشورہ کیا، اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ نیولین تہذیبی سطح پر اُس سے پست ہے، تاہم شازے نے ہر دلیل رد کر دی۔

”بیاری روز، کیا تم نے غور کیا؟ تم تیزی سے ادھیڑ عمر کی جانب بڑھ رہی ہو۔ اپنے شاطر عشاق کو بھول جاؤ۔ انہیں اپنے مفادات کی فکر ہے، تم اپنے مفادات کی فکر کرو۔ اور ہاں، یہ فیصلہ کیا چکا ہے کہ نیولین ہی اٹلی کے محاذ پر فوج کی کمان سنبھالے گا۔ مجھے کی کوشش کرو!“

شازے کے موقف نے روز کے خدشات دور کر دیے اور اُس نے نیولین سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُن ہی دنوں نیولین نے روز کا نیا نام تجویز کیا... جوزفین!

روشن مستقبل کی متلاشی روز نے بہ خوشی یہ نام قبول کر لیا۔ یوں وہ روز سے جوزفین ہو گئی اور بعد میں تاریخ میں اسی نام سے زندہ رہی۔

کہتے ہیں، عشق اور محبت چھپائے نہیں چھپتے۔ جلد ہی نیولین اور جوزفین کی داستان محبت پیرس میں گرما گرم

موضوع بن گئی۔ یہ خبریں بھی گردش کرنے لگیں کہ وہ جلد شادی کر لیں گے۔ جب نیولین کے اہلی خانہ کو یہ خبریں ملیں، وہ غصے سے آگ بکولا ہو گئے۔

بڑے بھائی جوزف نے اُس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ سمجھا یا کہ اُس کی گفتگو ہو چکی ہے۔ ”عشق لڑانے کی حد تک تو ٹھیک ہے، لیکن شادی کا خیال ذہن سے نکال دو!“ لیکن نیولین نے اُس کی باتوں پر توجہ نہیں دی۔ اُسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ جوزفین عمر میں اُس سے بڑی ہے اور ماضی میں کئی عشق لڑا چکی ہے۔

جوزف کی ناکامی کے بعد نیولین کی ماں لیلیکا نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ ”جوزفین فقط تمہاری زندگی میں تباہی لائے گی!“

تجربہ کار ماں کی باتوں کا بھی عشق میں اندھے نوجوان پر کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اہلی خانہ کی جانب سے جوزفین کی مخالفت نے آتش عشق کو مزید ہوا دی۔ وہ بنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچنے لگا۔

بالآخر ایک رات اُس نے جذبات سے بھرا ایک خط جوزفین کے نام روانہ کر دیا، شادی کی درخواست کر دی۔

جواب میں جالاک جوزفین نے سوچ بچار کے لیے کچھ وقت کا تقاضا کیا لیکن یہ رسی تقاضا تھا، اُس وقت تک شاطر جوزفین یہ سمجھ چکی تھی کہ نوجوان جزل سے شادی کرنا فائدے کا سودا ہے۔

”اُس کی زندگی کا بڑا حصہ تو محاذ ہی پر گزرے گا، یوں مجھے آزادی کے ساتھ اپنی پسند کی زندگی گزارنے کا موقع مل جائے گا۔“ اُس نے خود سے کہا۔ ”اور پھر اس کا مستقبل روشن ہے!“

دراصل جوزفین کو حالات کی عینگی کا ادراک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پال جسے وہ ٹوٹ کر چاہتی تھی، اب اُس میں دھچکی کھو چکا ہے۔ دوسرا مفاد پرست عاشق جزل لوکس نے بھی اُسے خاصا ایوس کیا تھا۔ لوکس سے اُس زمانے میں ملاقات ہوئی تھی جب وہ پیرس کے ایک قید خانے میں صعوبتیں برداشت کر رہی تھی۔ لوکس ہی وہ پہلا مرد تھا جس نے اکیڑہ بیڑی موت کے بعد اُس کے دھچکی دل پر مہم رکھا۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہنے بھی لگی لیکن اس نے جوزفین کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ سو اب جوزفین کے پاس نیولین کی درخواست قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور اُسے یہ فیصلہ فوری کرنا تھا کیونکہ وہ

اگست 2012

نپولین کے مزاج سے واقف تھی جسے جنگی محاذ سے مشتاق تھا۔
جوزفین کو احساس تھا کہ اگر اس نے تاخیر کی اور
نپولین کی جنگ میں حصہ لینے کے لیے نکل گیا تو یقیناً ممکن
ہے وہ اُسے بھول جائے۔ عشق کی کشتی چنگاری بجھ جائے۔
سو اُس نے شادی کے لیے اپنا ذہن بنالیا۔

نپولین کے مانند جوزفین کے چند احباب نے بھی اس
رشتے کی مخالفت کی جن میں اس کی بیٹی ہارٹس جوش جوش
تھی۔ جوزفین کو علم تھا کہ اُس کی جواں سال بیٹی کے
اندیشوں کا سبب کیا ہے۔

”کیا تم سوچتی ہو کہ میں ایک نوجوان جنرل سے
شادی کر کے تمہیں بھول جاؤں گی؟“ اُس نے مسکراتے
ہوئے اپنی بیٹی سے سوال کیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہوگا، میرا
یقین کرو۔ وہ شخص ہر ممکن طریقے سے تمہارا خیال رکھے گا۔“

☆☆☆

یوں معلوم ہوتا تھا کہ اُس برس موسم سرما میں ہیرس
کے پاسوں کے پاس نپولین اور جوزفین کی شادی کے علاوہ
بات کرنے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں تھا۔

جس شام جوزفین نے رضامندی ظاہر کی، نپولین
تک یہ خبر پہنچنے سے قبل اُدھا شہر اس سے آگاہ ہو چکا تھا۔
شاطر فطرت پال اور لوگوں تو بہت ہی خوش تھے کہ چلو
روزے... جو آپ جوزفین ہو گئی... جان بھولی۔

جب نپولین کو اطلاع ملی کہ اُس کی محبوبہ راضی ہو گئی
ہے، اُس نے فوراً ڈیویری لکیرے سے منگنی توڑنے کا اعلان
کر دیا جس پر اس کے خاندان نے بہت لعن طعن کی لیکن
نوجوان سپہ سالار کو اپنی پُرشش محبوبہ کے سوا کسی کی پروا
نہیں تھی۔

شادی کے لیے 9 مارچ 1796ء کی تاریخ مقرر
ہوئی۔ وصل کی خواہش شدت میں مبتلا نپولین نے ایک ایک
دن گن کر گزارا۔

بالآخر وہ دن آ ہی گیا۔ شادی کی تقریب میں شرکت
کے لیے تمام مہمانوں کو رات آٹھ بجے سول کورٹ پہنچنے کی
ہدایت کی گئی تھی۔ پال نے تمام انتظامات سنبھال رکھے
تھے۔ وہ نپولین کی طرف سے گواہ تھا۔

جوزفین اُس رات بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔
اس نے نپولین کی جانب سے تحفے میں دیا جانے والا ایک
قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا جس کی تیاری پر خاصا خرچ کیا گیا
تھا۔

اس شام سول کورٹ سے سو میٹر دور کھڑا بھیجی پر
آسانی یہ بتا سکتا تھا کہ وہاں ایک شان دار تقریب کا انعقاد
کیا گیا ہے جس میں ہیرس کی تمام بڑی عیال مدعو ہیں۔
بڑے بڑے فوجی افسران، سیاست دان، کلاڑی، دانش
ور... سب!

اور واقعی وہاں کئی قد آور شخصیات تھیں، جو تقریب
میں شرکت کی غرض سے وقت پر پہنچ گئی تھیں، ماسوائے ایک
فصل کے... اور وہ تھا نپولین۔ اور یہ حیرت انگیز تھا۔ نپولین
وقت کا بہت پابند تھا، وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ ”وقت ہی سب
کچھ ہے۔ میں جنگ ہار سکتا ہوں لیکن وقت ضائع نہیں
کر سکتا!“

اور پھر وہ تو جلد از جلد جوزفین کو اپنا بنالینا چاہتا تھا کہ
اس فتنہ پرور حسد سے دوری اس کے لیے جان لیوا ثابت
ہونے لگی تھی۔ لیکن اس شام وہ وقت نہیں پہنچ سکا۔ چند
لمحوں کی تاخیر کا تو غدر پیش کیا جاسکتا ہے لیکن معزز مہمانوں کو
پورے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ سرکاری اہل کار جہانیاں لینے
لینے بالآخر سو گئے۔ دیگر مہمانوں کے چہروں سے بھی
آکٹاہٹ عیاں تھی۔ جوزفین بھی اندیشوں میں مبتلا تھا۔

جب تناؤ بڑھنے لگا تو پال نے معاملات سنبھالے
جسے اطلاع مل چکی تھی کی نپولین کورٹ پہنچنے کے لیے گھر سے
نکل چکا ہے۔

”صاحبو...“ اس نے مسکراتے ہوئے مہمانوں کو
مخاطب کیا۔ ”میں آپ سے معذرت خواہ ہوں“ لیکن آپ
نوجوان نپولین کو تو جانتے ہی ہیں، جس کے کاندھوں پر
فرانسیسی فوج کی قیادت کی ذمہ داری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ

وہی ہمارا محافظ ہے۔ بے شک آپ کو انتظار کی اذیت
برداشت کرنا پڑی لیکن جب آپ کو اس کی وجہ پتا چلے گی،
آپ کا غصہ ٹھنڈ ہو جائے گا۔ واصل... ہمارا نوجوان
دوست اٹلی کی مہم کی تیاری میں جتا ہے کیونکہ شادی کے فوراً
بعد اسے میدان جنگ کی جانب کوچ کرنا ہے۔ وہ تیاریوں
میں اتنا مصروف ہے کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی
نہیں ہوا، اسی وجہ سے آپ کو انتظار کرنا پڑا... ارے دیکھیے
وہ آگیا!“

اُسی وقت نپولین کورٹ میں داخل ہوا۔ وہ تھکا ہوا
معلوم ہوتا تھا لیکن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پال کی تقریر سے
متاثر ہونے والے وہاں موجود تمام مہمانوں نے اُس کے
لیے احترام محسوس کیا۔

وہ تقریب کسی طور روایتی نہیں تھی۔ دولہا کے تاخیر
سے پہنچنے کے علاوہ اور بھی کئی عجیب و غریب چیزیں رونما
ہوئیں۔ سرکاری کاغذات میں جوزفین نے اپنی عمر چار برس
کم کر کے لکھوائی۔ نپولین نے اٹھارہ مہینے بڑھا کر بتائے،
یوں سرکاری کاغذات کی حد تک اُن کی عمروں کا فرق مٹ
گیا۔

کاغذی کارروائی کے بعد جوزفین نے نپولین کا ہاتھ
تھام کر اُس مکان کا رخ کیا جو اُس کا نیا گھر تھا جہاں حملہ
عروبی ان کا منتظر تھا۔

گوکہ مہمان خاصے تھک چکے تھے لیکن انہوں نے
اُچھرتے ہوئے جنرل کی خوشی کی خاطر عشاہیے میں شرکت
کی۔

ملن کی اُس رات کے تعلق سے چند عجیب و غریب
کہانیاں ملتی ہیں، تاہم سنجیدہ مورخین انہیں غیر حقیقی گردانتے
ہیں۔

بہر حال، شادی کے دوسرے روز نپولین نے
جوزفین کے دونوں بچوں سے ملاقات کی، جو اپنے سوتیلے
باپ کے بارے میں طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا
تھے۔ شفیق نپولین نے اپنی محبت سے تمام اندیشے رفع کر
دیے۔ بہت اچھی طرح عیاش آیا۔ ان کے اسکولوں کا بھی
دورہ کیا۔ الغرض اس نے ثابت کر دیا کہ جوزفین کی اولاد
اس پر بھروسہ کر سکتی ہے۔ اب وہی ان کا سرپرست، ان کا
باپ ہے!

☆☆☆

جس عورت کے حصول کے لیے اُس نے زمانے بھر
کی مخالفت مول لی تھی، اس کے ساتھ وہ فقط اڑتالیس گھنٹے
گزار پایا کہ جنگ کا طبل بج گیا، اٹلی کا مشکل محاذ منتظر تھا،
جہاں اسے کڑے امتحان سے گزرنا تھا کہ اس کی فوج کی
حالت خاصی خستہ تھی۔

رخصتی کے وقت گوکہ آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن
اس کا دل دور رہا تھا۔ اس نے جوزفین کا ہاتھ تھام کر کہا۔
”اگرچہ میں دور جا رہا ہوں، لیکن اپنا دل یہیں تمہارے
پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں پیارے نپولین۔ جاؤ، میری
دعاؤں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم ہمارے محافظ ہو!“ جوزفین
کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔
اور یوں نپولین دھجی دل لیکن بلند حوصلے کے ساتھ

میدان جنگ کی جانب چل دیا جہاں آنے والے چند دنوں
میں اس نے ایک ایسی جنگ لڑی جس نے پورے یورپ
میں برقی رور دوا دی۔
مورخین کہنے لگے۔ ”ہم نے یورپ کی ہزار سالہ
تاریخ میں نپولین جیسا جنگجو نہیں دیکھا۔“

دلچسپ امر یہ ہے کہ زندگی کی اہم ترین جنگ لڑنے
والے نوجوان سپہ سالار کا دل ہیرس میں اٹکا تھا۔ وہ ہر روز
جوزفین کو خط لکھتا۔ شدت جذبات، محبت اور امید سے لبریز
خط۔ محاذ سے لکھے نپولین کے چند خط آج بھی محفوظ ہیں،
جس میں سے ایک میں اُس نے یوں اپنے جذبات صفحہ
قرطاس پر نکھرے:

”میری محبوبہ، تم نے مجھے ایک ایسی محبت سے
روشناس کر دیا، جو میرے ہوش و حواس پر چھا گئی ہے۔ کاش
میں میدان جنگ چھوڑ کر ہیرس لوٹ سکتا، تمہارے قدموں
سے لپٹ جاتا۔ تم نے میرے اندر لاتنا ہی محبت بھردی ہے،
میں ہر وقت وجدانی کیفیت میں رہتا ہوں!“

ایک اور یادگار خطوط کچھ یوں تھا۔
”جانا! یہ تم ہی ہو... جسے فطرت نے اپنی روح،
شانلگی اور اپنا حسن عطا کیا۔ تم... فقط تم میری دل کی ملکہ ہو۔
اور اپنی سلطنت کی حدود دار بعد سے کماحقہ واقف ہو۔ میری
جان، میری پیاری!“

اس نوع کے محبت ناموں کے لیے عورتیں ترستی ہیں،
دعا میں کرتی ہیں کہ کبھی عشاق کی جانب انہیں بھی اس
ذہب پر یاد کیا جائے، اور بدلے میں وہ اپنی روح میں
دوڑتی توانائی، انگ انگ میں بھری سرت اُن پر بچھاؤ کر
دیں لیکن... شاطر جوزفین کو ان محبت ناموں کی کوئی پروا نہیں
تھی۔ اکتھار عشق کا یہ طریق اُسے بیز اثر لگتا۔ وہ اُن خطوط
کو نپولین کا بچپنا گردانتی۔ سچ تو یہ ہے کہ نپولین کے رخصت
ہوتے ہی اُس زمین مزاج عورت نے اپنے پُرانے مشغلوں
کا آغاز کر دیا تھا۔

وہ اُن خطوط کا انتہائی مختصر جواب دیتی جن میں یہ
دعویٰ کرتی کہ وہ بھی اسے بہت یاد دہانی ہے، اُذکر اس تک
پہنچ جانا جاتا ہے، لیکن حقیقتاً وہ فقط دکھاؤ کر رہی تھی۔ قطعی
ذہنی نہیں تھی، بلکہ باقاعدگی سے سماجی تقریبات میں شرکت
کر رہی تھی۔

دوسری جانب اٹلی کے محاذ پر نپولین اس کی یاد میں
تڑپ رہا تھا۔ اس نے جوزفین کو فوراً اپنی پہنچنے کی ہدایت کی،

تاکہ وہ فراق کا غم بھلا کر جنگ پر توجہ دے سکے، تاہم جو زمین کو یہ قطعی گوارا نہیں تھا۔ بیس میں اُسے پُر اسائن زندگی میسر تھی، جبکہ جنگ کا محاذ اسے بیزار کن لگتا تھا، اس لیے وہ مختلف بہانے بنا کر اس معاملے کو ناقص رہی اور قص و سرحد کی محافل میں شرکت کا سلسلہ جاری رکھا۔

جب نیولین کے تقاضوں میں شدت آنے لگی، وہ منہ بسورتے ہوئے اپنے ہر آنے محبوب پال کے پاس پہنچ گئی اور درخواست کی کہ نیولین کو ٹالنے کی کوئی صورت نکالے۔ پال نے ہر آنے تعلقات کی بنیاد پر اُس پر ی پیکر کا ساتھ دیا اور نیولین کو لکھ بھیجا کہ موجودہ حالات میں ایک بہادر اور مخلص سپہ سالار کی طرح اُسے ملکی مفادات پر توجہ دینی چاہیے، بہتر ہے کہ وہ جو زمین کو بیس ہی میں رہنے دے اور فرائض عوام کو جیت کا تحفہ دے جو اس سے محبت کرتے ہیں۔

پال کی کوششیں زیادہ عرصے نیولین کو پابند نہیں رکھ سکیں۔ وہ اندری ہی اندر شگ رہا تھا۔ جو زمین کو اپنے پہلو میں دیکھنے کی خواہش پر خاموش رہا وہی آگئی تھی۔ اس نے پال کے خط کو نظر انداز کر دیا، وہ سرکاری حکم نامہ نہیں تھا اور اپنے ایک افسر میورٹ کو یہ ڈٹے داری سونپی کہ وہ فوری بیس جانے اور جو زمین کو ساتھ لے کر لوٹے۔ اپنے سپہ سالار کے حکم پر بیس پہنچنے کے بعد جس پہلے معاملے سے میورٹ کا سامنا ہوا، وہ جو زمین کے بابت گردش کرتی افواہیں تھیں۔

جب وہ جو زمین سے ملا اور اس کے سامنے نیولین کا حکم پڑھ کر سنایا تو ایک لمحے کے لیے وہ ہڑبوا گئی لیکن جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ اس سے قبل کہ میورٹ کا شک یقین میں بدلنا، جو زمین نے بڑے احترام کے ساتھ اسے ٹھہرانے کی دعوت دے ڈالی جسے سنجیدہ طبع فوجی افسر نے قبول کیا۔ اس نے میورٹ کی خوب آؤ بھگت کی، نہ غم اور ندمی ہوئی آواز کے سہارے اسے یقین دلانی رہی کہ وہ نیولین سے کتنی محبت کرتی ہے۔

”میں ایک ایک دن گن کر گزار رہی ہوں!“ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

البتہ آخر میں اس چالاک عورت نے یہ کہتے ہوئے ساتھ چلنے سے معذرت کر لی کہ وہ حاملہ ہے۔

”ان حالات میں سفر مناسب نہیں!“ کمال مہارت سے اس نے چہرے پر نقاہت کی سیاہی بکھیر دی۔ ”میری درخواست ہے جو ان میورٹ کہ تم میرے شوہر کو یہ خوشخبری

سنادینا!“

جب محاذ پر لوٹ کر میورٹ نے اپنے افسر اعلیٰ کو اطلاع دی تو وہ مسرت سے بھر گیا لیکن یہ مسرت عارضی ثابت ہوئی۔

دراصل چند ہی ہفتوں بعد میورٹ کو پھر کسی کام سے بیس جانا پڑا اور اس بار اس کا شک یقین میں بدل گیا کیونکہ اُس نے خود ایسی چند تقریبات میں شرکت کی، جن میں جو زمین جان محفل بنی ہوئی تھی۔ وہ کسی طور حاملہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ محاذ پر لوٹنے کے بعد اس نے بڑے ہی بے تسلے الفاظ میں نیولین کو یہ بتا دیا کہ بیس میں جو زمین کے بارے میں عجیب و غریب افواہیں گردش کر رہی ہیں۔

”یہ خیال عام ہے کہ وہ آپ کو بیوقوف بنا رہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میورٹ کی نظریں ٹھنکی ہوئی تھیں۔

نیولین آگ بگولا ہو گیا۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ اس نے محاذ جنگ چھوڑ کر بیس جانے کا اعلان کر دیا۔

فوج میں موجود پال کے حامیوں نے فوراً ہی یہ اطلاع بیس بھجوا دی۔ پال کے سیاسی مفادات جنگ سے وابستہ تھے۔ وہ جانتا تھا کہ نیولین ہی وہ واحد شخص ہے جو یہ جنگ جیت سکتا ہے، سو اس نے جو زمین کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی عیاشیاں ترک کرتے ہوئے فوراً رختِ سفر باندھے۔

بادل ناخوستہ جو زمین نے نیولین کو ایک محبت بھرا خط لکھ ڈالا: ”جانا، میں تمہارے پاس آ رہی ہوں!“

پال کے منصوبے کے عین مطابق خط وصول کرنے کے بعد نیولین نے بیس لوٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنی بیوی کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اپنی قیام گاہ میں وہ تمام انتظامات بھی کر دیا دیے، جن کی حاملہ عورت کو ضرورت پڑ سکتی ہے کیونکہ اُس کے اندازے کے مطابق زچگی کے دن قریب تھے۔ لیکن جب جو زمین سامنے آئی وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ محبت کا مارا وہ شخص کوئی سوال کرتا، شاطر جو زمین نے آنکھوں میں آنسو لیے اُسے مطلع کیا۔

”میرے محبوب، میں کیسے بیان کروں کہ یہ دیکھ کر مجھ پر ہے... میں اسقاطِ حمل کے عذاب سے گزری... اور ہم وارث سے محروم ہو گئے... شاید قدرت کو یہی منظور تھا!“

معصوم نیولین کے لیے یہ خبر شدید صدمے کا باعث بنی، وہ کئی گھنٹے کم رہا لیکن پھر جو زمین کے شیریں لہجے چمکتی آنکھوں اور گداز بدن نے اس کے سوختہ دل پر ایسا

مہم رکھا کہ وہ سکون کی وادی میں اتر گیا۔

☆☆☆

امی میں نیولین نے شاندار فتوحات حاصل کیں، بیس واپسی پر اُس کا استقبال ایک بہرو کے مانند ہوا۔ ہر کوئی اس کے سامنے بچھا جا رہا تھا لیکن اس دیوانے کو تو فقط ایک ہستی کی نوازشات درکار تھیں، اور وہ تھی جو زمین!

بیس میں قیام کے زمانے میں جو زمین نے خود کو ایک اچھی بیوی ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اپنے شوہر کا بھرپور خیال رکھا۔ اُسے مسرت سے ہم کنار کیا۔ اُن دنوں بیس میں مصر کی ہم زیر بحث تھی جس کا مقصد ہندوستان تک رسائی حاصل کر کے انگلستان پر کاری ضرب لگانا تھا۔

پال جانتا تھا کہ جنگ کے عشق میں مبتلا نیولین ایک محفل میں اس ہم کی قیادت کی خواہش کا اظہار کر چکا ہے۔ ”اس وقت نیولین اپنے عروج پر ہے۔ بہتر ہے اُس سے جتنا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اٹھالیا جائے!“ اس نے خود سے کہا اور فوراً نیولین کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

1798ء میں فرانسیسی فوج نے جوش سے مصر کے نیولین کی قیادت میں مصر کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ شوہر کے بیس چھوڑتے ہی جو زمین اپنی پرانی جون میں لوٹ آئی۔ وہی دعوئیں، قص و سرحد کی محافل، موج مئی!

اُس نے یہ سب اس قدر شدت سے انجام دیا کہ بیس کی اشرفیہ میں بے چینی پھیلنے لگی۔ کئی افراد نے اسے متنبہ کیا کہ وہ احتیاط کرے۔ پال نے بھی اُسے اپنے اندیشوں سے آگاہ کیا۔ ”ان بے لگام سرگرمیوں کی خبر نیولین تک پہنچ سکتی ہے۔“

لیکن اُس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی! 19 جولائی 1798ء کی گرم دوپہر تھی، جب نیولین کی قیادت میں مصر کی جانب پیش قدمی کرنی فرانسیسی فوج نے بیس کی سمت سے ایک مشکوک گھڑ سوار کو آتے دیکھا۔ قریب آنے پر اُس نے اپنی شناخت کروائی اور نیولین کے دستِ راست جنرل جوناٹ کے خیمے میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد جوناٹ چہرے پر تذبذب اور تاسف کے خیمے سے برآمد ہوا اور نیولین کے خیمے کی جانب بڑھنے لگا۔

نیولین کا سیکرٹری یویری اندیشوں میں لپٹا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد نیولین اور جوناٹ خیمے سے باہر نکلے اور سپاہیوں سے کچھ دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ یویری فاصلے کے باعث اُن دونوں کی گفتگو تو نہیں سن سکا لیکن اس نے صاف محسوس کیا کہ نیولین کا چہرہ پتلا پڑ گیا ہے، آنکھوں میں وحشت سمٹ آئی ہے۔

جب جوناٹ اور اس کے درمیان مکالمے کا اختتام ہوا، نیولین خستہ حالی کی تصویر بنا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا یویری کی جانب بڑھنے لگا۔ اپنے سیکرٹری کے قریب پہنچتے ہی وہ چلا یا۔

”یویری تم مجھ سے وفادار نہیں ہو... اگر وفادار ہوتے تو مجھے حقیقت سے آگاہ کرتے۔ تمہیں ایک سچے دوست کا کردار ادا کرنا چاہیے تھا۔ جوناٹ کی مانند!“ یویری کی آنکھوں میں تذبذب تھا۔ وہ خاموش رہا۔ نیولین نے آگے بڑھ کر اسے کانڈھے سے پکڑ لیا۔ ”جو زمین... میں اور وہ ابھی کسوں دور ہیں... تم مجھے بتا سکتے تھے کہ وہ مجھے دھوکا دے رہی ہے... بولا، کیا یہ تمہارا فرض نہیں تھا؟“

”میں نے سوچا کہ شاید آپ...“ یویری نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن نیولین نے بات کاٹ دی۔

”شاید میں تمہاری بات کا یقین نہیں کروں... کیونکہ میں اُس کے سحر میں مبتلا ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو ناں؟“ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ ”لیکن تمہیں مجھے خبردار تو کرنا چاہیے تھا، ایک سچے دوست کی طرح! اور جہاں تک جو زمین کا تعلق ہے... طلاق... یہی واحد حل ہے... اعلان یہ طلاق...“

یویری کا خیال تھا کہ جوناٹ نے ذاتی مفادات کے پیش نظر اس معاملے کو بڑھا چڑھا کر نیولین کے سامنے پیش کیا ہے جس کی وجہ سے وہ اتنا آگ بگولا ہو گیا ہے لیکن وہ غلط تھا۔

جنرل جوناٹ نے جو کچھ نیولین کو بتایا تھا وہ من و عن ج تھا۔

جب دیگر ذرائع سے بھی جوناٹ کی بیان کردہ کہانی کی تصدیق ہو گئی، نیولین کے سوختہ دل نے ایک آہ سرد بھری۔ اُس کے عشق میں ٹھہرے ہوئے پانی کا سکوت آ گیا۔ یہی وہ موقع تھا، جب محبت کا شدید جذبہ انتقام کی

خواہ میں بدلنے لگا۔ وہ انسان سے ایک "قصاب" کے روپ میں ڈھلنے لگا۔

"جس طرح اس ظالم نے میرا دل چھیل ڈالا، میں بھی اس کی روح کو لوہان کر دوں گا۔" نیولین نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ وہ ٹھیک اپنی عیاش مجبور کی جون میں ڈھلتا جا رہا تھا، اُس کے مانند عشق لڑانے کے منصوبہ تریب دے رہا تھا۔ اور اُس نے ایسا کیا بھی۔ مصر کے محاذ پر ایک بار اُس نے ایک مصری دو شیرہ کو اپنے دفتر میں جانے پر بد کو کر لیا اور گھنٹوں گتھائی میں اُس سے روانوی گفتگو کرتا رہا۔

کسی نہ کسی طرح یہ اطلاع پیرس میں بیٹھی جوزفین کو مل گئی کہ اُس کا شوہر اب غیر عورتوں میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ وہ بہت سچ پا ہوئی۔ شکایت سے بھرا ایک خط لکھا، جس پر آنسوؤں کی سیاحی گرائی۔ نیولین کو اُس کا وعدہ یاد دلایا۔۔۔ اُس جینے مرنے کے عہد کا تذکرہ کیا جو شادی سے قبل نیولین نے باندھا تھا۔ ساتھ ہی اسے اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

نیولین دنیا کے لیے ایک سخت دلی آدمی تھا لیکن جوزفین کے لیے اُس کے دل میں فقط محبت تھی۔ خط پڑھنے کے بعد وہ تذبذب کا شکار ہو گیا اور سوچنے لگا کہ جو کچھ جو بات نے بتایا کہیں وہ جھوٹ تو نہیں؟

ازدواجی محاذ کے ساتھ جنگی محاذ پر بھی اُسے شاید مشکلات کا سامنا تھا۔ فرانسیسی فوج نے خشکی پر توجہ حاصل کر لی تھی، لیکن لاؤنڈین کی قیادت میں دریائے نیل کے محاذ پر برطانوی بیڑے نے فرانسیسی بیڑے کو تباہ کر دیا تھا اور پیرس میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ مصر میں فرانسیسی فوج کو شکست ہو گئی ہے۔

1799ء میں جب فرانسیسی فوج مصر کے محاذ پر اپنی بھا کی جنگ لڑ رہی تھی، نیولین نے اچانک پیرس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

اُس نے ایسا کیوں کیا، کوئی نہیں جانتا؟ لیکن عام خیال ہے کہ اسے چند مستند رائج سے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ جوزفین اُس کی دولت دونوں ہاتھوں سے اپنے نوجوان عاشقوں پر لٹا رہی تھی۔

جب جوزفین کو یہ خبر ملی کہ نیولین پیرس کے لیے رخصت سفر باندھ چکا ہے، اسے پریشانیاں نے گھر لیا۔ اب تک تو جوزفین بھی سمجھ رہی تھی کہ نیولین عشق کے انجلاط میں کھینچا ہے، وہ پیش اس کی سچی میں رہے گا لیکن وہ

بھول گئی تھی کہ وقت کبھی ایک سانس نہیں رہتا۔ اب اُسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اُس نے نیولین کو سمجھنے میں غلطی کی۔

"کیا وہ پیرس پہنچے ہیں مجھے طلاق دے دے گا؟"

خدا شہ اُسے پاگل سے جا رہا تھا۔ مستقبل اسے تاریک نظر آ رہا ہے لیکن وہ جلد ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔

جس دن نیولین کا بھری جہاز بندرگاہ پر لگنا تھا، جوزفین اپنی بیٹی ہارٹیش کے ساتھ بن بھن کر، ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے بندرگاہ پہنچی، تاکہ کوئی فیصلہ کرنے سے قبل اُسے قائل کر لے کہ وہ اب بھی اُسے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔

شاہر جوزفین کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ نیولین کا جہاز کسی اور بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ یوں اُسے تاتف سے ہاتھ ملتے ہوئے شہر لوٹا پڑا جہاں ایک اور صدمہ اس کا منتظر تھا۔ نیولین اس کی شہر واپسی سے قبل اپنے گھر پہنچ گیا تھا جہاں اُس نے خود کو خواب گاہ میں بند کر لیا تھا۔

چالاک جوزفین کے لیے وہ عجیب صورت حال تھی۔ خواب گاہ کے دروازے کے اُس طرف نیولین تھا جو اُس سے بات کرنے کو تیار نہیں تھا، اور دوسری جانب وہ کھڑی تھی، پریشان، اندیشوں میں گھری ہوئی۔

اُس نے دروازہ پیٹا۔ نیولین کو مٹانے کی کوشش کی۔ پھر دھمکی دی، طعنے دیئے کہ وہ مصر میں گل چترے اڑاتا ہے اور وہ یہاں اُس کے انتظار میں تھیں۔ لیکن نیولین اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔

بالآخر معاملہ فہم ہارٹیش کو دروازے پر دستک دینی پڑی جسے نیولین حقیقی باپ کی طرح چاہنے لگا تھا۔ اس نے گڑگڑاتے ہوئے دروازہ کھولنے کی درخواست کی۔

دروازہ کھل گیا۔ ہارٹیش اندر داخل ہوئی، لیکن جوزفین کو داخلے کی اجازت نہیں ملی۔ اُسے باہر ہی انتظار کرنا پڑا۔

کچھ دیر بعد جب ہارٹیش کمرے سے برآمد ہوئی اُس کی آنکھوں میں اپنی ماں کے لیے ناپسندیدگی تیر رہی تھی۔ "تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے۔ وہ تمہیں طلاق نہیں دے گا۔" اس کے لہجے میں ترس و تاتف کی لہریں تھیں۔

"لیکن اس نے ایک پیغام بھجوایا ہے۔ کہا ہے، تم نے اُس کے دل کو فوج کر دیا اور اب وہ مجھی کسی سے محبت نہیں پائے گا۔"

وہ جوزفین کی زندگی کا سب سے جذباتی لمحہ تھا۔ آدراؤدھی۔ اور اسی آدراؤدی سے پشیمانی نے جنم لیا۔

"کیا کوئی انسان اتنا عظیم ہو سکتا ہے؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔ فرط جذبات سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہارٹیش تو چلی گئی لیکن وہ وہیں دروازے کے پہلو میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی گئی اور نہ جانے کب تک یونہی بیٹھی رہی۔

اُس روز پشیمانی کے بوجھ تلے وہ قلب ماہیت کے عمل سے گزری۔ بدل گئی، جس شخص کو کل تک وہ ہزاروں اور بیوقوف خیال کرتی تھی، اُس کے لیے جوزفین کے دل میں گداڑ محبت بن گئی۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے قبل وہ پوری طرح نیولین کے سحر میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اُس سے محبت کرنے لگی تھی۔

اور اب ایک نئی کہانی شروع ہونے والی تھی!!

☆☆☆

بے شک نیولین نے اُسے طلاق نہیں دی، مگر سے بے دخل نہیں کیا لیکن اب صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔ وہ مزہ کر چکا تھا کہ اپنی ظالم بیوی کو اسی ہتھیار سے زخمی کرے گا جس نے اُس کے دل میں جمید کیے ہیں۔

آنے والے چند دن وہ عورتوں میں گھرا رہا۔ اس کی عیاشیوں کے تھے شہر میں گردش کرنے لگے۔ ہر رات وہ اپنی مجبور بدلتا۔ دوسری جانب جوزفین دھیرے دھیرے سانی سرگرمیوں سے دور ہو رہی تھی۔ اُس کے رابطے محدود ہوتے گئے۔

الغرض جوں جوں نیولین ایک بے وفا شوہر کے روپ میں ڈھلتا گیا، وہ ایک با وفا بیوی بنتی گئی۔ ہر رات نیولین نئے نئے دھت کھڑا ہوتا لیکن جوزفین خاموش رہتی۔ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی۔

گو کہ اب وہ پہلے کے مانند جوزفین سے محبت نہیں کرتا تھا لیکن اُس نے کسی موقع پر اُس سے بدسلوکی نہیں کی، تذلیل نہیں کی۔ خصوصاً وہ جوزفین کے بچوں پر تو بہت مہربان تھا۔ ہارٹیش کی شادی اُس نے اپنے چھوٹے بھائی لوئس سے کر دی تھی اور وہ اُن کا ہمراہ خیال رکھتا تھا۔

اس عرصے میں سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ نیولین کے مصر کے محاذ سے یوں اچانک لوٹ آنے کے فیصلے کو حکومت کی جانب سے شدید تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا لیکن اُس وقت حکومت فرانس اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اُسے مزاحمت دے نہ سکی۔ وہ تاحال عوام میں مقبول تھا۔

جولیا جوں جوں موت اپنی طاقت کھو رہی تھی، فوجی

اطہر نیس کو اس کے ہم جماعت کنور جی کہتے تھے۔ کیونکہ اطہر اپنے نام کے ساتھ کنور ضرور لکھتا تھا، کنور اطہر علی خاں!

بچپن ہی سے اطہر حسن پرست تو تھا ہی، نوے جماعت میں پہنچا تو ایک ہندو دو شیرہ اس کے دل کو بھاگئی۔ اس دو شیرہ کا گھر حکیم کی سرایے میں تھا۔ ریل گنج سے بارہ دری کی طرف جاتے ہوئے رستے میں حکیم کی سرایے پر پڑتی تھی۔ پہلے تو وہ اطہر کو طرح دیتی رہی کہ ابھی بچہ ہے، تاکتا ہے تو تاکا کرے مگر کچھ روز بعد جب اطہر کی خاموش نگاہوں نے اسے پیغام عشق دینا شروع کیا تو وہ چونک اٹھی۔ وہ ان نگاہوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ بڑی بڑی شریقی آنکھوں والی گوری چٹنی اور دراز قد وہ ہندو دو شیرہ اطہر سے تقریباً تین سال بڑی تھی۔ سولہ کے سن کی تھی اور جوانی اس پر ٹوٹ کے برسی تھی۔

اطہر اسے عجیب بے خودی کے عالم میں دیکتا اور دیکھے ہی جاتا۔ وہ مندر جاری ہوتی تو اطہر اس کے پیچھے پیچھے چلتا، لوہی تو سائے کی طرح ساتھ ہوتا۔ درختے میں کھڑی ہوتی تو اطہر اسے سائے کے کھڑا نظر آتا، پاس پردوس میں کسی کے گھر جاری ہوتی تو اطہر کی نگاہیں اس کے تعاقب میں ہوتیں۔ اس طرح سے وہ عشق پروان چڑھ رہا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان بھر میں ہندو مسلم فسادات کی ابتدا ہو چکی تھی۔ کسی بھی وقت علی گڑھ میں بھی فساد کی آگ بجڑ کر کھڑی تھی۔ معلوم نہیں اطہر کو یہ احساس ہوا یا پھر اس ہندو دو شیرہ کے تو جین آئینہ الفاظ نے اس کا دل توڑ دیا۔ بہر حال پھر اس نے ان شریقی آنکھوں کا تصور تو بار بار کیا مگر ان کے قریب نہ گیا۔ اس کے باوجود اطہر اسے بھول نہ سکا۔

اک شکل ہمیں پھر بھائی ہے، اک صورت دل میں سائی ہے ہم آج بہت سرشار سخی پر اگلا موڑ جدائی ہے اور پھر جدائی کا یہ موڑ اگلے سال ہی آ گیا۔ اطہر نے مسلم یونیورسٹی شریانی ہائی اسکول سے میٹرک کر لیا تھا اور ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے کہ اسے اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنے گھر کو چھوڑ کر اور ایک بت کا فر کو بھلا کر پاکستان کے لیے ہجرت کرنا پڑی۔ اس وقت اطہر کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ اتنی ہی عمر میں اس نے ناکام عشق کا مزہ چکھ لیا تھا۔

اقتباس: شہید عشق، اطہر نیس مرسلہ: خالق سخی، اللہ آباد

افران کی قوت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی عرصے میں معروف سیاست دان راجدڑ کیوں اور فرانسسی جیج کے با اثر ترین شخص ابی یز نے اُس سے رابطہ کیا، جو آئینی حکومت کے خلاف ایک انقلاب کا منصوبہ ترتیب دے رہے تھے۔ نیپولین فوراً اُس کا حصہ بن گیا۔ یہ منصوبہ ایک نئی حکومت کے قیام پر مبنی تھا، جو ”حکام ثلاثہ“ یعنی نیپولین، ابی یز اور ڈی کیوں پر مشتمل تھی۔

گہما گہما کے ان دنوں میں جوزفین کی بے لوث خدمت کے طفیل وہ ذمہ تو مندل ہونے لگا جو اُس کی بے وفائی سے نیپولین کے دل پر لگا تھا لیکن جلد ہی ایک اور مسئلہ آن کھڑا ہوا۔ نیپولین ایک وارث چاہتا تھا لیکن اس معاملے میں جوزفین اُس کی مدد کرنے سے قاصر تھی۔ وہ ماں بننے کی صلاحیت کھو چکی تھی۔

فرانس پر ایک کمون کی حکومت تھی۔ ابتدا میں خیال کیا جا رہا تھا کہ ابی یز اُن کمون کا سربراہ ہوگا لیکن نیپولین نے جلد ہی اپنے سیاسی حریفوں پر برتری حاصل کر لی اور بڑی سبک رفتاری سے اقتدار پر قابض ہونے کا عمل انجام دیا۔ اگرچہ نئی حکومت نے تقصیری آئین اپنایا لیکن یہ شخص عسکری آمریت کو جمہوری روپ دینے کا ڈھونڈ تھا۔ یوں تو لوگوں کے حاصرے کے شخص چھ سال بعد جب اُس کی عمر تیس برس تھی، وہ فرانس کا غیر متنازعہ حکمران بن گیا۔

سیاسی پیچیدگیاں تو اس نے سلجھا لیں، لیکن گھریلو پریشانیوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ سب جوزفین ہی تھی جس کے خلاف اب نیپولین کے اہل خانہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس معاملے میں اس کی بیٹی پیش پیش تھیں، جو تعلیم، تہذیب اور اخلاقیات سمیت کسی بھی میدان میں جوزفین کا مقابلہ کرنے سے خود کو قاصر پاتی تھیں۔

چند برس پہلے تک جب جوزفین نیپولین کے دل کی حکمران تھی، وہ دینی رہنمائی اور فحش محافل میں اُسے ”بوزمی عورت“ کہہ کر مذاق اڑاتیں، لیکن اب حالات اپنا رخ بدل چکے تھے۔ جوزفین اپنے شوہر کے دل پر مزید قابض نہیں رہی تھی، سو انہوں نے اپنے بھائی کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ وہ استہزائیہ انداز میں نیپولین سے کہتیں۔ ”اس بوزمی سے جان چھڑاؤ، جو تمہیں وارث دینے کے قابل نہیں!“

یہ جملے نیپولین کو کاٹ ڈالتے۔ بے شک وہ اپنی محبوبہ

سے ناراض تھا لیکن اُسے اندازہ تھا کہ وہ اب بدل چکی ہے۔ اُسے چاہئے تھی کہ وہ اور وہ اس تبدیلی کا احترام کرتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جوزفین ایک بہترین شیرے سماجی تقریبات کے انعقاد کا وسیع تجربہ رکھتی ہے، گفتگو کے فن میں بھی طاق ہے اور ایسی عورت اُسے پھر نہیں ملے گی۔ لیکن اہل خانہ کا تقاضا بڑھتا جا رہا تھا جو جوزفین سے شدید نفرت کرتے تھے۔

اسی عرصے میں نیپولین کے چھوٹے بھائی لوکس (جس کی شادی اُس نے اپنی سوتیلی بیٹی سے کر دی تھی) کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ کچھ دوستوں کے اصرار پر کچھ اپنی خوشی کے تحت اُس نے نو مودلو کو اپنا وارث قرار دے دیا۔ اس اعلان کے بعد جوزفین کے مخالفین کے ہاتھ ایک جواز آ گیا۔

”اب تو تمہیں وارث مل گیا... اب اس بوزمی سے جان چھڑاؤ!“ ایک بہن نے مشورہ دیا۔ ”دیو دوست! لوکس تمہارا بھائی ہے۔ اُس کے بچے کو تم اپنا بیٹا قرار دیتے ہو، لیکن وہ تمہارا حقیقی بیٹا تو نہیں۔ ابھی تمہارا سانسے زندگی پڑی ہے۔ دوسری شادی کر لو!“ ایک دوست نے سمجھایا۔

جوزفین کو اپنے خلاف نئی جانے والے سازشوں کا علم تھا اور وہ حتیٰ الامکان کوشش کر رہی تھی کہ نیپولین کی انتہائی فیصلے سے باز رہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت نیپولین کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اپنے سیاسی مخالفین کو شکست دینے، سرحد پر منزل لاتے خطرات کا قلع قمع کرنے پر مرکوز تھی۔ اور اسی گہما گہمی میں دسمبر 1804ء آن پہنچا جب نیپولین کی عسکری قوت اتنی بڑھ گئی کہ اُس نے خود کو فرانس کا شہنشاہ قرار دیتے ہوئے پوری طرح اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اور وہ بارسوخ افراد، جنھوں نے چند برس قبل یہ سوچ کر اسے انقلاب فرانس کا حصہ بنایا تھا کہ وہ ان کے اشاروں پر اپنا چہرہ گارے گا، منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

اب نیپولین سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ اتنا بڑا قوت تھا کہ کوئی اس کے خلاف سازش کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنا ظالم تھا کہ دشمن اس سے پناہ مانگتے تھے۔

جب سیاسی پریشانیوں سے نجات حاصل کر لی تو ازدواجی اُنچھوں کی جانب توجہ ہوا۔

جوزفین کو علم تھا کہ کسی بھی وقت اُسے رخصت کرنے کا اعلان ہو سکتا ہے لیکن وہ اس ممکن میں خود کو بے بس پاتی تھی۔ لیکن پھر... قدرت نے عجیب ڈھنگ سے اُسے ایک موقع فراہم کیا۔

دراصل تاج پوشی کے رسم کے لیے نیپولین نے رومن کیتھولک چرچ کے سربراہ کی حیثیت سے پوپ کو فرانس مدعو کیا تھا۔ جس روز پوپ فرانس پہنچا جوزفین کو اپنے محبوب سے وابستہ رہنے کا طریقہ سوجھ گیا۔

وہ آنکھوں میں محبت لیے، وہ لباس زیب تن کیے جو چند برس قبل نیپولین نے اُسے تحفے میں دیا تھا، اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”میرے پیارے شوہر، میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں!“ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”کہو!“ نیپولین نے گہری نظروں سے اُس کا جائزہ لیا۔ سوچا، جوزفین آج بھی بہت حسین ہے۔

”ہماری شادی کو نو برس ہو گئے ہیں۔ اے جری بہ سالار، جنھیں یاد ہوگا کہ ہم نے چرچ میں شادی نہیں کی تھی، سول کورٹ میں کی تھی؟“

”جیسے یاد ہے!“ نیپولین نے کہا۔

”کیسا ایسی شادیوں کو قبول نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں تو ہم ان برسوں میں گناہ کرتے رہے۔ میں سوچ رہی تھی... اب جبکہ پوپ یہاں ہے، ہم اپنی شادی کو مذہبی حیثیت دے دیں... میرے دل کی دھڑکن، میری بات کا براہ راست منانا، حتمی فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے!“

جوزفین نے سبک دل نیپولین کو پکھلانے کی ایک کوشش کی تھی اور اس حد کا میاب رہی تھی کہ اُس نے اپنے شوہر کو تذبذب میں ڈال دیا تھا... اس کے دل میں شادی کو مذہبی حیثیت دینے کے خیال کا بیج بو دیا تھا۔

بے شک طلاق کی بابت سوچنا نیپولین کے لیے ناممکن ہو گیا تھا، لیکن عشق لڑانے کی خواہش اُسے متحرک رکھے ہوئے تھی۔

اُن دنوں الڑتہ نامی ایک قاتل حینہ اُس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی، جسے نیپولین نے کچھ ہی عرصے قبل ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کیا تھا۔

پھر... ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ ٹھیک تاج پوشی والے روز رسم کے ادا کیے سے قبل جوزفین نے الڑتہ اور نیپولین کو ایک نیم تاریک کمرے میں رنگ لیاں مناتے

ہوئے پکڑ لیا۔

اُس لمحے احتیاط کا دامن جوزفین کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ آگ بجولا ہو گئی۔

یہ درست ہے کہ وہ خود بھی ایک عرصے تک نیپولین کو دھوکا دیتی رہی تھی لیکن اب وہ ایک مخلص بیوی تھی، اپنے شوہر کا دل جیتنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی تھی، ایسے میں اُسے توقع تھی کہ نیپولین کی جانب سے بھی مثبت جواب آئے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

جذبات کی شدت سے لڑتی جوزفین نے اپنے شوہر اور اُس کی توخیز محبوبہ کو بہت برا بھلا کہا۔ اس وقت تک چلائی رہی جب تک الڑتہ آنکھوں میں آنسو لیے کمرے سے چلی نہیں گئی۔

شہنشاہ فرانس اس طرح اپنی جاسوسی کرنے پر بہت تنج یا ہوا۔ اُس نے جوزفین کو بے نقط سناٹی۔ ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اب وہ اُسے طلاق دے کر ہی رہے گا۔

نیپولین کی سوتیلی بیٹی اس وقت محل ہی میں موجود تھی۔ اُسے پورے واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ فوراً دوڑی دوڑی پہنچی اور نیپولین سے شٹلے دماغ کے ساتھ اس معاملے پر غور کرنے کی درخواست کی۔

”اس موقع پر یہ مناسب نہیں ہے شہنشاہ!“ اُس نے بڑے احترام سے نیپولین کی پوشاک کے دامن کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”تاج پوشی میں چند ہی لمحات باقی ہیں، اس معاملے کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیں!“

ہارٹیس یہ کہہ چلی گئی۔ اب کمرے میں نیپولین اور جوزفین رہ گئے، جو بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کمرے میں جوزفین کی ہچکچاہٹ گونجنے لگیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، جنہوں نے نیپولین کو پکھلا دیا۔ اُس نے اپنا فیصلہ مؤخر کر دیا۔ 2 دسمبر 1804ء کو نیپولین کے سر پر تاج رکھ دیا گیا جس کے فوراً بعد اُس نے جوزفین کے سر پر تاج رکھتے ہوئے اُسے اپنی ملکہ قرار دے دیا۔

آنے والے دنوں میں چند ایسے اشارے ملے، جس سے اس خیال کو تقویت ملنے لگی کہ نیپولین کے دل میں جوزفین کے لیے پھر محبت جاگ اٹھی ہے۔

وہ اُسے دوبارہ اہمیت دینے لگا تھا، اُس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ جوزفین نے بھی اُس کی محبت کا بھرپور جواب دیا۔ ہر محاذ پر اپنے شوہر کے ساتھ کھڑی رہی۔ اس کی حمایت

کی۔ عوام کی سب پر بادشاہ کی مثبت شبیہ پیش کرنے کے لیے کئی مفید مشورے دیے۔ الغرض وہ پھر دھیرے دھیرے قریب آنے لگے تھے۔

☆☆☆

سیاسی طور پر حالات بگڑ رہے تھے! نپولین نے اپنے بھائیوں کو یورپی ریاستوں میں تعینات کر دیا تھا۔ اس فیصلے پر فرانس میں خاصی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ بدقسمتی سے 1805ء میں ژرفالکر کی زبردست جنگ میں انگلستان کے بحری بیڑے کو فرانسیسی فوج پر نمایاں فتح حاصل ہوئی جس کے بعد پاپیوں پر انگلستان کی عجم رانی مسلم ہوئی۔ چند برسوں بعد نپولین نے فرانس کو جزیرہ ہائے ابرین کے ساتھ طویل جنگ میں الجھا دیا۔

اُن ہی دنوں نپولین نے روس کے زار سے مل کر ٹلسٹ معاہدے کے تحت دوستی کا پیمانہ باعہا لیکن یہ اشتراک دھیرے دھیرے شکست و ریخت کا شکار بننا جا رہا تھا۔

مشکل کے اُس دور میں ایک وفا شعار بیوی کے مانند جوزفین نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس کی غم غسار بنی رہی، اُسے خوشی فراہم کرنے میں بے بسی رہی۔

اسے حالات کی تہم طغیانی ہی کہا جاسکتا ہے کہ نپولین کا طبیب ہی اُس کی اصل بیماری تھا۔ جوزفین نپولین کے دکھ کا بنیادی سبب تھی کیونکہ وہ اب تک اُسے وارث نہیں دے سکی تھی۔ یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ نپولین دوسری شادی کر لے۔ نپولین سخت دباؤ تھا لیکن جوزفین کی محبت اُسے انتہائی فیصلے سے باز رکھتی۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اُن کی جدائی پر تقدیر کی مہر ثبت کر دی۔

1807ء میں جوزفین کا نواسا نپولین چارلس یونا پارٹ جسے فرانس کے تخت کا وارث قرار دیا گیا تھا، فقط چار برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔

اس سانحے نے نپولین کی راتوں کی نیند حرام کر دی۔ اب اُسے شدت سے یہ فکرتانے لگی کہ کہیں وہ بے وارث نہ رہ جائے۔

اس سانحے نے جوزفین کے مخالفین کو پھر متحرک کر دیا۔ انہوں نے مختلف ریاستوں کی اُن شہزادیوں کی فہرست مرتب کرنی شروع کر دی جو فرانس کی اگلی ملکہ بن سکتی تھیں۔

والہ انہوں نے اپنے لیے فیصلہ آسمان نہیں تھا۔ وہ جتنا

سوچتا، اتنا اگھٹاتا۔ اُس نے اس معاملے کو نالائقی الامکان کو پیش کی لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ بالآخر نومبر 1809ء کی ایک رات، عشا سیر کے دوران جوزفین کا ہاتھ تھام کر نرمی... آواز میں دھمکی نپولین اُسے مطلع کر دیا۔

”جانا، فرانس کے عظیم تر مفاد کے پیش نظر مجھے تمہیں طلاق دینی پڑے گی، سبھی عقیدے کے مطابق بیوی کو طلاق دیے بغیر میں دوسری شادی نہیں کر سکتا!“

ان حزنہ الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی اِلم میں ڈوب کر ایک جھج کر عیاضیت میں گھٹی۔

”میں یہ صدمہ برداشت نہیں کر پاؤں گی!“ جوزفین کی آواز لرز رہی تھی۔

نپولین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بے شک وہ بھی صدمہ برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوسرے روز جوزفین اپنے ملازمین کی معیت میں نرس سے رخصت ہو گئی۔ جب اُس کی بھی محل کے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی، بے روح نپولین کھڑکی میں کھڑا تھا ہاتھ میں ایک رتھ تھا، جو جوزفین نے اُس کے نام لکھا تھا۔

”میری جان، میرے محبوب، میری روح... میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ تم دوسری شادی کر لو، فقط اگر امید ہے کہ فرانس کو اس کا وارث مل سکے!“

نپولین کی آنکھوں میں نمی تھی۔ دوسری جانب کبھی شہزادہ جوزفین کی بچیاں لرز رہی تھیں۔

☆☆☆

گوکہ آنے والے چند دنوں میں جوزفین ملکہ فرانس ہی کی حیثیت سے تقریبات میں شرکت کرتی رہی لیکن بات سب کے علم میں تھی کہ نپولین اُسے طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

شاہ فرانس روس کے زار کی بہن سے شادی کرنے کا منصوبہ ترتیب دے رہا تھا۔

اس فیصلے سے کئی سیاسی مفادات وابستہ تھے لیکن بدقسمتی سے یہ تیل منڈھے نہیں چڑھی۔ جس کا بنیادی سبب نپولین کا وزیر خارجہ ٹالیر پڑھا تھا جو فرانس اور روس کے اتحاد کے سخت خلاف تھا۔ اُس نے بڑی چالاکی سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ زار کی جانب سے نپولین کا رشتہ مسترد کر دیا گیا۔ اس بے عزتی نے نپولین کو حواس باختہ کر دیا اور چند برس بعد مسترد کیے جانے کے اسی احیاس سے ایک

جنگ پھوٹی۔ روس سے باپس ہونے کے بعد وہ آسٹریا کی جانب متوجہ ہوا جس کی فوجیں ماسی میں نپولین کے ہاتھوں کی بار شکست کا ذائقہ چکھ چکی تھیں۔ اس نے فرینسز اول سے اُس کی بیٹی شہزادی میرلوی کا رشتہ مانگ کر پورے آسٹریا کو تذبذب میں ڈال دیا۔ اہل آسٹریا نپولین سے سخت نفرت کرتے تھے کیونکہ اُس قسبی نے ان کے ہزاروں نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میری لوئی بھی اُسے جلاد تصور کرتی تھی، دعائیں مانگا کرتی تھی کہ وہ نپولین کی دہلیز نہ بنے لیکن اُس کے مجبور باپ نے ہاں بھر لی تھی۔

بعد کے برسوں میں نپولین اُس شخص کو دستار باجس نے میری لوئی کا نام تجویز کیا تھا کیونکہ وہ اُس کی قربت میں نپولین کو سکون کا ایک لٹھ بھی میسر نہیں آیا۔

بہر حال، جب آسٹریا کے شاہی خاندان کی جانب سے یہ خبر موصول ہوئی کہ وہ رشتے کے لیے تیار ہیں، نپولین کو کہہ دے دکھ نے اُن گھبرا کر اب اُسے جوزفین کو ہر صورت طلاق دینی تھی۔

بالآخر 10 جنوری 1810ء کی گرم دوپہر فرانسیسی تاریخ کی اداس ترین تقریب منعقد ہوئی، جس میں طلاق کا اعلان کر دیا گیا۔

اس روز ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار نپولین اور جوزفین انتہائی افسردہ تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ طلاق کے کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے دونوں ہی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

یاسیت سے پُر اس کارروائی کے اختتام پر نپولین نے جوزفین کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ میں تمہیں بھول نہیں پاؤں گا!“

”میں مرے دم تک تم سے محبت کرتی رہوں گی!“

اور دونوں درست تھے کہ جدائی کے اُس لمحے وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر جانے کے آرزو مند تھے، اپنی کتاب زلیخہ میں ایک نئی کہانی لکھنے کے خواہش مند تھے، لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا!

نپولین ایک بیٹے تک اپنے محل میں گم صدمہ بٹھا تھا۔ نہ تو کچھ کھاتا چیتا، نہ ہی کسی سے بات کرتا۔ بس خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ دوسری جانب جوزفین نے بھی خود کو ماتی لباس تک محدود کر لیا۔

کیوں ہے کہ ان اداس دنوں میں وہ ایک دوسرے کی طلب میں ترپے رہے۔ نپولین کی ہدایت کے مطابق آنے والے برسوں میں جوزفین کو ملکہ والی تمام مراعات حاصل رہیں... اور وہ اس کی حقدار بھی تھی۔ نپولین کے دل کی ملکہ تو ہی تھی! چند ماہ بعد نپولین نے میری لوئی سے شادی کر لی جس نے اس کی زندگی عذاب بنا دی۔

جہاں تک جوزفین کا تعلق ہے، بعد کے برسوں وہ پیرس ہی کے نزدیک ایک بڑھکھو محل میں مقیم رہی۔ مارچ 1811ء میں میری لوئی نے اُس وارث کو جنم دیا، جس کے لیے نپولین نے اپنی محبت، اپنی روح کو خود سے جدا کر دیا تھا۔

شاہ فرانس نے اپنے بیٹے کو ”روم کا بادشاہ“ کا خطاب دیا۔ دو برس بعد نپولین نے جوزفین کی اپنے وارث سے ملاقات کروائی، جورج و اِلم میں ڈوبی ایک عجیب ملاقات تھی کہ جوزفین کے سامنے وہ بچہ تھا جو اُس کے محبوب سے دور لے گیا تھا... اور وہ اسے دعائیں دینے پر مجبور تھی۔

☆☆☆

سیاسی سطح پر لڑکھاتا نپولین اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ زار پر خا رکھا بیٹھا تھا۔ سوشلسٹ معاہدے کو کاہل قدمی قرار دیتے ہوئے وہ جون 1812ء میں اپنی فوج کے ساتھ روس میں داخل ہو گیا۔

روسی فوج نے منصوبہ بندی کے تحت لڑنے سے اجتناب برتا، اُسے پیش قدمی کا موقع دیا۔ تجربہ کار نپولین نے ماسکو پر قبضہ کر لیا، تاہم روسیوں نے شہر کو آگ لگا کر اُسے تباہ کر دیا۔ ماسکو میں وہ پانچ ہفتے انتظار کرتا رہا کہ روسی امن کے لیے التماس کریں گے۔ اس بے ثمر، بیزار کن انتظار نے اُسے واپسی کے فیصلے پر مجبور کر دیا۔

روسی اسی کے منتظر تھے، کیونکہ موسم سرما اپنی تمام تر ہولناکیوں کے ساتھ فرانسیسی فوج کے راہ میں کھڑا تھا۔ روسی سبھی کسر روسی فوج کے تیز دھار تھیا روں نے پوری کر دی۔

الغرض واپسی کا مکمل ایک عظیم شکست ثابت ہوا۔ فقط دس فیصد فوج ہی روسی زمین سے واپس آ سکی۔

یورپی ممالک کو یہ احساس ہو گیا کہ انہیں فرانسیسی غلامی کا پھندا گلے سے اتار چکے گا سنہری موقع مل گیا ہے۔ انہوں نے نپولین کے خلاف اتحاد قائم کر کے جنگ کا اعلان

وہ پاکستان کے ایک چھوٹے سے علاقے کا تھا مگر اس نے تعلیم کے ذریعے شہرت کی بلندیوں کو چھو لیا۔ اس میں مردانہ وجاہت بھی غضب کی تھی جس نے برطانیہ کی ایک شہزادی کو اس کے حضور جھکادیا۔ دونوں کی محبت پروان چڑھنے لگی۔ وہ شہزادی پاکستان آئی تو سیدھے اس کے گھر پہنچی مگر حالات نے ساتھ نہ دیا اور یہ عشق اپنے عہد شباب میں ناکام ہو گیا۔

عشق مسلسل

آصف ملک



دیکھا تھا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ جلد یہ رومانی کہانی ایک المیہ داستان میں بدل جائے گی۔ شادی کے وقت شہزادہ چارلس کی اہمیت تھی اور شہزادی ڈیانا اتنی اہمیت کی حامل نہیں تھی اگرچہ میڈیا نے اسے بھی بھرپور روبرو کر دی تھی۔ نہایت دھوم دھام سے شاہی جوڑا ہی منوں منانے کے لیے روانہ ہوا۔ ان کے بیٹے مون کو بھی میڈیا اور لوگوں کی

اٹھارہ سال کی شہزادی ڈیانا کی تقریباً دو گنی عمر کے شہزادہ چارلس سے شادی ہو رہی تھی۔ لیکن اس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی رومان بھری کہانی اپنے عروج پر ہو۔ یہ دنیا میں سب سے زیادہ دیکھی جانے والی شادی تھی۔ جسے ایک اندازے کے مطابق ٹی وی پر دنیا بھر کے پچاس کروڑ سے زیادہ افراد نے



کر دیا۔ اکتوبر 1813ء میں اتحادی فوج نے ”لیپ زگ“ کے مقام پر فرانسیسی فوج کو درہم برہم کر دیا۔ نیپولین کی تمام تر کوششوں کو ناکامی کو منہ دیکھنا پڑا۔ برطانوی فوج نے جنوب سے دباؤ ڈالنا شروع کیا، اتحادی فوج نے جرمنی کے محاذ کو خون میں نہلا دیا۔

بالآخر مارچ 1814ء میں اتحادی فوج نے پیرس پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ یہ خبر ملتے ہی سرحد پر موجود نیپولین نے اپنی فوج کو دارالحکومت کی جانب پیش قدمی کا حکم دیا، تاہم فوج کے اعلیٰ افسران نے بغاوت کر دی۔

حالات اتنے بگڑ گئے کہ مجبوراً اُس نے اپنے بیٹے کے حق میں تخت سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا، لیکن اتحادی فوج نے یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ نتیجتاً 11 اپریل کو وہ کبھی طور پر فرانس کے تخت سے دستبردار ہو گیا۔ اُسے جلاوطن کر کے قریبی ساتھیوں کے ساتھ اٹلی کے سرحدی علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے جزیرے البانک محدود کر دیا گیا۔

ان پے درپے شکستوں نے نیپولین کے خیر خواہوں پر یاسیت کی چادر تان دی لیکن میری لونی بہت خوش تھی۔ 1814ء میں وہ نیپولین کے وارث کو ساتھ لے کر آسٹریا لوٹ گئی جس کے بعد نیپولین کی پھر بھی ان دونوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔

وہ نیپولین کی زندگی کا سب سے اذیت ناک لمحہ تھا۔ اُس نے فقط وارث کے لیے جوزفین کو طلاق دی تھی اور جس عورت نے اُس کی محبوبہ کی جگہ لی، اُس نے نیپولین کو فقط دکھ دیے۔

☆☆☆

29 مئی نیپولین کی زندگی کا منحوس ترین دن تھا! جلاوطنی کا دکھ بھٹتے نیپولین کو وہ اطلاع ملی جس نے اس کے سوختہ، محبت سے محروم دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اُس کی محبوبہ، اُس کے دل کی ملکہ جوزفین مختصر علالت کے بعد اس فانی جہان سے کوچ کر گئی تھی۔

تاریخ نگواہ ہے، اُس عورت نے مرے وقت اپنے محبوب نیپولین ہی کو پکارا تھا... وہ سرتاپا اُس کی محبت میں گرفتار تھی۔

جب نیپولین کو جوزفین کی موت کی خبر ملی، اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا، جہاں وہ دو دن بھوکا پیاسا اُسے پکارتا رہا۔ غم کے دنوں میں اُس پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اُنکھیں کھاتا تھا۔ ”میں اپنی جوزفین سے شدید محبت کرتا تھا، لیکن میں نے اُس کی قدر نہیں کی۔“

اور وہ درست ہی کہتے ہیں!



طرف سے بھر پور توجہ ملی تھی۔
مگر جلد ہی چارلس اور ڈیانا کے درمیان اختلاف کی خبریں آنے لگیں ان اختلافات کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں چیمگوئیاں جاری تھیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ شادی کے فوراً بعد دونوں میں جھگڑا ہوا اور کچھ عرصے بعد ڈیانا نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوئی۔ ڈیانا کا تعلق ایک معزز گھرانے سے تھا لیکن اسے شادی خاندان کے برابر نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس لیے چارلس کے گھر والوں کا رویہ بھی ڈیانا سے سرد ہی تھا۔ خاص طور سے ملکہ الزبتھ سے اس کے پہلے دن سے اختلافات تھے۔ مگر یہ ساری خبریں رفتہ رفتہ محرم راز قسم کے لوگوں اور خود ڈیانا یا شاہی خاندان کے افراد کے توسط سے باہر آتی رہیں۔ شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سارا رومان ٹھنڈا پڑ گیا اور اب لوگ خطرہ تھے کہ کب شاہی جوڑے میں علیحدگی ہوئی ہے؟ اس قسم کے حالات میں طلاق میں زیادہ دیر نہیں لگتی ہے لیکن خلاف توقع لوگوں کو خاصی دیر انتظار کرنا پڑا تھا۔

بعد میں مزید کہانیاں سامنے آتی رہیں۔ بے وفا کی شہزادے کی طرف سے ہوئی تھی وہ کیلا پارک نامی ایک شادی شدہ عورت کا دیوانہ تھا جو سن اور طبقے کے لحاظ سے ڈیانا کا پانچ گنا بھی نہیں تھی۔ شاہی خاندان کی صورت چارلس کی کیلا پارک سے شادی کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں تھا جو پہلے سے شادی شدہ تھی۔ اس لیے قربانی ڈیانا کی دی گئی۔ شادی کے شروع کے دنوں میں یہ اسکیٹلڈ ڈیانا کے علم میں آچکا تھا اور شہزادہ کھلم کھلا کیلا سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ ان حالات میں ڈیانا کے پاس تین راستے تھے۔ ایک وہ سب کچھ بالائے طاق رکھ کر چارلس سے طلاق حاصل کر لے۔ دوسرے خاموشی سے اس کی بے راہ روی برداشت کرے اور خود نفسیاتی مر لیٹھ بن جائے اور تیسرا راستہ یہ تھا کہ وہ بھی بے وفا کی پر آرت آئے اور وہ محبت جو اسے چارلس نے اس کا حق ہوتے ہوئے بھی نہیں دی تھی اسے کہیں اور تلاش کرے۔ ڈیانا نے تیسرا راستہ اختیار کیا۔

اپنی موت سے پہلے اچانک ہی کسی قدر پس منظر میں چلی جانے والی لیڈی ڈیانا کی چونکا دینے والی تصاویر منظر عام پر آئیں۔ یہ تصاویر اس کے تازہ ترین ہوائے فریڈ دودی الفائد کے ساتھ تھیں۔ عابد الدین محمد عبدل موسیٰ فائد ایک مصری فلم پروڈیوسر اور ارب پتی تاجر محمد الفائد کا بیٹا تھا۔ ایک مسلمان اور عرب سے ڈیانا کا انفرامیٹاں نہیں تھا جسے

مغربی دنیا نظر انداز کر دئی۔ اس لیے کامن ہاؤس میں آگیا۔ برطانوی عوام اور خواص نے اس محبت کو دیکھا اور اکثر کٹر کارڈل مبنی تھا۔ اس کی سب سے دودی الفائد کا مسلمان ہونا تھا۔ دوسری طرف ڈیانا بالکل پروا نہیں تھی اور اس نے دودی سے منگنی کا ارادہ کر دیا تھا۔ ڈیانا کے قریبی حلقے دعویٰ کرتے ہیں کہ دودی سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ صرف مصلحت کی وجہ سے ایسا ظاہر کر رہی تھی۔

کیا ڈیانا واقعی دودی سے محبت کرنے لگی تھی؟ سوال کے جواب میں ایک مصنفہ کیٹ اسمیل نے مفصل کر کے بعد ایک ڈاکومنٹری بنائی اور اس نے ثابت کر کے کوشش کی کہ دودی کے ساتھ ڈیانا کی خفیہ تصویروں کا سرا آنا اتفاق نہیں تھا۔ یہ تصاویر ایک منصوبے کے تحت سر دینا کے میڈیا میں ایک ساتھ شائع کی گئیں اور ان تصاویر کا مقصد ایک ایسے شخص کو چیلنس کرنا تھا جس سے ڈیانا محبت کرنے لگی تھی۔ یہ شخص پاکستانی نژاد ڈاکٹر حسنا تھا۔ کیٹ اسمیل لکھتی ہے۔ ”اپنی زندگی کے بالکل آخر حصے میں ڈیانا نے اپنے ایک قریبی دوست سے کہا۔ اب اکیلی نہیں رہوں گی میں جان لگتی ہوں محبت کیا ہے؟“ اسے یہ تحفہ ایک آدمی نے دیا تھا اور وہ آدمی ڈاکٹر حسنا تھا۔“

ڈاکٹر حسنا خان پاکستان کے ایک روایتی قدیم پرست گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور وہ کارڈیالوجسٹ کی حیثیت سے آج بھی لندن میں پریکٹس کر رہا ہے۔ میڈیا لوگوں کے سامنے نمایاں ہونے سے گریز کی وجہ سے اس ڈیانا سے تعلق آخر تک سامنے نہیں آیا تھا۔ لیکن کیا واقعی ڈیانا نے مرنے سے کچھ عرصے پہلے ڈاکٹر حسنا کی صورت میں محبت کو پایا تھا؟ کیٹ اسمیل اس سوال کے جواب میں لکھتی ہے۔ ”وہ خود کو بہت زیادہ غیر محفوظ سمجھتی تھی اور اس نے جی محبت کی تلاش میں بہت محسوس کر لیا تھا۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ اسی کام میں گزار دیا تھا۔ ایک کے بعد ایک ہوائے فریڈ بدلتی رہی اور سب سے اسے صدمہ دیا۔ وہ اس سے نہیں اس کی خوب صورتی اور اس کے مرنے سے محبت کرتے تھے۔“

ڈیانا کی یہ تلاش اسی دن سے شروع ہو گئی تھی جس دن اس کی شادی شہزادہ چارلس سے ہوئی تھی اور اس نے محبوب کیلا پارک کو بھی اس شادی میں مدعو کیا تھا اور ڈیانا

بات سے واقف تھی۔ اس کے باوجود اس نے چارلس کے ساتھ بھانسنے، ایک شہزادی کی حیثیت سے شاہی خاندان کے لیے اور شہزادے کیلئے کے کردار کو نبھانے کے لیے اپنی ہی بہترین کوشش کی۔ اس نے کہیں کوئی کی یا کوئی نہیں چھوڑی۔ اس کے مقابلے میں شاہی خون رکھنے والی اس کی منہ شہزادی مارگریٹ کا کردار سب کے سامنے ہے جسے اپنے اور شاہی خاندان کے کردار کی کوئی پروا نہیں رہی۔ ڈیانا بہت سادہ عورت تھی جو جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس نے شاہی خاندان اور چارلس کے لیے یہ سب کیا شاید اسے امید تھی کہ چارلس اس کی طرف واپس آجائے گا وہ کیلا کو چھوڑ دے گا۔ لیکن جواب میں اسے چارلس کی طرف سے کھلی بے وفائی اور شاہی خاندان کی طرف سے سرد مہری کا سامنا کرنا پڑا۔

☆☆☆

1994ء میں اس طویل ترین تعلق کا خاتمہ ہوا جو ڈیانا نے کسی ایک مرد سے رکھا تھا۔ چارلس سے اس کی شادی اول دن سے اس کی طرح تھی جو بھنور میں پھنس گئی ہو۔ بعض مجبور یوں کی وجہ سے یہ شادی فوری خاتمے کا شکار ہونے سے بچ گئی اور اس دوران میں ڈیانا اور چارلس دو بیٹوں کے ماں باپ بھی بن گئے تھے۔ صرف شادی ہی نہیں ڈیانا کے کئی انفریکٹ بھی خاتمہ ہوا تھا۔ اب وہ بالکل اکیلا اور اداس تھی۔ چارلس سے طلاق سے اس کی شاہی خاندان میں حیثیت میں فرق آیا تھا لیکن جہاں تک اس کے پبلک ایجنڈا کا تعلق تھا اس میں بہتری آئی تھی اور طلاق کی کارروائی شروع ہونے کے بعد منظر عام پر آنے والی کہانوں کی وجہ سے لوگ اسے ہمدردی کا ماحق سمجھنے لگے تھے۔ ڈیانا کے ساتھ چارلس اور شاہی خاندان کا رویہ ہمیشہ استارکس سسرال ٹاپ کار یا لیکن طلاق تک اس میں سے بہت ساری چیزیں منظر عام پر نہیں آئی تھیں۔

ڈیانا کے دوستوں اور قریبی رشتے داروں کا خیال تھا کہ چارلس اور شاہی خاندان کا مہیب سایا بھٹنے کے بعد ڈیانا ایک مضبوط شخصیت کے طور پر سامنے آئے گی اور اپنے مرنے کے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے گی۔ مگر ان کی توقع کے برخلاف ڈیانا کا محبت کے معاملے میں سابقہ رویہ برقرار رہا تھا۔ ابھی اسے اکیلے ہونے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ اس کی ملاقات ڈاکٹر حسنا سے ہو گئی۔ ڈیانا کا ایک قریبی دوست ہارٹ ایک کا شکار ہوا اور وہ اس کے

دوست تو اس بیماری سے جانبر ہو گیا لیکن خود ڈیانا کو دل کا نیا روگ لگ گیا۔ وہ ڈاکٹر حسنا خان سے فوراً متاثر ہو گئی تھی اور اس نے یہ بات اپنے دوستوں کو بتانے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ کیٹ اسمیل لکھتی ہے۔ ڈیانا نے ان الفاظ میں ڈاکٹر حسنا کا تعارف کرایا۔

”وہ جان لیوا حد تک پرکشش ہے۔“ اس نے اپنے دوستوں سے کہا۔ ”شاید یہی وہ مرد ہے جس کی مجھے تلاش تھی اور جو میرے خوابوں کو حیر دے سکتا ہے۔“

اس پہلے دورے کے بعد ڈیانا اتنی باقاعدگی سے برومپٹن ہسپتال لندن کا چکر لگانے لگی کہ وہاں کی ایک مستقل مہمان بن گئی۔ وہ اکثر وہاں مریضوں کی عیادت کرتی، ان میں تحائف تقسیم کرتی تھی اور کبھی کبھی براہ راست کی سرجری کے موقع پر بھی پائی جاتی اور لازمی بات ہے اس وقت آئرلینڈ روم میں سرجن ڈاکٹر حسنا ہوتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت حسنا خان کے گرد منڈلانے میں صرف ہوتا تھا۔ ڈاکٹر حسنا ایک شہر میلا اور خاموش طبع شخص تھا جسے دنیا میں کسی چیز سے دلچسپی تھی تو وہ اس کا پیش تھا۔ ساسھی اسٹاف اور مریضوں میں اس کی ساکھ بہت اچھی تھی اور سب اس کی عزت کرتے تھے۔ خان فیملی سے تعلق رکھنے والا حسنا خان دیکھنے میں خوبصورت، باوقار اور شریف آدمی تھا۔ لندن جیسے شہر میں رہ کر اس نے اپنے کردار کو برقرار رکھا تھا اور اس کی گواہی اس کے ساتھی بھی دیتے تھے۔

”ڈیانا اس کے کردار، اس کی شرافت اور مریضوں اور ساتھیوں کے لیے اس کی توجہ اور خلوص سے متاثر ہو گئی تھی۔“ کیٹ اسمیل نے کہا۔ ”ڈیانا اگر اس سے کوئی تعلق رکھتی تھی تو وہ اس تعلق کو یقیناً ممکن حد تک سب سے چھپانا چاہتی تھی خاص طور سے میڈیا سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی اس کے برومپٹن ہسپتال کے دورے ہمیشہ ساسھی خدمت کے طور پر پیش کیے جاتے تھے۔“

ایسا لگتا تھا کہ ڈیانا ڈاکٹر حسنا خان سے پوری طرح متاثر ہو گئی تھی اور وہ اسے چاہنے لگی تھی۔ اب تک اس کے تمام ہوائے فریڈز معزز برطانوی سفید فام شہری تھے۔ لیکن حسنا خان برطانوی شہری ہوتے ہوئے بھی ایک ایشیائی اور مختلف مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص تھا۔ یہی نہیں ان کے کچھ میں بھی اتنا فرق تھا کہ وہ دونوں بالکل مختلف دنیاؤں کے باشندے تھے۔ ڈیانا کو پیش آنے

والے اہلک سامنے کے بعد متحدہ صحافی حضرات نے ڈاکٹر حسنا خان سے انٹرویو کرنے کی کوشش کی اور ان میں سے صرف چند ایک کو کامیابی ملی تھی۔ ان میں ایک انڈین نژاد برطانوی صحافی شیکھر بھانی بھی تھا اس نے ڈاکٹر حسنا کے بارے میں لکھا۔

”اسے ڈیانا کی دولت سے لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کی حیثیت سے متاثر تھا وہ صرف ڈیانا سے محبت کرتا تھا۔“

ڈاکٹر حسنا خان کے پاس ہونے کے بعد ڈیانا کو احساس ہوا کہ اس کا تعلق پاکستان کے ایک قدامت پرست لیکن تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا اور وہ اپنے رسم و رواج کو چھوڑنے کے قائل نہیں تھے۔ ڈاکٹر حسنا برطانوی شہری ہوتے ہوئے بھی اپنے خاندانی، معاشرتی اور مذہبی رسم و رواج کا پابند تھا۔ وہ کسی ایسی عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا جو ان رسم و رواج کی پابندی نہ کرتی ہو۔ لباس، ڈریس اور مردوں سے میل جول کے معاملے میں بہت ساری پابندیاں تھیں جو ڈیانا کے لیے بالکل نئی چیز تھیں۔ مگر حسنا خان کے لیے اس نے ان پابندیوں کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے باوجود یہ تعلق قائم ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔

اس سے پہلے ڈیانا نے بھی اسلام یا پاکستان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس کے دوستوں اور ملنے جینے والوں میں شاید ہی کوئی پاکستانی تھا اور اگر وہ کسی پاکستانی کو جانتی تھی تو وہ عمران خان تھا۔ حسن اللہ دیکھیں حسنا خان اسی عمران خان کا دورہ کرنا لڑن تھا۔ اب ڈیانا پاکستان اور اسلام کے بارے میں جانتا چاہتی تھی۔ اس نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے عمران خان سے بہترین شخص ہو سکتا تھا۔ جوان دنوں کینسر ہاسپٹل قائم کر رہا تھا۔ 1996ء میں ڈیانا پاکستان کے دورے پر آئی۔ یہ ظاہر اس کا مقصد کینسر ہاسپٹل کی فنڈ ریزنگ میں حصہ لینا تھا لیکن اس کا اصل مقصد ڈاکٹر حسنا خان کی فحشی سے ملنا اور ان کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنانا تھا۔ اسے معلوم تھا ایسا کیے بغیر وہ اسے حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

پاکستان سے واپسی کے بعد ڈیانا کی طلاق سرکاری طور پر موثر ہو گئی تھی اور اب اس کا شہزادہ چارلس سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ اس کے دو بچوں کی ماں بھی اور ان میں سے ایک آنے والے دنوں میں شاہ برطانیہ کا تاج سنبھالنے والا تھا۔ اس دوران میں اس کی

ڈاکٹر حسنا سے ملاقات جاری رہی تھی اور ڈیانا دوست کہتے ہیں کہ وہ اپنے اپنی کاری ڈکی میں چھپا کر بیس بھی لے جاتی رہی تھی۔ مگر حسنا خان کی شخصیت پھر ڈیانا کی سابق آزاد روی کو دیکھتے ہوئے یہ صرف لگتی ہے۔ جب ڈیانا کے دوسرے بوائے فرینڈز کئے اس کے ساتھ مل کر آتے تھے اور رات رات بھر وہیں کر کے تھے تو حسنا خان کو اس طرح چھپ کر جانے کی ضرورت تھی؟ پھر ملاقات کے لیے جگہوں کی کمی تھی جو وہ کی ڈکی میں چھپ کر جانے کا خطرہ مول لیتا۔ اس میں سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اسے چھپ کر مل میں داخل ہونے کے الزام میں گرفتار کیا جاسکتا تھا اور اسے سزا بھی ہو سکتی تھی۔ یہ خطرہ اگرچہ ڈیانا کے دوسرے بوائے فرینڈز کو تھا لیکن ان میں اور ڈاکٹر حسنا خان میں ایک بنیادی فرق تھا وہ برطانوی شہری ضرور تھا لیکن نسلی سفید فام نہیں تھا۔ دوسرے مسلمان تھا اس لیے اگر اس کا ڈیانا سے ملنے سامنے آجاتا تو ملک میں یقیناً ایک طوفان اٹھ کر ہوتا۔ برطانوی عوام کی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مستقبل کی مادرملکہ کا تعلق کسی طرح بھی ایک مسلمان سے اور یہ تو قطعی ناقابل برداشت تھا کہ خود ڈیانا بھی مسلمان پائے۔ خود ڈیانا بھی جانتی تھی کہ اس کا حسنا خان سے تعلق اتنی ہنسی خوشی برداشت نہیں کیا جائے گا جس طرح دوسرے بوائے فرینڈز سے کیا جا رہا تھا۔

اس متوقع مخالفت کے خطرے کے باوجود ڈیانا حسنا خان کے عشق میں اس طرح ڈوب گئی تھی کہ اس کے لیے سب سمجھ کرنے کو تیار تھی۔ اس نے ایسا لباس پہنا شروع کر دیا جو اسے زیادہ چھپاتا تھا۔ وہ سر پر اس کا کراف لینے لگی تھی اور پاکستان کے دورے میں اس نے مکمل طور پر مقامی لباس پہنا اور سوائے چہرے اور ہاتھوں کے پورا جسم پوشیدہ رکھا تھا۔ وہ اسلام سے دلچسپی ظاہر کر رہی تھی اور اس نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ باتیں میڈیا اور عوام سے چھپی نہیں رہ سکتی تھیں۔ سب ہی بے چین ہو رہے تھے کہ ڈیانا میں اس تبدیلی کا ذمہ دار کون ہے؟ نائن الیون کے بعد ایک طرف مغربی حکومتوں اور میڈیا نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مہم چلائی تھی تو دوسری طرف مغرب میں اسلام قبول کرنے کے واقعات میں بے پناہ تیزی آ رہی تھی۔ برطانیہ سے تعلق رکھنے والی کئی اعلیٰ شخصیات نے

اسلام قبول کر لیا تھا جن میں سب سے معروف شخصیت خاتون صفائی مریم ریڈ لے تھیں۔ وہ طالبان کی قید میں رہ کر آئی تھی اور بعد میں اس نے قرآن کریم کا مطالعہ کر کے اپنے لیے اسلام کو بہ طور مذہب منتخب کر لیا تھا۔ مقبول شخصیت ہونے کے باوجود مریم ایک عام عورت تھیں جبکہ ڈیانا شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور مستقبل کی مادرملکہ کی اس کا قبول اسلام کسی صورت قبول نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس بات کا امکان ہے کہ ڈیانا پر اس حوالے سے دباؤ آیا ہو۔ اس لیے ڈیانا اس تعلق کو خفیہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ وہ جہاں بھی ملتے ملتے بہت احتیاط سے ملتے تھے اور جب وہ کہیں باہر ملتے تو ڈیانا شرعی لباس پہنتی تھی۔ وہ جس ہوئی، ریسٹوران یا کلب میں جاتے تھے وہاں ان کے قریب بیٹھے لوگوں کو بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ڈیانا ہے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو وہ اسے اپنا دہم ہی سمجھا ہو گا کہ ڈیانا ایک میڈیا شخصیت کے ساتھ نظر آئے یہ ناممکن تھا۔ وہ ناول جوڈا نظر آنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ ناول جوڈا نہیں تھے اور نہ ہی کبھی بن سکتے تھے۔ وہ دو الگ دنیاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ دنیا میں آپس میں متصادم تھیں۔ اسلام اور عیسائیت میں دشمنی کوئی دھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ صلیبی جنگیں آج بھی اہل یورپ کے ذہن و قلب میں اسی طرح تازہ ہیں جیسے آج سے ہزار سال پہلے تھیں۔ وہ وہ وقت و قفے سے اپنے تعصب کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔

ڈیانا عیسائی تھی اور شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ نہایت مقبول اور ہر دل عزیز تھی۔ چارلس سے طلاق کے باوجود عوام میں اس کی ساکھ تھی۔ اپنے سماجی کاموں کی وجہ سے اس نے عوام کے دل جیت لیے تھے۔ برطانوی عوام میں وہ برسوں سے مقبولیت کے لحاظ سے نمبر ون شخصیت چلی آ رہی تھی اور اس فہرست میں اس کا مقابلہ ملکہ اور چارلس سے بھی ہوتا تھا جو ہمیشہ اس سے پیچھے رہ جاتے تھے۔ اسکے ڈیانا کی مقبولیت سارے شاہی خاندان سے زیادہ تھی۔ اس کے باوجود اگر لوگوں کے علم میں آجاتا کہ وہ ایک پاکستانی مسلمان ڈاکٹر کی محبت میں گرفتار ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے تو یقیناً اسے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔

کیٹ اسٹائل ان دونوں کے تعلق کے بارے میں کہتی ہے۔ ”میرا خیال ہے ڈاکٹر حسنا خان ڈیانا سے ایک مرد کی

توبل انعام کے بانی الفریڈ توبل کا شمار ان مشہور میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی ناکام محبت کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ انہیں توبل انعام قائم کرنے کا خیال صرف معنف برحقا دان بت نے کرنا۔ ”بھیا رکھو“ پڑھ کر آیا تھا۔ اس ناول کے مطالعہ نے انہیں معنف کی جانب مائل کر دیا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ بہت قریب آ گئے تھے۔ یہ وہاں پہنچا کہ برحقا دان سٹ نر، توبل سے ناراض ہو گئی۔ یہ ناراضی دیر سے دیر سے بڑھتی چلی گئی۔ توبل نے شادی کا بیجا بیجا توہر تھانے حکارت سے اسے ٹھکرایا۔ یہ غم وہ دم آخر بھی بھلا نہ سکا۔

توبل انعام کا آغاز توبل کی وفات (1896ء) کے پانچ برس بعد 1901ء سے ہوا۔ مزے دار بات یہ ہے کہ 1905ء کا توبل انعام برائے امن برحقا دان سٹ نر کو ملا۔ وہ توبل انعام حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہے۔

اقتباس: عجائبات دنیا اور شہداء اقبال مرسلہ: ندیم فرحت، کراچی

طرح محبت کرتا تھا۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ لیڈی ڈیانا ہے یا مستقبل کے شاہ برطانیہ کی ماں ہے۔ حسنا کے تمام احساسات اور جذبات صرف ڈیانا کے لیے تھے کیونکہ ڈیانا اس کے لیے خود کو بدلنے کے لیے تیار تھی۔ حسنا کے والدین قدامت پرست تھے۔ ان کے خاندان میں صرف ماں باپ کی مرضی سے شادی ملے کی جاتی تھی۔ ایک طلاق شدہ، نان مسلم اور آزاد خیال عورت سے حسنا کو شادی کی اجازت دینا ناممکن نہیں تھا۔ یہ بات حسنا خان بھی جانتا تھا اور اس نے ڈیانا کو واضح لفظوں میں سمجھا بھی دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈیانا نے پاکستان کا دورہ کرنے اور حسنا خان کے گھر جانے کی ضرورت محسوس کی۔ ”حسنا خان کے ماں باپ اس بارے میں مکمل یقین رکھتے تھے کہ وہ ان کی مرضی سے شادی کرے گا۔“ شیکھر بھانی نے کہا۔ ”یہ اس کے باپ کے الفاظ ہیں، میرا بیٹا کسی سے نہیں بھی اور بھی کسی شادی نہیں کر سکتا جب تک اس میں میری اجازت شامل نہ ہو۔“

دوسرے لفظوں میں ڈاکٹر حسنا کے والدینے کہہ دیا تھا کہ اسے ڈیانا سے شادی کرنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ یہ بات قطعی الفاظ میں حسنا خان تک پہنچ گئی تھی۔ 1997ء کے آغاز میں ان دونوں کے تعلقات ایک مقام پر رکے گئے تھے۔ ڈیانا حسنا خان سے شادی کرنا

دو عہد عشق

قاریب

عشق وہ جذبہ اولین ہے جس نے حضرت انسان کو سب سے پہلے متاثر کیا اور اسی جذبہ نے انسان کو کامل بنایا۔ ابن آدم اپنی خلقت کے ساتھ ہی اس جذبہ کا اسیر بن گیا تھا۔ ہر دور میں ایسی داستانیں دہرائی جاتی رہی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ گر عشق نہ ہو تو سب کچھ بیکار ہے۔

جذبہ عشق پر دو عہد کی دو داستانیں



مغلی امیری، رنگ و نسل، زبان اور مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ شاید یہی وہ واحد فطری جذبہ ہے جو اپنی پوری شدت کے ساتھ آج بھی زندہ ہے اور جب تک انسان زندہ ہے، محبت زندہ رہے گی۔ جن کا خیال ہے کہ عشق ناکام،

پیار کرنے والے ہر دور میں ہوتے ہیں۔ چاہے وہ زمانہ قبل از مسیح کا ہو یا آج کا۔ مرد نے عورت سے اور عورت نے مرد سے محبت کی ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جس کے ساتھ زندگی موت،



ماہنامہ سرگشت

قریبی لوگ جانتے تھے کہ اس نے خود یہ تصاویر میڈیا کو بھیج دی ہیں وہ ان تصاویر کی مدد سے حنا خان کو جنس کی چاہتی تھی۔ یا پھر اسے یہ جانا چاہتی کہ اسے چاہنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

”وہ دودی سے محبت نہیں کرتی تھی۔ وہ حنا خان سے محبت کرتی تھی۔“ کیٹ اسٹیل نے کہا۔ ”وہ ٹکنٹن پینکس واپس جانا چاہتی تھی اور وہ دودی کے ساتھ فرانس میں صرف تفریح کرتی رہی تھی۔ جب وہ واپس گھر جاتی تو دودی اس کی کتاب زندگی کا ماضی کا ایک باب بن چکا ہوتا۔“

لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تصویروں والا پیغام اصل میں حنا خان کے لیے نہیں بلکہ کچھ اور لوگوں کے لیے ہو۔ یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ ڈیانا اور حنا خان کا افیئر برٹش حکومت کے علم میں آ گیا ہو اور ان کی طرف سے فیصلہ بھی کر لیا گیا ہو گا کہ یہ شادی برطانیہ کے مفاد میں نہیں ہے اور جب کوئی چیز حکومت کے مفاد میں نہیں ہوتی ہے تو اسے روکنے کے بہت سارے طریقے حکومت کے پاس ہوتے ہیں۔ پہلے ڈیانا اور ڈاکٹر حنا خان پر دباؤ ڈالا گیا ہو اور جب یہ دباؤ کارآمد ثابت نہیں ہوا تو برٹش حکومت نے اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان پر دباؤ ڈالا ہو اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہو یعنی حنا خان کے گھر والوں کی طرف سے انکار ہو گیا ہو اور یوں یہ شادی ممکن نہیں رہی۔ ڈیانا چاہتی ہو گی کہ اسے حنا خان سے کس طرح دور کیا گیا ہے اور اس کے پیچھے کیا وجوہات ہوں گی اس لیے اس نے فوراً ہی دودی سے تعلقات بڑھا لیے اور ان تصویروں کے ذریعے برٹش حکومت کو پیغام دیا کہ وہ اسے ایک مسلمان سے شادی کرنے سے روک سکتی ہے دوسرے ہاں اس کے بعد کسی تیسرے سے شادی کرنے سے نہیں روک سکتی۔ ڈیانا کا پیغام واضح تھا اور شاید اسی پیغام نے اس کی زندگی کے لمحات مختصر کر دیے۔

جو کچھ بھی ہوا تھا لیکن یہ ڈیانا کی زندگی کا آخری باب بھی ثابت ہوئے۔ حنا خان نے کبھی نہیں بتایا کہ ان کے دونوں کے درمیان کیا ہوا تھا اور وہ کیوں الگ ہونے پر مجبور ہوئے؟ لیکن جس روز ڈیانا کی تدفین کی تقریب تھی اسی تقریب میں حنا خان آخر تک شامل رہا تھا اور ایک بار سائن گلاس اس کے چہرے کے تاثرات کو چھپاتے ہوئے تھا۔ شاید وہ اپنے ناکام عشق کو بھی چھپانا چاہتا ہو۔

چاہتی تھی اور وہ اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر اسے پروپوز بھی نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے ڈیانا کی شدید خواہش کے باوجود اسے پروپوز نہیں کیا تھا اور یہیں سے ان کے تعلقات میں دراڑیں آنے لگی تھیں۔ ڈیانا اس معاملے میں اتنی آگے جا چکی تھی کہ جب اسے حنا خان کی طرف سے رد عمل نہیں ملا تو اس نے عمران خان سے رابطہ کیا۔ عمران خان نہ صرف حنا خان کا کزن تھا بلکہ وہ خود بھی برطانوی قدامت پرست دولت مند گھرانے میں شادی کر چکا تھا۔ اگرچہ بعد میں یہ تجربہ ناکام رہا اور جہانم خان نہ صرف پاکستانی معاشرے میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکی تھی بلکہ وہ اسلام پر بھی قائم نہ رہی اور دوبارہ سے لندن لوٹ گئی۔

ڈیانا چاہتی تھی کہ عمران خان اس کے لیے حنا خان سے بات کرے اور اسے راضی کرے کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ عمران خان نے اسے جواب دیا۔ ”ممکن ہے میں اس سے اس بارے میں بات کروں۔ ملک اور مذہب کے فرق کے ساتھ شادی کرنا ہمارا رواج نہیں ہے لیکن ایسی شادیاں ہوتی ہیں ممکن ہے وہ اس بارے میں اپنا نقطہ نظر رکھتا ہو۔ اگر اس نے مجھ سے اس بارے میں کوئی مشورہ مانگا تو ممکن ہے میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔“

پاکستان کے اس دورے میں ڈیانا نے کچھ وقت ڈاکٹر حنا خان کے گھر میں گزارا تھا اور اس نے کوشش کی کہ وہ اس کے والدین کو راضی کر لے کہ وہ اپنے بیٹے کو اس سے شادی کی اجازت دے دیں کیونکہ وہ ان کے بیٹے کے لیے بہترین عورت ہے۔ اس سے پہلے وہ ان کو قائل کرنے کے لیے خطوط بھی لکھتی رہی تھی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ انہیں قائل نہیں کر پا رہی ہے۔ اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی اور وہ پاکستان سے خالی ہاتھ لوٹ آئی۔ کیٹ اسٹیل نے اس بارے میں لکھا۔ ”میرا نہیں خیال کہ ڈیانا مستقبل کے بارے میں پر امید تھی۔ تقریباً یہی خیال ڈاکٹر حنا خان کا بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اس نے ڈیانا سے اب تعلق ختم کرنے کو کہا ہو لیکن مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے کہ ڈیانا معاملے کو ختم سمجھ رہی ہوگی۔“

کیٹ اسٹیل کا کہنا ہے۔ حنا خان اور ڈیانا کے تعلقات اس واقعے سے چند دن پہلے ختم ہوئے تھے۔ جب ساری دنیا میں اخبارات اور چینلوں نے ڈیانا کی وہ تصاویر شائع کی تھیں جن میں وہ دودی الفاٹو کو بوسہ دے رہی تھی۔ یہ ظاہر یہ میڈیا کا سکیڈل لگ رہا تھا لیکن ڈیانا کے



قاتل محبت ہے یعنی جذبہ محبت کی ناکامی وہ ذرا میرے ساتھ
ماضی کے سفر پر چلیں۔

یہ تہذیب تھی بے بیلون (بابل) کی۔ اب سے
ہزاروں سال پہلے کی تہذیب۔ اس دوران رونما ہونے والی
محبت کی ایک داستان آج بھی زندہ ہے اور جب جب یہ
داستان دہرائی جاتی ہے تو سننے والوں کی آنکھوں میں ان
بد نصیب محبت کرنے والوں کے لیے غمی آ جاتی ہے۔
یہ کہانی ہے بے بیلون کے ایک شہر کی۔

پختہ اور نیم پختہ مکانات سے بھرا ہوا تھا وہ شہر۔ مٹی،
گارے اور لال اینٹوں سے بنائی گئی عمارتیں یہ بتا رہی تھیں
کہ یہ لوگ معاشرت کا ہنر جانتے تھے۔
یہ اس دور کے لحاظ سے مہذب اور ترقی یافتہ لوگ
تھے۔

محبت کی طرح ایک جذبہ اور بھی زندہ تھا اور اپنی اہمیت
ثابت کر رہا تھا، وہ تھا نفرتوں کا جذبہ۔ یا طبیعتی نفرت کا
جذبہ۔

امیر غریب، خام ظنوم، کزور اور طاقت ور اس دور
میں بھی ہوا کرتے تھے۔

پیرامس (Pyramos) ایک غریب نوجوان تھا
جس کا باپ دربار سے وابستہ تھا۔ اس کی حیثیت بہت معمولی
ہی تھی اسی لیے اس کے بیٹے پیرامس کی بھی کوئی حیثیت نہیں
تھی۔ صرف ایک بات اسے دوسرے غریب نوجوانوں سے
الگ کرتی تھی اور وہ تھا اس کا بہت خوبصورت اور طاقت ور
ہونا۔

وہ ایک شاندار نوجوان تھا۔ محلے اور شہر کی لڑکیاں اسے
دیکھ کر آہیں بھرا کرتی تھیں لیکن وہ اپنی دھن میں مگن رہنے
والا نوجوان تھا۔

اس کی دلچسپی اپنے ساز سے تھی جو اس زمانے میں رائج
تھا۔ وہ اس ساز کو بجانے میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔

اس کے باوجود اس کی مالی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں
آئی تھی۔ اس کا باپ اسے سمجھایا کرتا لیکن پیرامس اپنے
روش پر قائم رہا کرتا۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں زندہ رہنے والے لوگ اپنی
نقد پر میں یہی لکھوا کر لاتے ہیں۔ انہیں چونکہ ایک مثال قائم
کرتی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کسی اور طرف دھیان نہیں
دیتے۔

پیرامس کو اپنے عشق کی لازوال مثال قائم کرنی تھی۔

اس لیے وہ اپنی ڈگر پر چتا رہا۔ محلے کی لڑکیاں اسے
اشارے کیا کریں۔ اپنی جانب راغب کرنے کی کوششیں
کرتیں لیکن پیرامس کو کسی کی پروا نہیں تھی اس کے دل میں
کسی کے لیے محبت کی آگ نہیں بجڑ سکتی تھی۔

لیکن ایک دن یہ آگ اس کے دل میں بجڑ اٹھی۔
اس لڑکی کا نام تھا کی سپ تھا۔ وہ فوج کے ایک امیر اور
طاقت ور عہدے دار کی بیٹی تھی جو پیرامس ہی کی طرح
خوبصورت اور دلکش تھی۔

ان دونوں کا ٹکراؤ ایک ایسی تقریب میں ہوا تھا جس
میں پیرامس نے ساز بجانے کا مظاہرہ کیا تھا۔ بس اسی وقت
تھا کی سب پیرامس کو دل دے بیٹھی۔

پیرامس بھی اس کے عشق میں گھائل ہو کر رہ چکا تھا۔
دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ اب پیرامس
سوائے آہیں بھرنے کے اور کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔

دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور دونوں عشق کی آہیں
کو پہنچ گئے۔ ایک دوسرے کے بغیر سکون نہیں تھا۔ پورے
شہر میں ان دونوں کی محبت کی داستانیں زبان زد عام ہو گئی
تھیں۔

یہ خبر تھا کی سب کے باپ کو بھی پہنچ گئی۔ اس نے ایک
ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی
بیٹی کا نام کسی عام آدمی کے ساتھ لیا جائے۔

اس نے تو اپنی بیٹی کے لیے بہت اونچے خواب دیکھ
رکھے تھے۔ اس نے تھا کی سب پر پابندی لگا دی کہ وہ گھر
سے باہر نہیں جایا کرے گی۔

تھا کی سب نے ایک بار پیرامس کو اپنی کسی کینز کے
ذریعے پیغام بھجوایا ”میرے محبوب! میری زندگی اور موت
صرف تمہارے لیے ہے۔ یہ بات یاد رکھنا۔ اگر میں زندہ
رہوں تو تمہارے لیے۔ اگر موت آئی تو تمہارے لیے آئے
گی۔“

پیرامس اس کے عشق میں باگل ہو کر رہ گیا تھا۔
اس نے تھا کی سب سے ملنے کی بہت کوشش کی لیکن
اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ تھا کی سب
باپ نے پہرے لگا رکھے تھے۔ بالآخر وہی کینز دونوں کے
کام آئی۔

تھا کی سب نے اسی کی معرفت پیرامس کو یہ پیغام بھجوایا
”میرے محبوب! اب تمہاری جدائی برداشت نہیں ہوئی۔
میں اپنی زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں اس لیے“

میں نے اپنا گھر اور اپنا خاندان سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم کل دوپہر وادی میں پہنچ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ پھر ہم دونوں کسی اور طرف نکل جائیں گے، کسی اور طرف جہاں یہ اونچ نیچ کا کوئی تصور نہ ہو۔ جہاں ہمیں کوئی جاننے والا نہ ہو۔ جہاں ہم زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں۔“

پیرا اس نے اس کنیز سے کہا ”میری محبوبہ سے کہہ دو کہ وہ کل دوپہر ٹیلے والے میدان میں آ جائے۔ میں وہاں اس کا انتظار کروں گا۔ پھر ہم کسی مہربان سرزمین کی طرف نکل جائیں گے۔“

وفادار کنیز نے پیرا اس کا یہ پیغام تھا کی سب کو پہنچاتے ہوئے اپنی خواہش کا بھی اظہار کر دیا ”شہزادی، میں تم کو اکیلا تو نہیں جانے دوں گی بلکہ تمہارے ساتھ چلوں گی جس طرح آج تک سایہ بن کر تمہارے ساتھ رہی ہوں، اسی طرح آئندہ بھی رہنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن میرے راستے تو بہت دشوار ہیں۔ ہماری کوئی منزل نہیں ہے۔ ہمارے چاروں طرف دشمن ہیں۔ ہمارے پاس زندگی گزارنے کے وسائل نہیں ہوں گے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا شہزادی! جو حال تمہارا ہوگا، وہی میرا بھی ہوگا۔ دیوتا ہماری حفاظت کریں گے کیونکہ ہم محبت کے لیے گھر سے جا رہے ہیں۔ اپنا شہر چھوڑ رہے ہیں۔“

تھائی سب خاموش ہو گئی۔ کنیز کی وفاداری اسے اچھی لگی تھی۔

دوسری دوپہر وہ دونوں گھر سے نکل گئیں۔ گھر والوں نے کسی شک کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ تھائی سب اپنی اسی کنیز کے ساتھ باہر جایا کرتی تھی۔

تھائی سب نے بُرے وقتوں کے لیے اپنے ساتھ سونے کے کچھ کئے بھی رکھ لیے تھے۔

ٹیلے والا میدان بہت فاصلے پر تھا۔ شہری حدود سے آگے نکل کر اس میدان کے ارد گرد پہاڑیاں تھیں اور پہاڑیوں کے عقب میں دور تک پھیلا ہوا جنگل۔

اسی جنگل کے درمیان ایک کپڑا سہ بنا ہوا تھا۔ جو لہراتا ہوا دور، بہت دور نکل جاتا تھا۔ شاید پیرا اس نے اسی راستے پر سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی لیے اس نے تھائی سب کو ٹیلے والے میدان میں بلا لیا تھا۔

دونوں وقت مقررہ پر میدان میں مہیب ٹیلے کے پاس

پہنچ گئیں۔ پیرا اس ابھی نہیں آیا تھا۔ دونوں خاموش تھیں۔ شاید آتے والے دنوں کے اندیشوں نے ان کی زبانیں بند کر دی تھیں۔

پھر چاک ایک آواز سنائی دی۔

یہ آواز پیرا اس کی یا کسی انسان کی نہیں تھی، بلکہ ایک شیر کی تھی جو ٹیلے کے آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ اس کی دہانے پورے میدان کو لرزادیا تھا۔ پرندے پرواز کرنے لگے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ شیر کی پہاڑی سے کود کر ان کے سامنے آ گیا۔ اس کے نوکیلے، خونخوار دانت دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ انہی کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس انداز سے جیسے ان کی بے بسی اور خوف کا لطف اٹھا رہا ہو۔

کنیز کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ چیخ کر ایک طرف بھاگ نکلی۔ شیر نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ تھائی سب کی طرف بڑھتا رہا۔

تھائی سب بھی اب اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکی، اس نے بھی بے تحاشا دوڑ لگادی۔ وہ اونچے نیچے پتھروں کے درمیان بھاگ رہی تھی۔

اس بھاگ دوڑ میں اس کی مثال اس کے شاتوں سے پھسل کر نیچے جا گری۔ شیر اس مثال کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے وہ مثال اپنے دانتوں میں اٹھائی تھی، اس کو ٹوچنے لگا۔

اس دوران کنیز اور تھائی سب دونوں کو اتنا موقع مل گیا تھا کہ دونوں الگ الگ مقام پر جا کر چھپ گئیں۔ شیر ابھی مثال ہی سے اُلجھا ہوا تھا کہ پیرا اس بھی وہاں آ گیا۔ اس نے شیر کو مثال سے اُلجھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ تھائی سب بھی آس پاس دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ ظالم شیر نے اس کی جگہ بے جا مار ڈالا ہے۔

پیرا اس کے لیے اب زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کی زندگی اپنی محبوبہ کے بغیر بے کار تھی۔ اس نے اپنی تلوار نکالی اور پوری قوت سے اپنے پیٹ میں آٹا رلی۔

خوف زدہ کنیز کچھ فاصلے سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ وہ کہنے کی سی کیفیت میں تھی۔ شیر نہ جانے کیوں واپس چلا گیا تھا۔ اس نے دم توڑتے ہوئے پیرا اس پر بھی توجہ نہیں دی تھی۔

شیر کے جانے کے کچھ دیر بعد تھائی سب اس جگہ سے

باہر نکلی جہاں اس نے خود کو چھپایا ہوا تھا۔ اپنے محبوب کی لاش دیکھ کر اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔

اس نے پیرا اس کی گری ہوئی تلوار اٹھائی اور اپنے سینے میں آٹا رلی۔ دونوں محبت کرنے والوں کی لاشیں ایک دوسرے کے قریب پڑی ہوئی تھیں۔

بے بیلون والوں کو یہ چشم دید کہانی اسی کنیز نے سنائی تھی۔ اس کے بعد صدیوں تک یہ الم ناک کہانی محبت کی یادگار کے طور پر ایک دوسرے کو سنائی جاتی رہی۔

اب اس کے بعد کے دور کی ایک داستان تھی۔ یہ داستان پیرا اس کی موت کے ہزار سال بعد کی داستان ہے مگر مکمل طور پر ناکام عشق نہیں ہے۔ ہاں، جزوی ناکام کہہ سکتے ہیں۔

(مرسلہ: عدنان فاروقی، لید)

انتھونی اور قلو پطرہ

محبت کی وہ داستان جو نہ جانے کتنے افسانوں، ڈراموں اور فلموں کا موضوع بن چکی ہے، ان کی کہانی عالمی تاریخ کا ایک بہت اہم حصہ بن گئی ہے۔

انتھونی اور قلو پطرہ کے ساتھ اس داستان کا ایک اور اہم کردار جو لیس سیز بھی ہے۔ اس بہادر شخص کو 44 بی سی میں دھوکے سے قتل کر دیا گیا تھا۔

جولیس کی موت کے بعد مارک انتھونی نے روم پر حکومت کی۔ انتھونی ایک رومن جنرل تھا۔ جولیس کی موت کے بعد انتھونی روم کا بادشاہ بن گیا لیکن اس کے ساتھ دو بادشاہ اور بھی شراکت میں تھے۔ اوکٹاویوس سیزر اور لیپائی ڈس۔

ان تینوں کے حصے میں روم کے تین مختلف علاقے تھے جن پر یہ حکومت کیا کرتے، روم کی شان و شوکت دیکھنے کے قابل تھی۔

اس کے سپاہیوں اور جنرلوں کی بہادریوں کی داستانیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے کھلات، ان کے فوجی ساز و سامان، ان کی دولت، سلطنت روم ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

محبت کی اس داستان کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ انتھونی ملک کے مشرقی علاقے کا حاکم تھا۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ شان و شوکت، دولت اور طاقت لیکن ابھی تک اس کی زندگی میں وہ گھر نہیں آیا تھا جو محبت کا گھر ہوتا

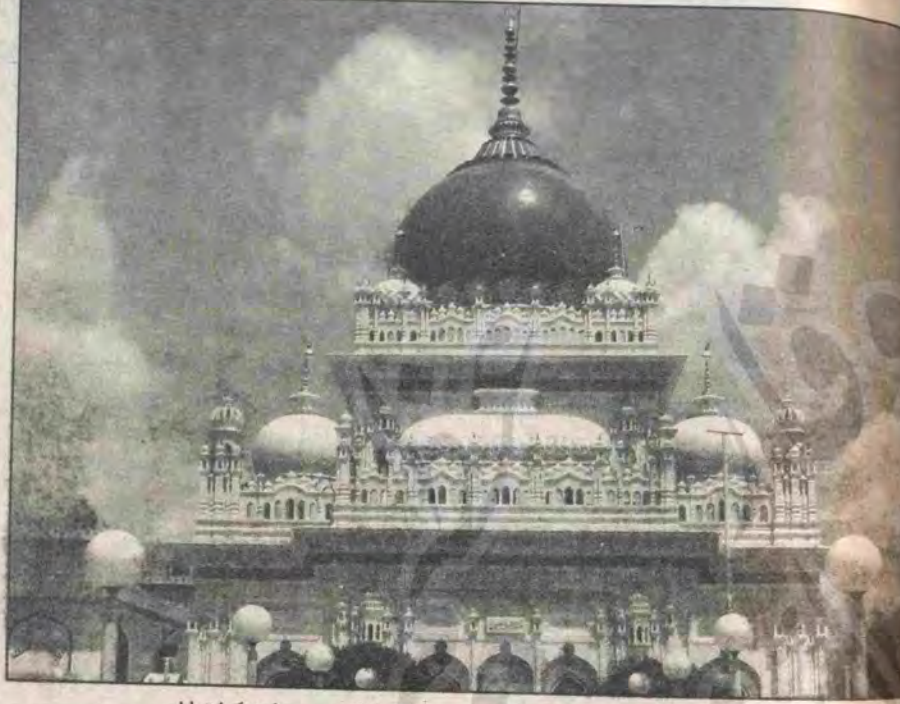
عشق کی ماری نوشہر ادیاں

یونانی دیو مالا میں نوشہر ادیوں کو بے انتہا اہمیت حاصل ہے جو عشق میں ناکام رہی تھیں۔ انہیں میوزس The muses کے اجتماعی خطاب سے یاد آ جاتا ہے۔ یہ نوشہر ادیاں ریوس اور نیوین کی بیٹیاں تھیں۔ جو ایک ہی دیوتا کا ڈس (Chaos) سے محبت کرتی تھیں۔ جبکہ ان کے دوستوں میں ہورا، ڈایوناس، اپالو، ایفر و ڈائنٹ، ہارمونیا اور ریوسی روس شامل تھے۔ ایک کہانی کے مطابق مقدونیہ کی ریاست ایماتیا کے بادشاہ اور اس کی بیوی یونی کی نو بیٹیاں تھیں جن کے نام میوزس کے نام پر رکھے گئے تھے۔ ان لڑکیوں نے شہزادیوں کے پسندیدہ مردوں سے عشق کیا چنانچہ میوزس نے انہیں مختلف برندوں میں تبدیل کر کے ان کے نام کولمبس، بے کس، سنجریس، کیسا، بکوس، اگلا تھس، نیسا، پیٹو اور ڈرے کوئس رکھ دیے۔

دی میوزس میں شامل نوشہر ادیوں میں سے کیلی اوپ رزمیہ شاعری، کیلیو، تاریخ نگاری، اریٹو، عشقیہ شاعری، تھالیا، مزاح اور طرب، میلپوین، المیہ، ٹریسیکور (Trepscicor) فنی رقص، ایٹپ، غنائیہ شاعری۔ پولی مینیا، گیتوں اور یورانی، علم فلکیات کی دیوی ہے۔ ان تمام اصناف کا تعلق جذبات سے ہے اسی لیے ان ٹوٹے ہوئے دلوں کی شہزادیوں کو زیوس نے فن کی دیویوں کا درجہ دیا ہے۔

انتھونی: یونان، حیرت بھرے قصوں کی سرزمین

مرسلہ: ایاز راہی ہاسمہ



عشق ہی انسان کی معراج ہے۔ اس نے بھی ایک لڑکی سے عشق کیا تھا اور یہ عشق اسے رسوا کر رہا تھا۔ اس کی دلی کیفیت کو صرف ایک شخص محسوس کر رہا تھا۔ وہ تھے پیرکامل حضرت حاجی وارث علی، دیوہ شریف۔ آپ ہی کی نظر کرم تھی کہ وہ کیا سے کیا بن گیا۔

عشق حقیقی

ذہین مہدی

عشق مجازی نا کام مٹھرا مگر عشق حقیقی نصیب ہوا اور وہ فیض عام کا منبع بن گیا

سب سے چھوٹے جزو اہم میں بھی ذرات کشش کے ایک نظام کے تحت آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔ کشش کی یہ عجیب و غریب قوت دراصل خالق کائنات کی ایک صفت ہے جو تمام مخلوقات کے اندر کار فرما ہے۔ یہ قوت بندے اور خالق کے درمیان ایک ربط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں پر جب یہ قوت رونما ہوتی ہے تو ان کا شعور عالم اقدس کی طرف صعود کر کے اللہ تعالیٰ کی صفات کا مشاہدہ کرتا ہے۔

کارخانہ قدرت میں کشش اور گریز کا ایک عجیب کرشمہ برسر عمل ہے۔ کسی بھی حرکت کی گہرائی میں جائے تو کشش کی قوت یا گریز کا عمل کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جسے گریز کہتے ہیں وہ بھی کشش کے ساتھ پیوستہ ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات کے اندر کام کرنے والے تمام معاملات کشش کی آن دیکھی قوت پر قائم ہیں۔ ہر نوع کا زرمادہ کی جانب ایک نامعلوم طاقت کے زیر اثر کھینچ چلا جاتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مادے کے



دینے کے سیزر کی بہن کو روم واپس بھیج دیا اور خود قلوپٹرہ کے پاس چلا گیا۔ سیزر کو یہ بات بہت گراں گزری۔ اس نے یہ ایک وقت انتھونی اور قلوپٹرہ کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

بحری جنگوں کی تاریخ میں اس جنگ کی بہت اہمیت رہی ہے۔ انتھونی نے یہ جنگ سمندر میں لڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن سیزر کی بحری طاقت بہت زیادہ تھی۔ اس نے انتھونی اور قلوپٹرہ کی بحری فوج کو شکست دے دی۔

قلوپٹرہ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے لیے ایک مقبرہ بنوا رکھا تھا۔ وہ اپنی شکست سے دلبرداشتہ ہو کر اپنے مقبرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے انتھونی کو اپنی موت کی خبر پہنچادی۔

انتھونی کو جب اس کی موت کی اطلاع ملی تو اس نے خودکشی کے ارادے سے اپنے آپ کو بڑی طرح زخمی کر لیا۔ لیکن ابھی اس کی تھوڑی سی زندگی باقی تھی۔ اس کے ساتھی اسے اٹھا کر قلوپٹرہ کے مقبرے پر لے گئے جہاں وہ قلوپٹرہ کو زندہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

لیکن اب اس کے لیے زندگی کی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ تاریخ کے ایک بہت بڑے جرنیل نے قلوپٹرہ کے بازوؤں میں دم توڑ دیا۔

قلوپٹرہ بہت بڑی طرح بکھر کر رہ گئی۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کا محبوب انتھونی مر چکا تھا اور وہ خود سیزر کے رحم و کرم پر تھی۔

اس نے بھی بالآخر اپنی موت کا فیصلہ کر لیا۔ اپنی موت کے لیے اس نے زہریلے سانپوں کا انتخاب کیا تھا۔ یہ زہریلے سانپ اسے ڈستے رہے اور وہ لمحہ بہ لمحہ موت کی آغوش میں گم ہوتی چلی گئی۔

سیزر اس کی موت کے فوراً بعد اس کے پاس پہنچا تھا لیکن اب دنیا کی ایک خوبصورت ترین عورت لاش کی صورت میں اس کے سامنے پڑی تھی۔

اس نے حکم دیا کہ قلوپٹرہ کو کبھی اس کے محبوب انتھونی کے پہلو میں دفن کر دیا جائے اور اس طرح قلوپٹرہ اور انتھونی کی کہانی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

(مرسلہ: دروانہ احمر علی، لاڈکانہ)



ہے۔ اس کی زندگی میں سب سے بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب اس نے قلوپٹرہ کو دیکھا، مصر کی وہ ملکہ جس کے حسن کی مثالیں آج بھی دی جاتی ہیں۔ وہ انتہائی شان و شوکت والی عورت تھی۔ انتہائی رومانیک، اس کی ذات سے نہ جانے کتنی داستانیں وابستہ ہیں۔

ایک داستان یہ بھی ہے کہ وہ ہر رات ایک غلام کو اپنی خواب گاہ میں مدعو کرتی اور دوسری صبح اس غلام کو مار دیا جاتا تھا۔

کہا نہیں جاسکتا کہ اس داستان میں کتنی حقیقت ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ ایک رومان پسند عورت تھی۔ انتھونی اس کی زلفوں کا اتنا اسیر ہوا کہ اس نے اسکندریہ میں رہائش اختیار کر لی اور قلوپٹرہ کی زلفوں کی چھاؤں میں اس کے شب و روز گزرنے لگے۔

اُدھر روم کی صورت حال یہ ہوئی کہ یکس ٹس پاچی نے سلطنت روم سے جنگ کا اعلان کر دیا۔ یکس ٹس پاچی، پاچی سینٹر کا بیٹا تھا جس کو جولیس سیزر نے شکست دی تھی۔ اب وہ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے روم والوں سے اُلجھنا چاہ رہا تھا۔

انتھونی کی ضرورت اس کے وطن کو تھی، لہذا انتھونی اسی جنگ کے لیے اپنے وطن واپس چلا گیا۔ یہاں بھی بہت افراتفری تھی۔ روم کے ایک حصے کے حاکم Octavianus کی طرف سے انتھونی کو اندیشے لاحق ہو گئے تھے کہ وہ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے گا۔

اسے کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کرنی تھی کہ اس کی اور اوکٹاویوس سیزر کی طاقت ایک ہو جائے اور دونوں مل کر دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔

اسی دوران انتھونی کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس نے یہ موقع فتنیت جانا اور حکمت عملی کے طور پر اوکٹاویوس سیزر کی بہن سے شادی کر لی۔

یہ خبر جب قلوپٹرہ کو ملی کہ اس کے محبوب انتھونی نے اوکٹاویوس سیزر کی بہن سے شادی کر لی ہے تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ انتھونی صرف قلوپٹرہ ہی سے محبت کرتا ہے اور اوکٹاویوس کی بہن سے اس نے حکمت عملی کے تحت شادی کی ہے۔

انتھونی یونان چلا گیا۔ اسی دوران اوکٹاویوس اور پاچی کے درمیان جنگ کی ابتدا ہو گئی۔ انتھونی نے بجائے ساتھ

خاص خدا کی نظر میں کشش کے تمام کشتے مجاز ہیں۔ مجاز میں ردو بدل ہوتا رہتا ہے۔ مجاز فنا ہے لیکن مجاز جس حقیقت پر قائم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو لافانی ہے اور اسی صفت سے تمام مجازی کشتے متحرک رہتے ہیں، عشق حقیقی اس خدا کی صفت کا دیوانہ ہوتا ہے اور اس کی نظر مجاز سے ہٹ کر حقیقت پر ہوتی ہے۔

انسانی زندگی خیالات پر رواں دواں ہے۔ زندگی کی تمام حرکات خیالات سے شروع ہوتی ہیں جس نقطے پر خیال مرکوز ہو جاتا ہے وہ مظہر بن جاتا ہے اولیاء اللہ ظلم خیال کے ماہر ہوتے ہیں۔ انہیں خیالات کو پڑھنے، خیالات کو مٹھل کرنے اور خیالات کو تبدیل کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل ہوتا ہے۔ اہل اللہ جب اپنے شاگردوں کی روحانی تربیت فرماتے ہیں تو انسانی طبیعت اور بشری خصائل ان کے سامنے ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شاگرد کو جو شوق مجازی میں اٹھنا کو پہنچ جاتا ہے اس طرح کشش حقیقی کا مشاہدہ کراتے ہیں کہ عشق مجازی عشق حقیقی میں بدل جاتا ہے۔

اس ضمن میں ہم جس واقعے کو بیان کرنے جا رہے ہیں اس کی بائیں مغز وحیثیت رکھتی ہیں۔ یہ واقعہ بھاری صوبہ یوپی کے شہر بارہ بنکی کا ہے جو لکھنؤ کے قریب ہے۔ وہاں ایک بہت بڑے اللہ والے رہتے تھے جن کا نام حاجی وارث علی شاہ ہے۔ ان کے ایک شاگرد سے اس واقعہ کا تعلق ہے۔ جس کے عشقِ ناکام نے اسے معراج دے دی۔ حاجی وارث علی اولیاء اللہ میں بڑے صاحبِ حال و مقام بزرگ گزرے ہیں۔ شروع ہی سے ان کی طبیعت میں استغناء و توکل غالب تھا۔ دس برس کی عمر میں سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی اور اپنے پیر و مرشد کے حکم پر مختلف ممالک کی سیر کی۔ بہت سے بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے اوپر نسبت عشق کا غلبہ رہتا تھا۔ حج پر تشریف لے گئے تو احرام پہننے کے بعد کوئی اور کپڑا انہیں پہنا۔ ہمیشہ احرام زیب تن رکھتے تھے۔ لوگ بطور خدمت آپ کو احرام پیش کرتے تھے اور آپ کے نام کے ساتھ حاجی کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ آپ کا قیام زیادہ تر یوپی کے شہر دیوہ ضلع بارہ بنکی میں رہتا تھا۔ 1904ء میں وصال فرمایا۔ آپ سے تعلق رکھنے والے لوگ واری کہلاتے ہیں۔

یہ انہی کے ہاں کا اٹھارہ سواٹھانوے کا قصبہ ہے۔ حاجی وارث علی مریدوں کے جھگڑے میں پیشے تھے۔ پند و نصائح کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک خوش پوش شخص نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ اس کی آواز نہایت بھاری تھی۔ گو کہ اس

نے اپنی آواز کو ہلکا بنانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ اس کی کراخت آواز نے ہر ایک کو مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دروازے کے درمیان کھڑا اذان کا منتظر تھا کیونکہ حاجی صاحب اُٹھ رہے دیکھ رہے تھے لیکن ان کی نظر پر اس پر مرکوز نہ تھیں۔ اس کے پیچھے کھڑے نو جوان رنگی ہوئی تھیں۔ وہ اس نو جوان کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار کسی کو دیکھا ہو۔ ان کی تیز نظروں کا کمال تھا کہ وہ نو جوان خود میں سنسنے لگا تھا۔ اسے شرماتے دیکھ کر حاجی وارث علی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے پھر ایک غمرہ مستانہ بلنڈ کیا اور دونوں بائیں کھول کر بولے ”عاشق آ یا ہے، عاشق..... آ میرے گئے لگ جا۔“

مریدوں نے پہلی بار ایسا انداز، لہجہ میں ایسی مٹھاس دیکھی تھی۔ وہ سب حیرت بھری نظروں سے نو جوان کو دیکھ رہے تھے۔

اس نو جوان کا نام عبدالکریم تھا اور وہ لکھنؤ کے کسی مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ عمر ہوگی بیسی کوئی 14-15 سال۔ لوگ اسے حافظ عبدالکریم کہتے تھے۔

حافظ عبدالکریم نے بیعت کی درخواست کی جسے حاجی صاحب نے فوراً قبول کر لیا۔

دیوہ میں حافظ کے رشتے کے چچا رہتے تھے۔ وہ انہی کے یہاں رہنے لگا۔ اس گھر میں اس کا دل لگ گیا تھا۔ وہ دن بھر ہنسی خصلوں کرتا رہتا۔ اس کی اس عادت نے سب کو اس کا گردیدہ بنادیا تھا۔ حافظ عبدالکریم کی چچی نے ایک روز اس سے کہا، بچیاں بڑی ہو گئی ہیں اور باہر کے کسی شخص سے قرآن شریف پڑھوانا مناسب نہیں ہے۔ تم گھر کے لڑکے ہو، انہیں قرآن شریف پڑھا دیا کرو۔ چچا کی لڑکیوں میں ایک لڑکی تیرا سپارہ پڑھتی تھی اور اسے سب پیاری کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ حافظ کی بے شعوری کا زمانہ تھا۔ لیکن اسے اس کام میں ایک خاص لطف آتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ پیاری قرآن شریف پڑھتی رہے اور وہ ممتاز رہے۔

حافظ عبدالکریم نے کچھ عرصہ یہاں قیام کیا اور پھر اپنے موضع بڑا گاؤں چلا گیا۔ کیونکہ بہن کی شادی طے ہو گئی تھی اور سب اعزاء اقارب جمع ہو رہے تھے۔ چچا صاحب بھی مع اہل خانہ تشریف لائے۔ تقریب کے خاتمے پر سب اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ چچی صاحبہ بھی تیاری کرنے لگیں۔ حافظ کے والدین نے انہیں روک لیا کہ چند دن بعد چلی جانا۔ چچی صاحبہ نے کہا کہ میرا رکنا تو ممکن نہیں ہے۔ لیکن لڑکیوں کو اس شرط پر چھوڑ سکتی ہوں کہ حافظ عبدالکریم قرآن شریف

پڑھا کریں۔ حافظ کی والدہ نے فوراً کہا، وہ تمہارا بی لڑکا ہے بس وہ چشمِ کلام پاک پڑھائے گا۔

حافظ نے نہایت جافشانی سے کلام مجید پڑھنا شروع کیا اور بہت جلد چشم بھی کرا دیا۔ لیکن حافظ عبدالکریم کی وائٹلی میں کمی نہ آئی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر وقت پیاری کی صورت اس کے سامنے رہے اور وہ قرآن شریف پڑھاتا رہے۔

حافظ اور پیاری کے درمیان پہلے یہ بات طے ہو چکی تھی کہ قرآن مجید ختم ہونے کا تذکرہ اپنی والدہ سے نہ کرے بلکہ یہ کہے کہ انہی کچھ پارے باقی ہیں۔ پیاری نے یہ بات اپنی والدہ کو بتائی تو انہوں نے حافظ سے بات کی۔ حافظ نے کہا، ”آپ فگر ہی نہ کریں، میں روز آکر پڑھا دیا کروں گا۔“ چچی نے حیرانی سے کہا، اپنے گاؤں سے یہاں اتنی دور آ کر تم کیسے پڑھاؤ گے۔ لوگ کیا کہیں گے؟

حافظ نے جواب دیا، مجھے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ اور لوگوں سے کیا مطلب۔ خدا تعالیٰ تو دلوں اور نیوٹوں کا دیکھنے والا ہے۔

حافظ عبدالکریم روزانہ بعد نماز مغرب اپنے گھر سے چلتا اور توبہ تک دیوہ شریف پہنچ جاتا۔ پھر قرآن مجید پڑھاتا۔ جب رات کچھ باقی رہتی تو وہاں سے اپنے گھر کی طرف چل پڑتا اور نماز فجر گھر پر آدا کرتا۔ دو دو سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا ایسی باتیں کب سمجھتی ہیں، دیوہ شریف کے لوگوں میں... چیمپوگیاں ہونے لگیں۔ پیاری کے والد عبدالرؤف ریاست جہانگیر آباد میں ملازم تھے۔ یہ بات ان تک پہنچی تو وہ وہاں سے گھر آئے اور سخت تاکید کی کہ حافظ عبدالکریم ہمارے گھر میں نہ آئے۔ اس رات جب حافظ قرآن پڑھانے پہنچا تو اسے منع کر دیا گیا۔ یہ بات پیاری کو بھی ناگوار لگی، وہ کتاب دینے کے بہانے دروازے پر آئی اور چپکے سے کہا، سب کا خیال ہے کہ اس مکان کے بالا خانے پر جن رہتے ہیں۔ اگر تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو تو رات کو جن کا تکبیر بدل کر آجایا کرو۔ لیکن کی کو خبر ہو گئی تو جان پر آئے گی۔ حافظ نے کہا، لوگوں کی پروا نہیں۔ میں دو تین دنوں میں انتظام کر کے آتا ہوں۔

حافظ عبدالکریم نہایت پریشانی کے ساتھ دل پر بوجھ لیے واپس ہوا۔ وہ دل ہی دل میں پیاری کی فہانت کی داد دیتا رہا تھا جس نے یہ ترکیب سوچ کر ملاقات کی راہ بھائی تھی۔ اس دن دل میں ٹھان لی کہ وہ ضرور جن بن کر جائے گا خواہ اصل جنات اسے ماری کیوں نہ ڈالیں۔ حافظ عبدالکریم چپکے سے لکھنؤ پہنچا اور مختلف قسم کے عطر،

اگر بتی، شہرینی، گولے، گولے اور دیلا سلیاں خریدیں۔ وہ ہاتھ لمبی موٹی موٹی سات آٹھ سلاسل لوہے کی بنوائیں جس کے ذریعے بالا خانے پر چڑھ سکے۔ رات کے وقت وہ تمام سامان لے کر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بالا خانے پر چڑھا۔ بالا خانے پر کسی جگہ اگر بتی سلگائی، کسی جگہ لوہاں جلا یا اور نہیں عطر و گلاب پھڑکا۔ پورا بالا خانہ خوشبوئیت سے مہک اٹھا۔ اچانک حافظ کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر وہ زینے کے راستے نیچے اترے گا تو جن بننے کے ڈرامے میں اصلیت کا رنگ نہیں آئے گا۔ چنانچہ وہ کھٹے پر سے ٹھن میں کود گیا۔ آواز سننے ہی گھر والوں کی آنکھ کھل گئی۔ خواتین حواس باختہ ہو کر چیخنے لگیں۔ پیاری کی والدہ نے خوف سے چراغ گل کر دیا۔ حافظ نے دالان میں پہنچ کر کہا۔ تم روز کہتی تھی کہ جن کی صورت نہیں دیکھی۔ چراغ جلاؤ اور ہماری شکل دیکھو۔“

پیاری کی والدہ نے کانپتے ہوئے کہا۔ ”خدا! رحم کیجئے ہم آپ کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔“

حافظ نے آواز بدل کر تیز لہجے میں کہا۔ ”ہمارے آنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تمہاری لڑکی قرآن پاک پڑھتی تھی تو ہم بھی سنا کرتے تھے۔ تین دن سے وہ لڑکا حافظ نہیں آ رہا اور ہمیں تلاوت قرآن سننے کو نہیں مل رہی۔“

پیاری کی والدہ نے ہمت کر کے جواب دیا حافظ کو ہم نے اپنی بدنامی کی وجہ سے منع کر دیا ہے اگر آپ قرآن شریف سننا چاہتے ہیں تو جس وقت آپ حکم کریں لڑکی اسی وقت تلاوت کر دیا کرے گی۔

حافظ نے جن کی آواز میں کہا، ہمیں قرآن شریف سننے سے مطلب ہے حافظ کے آنے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ ہم روزانہ رات کو آئیں گے اور تلاوت سنیں گے۔

حافظ روزانہ رات کو بالا خانے پر چڑھ کر خوشبو جلاتا اور پھر نیچے کود پڑتا تھا۔ قرآن شریف سننے کے بعد زینے کے راستے بالا خانے پر چڑھ کر واپس چلا جاتا تھا۔

پیاری کے گھر جن آتا ہے اس کی شہرت تمام بستی میں پھیل گئی۔ کسی نے حاجی وارث علی کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ”ہاں ہاں پڑھا لکھا جن ہے، پڑھا لکھا جن ہے۔“

ان الفاظ سے سب نے یہی مطلب اخذ کیا کہ کوئی عالم فاضل جن ہے۔ اصل بات کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ ایک روز حافظ عبدالکریم نے تلاوت قرآن شریف کے بعد پیاری سے کہا۔ ”میں چند روز کے لئے لکھنؤ جا رہا ہوں

تاکہ جن بنے کا سامان لاؤں اگر تمہیں کچھ دنگا نہ ہو تو بتاؤ۔“

بیاری نے عقیق الجحر کی بیخ کی فرمائش کی۔ حافظ کا خیال تھا کہ سب گھر والے سو رہے ہیں لیکن بیاری کی والدہ جاگ رہی تھیں اور انہوں نے یہ گفتگو سن لی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ بالا خانے کے جنات کو حافظ عبدالکریم نے غمگینوں کے ذریعے قابو کیا ہوا ہے اور ان کی مدد سے روزانہ یہاں بیاری سے ملنے آجاتا ہے۔ انہوں نے یہ بات اپنے تکبہ و دوسری اور حافظ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ حافظ اب تک جن کی شکل میں بیاری کے گھر جاتا رہا۔ پھر تین ماہ بعد وہ مہمان بن کر چچا کے گھر پہنچا تو خلاف معمول بیاری کی والدہ نے اسے حافظ کے سامنے آنے سے منع کر دیا۔

حافظ کچھ دیر تک پریشان بیٹھا رہا لیکن بیاری سامنے نہیں آئی۔ پھر نہ جانے اسے کیا سوچیں گی کہ اچانک وہ کمرے سے نکل کر حافظ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

اس کی بڑی بہن نے کہا: ”تم کیوں باہر آئیں۔ اماں جان نے باہر آنے سے منع کیا تھا۔“

بیاری نے کہا: ”اماں جان کی بات خلاف عقل ہے۔ حافظ عبدالکریم رشتے دار ہیں اور مجھے قرآن شریف پڑھا رہا ہے۔ اگر اب ان سے پردہ کروں گی تو اس میں میری بدنامی ہے۔ لوگ پوچھیں گے کہ اچانک پردہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟“

بیاری کی یہ منطقی من کر تمام خواتین دم بخود رہ گئیں۔ یہ صورتحال دیکھ کر حافظ کی طبیعت میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور وہ اٹھ کر جانے لگا۔

بیاری کی والدہ نے بہت روکا لیکن حافظ نہیں رکا۔ تمام راستے اس واقعے کا خیال اسے پریشان کرتا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب جن کی شکل میں آکر ان لوگوں کی اچھی طرح خبر لے گا۔ راستے میں بے اختیار ہو کر واپس بیاری کے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ حافظ کے جانے کے بعد بیاری کی والدہ نے اس کی خوب پٹائی کی ہے۔ یہ سن کر وہ مزید بدحواس ہو گیا۔

مضروبے کے مطابق حافظ اسی رات بالا خانے پر چڑھ کر صحن میں کودا۔ اس نے گزشتہ دن اہل خانہ سے جن کی آواز میں کہہ دیا تھا کہ چند روز کے لئے ہم اجیر شریف جارہے ہیں۔ اس لیے کہ وہ مہمان بن کر اگلے روز بیچا کے گھر جانا چاہتا تھا۔ اہل خانہ اس خلاف اطلاع جن کی آمد پر حیران ہوئے۔ حافظ نے جن کی آواز میں قصے کا تاثر پیدا کیا اور کہا ”تم نے لڑکی کا پردہ حافظ سے کیوں کرایا اور حافظ کے جانے کے بعد اس کو کیوں مارا؟ ہمیں اس واقعے کی خبر ہو گئی ہے اس لئے ہم

اجیر شریف سے فوراً واپس آئے ہیں۔ یہ بات جان لو کہ ہم حافظ کے قبضے میں ہیں اور جو کچھ وہ حکم دے گا ہم اس کو بجا لائیں گے۔ میں تمہاری اس حرکت سے بہت رنج ہوا ہے۔ اب حافظ تمہارے گھر نہیں آئے گا۔“

سارے گھر والوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ طرح طرح سے خوشامد کرنے لگے تاکہ خطا بخش دی جائے لیکن حافظ (بشکل جن) نہ مانا۔ اگلے دن حافظ عبدالکریم مہمان بن کر بیاری کے مکان کے برابر میں ایک اور عزیز کے ہاں ٹھہرا۔ بیاری کی والدہ کو جب معلوم ہوا کہ حافظ آیا ہے اور کسی دوسرے عزیز کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے تو جنتا کے ڈر سے انہیں بہت پریشانی ہوئی۔ کئی باخادماؤں کو بھیجا کہ حافظ کو بلا لیں لیکن حافظ نے آنے سے انکار کر دیا۔ رمضان کا مہینا تھا چنانچہ جب افطار کا وقت ہوا تو انہوں نے افطار بھی بھیجا۔ حافظ نے اسی افطاری سے روزہ کھولا صرف اس خیال سے کہ افطاری کی تیاری میں بیاری کے ہاتھ لگے ہوں گے پھر اس افطاری میں کھیں اور سے آئی ہوئی افطاری ملا کر چچی صاحبہ کے گھر واپس کر دی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ حافظ نے ان کے گھر کی افطاری نہیں کھائی تو ناراضی دور کرنے کے لیے رات کو خود کھیں اور زبردستی اسے ساتھ لے کر آئیں۔ کھانے کے لیے بٹھایا اور بیاری سے کہا کہ وہ حافظ کے لیے کھانا لائے۔

حافظ عبدالکریم نے بیاری کے خیال میں کھانا شروع کیا تھا کہ اچانک چچی صاحبہ کی حالت پاگلوں جیسی ہو گئی۔ وہ سب گھر والوں کو مارنے لگیں لیکن حافظ اور بیاری کو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ مارتے مارتے وہ کنوئیں کی طرف دوڑیں لوگوں نے فوراً پکڑ لیا۔ نصف شب تک چچی صاحبہ کا دماغی توازن اسی طرح خراب رہا۔

بیاری نے گھبرا کر حافظ سے پوچھا کہیں آپ نے تو کچھ نہیں کروایا۔

حافظ عبدالکریم نے جواب دیا، یقیناً جانو میں نے کچھ نہیں کیا شاید حرارت قلب زیادہ ہونے سے حواس پر اثر پڑا ہے۔

بیاری کی بڑی بہن نے حافظ سے کہا۔ آپ ایک خط والد صاحب کے نام لکھ دیں تاکہ ملازم کے ہاتھوں بیچ کر جہانگیر آباد سے انہیں بلا لیا جائے۔ کیوں کہ والدہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ حافظ نے خط لکھ دیا لیکن اس بات کا اندیشہ اسے پریشان کیے ہوئے تھا کہ بیاری کے والد جہانگیر آباد سے آگئے تو نہ جانے کیا حالات پیش آئیں۔ اس نے عظمت

کی ملازم کو اگلے لے جا کر پوچھا، عظمت تم جانتے ہو یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

عظمت نے کہا، مجھے سب معلوم ہے کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ ان لوگوں نے آپ کو ناراض کر دیا ہے اور آپ کے قبضے میں جو جنات ہیں وہ انہیں پریشان کر رہے ہیں جب تک یہ لوگ آپ کو راضی نہیں کریں گے اسی حالت میں رہیں گے۔ حافظ دل میں خوش ہوا کہ عظمت بھی جنات کی کارروائی کا قائل ہے۔ اس نے کہا، میں جنات کو بہت سمجھا رہا ہوں لیکن وہ مانتے نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم خط لے کر جاؤ اور وہ تمہارے خلاف بھی کارروائی کریں۔

عظمت خوف کے مارے کا پھنے لگا۔ حافظ نے کہا، ایسا کرو کہ جب تمہیں خط ملے تو تم باہر جاتے ہی زمین پر گر کر لوٹنے لگنا گویا کہ تمہارے اوپر بھی جنات مسلط ہو گئے ہیں۔ اس طرح تم خط ملے جانے سے بچ جاؤ گے اور لوگ سمجھیں گے کہ تمہارے اوپر بھی جنات مسلط ہو گئے ہیں۔

عظمت نے ایسا ہی کیا۔ خط لے کر کچھ دور چلا اور زمین پر گر کر لوٹے اور چیخنے پکارنے لگا۔ جو قریب گیا اس کو زوردار طمانچہ رسید کیا۔

بیاری کے ایک عزیز آئے ہوئے تھے اور بیاری کی والدہ کی طبیعت بحال کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے، شورن کر باہر آئے اور یہ منظر دیکھ کر کہا، مستورات کی حالت پہلے خراب ہے ایک مرد تھا اس کا بھی یہ حال ہو گیا ہے۔ حافظ نے تو حد کر دی ہے تمام گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ حافظ کے پاس آئے اور کہا، بھائی! ان کی غلطی کو معاف کرو۔ کیا کسی کا خون کر کے خوش ہو گے۔ مستورات بے پردہ ہو جائیں گی تب تمہیں چین آئے گا۔

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ عظمت اٹھ کر گھر میں آیا اور کہا، اگر کسی نے حافظ عبدالکریم کے خلاف کوئی بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔

بیاری کی والدہ نے جن کی طبیعت اس وقت کسی قدر بہتر ہو چکی تھی کہا، میں ان کے خلاف کچھ نہیں کروں گی بلکہ جو وہ کہیں گے کیا جائے گا۔

حافظ عبدالکریم صبح کے وقت اپنے گھر روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ بیاری کے ایک قریبی عزیز بھی تھے۔ ان سے حافظ کی فیصلی بات چیت ہوئی۔ انہوں نے کہا، میں جہانگیر آباد بیاری کے والد کے پاس جا رہا ہوں تم بھی چلو۔ میں رات کے واقعے کا ذکر کروں گا اور ان پر زور دوں گا کہ وہ اپنی لڑکی کی

شادی تم سے کر دیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو رسوائی کے علاوہ کسی نہ کسی کا خون ہو جائے گا۔

حافظ عبدالکریم ان کے ساتھ جہانگیر آباد چلا گیا۔ بیاری کے عزیز نے تمام واقعہ تفصیل سے بیان کیا اور کہا کہ حافظ کے قبضے میں دو جن بھی ہیں۔

بیاری کے والد تمام واقعہ اور جنات کا تذکرہ سن کر طیش میں آ گئے، کہا، ”چاہے کچھ ہو جائے۔ ہرگز شادی نہیں ہوگی۔“

پھر حافظ سے نہایت برہمی میں انہوں نے کہا، ”جنات کیا تم نے قابو میں کر لیے ہیں مجھے ہو کہ خدا کی قسم میں کر لی ہے۔ سارے گھر کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہم اسی وقت گھر جارہے ہیں، دیکھتے ہیں کہ جنات ہمارا کیا کر لیتے ہیں؟“

حافظ عبدالکریم نے نہایت اطمینان اور بے پروائی سے جواب دیا۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جنات تو ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔ چاہیں تو ابھی اور نہیں تماشا دیکھ لیجئے۔“

غیر متوقع جواب سن کر بیاری کے والد کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ گھبرا کر کہنے لگے، کیا یہاں بھی تم اپنے گھرانے کو بے آبرو کرو گے۔

حافظ نے کہا، آپ لوگ خود ہی جنات سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو انہیں روک رکھا ہے۔ اس وقت تو جنات میرے ساتھ موجود ہیں اور اجازت طلب کر رہے ہیں۔

بیاری کے والد نے کہا، خدا کے لئے معاف کرو۔ تین دن بعد مجھے ملنا میں سوچ کر تمہیں جواب دوں گا۔

حافظ عبدالکریم تیسرے روز پھر جہانگیر آباد پہنچا۔ بیاری کے والد کے پاس بہت سے لوگ مہمان تھے جو ان کے رشتے دار بھی تھے۔ کسی نے حافظ سے بات نہیں کی۔ حافظ واپس اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہوا تو بیاری کے ایک رشتہ دار ساتھ ہو لیے۔ دوران سفر انہوں نے کہا، بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمہاری بیوہ سے ایک خون ہونے والا ہے۔ حافظ کے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا، ”لڑکی کے والد اور چچا کو تم دونوں کے جذبات کا علم ہو گیا ہے۔ شرفاء میں اس قسم کے واقعات سے بڑھ کر کوئی بات باعث شرم نہیں ہوتی اس لیے تمام رشتہ داروں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ لڑکی کو مار دیا جائے تاکہ مزید بدنامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کام کے لئے ابھی ابھی دونوں بھائی دیوہ شریف گئے ہیں۔“

حافظ عبدالکریم کے پیروں سے تے زمین نکل گئی۔ اس

کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ پیاری کے عزیز نے حافظ کو شور دیا۔
 ”میاں! اب تو تمہارا زخمہ رہنا حاصل ہے جہیں بھی اپنی جان کا نذرانہ دے دینا چاہیے۔“
 حافظ عبدالکریم نے اپنے گھر جانے کا ارادہ ترک کیا اور اسی وقت دیوہ شریف کو چلا جہاں پیاری کا گھر تھا۔ راستہ بھر طرح طرح کے خیالات اس کے دل و دماغ پر چھائے رہے۔ بار بار اس کے دل سے یہی آواز آتی کہ پیاری کے بعد زندہ رہنا بیکار ہے۔ تم کو بھی جان دے دینی چاہیے۔ اس کے گھر میں جو کنواں ہے اس میں کوہر چراغ زندگی گل کر دینا چاہئے۔

حافظ عبدالکریم سہ پہر کو دیوہ شریف میں پیاری کے مکان پر پہنچا تو وہاں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی اور دروازہ بند تھا۔ یہ خاموشی اسے موت کا سنا محسوس ہوئی اور یہ خیال بن گیا کہ پیاری اس دنیا میں نہیں رہی۔ حافظ نے کئی چکر مکان کے لگائے لیکن کھڑکی کھلی دکھائی دی اور نہ کوئی دروازہ، رمضان شریف کے دن تھے۔ بوقت افطار حافظ نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

حافظ عبدالکریم نے اللہ کا نعرہ لگا یا اور مکان کے اندر داخل ہو کر سیدھا کنوئیں تک جا پہنچا اور سر کے بل کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگاتے ہی ایک عجیب معاملہ ہوا۔ حافظ کو یوں لگا، جیسے کسی نے اس کے جسم کو سنبھال لیا ہے اور جب وہ نیچے پہنچا تو اس کا سر اوپر اٹھ بیٹھتے تھے۔ پھر بھی اس کے دونوں ہاتھوں میں سخت چوٹ آئی، ایک ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ کر باہر نکل آئی۔ اتفاقاً پیاری کی والدہ نے حافظ کو کنوئیں میں چھلانگ لگاتے دیکھ لیا۔ انہوں نے شور مچا کر رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو جمع کر لیا۔ رشتہ داروں نے پیاری کو ایک کمرے میں بند کر کے قفل لگا دیا اور کنوئیں میں آئینیں اور پتھر برسائے شروع کر دیئے۔ شور و غل اتنا زیادہ ہوا کہ ہر طرف اطلاع پھیل گئی۔ سید معروف شاہ واری دیگر معززین شہر کو لے کر حافظ کی اعانت کے لئے پہنچے۔ پیاری کی والدہ برا بھلا ناراضی کیا اور کنوئیں کے قریب پہنچ کر آوازیں دیں۔ ”کنوئیں کے اندر حافظ گھنٹوں تک پانی میں کھڑا ہوا تھا اُدھر پیاری کمرے میں بیٹھ رہی تھی کہ آج تم لوگوں نے حافظ کی جان لے لی۔ اب تو خدا را دروازہ کھول دو۔ یہ آواز حافظ کے کانوں میں پہنچی تو اس کے اندر زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اس نے پوری قوت سے آواز لگائی، میں زندہ ہوں۔“

حافظ کو باہر نکالا گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ایک نعرہ مستانہ لگایا۔ ”مڑہ ہے پیاری کا۔“
 سید معروف شاہ حافظ کو اپنے مکان پر لائے، دودھ پھینکری پائی اور کہا، میں کہاروں کو پلاتا ہوں وہ تمہیں پاکی میں بٹھا کر گھر چھوڑ دیں گے۔ لڑکی کے والد جہانگیر آباد سے آنے والے ہیں۔ نہ جانے تمہارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے لڑکی کا معاملہ ہے اس لئے تمام بستی والے بھی ان کا ساتھ دیں گے۔ حافظ نے کہا مجھے جان کی پروا نہیں ہے میں نے تو جان دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جان جانے سے رہ گئی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔

حافظ کے ایک رشتہ دار اسے اپنے گھر لے گئے۔ اسی رات پیاری کے والد بھی جہانگیر آباد سے آ گئے۔ حافظ کی حالت عجیب تھی۔ اسے نہ چوٹ کا احساس تھا۔ اور نہ تکلیف کا خیال۔ وہ پوری رات جاگتا رہا۔
 صبح کو یہ اطلاع زبان زد عام ہوئی کہ حاجی وارث علی شاہ دیوہ تشریف لا رہے ہیں۔ اس زمانے میں عبدالکریم حاجی صاحب کے بارے میں صرف یہ خیال تھا کہ حاجی صاحب ایک بہر ہیں جن کا سب لوگ حکم مانتے ہیں۔ حافظ، حاجی صاحب سے بیعت ہو گیا تھا لیکن مرتبہ ولایت کا ادراک و احساس اسے نہ تھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ لوگ جب اس معاملے کی اطلاع انہیں دیں گے تو ایسا نہ ہو کہ وہ اسے دیوہ شریف سے باہر نکلوا دیں۔ حافظ نے ان تمام لوگوں سے جو حاجی صاحب سے قربت رکھتے تھے، طرح طرح کی خوشامد کی اور بڑی منت سماجت سے کہا۔ خدارا سفارش کر کے مجھے دیوہ شریف سے نہ نکلے دینا۔ لیکن جو بھی یہ بات مستکا کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا تھا۔

صبح آٹھ بجے سید معروف شاہ واری اور دیگر معززین شہر حاجی صاحب کے استقبال کے لئے پہنچے۔ حاجی صاحب ان لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا:۔
 ”کیوں، کیوں! حافظ کنوئیں میں کود پڑا۔ کیوں ایسا کیا جو وہ کود پڑا۔“ پھر سید معروف شاہ سے مخاطب ہوئے۔ ”سنا، سنا محبت ایسی تو ہو جیسی حافظ کو ہے۔“
 سید معروف شاہ نے تمام رو داد عشق بیان کی حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”پاک محبت ہے پاک محبت ہے مگر دنیا کے لوگ نہیں مانتے گے اور ان کی بدنامی ہوگی۔ حافظ عاشق ہے۔“

حافظ کو لوگوں نے حاجی صاحب کی یہ باتیں سنیں تو حافظ

کی طرف داری میں یوں شروع کر دیا۔ حافظ کو جب اس بات کا علم ہوا تو بہت کر کے حاجی صاحب کے پاس پہنچا قاتمت گاہ کا دروازہ بند تھا۔ خادم نور محمد شاہ نے حافظ کے آنے کی اطلاع دی۔ حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”حافظ مستان حافظ مستان“
 حافظ اندر داخل ہوا تو حال یہ تھا کہ وہی خون آلود کپڑے جسم پر تھے جو کنوئیں میں گرتے وقت پہنے ہوئے تھے۔ حاجی صاحب نے کہا۔
 ”حافظ، حافظ ضبط نہیں ہوا، کنوئیں میں کود پڑے۔ کون سا ہاتھ ٹوٹا، کون سا ہاتھ ٹوٹا؟“

یہ کہتے کہتے حاجی صاحب نے حافظ کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھک دیا تو ہڈی اپنی جگہ بیٹھ کر بالکل جڑ گئی چوٹ کا اثر ختم ہو گیا۔ حاجی صاحب نے کہا۔ ”حافظ، حافظ! وہ لوگ تمہارے دشمن ہو گئے ہیں۔ اب ان کے گھر نہیں جانا۔“
 حافظ نے یہ حکم نہ تو لیا لیکن دل نے گوارا نہ کیا کہ محبوب کے در کو چھوڑ دے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے عزم کو دوہرایا، میں ضرور جاؤں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ابھی اس نے یہ سوچا ہی تھا کہ حاجی صاحب نے کئی مرتبہ زور دے کر کہا۔

”تم نے نہیں جانا، وہ لوگ مار ڈالیں گے۔“
 حاجی صاحب سے رخصت ہو کر حافظ باہر نکلا تو دیوانگی شوق نے اس قدر رشوت اختیار کی کہ بے تابانہ پیاری کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہاں موجود لوگوں نے اس کی خوب پٹائی کی اور دھکے دے کر نکال دیا۔ بعد ازاں پیاری کے گھر والوں نے کئی چوکیدار مقرر کر دیئے تاکہ حافظ مکان کی طرف نہ آئے۔ نیز کئی عورتیں بھی وقت پیاری کے ساتھ رہتی تھیں۔

ایک روز حافظ نے تابی کے عالم میں صدا لگاتا ہوا پیاری کے گھر پہنچ گیا۔ پیاری بھی دوڑتی ہوئی جھٹ پر چڑھ گئی۔ عورتوں نے اسے پکڑا اور پھینچتی ہوئی نیچے لے گئیں۔ مکان کے زینے کو توڑ کر گرا دیا گیا۔
 حافظ عبدالکریم کی حالت دیوانگی یہ ہو گئی کہ اس کا نام حافظ پیاری رکھ دیا گیا۔ لوگ اس سے غفا کہتے۔ ”حافظ! پیاری نے کہا ہے کہ میرے نام سے سو جوتے مارو۔“ پیاری کا نام سن کر حافظ ہر دھم سے جھکا کر بیٹھ جاتا اور لوگ اُسے جوتے مارتے۔
 حاجی صاحب کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو حافظ کو بلا کر کہا۔ ”حافظ تم کسی کے کہنے سننے میں نہ آیا کرو اور نہ کسی کا اعتبار کرو۔ جب وہ خود آکر کہے تو یقین کیا کرو۔“

حافظ عبدالکریم پیاری کے مکان کے گرد طواف کرتا اور مختلف صدائیں لگاتا رہتا۔ حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تو آپ ارشاد فرماتے۔ ”جاؤ! شاہ منعم صاحب کے مزار پر صدا لگاؤ۔“ چنانچہ حافظ اکثر شاہ منعم صاحب کے مزار پر حاضر ہو کر صدائیں لگاتا اور دیوان حافظ کے اشعار پڑھتا۔ ایک روز اُس نے پیاری کے مکان کا طواف کیا اور صدا لگائی تو پیاری کی والدہ دیگر عورتوں کو ساتھ لے کر حاجی صاحب کے پاس پہنچیں اور کہا۔ ”حضرت! حافظ ہمیں بدنام کرتا ہے اور ہماری لڑکی کا نام سب کے سامنے لیتا ہے۔“

حاجی صاحب نے کہا۔ ”اگر وہ ایسا ہے تو ہم اُسے ابھی دیوہ سے نکال دیتے ہیں۔“ خادم نور محمد شاہ کو حکم دیا۔ ”حافظ کو ابھی پکڑ کر لاؤ۔“

نور محمد شاہ نے یہ واقعہ حافظ کو بتایا تو حافظ ایک چاقو اپنے ساتھ لے کر گیا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اگر حاجی صاحب نے اُسے دیوہ شریف سے نکلے گا حکم دیا تو وہ اسی چاقو سے خود کو ہلا کر لے گا۔

حافظ حاجی صاحب کے پاس پہنچا لیکن انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے حافظ کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی۔ اسی زمانے میں حافظ اثر پٹنگ آڑا اور جان بوجھ کر پٹنگ پیاری کے گھر میں گر دیتا۔ پھر یہ کہتے ہوئے مکان پر جا پہنچتا کہ ہماری پٹنگ آگری ہے۔ کئی بار وہاں سے زد و کوب کر کے باہر نکالا گیا۔ حاجی صاحب نے حافظ کو بلا کر کہا۔ ”حافظ! تم ہمارے کوٹھے پر پٹنگ آڑا کرو۔“

راہ عشق میں آلام و مصائب برداشت کرتے ہوئے تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ طرح طرح کے واقعات و معاملات پیش آتے رہے۔ ایک روز حاجی وارث علی نے حافظ عبدالکریم سے کہا۔ ”حافظ حافظ! تم ہماری صورت دیکھا کرو۔“ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ترجمہ۔ ”تم تمہاری رنگ جان سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہیں۔“

حافظ نے کہا۔ ”حضور! دنیا میں پیاری سے زیادہ کوئی حسین نہیں ہے۔ کس کو دیکھیں؟ اگر آپ اُس سے زیادہ حسین ہوتے تو آپ کو دیکھتا۔“
 یہ جواب سن کر حاجی صاحب مسکرائے اور حافظ کو گلے لگا کر فرمایا۔ ”عاشق کے سوا کسی کی جرات نہیں کہ ایسی بات کہہ سکے۔“
 ایک عرصے بعد حاجی وارث علی نے حافظ سے کہا۔
 ”www.pdfbooksfree.pk“

حافظ نے گہرا کر کہا۔ ”نہیں حضور مجھے کچھ نہ ملے، وہ لڑکی مل جائے۔ اگر خدا و رسول کو بھی اسی صورت میں دیکھوں گا تو مانوں گا، ورنہ میں سب سے باز آیا۔“

یہ سن کر حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”عاشق کے سوا کوئی ایسا کفر تک نہیں سکتا۔“

حافظ عبدالکریم پر عشق کی کیفیت کا غلبہ ہوتا تو بے اختیار اُس کے منہ سے نکلتا۔ ”مڑہ ہے پیاری کا۔“ دیوان حافظ کے اشعار اکثر اُس کی زبان پر ہوتے تھے۔ ایک روز حافظ کو معلوم ہوا کہ پیاری اور اُس کی والدہ حاجی صاحب کے پاس آئی ہیں۔ حافظ مکان کے زنا نہ حصے کے پاس پہنچ گیا اور صدا لگائی۔ حاجی صاحب نے آواز سننے ہی ماں بیٹی کو واپس جانے کا کہا۔ وہ دونوں دروازے پر آئیں لیکن حافظ کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر پیاری کی والدہ نے مرزا منعم بیک واری کو بلا کر کہا کہ حافظ کو دروازے سے بٹایا جائے۔

مرزا صاحب نے حافظ سے کہا۔ ”یہ زنا نہ دروازہ ہے۔ اگر صدا لگائی تو بے مروتانہ حصے کی طرف جاؤ۔“ انہوں نے حافظ کو خوب بُرا بھلا بھی کہا۔ ”میں حاجی صاحب سے تمہاری شکایت کر کے تمہیں نکلا دیتا ہوں۔“

حافظ نے کہا۔ ”جاؤ! تم خدا سے بھی کہہ دو، میں نہیں جاؤں گا۔“

ایسا کفر سن کر مرزا صاحب کی عجیب حالت ہو گئی۔ کبھی اندر کی طرف جاتے اور کبھی باہر آ جاتے۔ اُسی وقت پیاری حافظ کے پاس آئی اور کہا۔ ”حافظ بھائی! کسی سے کچھ کہتے تھوڑا ہی ہیں، سب سہتے ہیں۔“

پیری کو سامنے دیکھ کر حافظ کی حالت ناقابل بیان ہو گئی اور اُس نے سر تسلیم جھکا دیا۔

پیری اور اُس کی والدہ رخصت ہو گئیں۔ مرزا منعم بیک صاحب نے حاجی وارث علی سے حافظ کی شکایت کی۔ حاجی صاحب نے حافظ کی طرف ایک نگاہ کی اور مسکرا کر کہا۔ ”عبدالرؤف (پیری کے والد) کے گھر میں کہہ دو کہ اپنی لڑکی کو لے کر ہمارے ہاں نہ آیا کریں۔ حافظ عاشق ہیں، کبھی روز پکڑ لیا تو قیامت تک چھوٹا مشکل ہے۔“

حافظ عبدالکریم عشق کی سرسختی میں اس حد تک پہنچ گیا کہ ہوش و خرد رخصت ہو گئے۔ لوگ اُن کی اس حالت کا نہ صرف مذاق اُڑاتے بلکہ طرح طرح سے فائدہ اُٹھاتے۔..... تاکن پیاری کے ناخن اور بال لے کر آتی اور فرم دیتے کہ وہ

تھا۔ دھوین اس کے کپڑے لاتی۔ حافظ اُسے پیسے دیتا اور پیاری کے کپڑوں کو دیکھتا اور اُس کی خوشبو سونگتا۔ اس طرح اُس نے ایک بڑی رقم صرف کر دی۔

حافظ اکثر حاجی وارث علی کی خدمت میں طرح طرح کی مشائیاں اور تحائف پیش کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ حاجی صاحب اُن چیزوں کو تقسیم کریں گے تو کچھ نہ کچھ پیاری کے گھر بھی جائے گا۔ یہ خیال اُس کی طبیعت کا باعث بنا۔ حافظ جو تحفہ پیش کرتا حاجی صاحب اُسے تقسیم کرنے کے بجائے پورے کا پورا پیاری کے گھر بھجوا دیتے تھے۔

ایک روز کئی شخص نے حافظ سے کہا۔ ”حافظ! اگر تم پانچ روپے مجھے دو تو تمہیں پیاری سے ملوا دوں گا۔“

رقم بڑی تھی اور حافظ کے پاس نہیں تھی اس لئے خاموش ہو گیا۔ اُن صاحب نے قبول راست بتاتے ہوئے کہا۔ کہ فلاں رئیس حاجی صاحب کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ اُن کی وجہ میں سونے کی انتہائی قیمتی گھڑی ہے۔ کسی طرح وہ گھڑی تمہیں لا دو تو تم تمہارا کام کر دو گے۔

حافظ دن کے دس گیارہ بجے کو گھر پر چڑھا، سیدھا کمرے میں داخل ہو کر جب سے گھڑی نکالی اور تیر کی تیزی سے واپس ہو کر کوٹھے پر سے کود پڑا۔ وہ رئیس چلائے کہ حافظ! گھڑی لے کر کہاں جا رہے ہو؟ شور سن کر لوگوں نے حافظ کو پکڑ لیا اور گھڑی سمیت حاجی صاحب کے سامنے پیش کیا۔ حاجی صاحب نے فرمایا۔ ”حافظ کو نکال دو۔ یہاں نہ آنے پائے اور جہاں سے پھرے ہوئے ہیں اُن سے بھی کہو کہ اپنے مکان پر ٹھہرنے نہ دیں۔ یہ ہمیں بدنام کرتے ہیں۔ لوگ کہیں گے کہ ہم لوگوں سے چوری کرتے ہیں اور ہماری بھی شراکت ہوگی۔“

چنانچہ حافظ کو شہر سے باہر نکال دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد حافظ کو معلوم ہوا کہ حاجی وارث علی رودولی تشریف لے گئے ہیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ پیاری کے گھر والوں نے یہ منت مانی ہے کہ اگر حافظ کو نکال دیا جائے تو وہ حاجی صاحب کی دعوت کریں گے اور اُن کو نیا احرام پیش کریں گے اور جلد ہی وہ اس تقریب کا اہتمام کرنے والے ہیں۔ یہ خبر سن کر حافظ کے دل کی حالت بُری ہو گئی۔ اُس نے سوچا کہ وہ بھی حاجی صاحب کی دعوت کرے گا اور خاص دیوہ میں، جہاں سے وہ نکلا جا چکا ہے۔ حافظ رودولی پہنچ کر حاجی صاحب کے خادموں سے ملا اور انہیں تحائف وغیرہ دینے تاکہ وہ حاجی صاحب کو مناسب وقت اطلاع کریں۔ حاجی صاحب نے

فرمایا۔ ”وہ ہماری دعوت دیوہ میں کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ چوری سے بدنام ہو گئے ہیں اور ہمیں بھی بدنام کیا ہے۔ رات کو پھر لوگوں نے حافظ کا مدعا پیش کیا تو فرمایا۔ ”اچھا بلاؤ!“ حافظ ڈرتے ڈرتے اندر گیا۔ حاجی صاحب نے تمام حال پوچھا اور کہا۔ ”اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ ہماری گردن مار دو تو ہم اُس لڑکی (پیری) سے ملادیں گے۔ تو تم کیا کرو گے؟“

حافظ نے نہایت بے باکی سے کہا۔ ”حضور! میرے بس میں ہوتا تو ضرور ایسا کر گزرتا۔“

حاجی وارث علی مسکراتے ہوئے اٹھے اور حافظ کو گلے لگا کر کہا۔ ”جاؤ دیوہ میں تمہاری دعوت میں منظور ہے۔“

حاجی وارث علی دیوہ تشریف لے گئے تو پیاری کے گھر والوں نے دعوت کی اور احرام پیش کیا۔ حاجی صاحب کے سامنے شیرینی پیش ہوئی تو حافظ نے سوچ رہا تھا کہ اس شیرینی میں پیاری کے ہاتھ بھی لگے ہوں گے۔ خدا کرے مجھے بھی نصیب ہو۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ سب کو شیرینی تقسیم ہوئی لیکن حافظ کو نہیں ملی۔ اچانک حاجی صاحب نے کہا۔ ”حافظ حافظ! تم کو حصہ نہیں ملا۔“ پھر اپنے ہاتھ سے مٹائی دی۔ پیاری کے گھر سے کھانا آیا تو کھانے میں سے بھی عطا کیا اور فیرنی کی مٹی سے بنی رکابیاں بھی حافظ کو دیں۔ حافظ فیرنی کھانے کے بعد رکابیاں بھی توڑ توڑ کر کھا گئیں۔ بعد ازاں حافظ نے حاجی وارث علی کی دعوت کی اور احرام تبدیل کر لیا۔

کچھ عرصے بعد پھر حافظ کی شکایتیں حاجی وارث علی تک پہنچیں کہ وہ پیاری کے گھر جا کر ممدانگتا ہے تو آپ نے حافظ کو دیوہ سے چلے جانے کا حکم دیا۔ حافظ دیوہ سے باہر خستہ حال و پریشان پھر تارہا۔ ایک روز طحہ لے کر حاجی صاحب کے پاس پہنچا۔ خادموں نے اندر اطلاع کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ ایک نوادر شخص نے اندر جا کر حاجی صاحب سے کہا۔ ”ایک عاشق آیا ہے۔“

فرمایا۔ ”عاشق کو کون روک سکتا ہے؟ اندر آنے دو۔“ حافظ حاجی صاحب کے پاس پہنچا تو وہ مسکرائے۔ طحہ پیش کیا تو اُسی وقت سارا طحہ پیاری کے گھر بھجوا دیا۔ اُن دنوں پیاری کے چچا اپنے بھائی کے گھر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے حافظ کو بلوایا۔ حافظ خوشی خوشی پیاری کے گھر پہنچ گیا۔ چچا صاحب نے پہلے تو حافظ کو سمجھا یا کہ وہ پیاری کا نام لینا ترک کر دے اور دیوہ سے چلا جائے لیکن حافظ نہ مانا۔ انہوں نے دست پناہ گرم کر کے حافظ کو دوا غنا شروع کر دیا۔ کسی شخص نے حاجی صاحب تک اطلاع پہنچائی کہ حضور! آج فیصلہ ہو گیا۔

حافظ اُن کے گھر میں بند ہے۔ ضرور مار ڈالیں گے۔ حاجی صاحب اُنھ کو دروازے تک آئے اور فرمایا۔ ”عاشق کو مار ڈالنا دل لگی نہیں ہے۔“

خدا مے گہرا کر کہا۔ ”حضور! عاشق ہیں، گھر میں گھس گئے ہوں گے۔“ پھر خدام پیاری کے گھر پہنچے اور حافظ کو نکال کر حاجی صاحب کے پاس لائے۔

حافظ نے اُس وقت پیاری کے ہاتھ کا ہٹا ہوا کرتہ پہنا ہوا تھا۔ کرتا جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور ختم زخموں سے داغدار تھا لیکن حافظ کو صرف اس بات کا ملال تھا کہ پیاری کے ہاتھ کا ہٹا ہوا کرتہ پھٹ گیا۔ اُسے زخموں کی قطعی پروا نہیں تھی۔ حاجی صاحب نے یہ دیکھ کر فرمایا۔ ”ظلم کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ حافظ کو مارنے سے کیا حاصل؟“

حافظ اسی تہجد و بانہ حالت میں زندگی گزارتا رہا۔ اک روز حاجی وارث علی نے حافظ کو بلایا اور کہا۔ ”تم بہراچ جاؤ اور کل آ کر ہم سے پیٹے پور میں ملو۔“

حافظ اُسی وقت پیدل بہراچ پہنچا اور حضرت سید سالار مسعود غازی کے مزار پر پہنچا۔ بیٹھے بیٹھے غنودگی کی لہر آئی اور اُس نے دیکھا کہ وہ اپنے گاؤں میں مکان پر بیٹھا ہے۔ اسنے میں حاجی وارث علی تشریف لائے اور فرمایا۔ ”حافظ! تم ہماری دعوت کر دو تو پیاری تمہیں مل جائے گی۔ گیارہ تاریخ اور دن دو بیٹھے کا ہونا چاہئے۔ اب ہم دیوہ جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔“

غنودگی کی اسی کیفیت میں حافظ دیوہ پہنچا اور شاہ منعم صاحب کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ مزار کا انویز عائب ہے اور شاہ منعم صاحب بیٹھے ہوئے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے ہیں۔ حافظ نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

”یہ تو فرمائیے پیاری مجھے کب ملے گی؟“

شاہ منعم صاحب نے جواب دیا۔ ”چار چڑھاؤ گے تو ملے گی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے حافظ کو واپسی کا اشارہ کیا۔ حافظ کی آنکھ کل گئی۔ دیکھا کہ حضرت سید سالار کے مزار پر بیٹھا ہوا ہے۔

حافظ مزار سے باہر نکلا تو ایک اجنبی شخص آیا اور تین سو روپے حافظ کے ہاتھ میں پکڑا دیے۔ حافظ دوسرے دن پیٹے پور پہنچا۔ حساب لگایا تو پیر کے دن گیارہویں تاریخ آنے والی تھی۔ چنانچہ حاجی صاحب کی خدمت میں پہنچ کر کہا۔ گیارہ تاریخ کو پیر کے دن آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔“

حاجی صاحب تک اطلاع پہنچائی کہ حضور! آج فیصلہ ہو گیا۔

کردیتا۔“

حافظ نے کہا۔ ”حضور ہی نے پہلے پیر کا دن مقرر فرمایا تھا۔“

مسکرا کر جواب دیا۔ ”اچھا یہی سہی۔“

حافظ عبدالکریم دیوبند پانچواں اور شاہ منعم صاحب کے سجادہ نشین سے ملا۔ اُن سے عالم رویا کا تمام واقعہ بتایا۔ حافظ نے جو شکل و شاہت شاہ منعم صاحب کی دیکھی تھی۔ سجادہ نشین نے اُس کی پوری تصدیق کر دی۔

گیارہ تاریخ کو صبح دس بجے حافظ نے حاجی وارث علی کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ حاجی صاحب نے پوچھا۔ شاہ منعم صاحب کے مزار پر چادر کب چڑھاؤ گے؟“

حافظ نے کہا۔ ”حضور کی دعوت کے بعد وہاں جاؤں گا۔“

دعوت کے بعد حافظ شاہ منعم صاحب کے مزار پر حاضر ہوا اور چادر چڑھائی۔ حاجی صاحب کی دعوت کرنے اور شاہ منعم صاحب کے مزار پر چادر چڑھانے کے بعد حافظ کو یقین ہو گیا کہ اب کوئی شخص پیاری کو اُس سے نہیں چھین سکتا۔ اُس کے دل کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اُس کا رواں رواں خوشی سے سرشار تھا۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ اب وقت کا انتظار کرنا فاضل ہے۔ گھر میں جا کر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے آتا چاہیے۔ یہ خیال اُس کے دل میں رائج ہو گیا۔ وہ کشاں کشاں پیاری کے گھر کی طرف چل پڑا۔ قدم رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ راستے میں حاجی وارث علی کا آستانہ تھا۔ وہاں پہنچ کر اُس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ خیال آیا کہ چلو پہلے قدم بوی کر لیتے ہیں پھر پیاری کے گھر چلتے ہیں۔ دیکھا کہ آستانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ حافظ اندر داخل ہو کر حاجی صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔

حاجی وارث علی تو نہ دکھائی دیئے البتہ ایک ایسا منظر جو اُس کا منظر تھا جو جلی بن کر اُس کے ہوش و حواس پر گرا۔ حافظ پتھر کا بت بن کر رہ گیا اور ٹپکیں جھکانے کی طاقت تک باقی نہ رہی۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی معصوم روپ ہے، وہی دلکش انداز ہے، وہی رنگ و رعنائی ہے۔ وہی پیاری ہے جس نے اُسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ پیاری کا نوب میں جگلیاں اور گلے میں چندن ہار پہنے گاٹنی دو پٹا اوڑھے بیٹھی تھی۔ پیاری نے نظریں اٹھا کر حافظ کی طرف دیکھا۔ ایک برقی سی حافظ کی نگاہوں کے سامنے کونہ لگی۔ حافظ ہوش و حواس کھو بیٹھا اور بے اختیار سر ہنجو ہو گیا۔ چند ثانیوں کے بعد ہوش و حواس بحال

ہوئے تو دل جیسا کہ دوبارہ اس مجسمہ حسن کو دیکھے۔ سر جو اٹھایا تو عالم حیرت و خیر میں ڈوب گیا۔ وہاں نہ پیاری موجود تھی اور نہ اُس کے حسن و جمال کی روشنی۔ بلکہ حاجی وارث علی شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ بے اختیار اُسکی زبان سے نکلا۔ ”حضور! یہ کیا؟“ فرمایا۔ ”یہی صورت ہے، اسی کے ساتھ تمہارا احشر ہے اور جہاں نہیں دیکھو گے اسی صورت کو دیکھو گے۔“

اس مشاہدے اور ان الفاظ میں نہ جانے کیا جا دو تھا کہ حافظ عبدالکریم کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ ماضی کے تمام جذبات و خیالات اس طرح ختم ہو گئے جیسے پانی ریت پر بنے نقوش کو مٹا دیتا ہے۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھتا رہا ہے اور اب تک کچھ ہوا ہی نہیں۔ اُس کی نگاہوں نے حاجی وارث علی کے اندر ایک ایسا نظارہ دیکھا تھا جس کی حقیقت و معنویت اُس کے قلب پر ظاہر ہو گئی تھی۔ پیاری کے عشقِ ناکام نے اس کے لیے عشقِ حقیقی کا درکھول دیا تھا۔

اس منظر کو دیکھنے کے بعد حافظ عبدالکریم عرف حافظ پیاری صاحب نے بھی پیاری کے گھر کا رخ نہیں کیا اور نہ کسی اُن کی زبان سے پیاری کا نام سنا گیا۔ البتہ کبھی کبھی وہ کہتے۔ ”مزا ہے پیاری کا اور سب بھول ہے۔“ (یعنی یہ معافی ہے) جن لوگوں نے راہِ عشق میں حافظ پیاری صاحب کی وادیِ شفق کی اور جذب و جنون کو دیکھا تھا۔ یہ امر اُن کے لئے ہمیشہ باعث صد حیرت و استعجاب بنا رہا کہ آخر وہ کیا قوت تھی؟ وہ کیا راز تھا جس نے ہفتوں، مہینوں، سالوں نہیں بلکہ چشمِ زدن میں اُن کو یکسر بدل دیا تھا۔

حافظ عبدالکریم ہمیشہ حاجی وارث علی شاہ کے والد و شیدا رہے اور جب حاجی صاحب نے اس دنیا سے انتقال فرمایا تو سال میں دو مرتبہ خصوصی طور پر حاجی صاحب کے مزار پر چادر چڑھانے جاتے تھے۔ جب چادر لے کر چلتے تو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ دو آدی اُن کو سنبھالے ہوئے چلتے تھے۔ بے خودی کے عالم میں ایک بار ایسی حالت طاری ہوئی کہ منہ سے خون جاری ہو گیا اور تمام راستے بہتا رہا لیکن اُن کو احساس تک نہیں ہوا۔ چادر چڑھانے کے بعد اُن کی حالت مردے کی سی ہو جاتی۔ گھٹنوں ہوا دی جاتی، گلاب تنکھایا جاتا تب کہیں جا کر ہوش و حواس میں آتے تھے۔ واقف اسرارِ عشقِ حاجی وارث علی شاہ نے حافظ پیاری صاحب کو کھنکھائی و جمالِ لافانی کا جو جلوہ مثلِ مخکنی طور دکھایا تھا اُس نے حافظ پیاری صاحب کو کششِ مجازی سے آزاد اور فانی رنگ و روپ سے رنگ کر دیا تھا۔



پنجاب یعنی پنج آب کے سب سے بڑے دریا، دریائے چناب کو دو ایسے اعزازات حاصل ہیں جو دنیا کے کسی اور دریا کو حاصل نہیں۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ دنیا کے محبت کی آبرو کھلانے والی تین لافانی اور عالمی شہرت یافتہ رومانوی داستانیں اسی دریا سے وابستہ ہیں۔ سیرا نچھا، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحبان کی لازوال محبتوں نے نہ صرف اس کے پانیوں سے جنم لیا بلکہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ہیر کا جھنگ، سوہنی کا کھجرات اور صاحبان کا کھنکھوا، دریائے چناب کے عین کنارے واقع ہیں اور عشق و محبت کی یہ دلکش تصویریں بھی ان شہروں کی پہچان اور شناخت ہوا کرتی تھیں۔

شاید اسی لیے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دریائے چناب

ناکامی نے ان کے عشق کو معراج بخش دی

ذوالفقار ارشد گیلانی

دشمنِ عشق

برصغیر میں ناکام عشق کی بہت ساری داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ پیر رانجھا، سوہنی مہینوال، عمر ماروی، مرزا صاحبان کے علاوہ بھی بہت سارے قصے زبانِ زہام ہیں۔ یہ قصہ بھی ہماری روایت کا حصہ ہے، بھلے ہی دو دل منہ نہ پائے مگر اپنی کہانی امر کر گئے۔



”چنا“ کا اشتراک ہے۔ یہ دونوں علاقے اتنے زرخیز اور سرسبز و شاداب ہیں کہ غلے کی شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جو یہاں پیدا نہ ہوئی ہو۔ گھنٹے، مالے اور کیوں کے باغات سے لے کر گندم، چاول اور گنے کے گھنے کھیت ان علاقوں کی آن، بان اور شان ہیں تو یہاں کی گائے، چھینیس اور بیل، مویشیوں کے سر تا سر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

رچنا دو آب کے ایک حصے کو ساندل بارکا کہا جاتا ہے جو شرقا غربا 80 کلومیٹر چوڑا اور شمالاً جنوباً چالیس کلومیٹر لمبا ہے۔ بارکا مطلب مقامی زبان میں ایسے علاقے کے ہیں جہاں جنگل تو ہو لیکن کاشتکاری کے لیے پانی جیسی کوئی سہولت دستیاب نہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ ساندل، پنجاب کے روایتی ہیرو دلا بھٹی کے دادا کا نام تھا جو اسی علاقے کا رہنے والا تھا چنانچہ اسی کی مناسبت سے اسے ساندل بارکا نام دے دیا گیا۔ شروع میں ساندل بارکا تمام علاقہ ضلع جھنگ میں شامل تھا لیکن اب یہ فیصل آباد، جھنگ، کمالیہ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے اضلاع میں تقسیم ہو چکا ہے۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ ساندل بار میں مذکورہ بالا علاقوں کے علاوہ ننگانہ صاحب، چینیوت اور حافظ آباد کے اضلاع کے علاوہ ضلع شیخوپورہ کے بعض حصے بھی شامل ہیں۔ ان کے مطابق اس وسیع و عریض خطے میں درجنوں پنجابی قبیلے آباد ہیں جن کی نہ صرف زبان اور ثقافت یکساں ہے بلکہ وہ آپس میں خونی رشتے دار بھی ہیں۔ کھل، اسی ساندل بارکا ایک راجپوت قبیلہ ہے جو ان کی وٹی پنہور کی اولاد ہے۔ مرزا صاحبان کی ناقابل فراموش داستان محبت کا مرکزی کردار مرزا کھل قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہی پنجاب کا مرزا جٹ ہے جو اپنی بہادری، تیرا اندازی، گھڑ سواری اور صاحبان سے محبت کے حوالے سے امر ہو چکا ہے۔

کھل قبیلہ کا ایک اور نامور سپہ سالار نور علی خان کھل بھی تھا جسے برصغیر پاک و ہند میں بادشاہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ضلع ننگانہ صاحب کے گاؤں چوکرے کھلاں کا رہائشی رائے محسن خان اپنے وقت کا بہت بڑا زمیندار اور پنجاب کی مشہور شخصیت تھا۔

کھلوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا جد امجد مہا بھارت کا مشہور کردار راجا کرن ہے۔ راجا کرن جسے ہندو وادھیا بھی کہتے ہیں۔ قدیم ہندوستان کی معروف رزمیہ داستان مہا بھارت کے مرکزی کرداروں میں سے ایک تھا۔ وہ انکا (موجودہ بھاگل پور) کا بادشاہ تھا۔ مہارشی وید واس کے تخریر کردہ مہا بھارت کے اصل نسخے کے مطابق کرن اور ہرشم

سمیت مہا بھارت کے مقتدر حکمرانوں نے کرن کو عظیم ترین جنگجوؤں میں سے ایک قرار دیا تھا۔ وہ سوریا (سورج دیوتا) اور کنتی کا بیٹا تھا جسے کنتی نے پانڈوکے ساتھ شادی سے پہلے جنم دیا تھا۔

کرن کو در یور دھنا کے قریبی دوست ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور اس نے در یور دھن کی طرف سے ہی کرک شترا کی جنگ میں اپنے بھائیوں یعنی پانڈوؤں کے خلاف اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ کرن اپنی پوری زندگی قسمت کے خلاف لڑتا رہا لیکن کسی بھی قسم کے حالات میں اس نے اپنے وعدے اور عہد پر آج نہ آنے دی۔ اس کی بہادری اور شجاعت کے کئی لوگ مداح تھے۔ خیال ہے کہ اس نے ہندوستان کا مشہور شہر کمال آباد کیا تھا۔

اسی راجا کرن کا ایک جانشین بھوپا، تیرہویں صدی عیسوی میں اپنے بیٹے کھل کے ہمراہ اچ شریف آیا جہاں انہوں نے مخدوم جہانیاں شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اچ سے کھل در یائے رادی کے کنارے واقع علاقے میں پھیل گئے اور اب وہ ضلع وہاڑی، فیصل آباد، ساہی وال، حافظ آباد، اوکاڑہ، ننگانہ صاحب، شیخوپورہ، گوجرانوالہ، بہاولنگر اور چشتیان میں آباد ہیں۔

کھلوں کی مشہور ذیلی شاخوں میں ٹوہکے، روہیرا، گوگیرا، چیرا، ساہی، ہیرو، ساہو، جالو، پورہیرا، کالیہ، بھنڈارا، لکھویرا، رائنہیر، دھرو، کے، شہر کے اور جلاکے وغیرہ شامل ہیں۔ سیالوں کی طرح یہ بھی شروع میں خاندہ بدوش ہی تھے لیکن چودھویں صدی عیسوی میں کمال خان نے ایک قدم قدم تھیں کو از سر نو آباد کیا۔ اس قصبے کو آثار قدیمہ کے ماہر جنرل جیمز ٹگنم نے ان مابی قبائل کے ایک مضبوط گڑھ کے طور پر شناخت کیا جنہیں الگیزینڈر دی گریٹ نے موجودہ ملتان کے قریب شکست فاش دی تھی چنانچہ کمال خان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اس قصبے کو ٹوٹ کمالیہ کا نام دیا گیا۔

کھلوں کی ذیلی شاخ لکھویرا عدوی اعتبار سے کبھی مضبوط نہیں رہی لیکن اسے مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں اس وقت بے حد اہمیت حاصل ہوئی جب کمالیہ کے سربراہ سعادت یار خان کو شہنشاہ کی طرف سے جاکیر عطا کی گئی۔ یہی وہ وقت بھی تھا جب ولی داد سیال، کمالیہ پر چڑھ دوڑا۔ اس نے کھلوں کو ان کے آبائی قصبے سے مار بھاگایا اور راوی کے کنارے مردانہ اور ترہانہ سیالوں کو آباد کروایا۔ ان میں سے بعض کھل تو وہاڑی، ملتان، فیصل آباد اور حافظ آباد

میں آباد ہو گئے جبکہ کچھ نے سندھ کی جانب ہجرت کو ترجیح دی۔ کھل قبیلے کے بعض افراد نیپال میں بھی آباد ہیں لیکن وہ بدھ یا ہندو مت کے پیروکار ہیں۔

کمالیہ اور اس کے گرد و نواح میں آباد کھلوں کے بڑی سیال تھے۔ دریائے چناب کے کنارے پر قابض اس پنجابی قبیلے کا آبائی وطن جھنگ سیال ہے لیکن مورخین کھلوں اور سیالوں، دونوں کو مستقل نڈیاں قبیلہ قرار دیتے ہیں جنہوں نے مخصوص علاقوں میں آباد ہو کر ان میں اپنی اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ یوں بھی 1500ء کے لگ بھگ کھلوں اور سیالوں کے علاقوں یعنی فیصل آباد، جھنگ اور سرگودھا وغیرہ میں بڑے بڑے جنگل تھے جنہیں وہاں بسنے والے چراگاہوں کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ دونوں قبائل کا زمین سے رشتے بے حد مضبوط تھا چنانچہ وہ انہی جنگلوں میں مویشی پالنے اور کاشت کاری کرتے تھے۔

محققین، سیال قبیلے کا شمار نو مسلم قبائل میں کرتے ہیں کیونکہ ان کے یہ قول سیالوں نے مسلمانوں کے پنجاب آنے کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ ہندو سیالوں میں زیادہ تعداد کھلوں کی ہے تاہم راجپوتوں اور جاتوں میں بھی موجود ہیں کیونکہ سیال قبیلہ، جات برادری کی ہی ایک ذیلی شاخ ہے۔ اسی طرح سیال، مسلمانوں کے علاوہ سکھوں اور عیسائیوں میں بھی سیال پائے جاتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت ہندو اور سکھ سیال ہجرت کر گئے۔ سکھ سیال زیادہ تر راجپوت ہیں جبکہ بلوچستان کے اضلاع چغتار آباد، نصیر آباد اور بولان میں بھی سیال آباد ہیں۔ پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے سیال، پنجابی، سندھی اور سرائیکی بولتے ہیں جبکہ بلوچستان کا رند قبیلہ بلوچی بولتا ہے اور خود کو بلوچ ہی قرار دیتا ہے۔

سیالوں کی ابتدا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سیو، نیو اور جیو تین بھائی تھے جن کا تعلق اگنی کو لاٹھی قبیلے سے تھا۔ روایت ہے کہ کوٹانے، نیو کی اولاد ہیں۔ راداپنڈی کے محاسب، گھوکے جانشین ہیں جبکہ جھنگ کے سیال، سیو کی نسل سے ہیں۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ سیال درحقیقت راجپوتانہ کے رہنے والے تھے جہاں سے ہجرت کر کے پاک چین کے علاقے میں آباد ہوئے۔ ان دنوں اجداد یعنی پاک چین کے مالک و مختار حضرت بابا فریدنج شہر کا طوطی بولتا تھا اور ان کا نام جاری تھا چنانچہ سیالوں نے انہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد وہ پاک چین سے جھنگ آ گئے جہاں

شاعر نا کام محبت

قیس بن عظیم کا شاعر قبل از اسلام خطہ عرب کے جدید شعرا میں ہوتا تھا۔ وہ حضرت حسان بن ثابت کا ہم عصر تھا اور خود کو عرب کا سب سے بڑا شاعر کہا کرتا تھا۔ ہوارہ بنت جحش سے محبت کرتا تھا لیکن قبائلی دشمنی کے سبب دونوں ایک نہ ہو سکے۔ ہوارہ کی شادی کے بعد وہ اس کی خوبصورتی کو قلم کرنے لگا تھا اور یہی وجہ شہرت بنی۔ قیس کا تعلق بنو نظر سے تھا جو قبیلہ اوس کے خاندان بیت سے متعلق تھا۔ قیس اپنے زمانے کے تمام خندرجی شاعروں خصوصاً حسان بن ثابت اور عبداللہ بن رواحہ سے بحث و مناظرہ میں الجھتا رہتا۔ قیس نے آخر وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ نبوت میں غریب (مدینہ) میں موجود تھا۔ اس کی بہن لیلیٰ بنت عظیم اور اس کے بیٹے ثابت نے مشرف بہ اسلام ہو کر شرف صحبت نبوی ﷺ پایا۔ قیس کا دیوان قسطنطنیہ کے ایک کتب خانے میں محفوظ کی شکل میں موجود ہے۔ اسلام سے پہلے کے زمانہ غریب کی تاریخ اور معاشرت سمجھنے میں قیس کا کلام کسی حد تک مدد و معاون ہے۔

قیس بن عظیم کے دیوان کا ترجمہ اور شرح 1914ء میں لائبریرگ سے شائع ہوا پھر 1962ء میں بغداد و قاہرہ سے بھی شائع ہوا۔

تھون عرب: از انیس جی حسن
مرسل: ایاز راہی ہاشمہ

ان دنوں سرکار دہلی کے نمائندے نول رہائش پذیر تھے۔
تواریخ کے مطابق رائے سال نے بھائی خان مین کی
بہن سے شادی کی جو ان دنوں ضلع سرگودھا کی تحصیل شاہ پور
کے علاقے ساہی وال کا بااثر زمین دار تھا۔ شاہ پور میں
بھانویہ کی ایک مقام پر کوٹ بھائی خان (بھائی خان کا قلعہ)
آج بھی موجود ہے۔

سیالوں نے اپنے مخالفین یعنی نول قبائل سے جنگ کی
اور ساندل بار کے علاوہ دریائے جہلم اور دریائے چناب کے
درمیان میں حصے جج دو آب کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔
اس وقت سیال ایک سو سے زائد قبیلی قبائل، شاخوں
اور برادریوں میں تقسیم ہیں لیکن ان میں ایک چیز مشترک ہے
اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے آخر میں ”انا“ یا
”اند“ کا لفظ آتا ہے۔ میر جانا، چوچکا، مکھیانا یا مکھیانیہ،
تربانہ، مندانا، حسانا، جانیانہ اور بھروانہ وغیرہ اس کی چند
مثالیں ہیں۔

داستان مرزا صاحبان کی روح رواں صاحبان، ہیر کی
طرح انہی سیالوں کی بیٹی تھی۔

ہمسایہ ہونے کے ناتے کھلور اور سیالوں میں رشتہ
داریاں بھی رہیں اور دشمنیاں بھی، جو اس عہد میں بھی تھیں اور
آج بھی ہیں۔ چنانچہ جس طرح ان دونوں قبائل کا وجود
حقیقت ہے اسی طرح مرزا صاحبان کا رومان بھی کوئی افسانہ
نہیں بلکہ پنجابی شاعری میں ہیر رانجھا کے بعد، دو جیتے جاگتے
اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے انسانوں کی سب
سے زیادہ تحریر کی جانے والی ایک سچی اور لافانی کہانی ہے،
جس سے وابستہ حقائق آج بھی پورے کروفرواں شہروں کے
ساتھ موجود ہیں۔

موجودہ جھنگ، چیٹوٹ روڈ پر، جھنگ سے آٹھ دس
میل کے فاصلے پر کھووا نام کا ایک گاؤں آباد ہے۔ یہی
صاحبان کا گاؤں تھا، جو اس زمانے میں خاصا بڑا قصبہ تھا اور
اس کا حاکم یا قبیلہ کا سردار، خان کھووا کہلاتا تھا جو ذات کے
اعتبار سے بھٹی سیال تھا۔ صاحبان کا بچپن اسی کھووا کی گلیوں
میں ٹھیل کود کو لڑکپن اور جوانی کی حدود تک پہنچا۔ کھووا کی ایک
قدیم مسجد آج بھی صاحبان کے وجود کی گواہی دیتی ہے کیونکہ
وہ اسی مسجد کے مدرسے میں پڑھا کرتی تھی۔ یہیں اسے مرزا
سے محبت ہوئی اور جب مرزا کے قتل کے بعد اس کے دریا یعنی
کھل بدلے لینے کھووا آئے تو انہوں نے اس مسجد کے علاوہ
گاؤں کی ہر چیز تروا کر دی تھی۔ کہتے ہیں کہ لڑکوں نے کھووا میں
اس قدر لڑائی و غارت کیا کہ آج اس قصبے میں جو آبادی موجود

ہے وہ ساری کی ساری اقل قتل عام کے بعد کی ہے۔
مرزا، ذات کا کھل تھا جس کے قبیلے کی حکمرانی راوی
کے دائیں کنارے پر شروع سے تسلیم کی جاتی تھی۔ چال
تحصیل بڑا نوالہ میں دانا آباد کا گاؤں مرزا کے کھل قبیلہ کا
تھا۔ اس کے باپ کا نام رائے و بھل تھا (بعض تذکرہ نگاروں
نے اس کا نام بھل بھی بیان کیا ہے) رائے و بھل کا
تعلق کھلوں کی ایک شاخ ساہی سے بتایا جاتا ہے جو خود
جاٹ بھی کہتے ہیں۔ مغربی پنجاب (پاکستان) میں جو جاٹ
اور راجپوت خود کو مختلف قبیلے بتاتے ہیں مگر مشرقی پنجاب میں
جاٹ اور راجپوت کو ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔

مرزا صاحبان کا قصبہ پنجابی زبان کے 35، اور فارسی
کے 12 سے زیادہ شاعروں نے منظوم کیا ہے لیکن کسی نے
اس واقعے کی حقیقت ہونے کے باوجود اس کے وقوع پذیر
ہونے کے اصل زمانے کی بابت کچھ تحریر نہیں کیا۔ آج بھی یہ
بحث تمام نہیں ہوئی کہ یہ قصبہ کب کا ہے اور سب سے پہلے
نے اسے تحریر کیا۔ بعض روایات کے مطابق بیلیو نامی شاعر اس
قصبے کا پہلا راوی ہے۔ بیلیو نے مرزا صاحبان اس طرح لکھی
کہ گو یا مرزا، بیلیو سے صلاح مشورہ کر کے عشق کی بازی کھیت
رہا۔ حتیٰ کہ مرزا جب صاحبان کو لینے دانا آباد سے کھووا روانہ
ہوتا ہے تو اس سے پیشتر، بیلیو سے پوچھتا ہے کہ میرے سفر کی
کامیابی کا حساب لگا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیلیو، مرزا کا ہم عصر ہے نہ کہانی کا
پہلا راوی بلکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرزا اور صاحبان کے آبائی
علاقوں سے اس کا دور دور تک کوئی تعلق نہ تھا۔ تاریخ میں بیلیو
کے بارے میں تفصیلات سرے سے دستیاب ہی نہیں، ہاں اس
کا تحریر کردہ منظوم قصہ اس کے وجود کی گواہی ضرور دیتا ہے۔ اس
بنیاد پر کچھ لوگ دعوٰی کرتے ہیں کہ پنجابی میں مرزا صاحبان کی
داستان لکھنے والوں میں وہ سب سے پہلا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ
بیلیو..... چکوال کے ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا اور تیسرے
مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں زندہ تھا۔ شہنشاہ
اکبر نے 1556ء سے 1605ء تک ہندوستان پر حکومت کی
اور بیلیو بھی ظاہر ہے، اسی دور میں حیات رہا ہوگا لیکن اس کا یہ
مطلب ہرگز نہیں کہ مرزا صاحبان بھی اسی دور میں تھے بلکہ
اندازہ یہ ہے کہ مرزا صاحبان، بیلیو نامی شاعر سے کم از کم پچاس
برس پہلے گزرے ہوں گے یا جب بیلیو نے یہ داستان لکھی تو
مرزا صاحبان کی طوفانی محبت کے بھٹی شاہ اور ممکن ہے کہ ان کی
اگلی پشت بھی اس دار فانی سے کوچ کر چکی ہو۔ اس مفروضے کو
یوں بھی تقویت ملتی ہے کہ خیر اللہ نامی ایک شاعر نے فارسی میں

بقصہ 1551ء میں لکھا جو شہنشاہ اکبر سے پہلے کا زمانہ تھا۔
یوں بھی اس زمانے میں کسی قصے کے مشہور اور ملک گیر
ہونے میں خاصا وقت لگتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بااثر
قبائل جن میں سیال اور کھل شامل ہیں، کسی صورت یہ
برداشت نہیں کرتے ہوں گے (اور آج تک برداشت نہیں
کرتے) کہ ہیر سیال یا صاحبان سیال کے عشق کی داستان
چھپی جائے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی جھنگ میں ہیر
کو بلی ہیر یا مائی عزت ٹی بی کہا جاتا ہے اور اس کی قبر کا کسی
ولی کے مزار جیسا احترام کیا جاتا ہے جبکہ تحصیل بڑا نوالہ کے
بک نمبر 484۔ جی بی، جھنگ والی میں واقع مرزا صاحبان کی
قبر پر مقامی خواتین کو جانے کی اجازت نہیں کیونکہ ان کے
مردوں کے خیال میں قبر پر جانے سے عورتوں کے دل و دماغ
میں مرزا صاحبان کی تقلید کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے جو ان کی نظر
میں قابل اعتراض فیض نہیں، ناقابل برداشت بھی ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہ بھی ہے کہ 1857ء میں
انگریزوں کے خلاف ضلع ساہی وال میں بغاوت کرنے،
جھیل توڑنے اور انگریزوں کو قتل کرنے کے ”جرم“ احمد خان
کھل کے علاوہ نظام لوبار، دلا بھٹی اور چرو وغیرہ کے بے
چار ڈھولے لکھے گئے لیکن انگریزی عہد میں کسی بھی شاعر نے
ان پر اپنا نام دینے کی جرأت نہیں کی کیونکہ یہ سارے انگریز
مرکار کے جرم تھے اور مجرموں کی تعریف کرنے یا انہیں
بہرہ دینا کرشمے کرنے کی پاداش میں انگریزی قانون کا پھندا
ان کی گردن تک پہنچ سکتا تھا۔

چنانچہ اگر حاکموں کے خوف سے شاعر احمد خان کھل،
نظام لوبار یا دلا بھٹی کے ڈھولے لکھ کر بھی سو سال تک ان پر
لٹا مارا نہ لیتا تو انہیں ہونے تو ہیر رانجھا اور مرزا صاحبان کی
داستانوں کا آغاز بھی ایسے ہی ہوا ہوگا۔ اس لیے اندازہ ہے
کہ مرزا صاحبان کا وجود لوبھوں کے آخری عہد یا مغلوں
کے ابتدائی زمانے کا ہے جو 1520ء سے 1540ء کا
درمیان عرصہ بنتا ہے لیکن یہ بھی طے ہے کہ صاحبان، ہیر کے
منظر بعد میں پیدا ہوئی بلکہ مختلط ترین اندازوں کے مطابق
ہیر کی موت اور صاحبان کی پیدائش میں چالیس سے پچاس
سال کا فرق ضرور ہوگا جو 1451ء سے 1489ء کے
درمیان کی عمر سے میں حیات تھی۔

بعض حلقے واضح طور پر بیلیو کو سترہویں صدی عیسوی یعنی
1601ء سے 1700ء کا شاعر قرار دیتے ہیں جس نے یہ
قصہ اپنے بزرگوں سے سن کر تحریر کیا لیکن اس سے انکار نہیں کہ
پنجاب سمیت دنیا بھر کو مرزا صاحبان کی لافانی محبت سے

روشناس کرانے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ اس کے بعد تخت
ہزارہ کے رہائشی اور چٹنی شیال (سیالکوٹ سے تین کلومیٹر
شمال مشرق میں واقع گاؤں) میں مدفون حافظ
برخوردار (1658ء تا 1707ء) نے بھی اس قصے کو پنجابی
میں منظوم کیا لیکن جو شہرت بیلیو کو نصیب ہوئی، وہ حافظ
برخوردار سمیت اسے لکھنے والے درجنوں شعرا کے حصے میں
بھی نہیں آئی اور پنجاب کے دیہی علاقوں میں آج بھی بیلیو کی
مرزا صاحبان ہی زبان زد عام ہے۔

اس داستان کو بعد میں اردو نظم اور نثر کی صورت میں بھی
لکھا گیا جبکہ 1884ء میں کیپٹن آر سی ٹیپل نے اپنی
انگریزی کتاب ”دی لیجنڈز آف پنجاب“ میں بھی اسے نقل
کیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ 1931ء میں جھنگ، پنجاب، لاہور
نے اردو میں یہ کہانی شائع کی جس کے سرورق پر تحریر تھا.....
مرزا صاحبان (صرف بالغوں کے لیے) اسی طرح بعض
تحقیق نگاروں نے اسے صریحاً شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر
کے عہد یعنی 1556ء سے 1605ء کے درمیان عرصے کی
سچی کہانی قرار دیا ہے اور تصدیق کی ہے کہ یہ واقعہ چناب اور
راوی کے درمیانی علاقے میں کسی جگہ رونما ہوا۔

بہر حال صاحبان اور مرزا 1520ء سے 1540ء کے
درمیان حیات رہے ہوں یا ان کا زمانہ 1556ء سے
1605ء کا درمیان عرصہ ہو، اس سے کسی کو انکار نہیں کہ
صاحبان، کھووا کے سیالوں کے سردار خان کھووا کی بیٹی تھی۔
گھر کھوے دے صاحبان، جی منگل وارا!

ڈوم سویلے گاوندے، خان کھوے دے بار
دو بھائی اس سے بڑے تھے جن میں سے ایک کا نام شیر
خان اور دوسرے کا میر خان تھا۔ یہ دونوں اپنے علاقے میں
دلیری اور بہادری کی علامت سمجھے جاتے تھے جبکہ ان کی
چھوٹی بہن یعنی صاحبان، حسن و خوبصورتی میں اپنی مثال
آپ تھی اور اس کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ بیلیو کے یہ
قول وہ منگل کے روز پیدا ہوئی اور روایات کے برعکس ایک
لڑکی کی پیدائش پر ایسا جشن برپا کیا گیا جو عرصے تک لوگوں
کے دلوں سے جھونکے ہو سکا۔

صاحبان کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے بیلیو لکھتا ہے
کہ جب صاحبان اپنی نازک اور پتلی کمر پر لنگی باندھ کر
گھر سے نکلی تو فرشتے اس کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے دم
توڑ گئے جبکہ دھابھی سانس لینا بھول گیا۔ (نوروز باللہ)
صاحبان کی طرح مرزا بھی اپنے بہن بھائیوں میں
سب سے چھوٹا تھا البتہ بعض تذکرہ نگاروں کے یہ قول وہ

بھائیوں میں چھوٹا تھا لیکن چھٹی نامی بہن سے بڑا تھا۔ مرزا خان یا مرزا جنت کو بھی بلا کا وجہ، دلیر اور بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کا تیر انداز بنایا گیا ہے۔ مرزا کے باپ کے نام پر تو کسی کو اختلاف نہیں کہ وہ رائے و نکل کا بیٹا تھا البتہ اس کی ماں کے نام اور صاحبان کے باپ کے ساتھ رشتے پر علیحدہ علیحدہ رائے دی جاتی ہے۔ کچھ لوگ مرزا کی ماں کو خان کھوکھلی کی بہن لکھتے ہیں جبکہ بعض دونوں کو رضاعی بہن بھائی قرار دیتے ہیں۔

ایک طے کا کہنا ہے کہ کھوکھلی ایک عورت نوران سے بیٹے کو جنم دیا لیکن بیٹا چند دن کا ہی تھا کہ نوران کا انتقال ہو گیا چنانچہ اسے دودھ پلانے کے لیے ایک ایسی عورت کے حوالے کر دیا گیا جو پہلے سے اپنی بیٹی کو دودھ پلا رہی تھی چنانچہ لڑکی اور لڑکا، دودھ شریک بہن بھائی بن گئے۔ لڑکا بڑا ہو کر اس علاقے میں رہنے والے سیال قبیلے کا سردار بن گیا اور کھوکھلی خان یا خان کھوکھلی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی دودھ شریک بہن جس کا نام فریح بی بی تھا، کی شادی کھوکھلی قبیلے کے رائے و نکل سے کردی گئی جو موجودہ ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑانوالہ کے گاؤں دان آ باد میں رہتا تھا۔

جو لوگ مرزا کی ماں کو خان کھوکھلی کی بہن بتاتے ہیں، ان کے مطابق اس کا نام لاگی مہری تھا۔ بہر حال دونوں صورتوں میں مرزا کی ماں صاحبان کی چھوٹی اور صاحبان کا باپ، مرزا کا ماموں تھا۔ اس طرح مرزا صاحبان، عاشق و معشوق ہونے کے علاوہ قریبی رشتے دار (فرسٹ کزن) بھی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ مرزا پیدائش سے پہلے اپنی ماں کے لیے سخت تکلیف کا باعث بن رہا تھا چنانچہ لاگی مہری نے اس تکلیف سے نجات پانے کے لیے کئی بار باروں اور بیروں، فقیروں کے پاس حاضری دی۔ انہی میں ایک صاحب کمال، نوشہرہ بخش بھی تھے۔ مہری نے انہیں مرشد بنایا اور اپنی تکلیف بتائی۔ نوشہ نے مہری کو دودھ کا ایک کورا پلایا جس سے اس کی تکلیف جاتی رہی۔ ساتھ ہی نوشہ نے مہری کے لیے دعا کی اور اسے خوش خبری سنائی کہ اس کے گھر چاند سا بیٹا پیدا ہوگا جو عشق میں بڑا نام کمائے گا۔

لاگی مہری ایک خالص دیہاتی عورت تھی۔ اس لیے اس نے اپنے مرشد کی بات پلے سے تو باندھ لی لیکن عشق کے بارے میں اس کی اپنی معلومات کچھ زیادہ نہیں لہذا اس نے اس طرف کوئی توجہ بھی نہ دی۔ ان دنوں یہ رواج عام تھا کہ بچوں کو تعلیم کے لیے اس کے ماں باپ یا بزرگوں کے

پاس بھجوا یا جاتا تھا چنانچہ مرزا کا بچپن لڑکپن کی حدود کو چھو لگا جبکہ بعض روایات کے مطابق جب وہ آٹھ یا نو سال کا تو اسے پڑھنے کے لیے نضال یعنی کھوکھلی بھیج دیا گیا جہاں کے ماموں خان کھوکھلی (صاحبان کے باپ) کے علاوہ اس کے خالہ بھی بچی رہتی تھی۔ مرزا کو اس کے ماموں نے اپنے گھر اور اپنی بیٹی کے ہمراہ مقامی مسجد میں داخل کر دیا جو نماز کے علاوہ مدرسے کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھی۔

مسجد میں ایک ساتھ تعلیم مرزا اور صاحبان کے لیے ایسے انوٹ بندھن کا باعث بن گئی جس میں ایک دوسرے کے بغیر زندہ رہنا محال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تعلیم تو پیچھے رہی لیکن عشق کے سبق میں دونوں بہت آگے نکل گئے۔ روایت ہے کہ عشق اور محبت چھپائے نہیں چھپتے اس لیے مرزا اور صاحبان کا دل تعلق بھی کچھ زیادہ عرصہ پوشیدہ نہ رہ سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر زبان پر دونوں کے چرچے ہونے لگے۔ صاحبان پڑھدی پٹیاں، مرزا پڑھتے قرآن و وح مسیت دے لگیاں، جانے کل جہان

مرزا اور صاحبان کی محبت ظاہر ہے کہ ان کے استاد یعنی مولوی صاحب سے چھپی نہ رہ سکی۔ کہتے ہیں کہ پڑھنے زمانے کے استاد بے حد سخت ہوا کرتے تھے اس لیے مولوی صاحب جنہیں صاحبان، قاضی کہہ کر مخاطب کرتی تھی، وہی اسی نوع کے ہوں گے۔ ان کا اصول یقیناً یہ رہا ہوگا کہ بچے شک جان سے چلا جائے لیکن ڈنڈے کی حکمرانی ہمیشہ قائم رہتی چاہیے۔ صاحبان نے بزدبان پیلوس ڈنڈے کو چھمک کا نام دیا ہے۔ پٹیاں زبان میں چھمک اس چاک کو کہا جاتا ہے جس کی مدد سے کوچوان، تانکہ چلاتے ہوئے ٹھوڑے کی خبر لیتا ہے لیکن مدرسوں یا اسکولوں میں جو چھمک استعمال کی جاتی ہے وہ درحقیقت درخت کی ایک لمبی، مضبوط، موٹی اور ہری بھری شاخ ہوتی ہے جس پر سے بچے اتار لیے جاتے ہیں لیکن جہاں سے بچے اتارے جاتے ہیں وہاں تو کیلے نشان باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ چیز یا چھمک جب انسانی بدن پر پڑتی ہے تو کھال اُتار لے جاتی ہے یا ایسی سرخ لکیر چھوڑ جاتی ہے جس میں سے نہ صرف خون نکل آتا ہے بلکہ کئی روز تک اس جگہ سے جلن ختم نہیں ہوتی۔

بچپن اور لڑکپن میں تو مولوی صاحب نے شاید مرزا اور صاحبان کے ایک دوسرے کو دیکھنے پر اعتراض نہیں کیا لیکن جب بالغ ہونے کے باوجود ان کی باہم سرگوشیاں، دلچسپی اور محبت ختم نہ ہوئی تو مولوی صاحب معترض ہونا شروع ہو گئے۔ تب تک مرزا اور صاحبان اس بڑی طرح ایک

دوسری کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے کہ دین کا عبوس رہ گیا تھا نہ دین کا۔ اکثر و بیشتر وہ مدرسے میں بھی مولوی صاحب کے سبق کے بجائے ایک دوسرے پر زیادہ توجہ دیتے چنانچہ مولوی صاحب کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے چھمک کا استعمال کرنا پڑتا۔

کہانی کے مطابق ایک بار سبق یاد نہ کرنے پر جب صاحبان کی چھمک سے توجہ ہوئی تو وہ بول اٹھی..... نہ مار قاضی چھمکاں، نہ دے تی قیوں تا پڑھنا ساڈا رہ گیا، لے آئے عشق کھا

اوقات (مولوی) مجھے چھمک یعنی ڈنڈے سے مت مارو اور میں تجھے جلاؤ کیونکہ میں تو پہلے سے ہی کسی آگ میں جل رہی ہوں (محبت میں مبتلا ہوں) پڑھنا پڑھانا اور کتابیں اب ہمارے لیے کچھ نہیں رہ سکیں کیونکہ ہم اپنی تقدیر میں محبت اور عشق لکھوالاے ہیں۔ اب یہی ہمارا نصیب ہے اور یہی مقدر! مولوی کی چھمکوں اور مرزا کی محبت بھری نظروں کے سامنے تلے صاحبان جوان ہوئی تو حسن گویا ٹوٹ کر اس پر برسا۔ پیلو نے اسے دلکش اور خوب رو ثابت کرنے کے لیے شاعرانہ مبالغہ آرائی کی انتہا کر دی۔ پیلو کہتا ہے کہ صاحبان ایک دن چٹاری کی دکان پر تیل لینے گئی تو وہ اس کی خوبصورتی دیکھ کر اپنی سادہ بدھ کھوپڑیا اور نہ صرف ترازو پکڑا بھول گیا بلکہ بانوں کا شمار بھی یاد نہ رہا۔ بنیا اس حسن جہاں ہونے سے اس قدر مسحور ہوا کہ اس نے صاحبان کے برتن میں تیل کے بجائے شہ ڈال دیا۔

صاحبان کی جیل قیوں، مٹی پادری دے مٹ پھر نہ جائے نگڑی، ہاڑ نہ جائے وٹ تیل بھلاوے بھلا بانیاں، دنا بہت اٹ

ایک اور جگہ شاعر کہتا ہے کہ جب بھی صاحبان کھینوں کے دریاں سے گزرتی تو کاشت کار مل جوتا بھول جاتے اور چتر کے جسے بن کر یک ٹک اسے دیکھتے اور اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کرتے۔

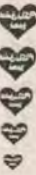
دو گوائے بانیاں، ہلد گوائے جٹ تن سے ناٹا پڑھیا، ہو گئے چور چپٹ مرزے صاحبان دی دوستی، رہی وہی وچ بگٹ حافظ بدخوردار، صاحبان کی تعریف میں پیلو سے کئی بات آگے ہیں۔ انہوں نے صاحبان کی خوبصورتی اور حسن کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ صاحبان آسمان سے اُتری اہریا کوہ قاف سے آتی پری محسوس ہوتی ہے۔

عشق وہے وچ چنڈے، عاشق گھٹ پھر

بیزے عشق مجاز دے، اسی وچ لکھ ترن! جنگ مثال بہشت دے، جتے موران وار کھنڈن پیچھی جو جس جو جھاڑیاں، کھدے عشق پون دج کھوے دی صاحبان، جس تے حواس گھنڈ کھن تے پریاں پر بت تے، جی دا دیکھ حسن صاحبان واقعہ سرکل کھنڈن عیون دو بے واہ پون لباس تے جام شراب دلی عاشق مست تھون صاحبان دے خوشنیں، پکھا بے بازاں دانگ کن اوہ پاڑن ول ول دلاں لوں کیں رات پون چٹیاں تھیں ناداں ترکش جد نین! رکھ نشانے دلاں تے کھیاں دانگ ہن اوہ باجھوں جلیوں، سرمیوں انویں گھاہ کرن جال توکال کڈھن جلیوں، سولی لوک چرھن صاحبان دے مین سندوے، عشق دے ہاٹی مت پھر جینوں شیشہ و پتھیں سائے، اناں حسن چین اوہدا متھانیاں امردا، جال پوہ جیٹی چین اوہدے سرے جیو جی کاڈواں، وچ تلیر یوگ جن اوہدے ہوش پاناں تھیں پنے، دندا نارن دن اوہدی ٹھوڈی حلقہ مسم دا، پرزے ہویتن اوہدے گل چولی چٹاری جو جس جھار بند کر اوہدی چھائی تھیمہ دوا، جتے دونوں مل جھن اوہدی دخی نکل شراب دی جتے عاشق گھٹ پھر اوہدے پٹ دوچن لگیاں، کھیر کھیر ٹھک جھن زہر چڑھائے زہرتے، فیر عاشق کیوں جون ایس کستوری دی بھاروں، حافظ مرزے لاگی سن یوں ایک طرف صاحبان کے حسن کی دھوم تھی تو دوسری جانب مرزا کی جوانی کی دھوم تھی۔ کہتے ہیں کہ مرزا کی پیدائش پر اس کی ماں لاگی مہری نے کہا تھا۔

مرزا پھل گلاب دا، میری جھولی ٹٹ بیا چنانچہ گلاب کا یہ پھول نہ صرف اپنے جو بچن پر تھا بلکہ کھل کر اپنی بہار بھی دکھا رہا تھا۔ وہ ایک شہزادہ، صبیح، بہادر، نڈر، دلیر اور جنگ جو نو جوان بن کر سامنے آیا تھا۔ اس کے گیسو شاٹوں جتنے لمبے تھے۔ وہ بہترین گھڑ سوار اور کمال کا تیر انداز تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ اتنی تیزی سے تیر برساتا تھا کہ ہواؤں کو بھی چھلنی کر دیتا تھا۔ اس کی بہادری کی شہرت نہ صرف جنگ کی آگ کی طرح چاروں جانب پھیلی بلکہ ایک روایت کا درجہ بھی حاصل کر گئی۔

لیکن صاحبان کا حسن اور مرزا کی جوانی مردی مل کر بھی





زمانے کی زبائیں نہ روک سکے اور جب دونوں کی محبت پر اٹھنے والی اکھیں کو زباں ملی تو صاحبان کے گھر والے بھی چونکے۔ صاحبان کے باپ کو پتا چلا تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے کسی کی ایک نہی اور بھانجے کو واپس دانا آباد روانہ کر دیا۔ صاحبان نے اپنے محبوب کی یوں اچانک روانگی کا سنا تو وہ بیمار ہو گئی۔ اس کی بیماری نے اس حد تک شدت اختیار کی کہ اس کے ماں باپ اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ طبیعوں کے علاج سے صاحبان ٹھیک تو ہو گئی لیکن مرزا کی جدائی کے باعث اس کا شاباب ماند پڑ گیا، جس کا حل کسی طبیب یا وید کے پاس نہیں تھا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ مرزا اور صاحبان کی بچپن میں ملتی جلتی طے کر دی گئی تھی لیکن صاحبان کی سوتیلی ماں کو یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ مرزا کو دانا آباد واپس بھیج کر اس نے خان کھیوا کو اس امر پر قائل کر لیا کہ صاحبان کی جلد از جلد کہیں اور شادی کر دی جائے چنانچہ ساندل بار کے ایک اور مشہور قبیلے چدھڑ کے طاہر خان سے صاحبان کی سگائی کر دی گئی اور چدھڑوں سے کہا گیا کہ جلد از جلد برات لے کر آجائیں اور اپنی امانت صاحبان کو بیاہ لے جائیں۔

صاحبان کو یہ رشتہ منظور نہ تھا کیونکہ وہ تو اپنا سب کچھ مرزا کو دے بیٹھی تھی۔ صاحبان نے اس سلسلے میں اپنی ماں کو قائل کرنے کی کوشش بھی کی اور ہیر سیال کی مثال دی۔ منظوم قصوں کے مطابق صاحبان نے ہیر کو پھوپھی سے ہیر کہہ کر مخاطب کیا اور ماں سے کہا کہ پھوپھی ہیر کی شادی رانجھے سے اس لیے نہ ہو سکی کہ ان کی ذات میں فرق تھا۔ ہیر سیالوں کی بیٹی بھی جو اعلیٰ ذات والے تھے جبکہ رانجھا سیالوں کا ملازم تھا۔ ہیر نے اعلیٰ قبیلے سے تعلق کے باوجود ایک کتر قبیلے کا فرد رانجھا سے عشق کیا (حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ رانجھا بھی ہیر کی طرح ذات کا جات اور اس کے ہم سر قبیلے کا فرد تھا) لیکن مرزا سے اس کا شوق اس لیے قبول کر لیا جائے کہ وہ کوئی چاک یعنی ملازم نہیں بلکہ نہ صرف سیالوں کے ہم پلہ اور رشتہ دار قبیلہ کھل کے ایک سردار کا بیٹا ہے اور اس کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔

دوسری جانب ان باتوں سے بے خبر مرزا اپنے علاقے دانا آباد میں بہادری کی دھاک بٹھانے میں مصروف تھا۔ صاحبان اسے بھولی تو نہیں تھی لیکن فی الوقت وہ اپنی گھوڑی بکی (اس کا نام بعض شاعروں اور محققوں نے نیلی لکھا ہے) پر سوار ہو کر دور دور تک پھیلی اپنی زمینوں کی حفاظت کرتا، کہا جاتا ہے کہ مرزا کی گھوڑی بکی، دسویں سکہ گرو، شادی گرو گوہند سکہ کے گھوڑے کی اولاد تھی۔ مرزا اسی گھوڑی پر

گھڑسواری کے مقابلوں میں حصہ لیتا اور نیزہ و جیر اندازی میں وقت گزارتا۔ زمانے بھر کی دلچسپیاں کے پاس نہیں لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ کھیوا اس کی محبت بیت رہی ہے۔

صاحبان ماں کو لاٹھل دیتے دیتے ہار گئی حتیٰ کہ وہ رو آ گیا جب اگلے روز ساندل بار والے چدھڑ اس کی بارگاہ لے کر آئے والے تھے۔ صاحبان نے خاموشی سے قہقہے کموں پر ہنسن (بعض قصہ نگاروں نے اس کا نام کر مومن لکھا ہے) کو بلایا بھجا اور اسے لاٹھ دیا کہ تمہیں ایک گھوڑی کاٹھی، سونا، دودھ دیتی بھینس اور ایک مل انعام میں دوں لیکن کسی طرح مرزا خان تک یہ خبر پہنچا تو کہ کل چدھڑ بیابنے آرہے ہیں۔ وہ مجھے لے جائیں گے۔ تم اگر مرزا میں آئے تو تمہارا آنا کس کام کا۔

صاحبان نے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ دو تمہیں آ کر صاحبان کے ہاتھ بھندری سے رکتے چاہئیں۔ وقت آ گیا کہ اپنی عزت نفس بچانے، وعدوں کی پاسداری اور بیچ کی جیت کے لیے جان کی بازی لگا دو۔

مکوں یہ تو جانتا تھا کہ صاحبان، سردار کی بیٹی ہے لیکن اس نے شاید کچھ اور سمجھا اور صاحبان کو پیش کش کی کہ اس جاٹ (یعنی مرزا) کی دوستی بھول کر اس سے دوستی کر لے۔ صاحبان مارے غصے کی لال چلی ہو گئی۔ اس نے مکوں کو دھمکی دی کہ ابھی جا کر بتاتی ہوں اسے اپنے باپ کو۔ اس کی پچھری میں تمہیں زنجیروں سے بندھوا کر پیش کر اؤں گی تو مجھ سے عشق پتا چل جائے گا۔ مکوں ذات کا برہمن اور پرلے درجے کا بزدل تھا۔ اس نے فوراً صاحبان کے قدموں پر گر کر معافی مانگ لی۔ اس نے گھوڑی لی اور چالیس کوس کا فاصلہ رات بھر میں طے کر کے اگلے روز دانا آباد پہنچ گیا۔

مکوں جس وقت مرزا کے پاس پہنچا، وہ اپنی بہن چھتی کی شادی کے کاموں میں مصروف تھا جس کی اتفاق سے اسی روز برات آنے والی تھی۔ مرزا نے صاحبان کا پیغام سنا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کھیوا جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے باپ، ماں اور بہن بھائیوں نے اس کی بہتری میں اور التجا میں کیں کہ وہ کھیوا نہ جائے۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ سیالوں کی راہ پر مت جا۔ اس راہ میں کاٹنے ہی کاٹنے ہیں۔ یاد رکھ سیالوں کی عورتیں چادوگر نیاں ہوتی ہیں۔ وہ تمہارا کچا نکال کر کھا جائیں گی۔ عورتوں کی دوستی بُری چیز ہے۔ یہ پہلے تو ہنس کر دوستی کرتی ہیں اور پھر مرد کو ساری بات بتا دیتی ہیں۔ یاد رکھ جس گھر میں دوستی ہو، اس گھر میں بھی قدم نہیں

رہتا ہے۔ راہے چھیتی ہوئی سلطنتوں، چور اپنی گرفتاری، عورت اپنے لیے ہونے روپ اور مور اپنے پیروں کی بددعوتی پریش آ سوتا ہے۔

چندہ سے مرزے خان نوں، چھیتی کرے سوال ہٹ کے نہیں مرزا، گھر وچ کریں صلاح اتے پنگ دے یہ کہ، میرے بھینس کاج سنوار بھلے آؤں گے بھٹی ساندل بارو، صاحب سندی یار روٹھی کے لیے تیار مرزے خان کو چھیتی نصیحت کر رہی ہے کہ واپس آؤ اور گھر پرکو۔ چار پائی پر بیٹھ کر صلاح مشورہ کرو اور اپنے ہاتھوں سے میری شادی کے کام انجام دو کیونکہ اس کی ماں کہتی ہے کہ سیالوں کی عورتیں قابل اعتبار نہیں اس لیے وہ کھیوے جا کر بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہے۔

چندہ سے مرزے خان نوں، متاں دیوے ماں برے سیالان دے معاملے، بڑی سیالان دی راہ بریاں سیالان دیاں عورتاں، لہند باں چادو پا! کٹھ گکیج کھاندیاں، میرے جھامے تیل نہ پا دن دی خاطر چلیا، آؤ نیس جان گوا آکے میرے لگ جا، اگے میر نہ پا

ماں مرزے کو بتا رہی ہے کہ سیال (صاحبان کے قبیلے والے) بُرے اور شیطان لوگ ہیں۔ ان کے پاس کوئی بھلائی نہیں۔ ان کی عورتیں بھی ان جیسی ہیں۔ وہ چادوگر نیاں ہیں اور آنے والوں پر چادو کرنے میں ذرا دیر نہیں کرتیں۔ ان کے ہاتھوں میں نہ ٹھیل۔ وہ کسی کی جان لینے میں ذرا عارت نہیں کرتیں اس لیے بڑھاپے میں مجھے دکھ نہ دے۔ ایک عورت کے لیے جارہے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی نہ ملے اور اپنی جان سے بھی جاوے۔ اس لیے میری بات مان لے اور کھیوے نہ جا۔

حافظ برخوردار کے الفاظ میں ماں، مرزا کو کہتی ہے۔ چڑھ دے مرزے خان نوں متیں دے مکی جتول لایے دوستی، نہ جانیے اوس مکی اگے کڑا پت گئے تیل دے، توں اوں نہلت دھری اگے ہاتھی سند دریا عشق وا کروا علی علی دونہاں پڑاں وچ آئیے حافظا کیوں ہندا کیوں ذری ذری بہن اور ماں کی طرح باپ نے بھی مرزا خان کو اسی طرح کی نصیحتیں کیں اور کھیوا جانے سے روکنے کی کوشش کی۔ چندہ سے مرزے خان نوں، وچھل دیندا مت

بھٹھر ناں دی دوستی، کھری جہاں دی مت ہس کے لاندیاں یاریاں، روکے دہندیاں دس عورتوں سے دوستی شیطانی فعل ہے کیونکہ وہ بے وقوف ہوتی ہیں۔ یہ ہنسنے ہوئے بیار کرتی ہیں لیکن جب کوئی آفت آتی ہے تو توڑے ہوئے نہ صرف راز فاش کر دیتی ہیں بلکہ آنسوؤں سے خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ مرزائے جب بہن اور ماں کی طرح باپ کی بھی بات نہ مانی تو رائے وچھل نے اسے کہا۔

جس گھر لایے دوستی، مول نہ جھپے لت! سٹھیں جھتہ نہ آؤندی، دانش منداں دی پت! صاحبان آئیں نہ چھڑ کے، سر نہ ہوئے ساڈی پت جس گھر میں محبت کی جائے وہاں پلٹ کر نہیں جاتے۔ یاد رکھنا! وقت گزر جاتا ہے لیکن عقل مندوں کی کہی ہوئی بات ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اور اگر یہ ساری باتیں تیری کچھ میں نہیں آ رہیں تو پھر جا لیکن خالی ہاتھ مت آنا۔ ایسا نہ ہو کہ تو صاحبان کو چھوڑ کر بھاگ آئے اور تیرے اس فعل سے ہماری بے عزتی ہو۔

دراصل مرزا کے گھر والوں کو خدشا تھا کہ کھیوا والے رشتہ داری کی پروا کیے بغیر اسے مار ڈالیں گے لیکن مرزا نے کسی نہ کسی اور یہ کہتا ہوا کھیوا روانہ ہو گیا کہ

دس مہیناں دا گھیکووتا، بکی دے ڈھڈ پا بکی توں ڈرے فرشتے، میتھوں ڈرے خدا چوہے وچ تیاں، اڈ کے چڑھے آ تاں چڑھنا اپنے شوق کوں، بکی کوں لاچ نہ لا میں نے اپنی گھوڑی بکی کوں مہینوں تک اصلی مکی کھلا کر پالا پوسا ہے۔ میری بکی سے فرشتے اور مجھ سے خدا ڈرتا ہے۔ یہ صرف دوزخ کو ہی نہیں روند سکتی بلکہ مجھے جنت میں بھی لے جاسکتی ہے۔

ایک شاعر نے مرزا کی کھیوا آمد پر اس کی خواہش کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ کتی مرے فقیری، جیہڑی چاؤں چاؤں نت کرے ہئی مرے تراڈ دی، جتھے دیوانت جے! شجست مرن گوانڈ ناں، تے رہندیاں نوں تاپ چڑھے سنجیاں ہو جان گھلاں، وچ مرزا یار پھرے فقیر کی کتیاہر وقت جیہڑی اور شور مچاتی رہتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ یہ مرجائے۔ لوہار کی دکان کو آگ لگ جائے کیونکہ یہاں ہمیشہ روشنی رہتی ہے۔ پانچ سات پڑوسیں مرجائیں اور جو باقی رہ جائیں انہیں ایسا بخار آئے کہ اٹھنے





کے قابل نہ رہ جائیں۔ بس محبوب کے گاؤں کی گلیاں سنسان ہو جائیں جس میں، میں یعنی مرزا اکیلا پھرے اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

لیکن مرزا کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی اور وہ ایک شیر جوان کی طرح تین تین اس وقت کھینچا پہنچا جب صاحبان کے گھر شادی کی ریتیں ادا ہو رہی تھیں۔ مرزانے ساری صورت حال اپنی خالہ بیو کو بتائی۔ بیو فوراً صاحبان کے پاس پہنچی جو اس وقت اپنی سہیلیوں میں گھر رہی تھیں۔ مرزا کی آمد کا پیغام سننے ہی صاحبان محل آگئی اور ہمیں بدل کر اس سے ملنے آگئی۔ صاحبان نے اسے قائل کر لیا کہ وہ اسے دانا آباد لے چلے ورنہ میرے گھر والے تجھے مار ڈالیں گے اور چیدہ میری ڈولی اٹھالے جائیں گے۔

مرزانے سرگوشیوں میں صاحبان سے معاملات طے کیے اور وہ جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔ مرزا وہاں سے ٹھہر کر لوہار کے پاس پہنچا اور اسے کچھ کھوینا بنانے کو کہا لیکن شرط رکھی کہ آدھی رات تک تیار مل جائیں۔ رات کو مرزانے کھوینا لیں اور انہیں مخصوص فاصلے سے کھینچا خان کے گھر کی عقی دیوار میں گاڑ دیا اور خود صاحبان کا انتظار کرنے لگا۔ مقررہ وقت پر صاحبان چھپتی چھپاتی جھپٹ پر پہنچی اور کھوینوں کے سہارے نیچے اتر کر مرزا کی کھوڑی پر آ بیٹھی۔ دونوں ہر ممکن خاموشی کے ساتھ گاؤں سے باہر آئے اور پھر مرزا کی کھوڑی کی یا بلکی تیز رفتاری سے دانا آباد کی طرف چل دی جو کھوہ سے ایک دن سے بھی کم مسافت پر تھا۔

صبح دم جب برات پہنچی تو صاحبان کو تلاش کیا گیا۔ سب سے پہلے صاحبان کے ماموں کے دوست فیروز ڈوگر نے راز کھولا کہ مرزا خان، صاحبان کو بھگا لے گیا ہے۔

یہاں کہانی کے واقعات میں ہلکا سا تضاد ہے۔ کچھ داستان نویسوں کا کہنا ہے کہ مرزا خان اس وقت کھینچا پہنچا تھا جب صاحبان کی برات آ چکی تھی اور اس کی توضیح کی جارہی تھی جبکہ صاحبان اپنے ہاتھ پیر ہندی میں رنگ کر کھی چورہ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مرزا سالوں اس گھر میں رہ کر گیا تھا اس لیے اسے گھر کا نقشہ نہ صرف اذہر تھا بلکہ یہ بھی علم تھا کہ صاحبان کس کمرے میں ہو سکتی ہے۔ اس نے خاموشی سے گھر میں داخل ہو کر ایک با اعتماد عورت کے ذریعے صاحبان کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد وہ خود بھی صاحبان کے کمرے میں جا گھسا، صاحبان کو لے کر نیچے اتر اور اسے کھوڑی پر بٹھا کر فرار ہو گیا۔ کہانی

نویسوں نے جو نقشہ کھینچا ہے، اس کے مطابق صاحبان کو مرزا کی گود میں بیٹھی اور اس سے چٹھی ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا ہے کہ مرزا صاحبان رات کی تاریکی میں کھینچا سے نکلے تھے سیالوں کی عزت ایک بار پھر خاک میں ملنے کی خبر پڑی۔ دیر راز نہ رہ سکی۔ خان کھینچا نے چیخ کر اپنے بیٹوں کا رندوں سے کہا کہ فوراً مرزا کا پیچھا کریں اور اسے دانا آباد پہنچنے سے پہلے موت کے گھاٹ اُتار دیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کا گاؤں مرزا صاحبان کی طرف میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ عشق انسان کو اس طرح تباہ کر دیتا ہے جیسے برف درختوں کو اجاڑ دیتی ہے۔ کونسی گہری نیند نہیں آتی اور عاشق کی بھوک اڑ جاتی ہے۔ مرزا عاشق بھی تھا اور عورت چڑا کر بھی لے جا رہا تھا لیکن اس کی بد قسمتی تھی کہ دور دوروں سے مسلسل جاگنے کے باعث اسے نیند آنے لگی یا ممکن ہے کہ وہ فتح کے نشے میں چور ہو گیا ہو چنانچہ سنانے کے لیے وہ راستے میں ایک جنگل میں رک گیا (اس جنگل کا حدود اور بعد موجودہ فصل آباد سے کچھ کلومیٹر دور سر شیر روڈ کے نواح میں بتایا گیا ہے۔ یہ قصہ بھی صاحبان کے بڑے بھائی شیر خان کے نام پر آباد ہے اور یہ روایت بھی ہے کہ مرزا کو اسی جگہ کے آس پاس موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا)

صاحبان نے اسے رکنے سے منع کیا۔ وہ جانتی تھی کہ سیال ان کا تعاقب ضرور کریں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ دانا آباد پہنچ کر دم لیا جائے لیکن مرزا کا جواب تھا کہ وہ سیالوں کے زیر اثر علاقے سے نکل آیا ہے لہذا خطرے کی کوئی بات نہیں ہے اور یوں بھی کوئی سورا، مرزا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں سیالوں کے سر کاٹ کر رکھ دوں گا۔ میرے تیر کا نشانہ کسی خطا نہیں جاتا۔ بس مجھے چند گھرانے سولینے دو۔

صاحبان کہہ رہی تھی۔ عشق لٹاڑے آدی، برف لٹاڑے رکھ نیندر نہ آوندی چوروں، عاشق نہ لگے کچھ صاحبان مرزے دی دوتی، جگ نہ ڈنکی لک لے چل دانا آبادوں، جان لگاوے کچھ مرزا تو سو گیا لیکن صاحبان اپنے عاشق کی رکھائی کرتے ہوئے سیکڑوں وسوسوں کا شکار ہونے لگی۔ وہ سوچے لگی کہ اگر اس کے بھائیوں نے انہیں پکڑ لیا اور مرزا کو مار دیا تو کیا ہوگا۔ مرزا کمال کا نشانہ نہ باز ہے۔ اگر اس کے بھائی مرزا کے نشانہ سے پر آ گئے تو کیا وہ بچ پائیں گے؟ صاحبان سوچتی رہی اور اپنے سوئے ہوئے عاشق کی

بہرے داری کرتی رہی لیکن اس کے دل کا خوف اور وسوسے بہت جلد حقیقت کا روپ دھار گئے۔ سیالوں کو دانا آباد کے راستے کا علم تھا۔ پھر ایک کھار نے بھی تصدیق کر دی کہ اس نے مرزا صاحبان کو ایک کھوڑی پر سوار سی طرف جاتے دیکھا ہے چنانچہ سیال گھڑ سوار بہت جلد ان کے سروں پر آ پہنچے۔ صاحبان نے مرزے کو جگانے کی کوشش کی لیکن بے سود رہی۔ صاحبان کی منت زاری کسی کام نہ آئی اور مرزا بدستور دانا آباد پہنچا۔

انہیں مرزا ستیا، گھسے آئے اسوار بھٹیں جھٹاں رنگیاں کردے مارو مار میرے ہاتھ رو گیاں گھوڑیاں ویر میرے اسوار کی دھنداون اسار دے، کی میر شکار اب آنے والے صاحبان کو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سب سے آگے اس کا بھائی شیر تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مرزا کے تیر کا نشانہ بھی خطا نہیں جاتا۔ اس نے اپنا ترش اور کمان سنبھال لی تو سب سے پہلے میرا بھائی اس کی راہ میں آئے گا۔ اس وقت مرزا کے ترش میں تین سو ساٹھ تیر تھے۔ بعض شاعروں کے مطابق تین سو تھے لیکن یہ طے تھا کہ سیالوں سے مقابلے کے لیے مرزا کو یہ تیر بہت تھے۔ یہی وجہ کہ صاحبان کو فکر ہوئی کہ اگر یہ سارے تیر موجود رہے تو میرے بھائی شیر خان کا بچنا محال ہے۔

اس وقت وہ مرزا خان کی محبوبہ کے بجائے خان شیر کی بہن بنی تھی جبکہ بعض نے لکھا ہے کہ ایک روایتی مشرقی عورت کی طرح صاحبان کی محبت بھائیوں اور محبوب میں تقسیم ہوگئی۔ وہ ان میں سے کسی کی موت نہیں چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سارا معاملہ بغیر کسی خون خرابے کے طے ہو جائے گا چنانچہ اس نے جلدی سے اٹھ کر مرزا کا ترش درخت کے بہت اوپر ناگ دیا جہاں مرزا کا ہاتھ نہ جاسکتا تھا۔ اس کی کمان کے ساتھ صرف تین تیر رہ گئے تھے۔ بعض شاعروں نے لکھا ہے کہ صاحبان نے ترش کے تمام تیر توڑ دیے تھے۔ اس کے بعد اس نے ایک بار پھر کوشش کی کہ مرزا جاگ جائے اور وہ دونوں کھوڑی پر سوار ہو کر سیالوں کی دھڑس سے اور دانا آباد پہنچیں۔

لیکن اس کی یہ آخری کوشش بھی بے کار گئی۔ سیال جب پہنچے اور انہوں نے لکارنا شروع کیا تو شورے مرزا کی آواز کی طرح اڑا۔ وہ تیزی سے اپنی کمان کی طرف لپک لپک کر رہا تھا کہ وہاں صرف تین تیر رہ گئے ہیں اور باقی اسی ترش میں تیر درخت کے اوپر لٹک رہا تھا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ صاحبان نے

کیا ہے جس کی محبت پر بھائی کا پیار غالب آ گیا تھا۔ حافظ برخوردار، مرزا کی زبان سے آخری شکوہ کچھ یوں کرتے ہیں۔

مندا کیتوئی صاحبان، میرا ترش ٹنکیوئی جنڈ ترے سوٹھ کا میرے ساروی، دیندا سیالیں وٹ پہلی ماراں خان شیر نوں، دوجی کٹے دے تنگ ترے جی ماراں اوس نوں، جس دی توں میں منگ چوکی ماراں اوس نوں، جیندی توں میں فرزند میرے سروں منڈا سا ڈھب پیا، ٹکی ہوگئی جھنڈ بابجوں بھراواں سکیاں، میری کول گھسی کنڈ کول ہندے بھائی کے، میرا یار بیڑا لیندے وٹے اور پیلو کہتا ہے۔

سروں منڈا سا ڈھب، گل وچ پیندی جھنڈ بابجوں بھراواں جٹ ماریا، کوئی نہ مرزے دے سنگ مرزانے صاحبان کو سیالوں سے مل جانے کا طعنہ دیتے ہوئے پہلا تیر پوری طاقت سے کمان کھینچ کر چھوڑا جو خان شیر کے گھوڑے کو لگا اور وہ گھوڑے سمیت نیچے گر پڑا۔ اس سے بہتر شکر کہ وہ دوسرا تیر اچھلا تا۔ خود اس پر تیروں کی بارش ہوگئی۔ اس کے جسم کے کئی حصوں سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ اس نے ڈوبتی ہوئی نظروں سے صاحبان کو دیکھا اور لکھڑائی زبان میں شکوہ کیا ”صاحبان! تم نے مجھے دھوکے سے مروا دیا۔ کاش تم میرا ترش ناگ کر مجھے بے بس نہ کرتیں۔ تم نے صرف مجھے ہی نہیں، خود کو بھی مروا دیا۔“ دھرت پڑی رن صاحبان، میری وچاںیں ٹی لاں جے نہ سی توڑ بھاونی، میری کا ہنوں پکڑی ہانہ چھوئی کئی غضب دی، لے لگی مرزے نوں نال روح مرزے دی نکل گئی، لگی چند و نال! منداں کہتا صاحبان، توں دل نہیں سیال نال بعض تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ مرزا کے تیر نے گھوڑے کو نہیں بلکہ شیر خان کو نشانہ بنایا تھا اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا جبکہ دوسرے کہتے ہیں کہ مرزانے نیندے اٹھ کر اپنی کمان اور ترش تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ نہیں ملا اور اسی اثنا میں خان، شیر کا چلایا ہوا تیر اس کے حلق میں ترازو ہو گیا۔ دوسرا تیر مرزا کے سینے میں لگا اور وہ تیرا کر زمین پر گر پڑا۔ اس نے شکوہ بھری نگاہوں سے صاحبان کی آنکھوں میں جھانکا اور بقول پیلو..... کہا۔

مندا کہتاں صاحبان، میرا ترش ٹنکیا جنڈ جیتی، سستی اور ملتی صاحبان نے مزید تیروں اور جنموں



سے بچانے کے لیے خود کو مرزا کے نیم جاں بدن پر گرایا لیکن سیالوں کے تیروں نے ایک دوسرے میں پیوست جموں کو وہیں چھید ڈالا۔ کچھ کہتے ہیں کہ مرزا کی لاش وہیں جلادی گئی۔ بعض شاعروں نے لکھا ہے کہ صاحبان کو زندہ گھوڑے پر لٹکایا گیا اور وہاں اسے قتل کر دیا گیا لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ دونوں کی لاشوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

مرزا کی گھوڑی نیلی (بکی) البتہ اس قتل و غارت سے بچ نکلی چنانچہ جب وہ خالی زین کے ساتھ دانا آباد پہنچی تو وہاں کبراہم چم گیا۔ سوار کا غائب ہونا، سیالوں کی سفاکی کی داستان سنانے کو کافی تھا۔

مرزا کی ماں (اور بعض شاعروں کے مطابق اس کا چچا ابراہیم) اپنے قبیلے کے سرداروں کو سیالوں کے ظلم کی داستان سناتی ہے چنانچہ کھل پوری قوت کے ساتھ کھڑا پر حملہ کرتے ہیں اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔ یعنی سیالوں کے ساتھ ساتھ چھوڑ دی گئی اس قتل عام کا نشانہ بنتے ہیں اور یوں گلاب کے پھولوں سی اس داستانِ محبت کا انجام خوں ریزی اور قتل و غارت پر ہوتا ہے۔

کھل، مرزا اور صاحبان کی لاشیں بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ پورے کھڑا شہر میں حملہ آوروں کے ہاتھوں صرف ایک مسجد باقی بچی جسے احتراماً چھوڑ دیا گیا۔ یہ مسجد آج بھی موجود اور مرزا صاحبان کی لازوال محبت کی گواہ ہے۔

پنجابی زبان میں مرزا صاحبان کی داستانِ محبت کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے راوی بیلو نے تو یہ لکھ کر قصہ تمام کر دیا کہ

مرزا باریا ملک الموت داء کچھ مار یا اوہوں گمان
وچ قبرائ دے کھپ گیا، مرزا سوہنا جوان
لیکن اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑ گیا جن میں سب سے بڑا سوال محققین کی نظر میں یہ ہے کہ خود بیلو کون تھا۔ وہ کب اور کہاں پیدا ہوا؟ کچھ لوگ بے شک اسے چچوال کے نواحی گاؤں کا باشندہ قرار دیتے ہیں لیکن مستند ذرائع اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ بیلو 1601ء سے 1650ء کے درمیان حیات تھا اور دیگر تمام رومانوی داستانوں کی طرح مرزا صاحبان کی کہانی بھی نسل و نسل سنائے جانے کے بعد بیلو تک پہنچی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیلو خود بھی کوئی قصہ خواں یا داستان گوئی رہا ہو۔

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کہ بیلو کی بیان کردہ داستان متعدد حوالوں سے بے حد اہم ہے۔ اس نے اپنے دور کے پنجاب اور اس سرزمین پر جنم لینے والی محبت کی بیج

عکاسی کی ہے جو کسی خاص مذہب، فرقے یا قبیلے کے نہیں۔ کچھ محققین کہتے ہیں کہ تم تک پہنچنے والا بیلو کا قصہ مرزا نہیں۔ اسے پڑھتے ہوئے کئی مقامات پر غلطی کا احساس ہوتا ہے جیسے اختتام پر مرزا تو مرگیا لیکن صاحبان پر کیا بیلو اس بارے میں خاموش ہے چنانچہ بعد کے شاعروں نے مصنفوں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا کہ صاحبان کو تیروں سے چھید دیا گیا ہوگا یا پھر اس نے اسی تلوار کو اپنے سینے میں گھونپ لیا ہوگا جس سے مرزا کو قتل کیا گیا ہوگا۔

بیلو نے لکھا ہے کہ مرزا، شیر خان کے تیروں کا نشانہ لیکن دیگر مصنفین لکھتے ہیں کہ سیالوں اور چھڑوں میں مشہر کہ طور پر مرزا پر چڑھائی کی۔ مرزا اپنی بہادری اور جانفشانی کے جوہر دکھاتا رہا اور نہایت دلیری سے لڑا۔ بہت سے لوگوں کے سامنے نہ شہر سکا۔ اسے عقب سے گولے مار کر گرایا اور بعد میں اس کے سر پر تلوار سے ضرب لگائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ لب مرگ مرزا نے صاحبان سے پوچھا کہ اس نے تیر کیوں توڑے؟ صاحبان نے اسے بتایا کہ اگر وہ تیر نہ توڑتی تو وہ انہیں صرف ہوا میں چلاتا تا کہ آنے والے نہ دے جاتے کیونکہ وہ اس کے بھائیوں کے قتل کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ صاحبان یہ سن کر رونے لگے۔ وہ چوہ مرزا کے بغیر زندہ نہیں رہتا چاہتی تھی اس لیے اس نے اسے قتل کر دیا اور اٹھائی جس سے مرزا کو قتل کیا گیا تھا اور اپنے سینے میں اُتار کر اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

بیلو نے لکھا ہے کہ مرزا دانا آباد میں رائے و نجل اور صاحبان، کھڑا کے سردار کے گھر پیدا ہوئی۔ اس کے نورانی دونوں کو مسجد میں اکٹھے تعلیم حاصل کرتے بتایا گیا۔ بعد میں لکھی جانے والی کہانیوں سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ مرزا ابتدائی دینی تعلیم کی تکمیل کے لیے لٹوانا آباد سے کھڑا بھیجا گیا اور دونوں کے درمیان محبت، مسجد میں دورانِ تعلیم پرانے چڑھی۔ یہاں ایک دلچسپ حقیقت کی نشاندہی بھی کر دی جائے کہ بیلو نے مرزا اور صاحبان کی داستانِ محبت تو سن لی لیکن اپنی تحریر میں یہیں پیار یا محبت کے الفاظ ادا نہیں کیے۔ مرزا صاحبان کی محبت کو دوستی کا نام دیا۔ مجموعی طور پر بیلو سات مقامات پر لفظ ”دوستی“ کا استعمال کیا ہے۔

بیلو کے بقول مرزا کو اچانک اس کے گاؤں والوں سے دیا جاتا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ کیوں بھیجا جاتا ہے؟ کہ اس کی پڑھائی مکمل ہو گئی ہو یا شاید اس لیے کہ صاحبان سے اس کی محبت راز نہ رہ سکی تھی۔ اسی طرح خان کھڑا صاحبان کی شادی کے لیے چھڑوں کو کیوں چنا جبکہ

اس کا بھانجا تھا اور صاحبان، طاہر چھڑ کی نسبت مرزا کے ساتھ زیادہ پر محسوس زندگی گزار سکتی تھی کیونکہ چھڑ کسی بھی مسئلے پر معائنات کا حوالہ دے کر صاحبان کی زندگی اجیرن کر سکتے تھے لیکن مرزا کے ساتھ شادی میں ایسا کوئی معاملہ بھی جنم نہ آتا۔

دو اور معنی محل طلب ہیں کہ مرزا، صاحبان کی شادی والے دن کھڑا پہنچا تھا یا مہندی والے روز۔ بعض شاعر اور مصنف مصر ہیں کہ مرزا، کھڑا میں زیادہ وقت نہیں رکھا لیکن کچھ کہتے ہیں کہ وہ تمام دن وہاں رہا اور اس نے لوہار سے کھوپڑیاں بنوائیں تاکہ ان کے سہارے صاحبان چھت سے نکل کر اس کے پاس آسکے۔ بیلو اس پر بھی کچھ زیادہ روشنی نہیں ڈالتا تاہم بعض معروف روایات کے مطابق صاحبان وہیں کے لباس میں مرزا کے ساتھ فرار ہوئی تھی جس سے اس خیال کو قوت ملتی ہے کہ مرزا اس کی شادی والے دن کھڑا پہنچا اور رات کی تاریکی میں اسے لے کر دانا آباد روانہ ہوا۔

دوسرا معتبر مرزا کا راستے میں رکن ہے کیونکہ کھڑا دانا آباد کا قاصد محض چالیس کوس تھا اور گھوڑے پر ایک دن سے بھی کم وقت میں منزل پر پہنچنا جاسکتا تھا۔ مرزا یہ بھی جانتا تھا کہ وہاں سیالوں کی سرزمین پر ہے جن کی بیٹی بھگا کر دھنکی کی بنا پر رکھ چکا ہے اور وہ اس کا تعاقب ضرور کریں گے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ صاحبان نے مرزا کی گھوڑی بکی کا مذاق اڑایا تھا جو اسے بے حد عزیز تھی اور وہ محض یہ ثابت کرنے کے لیے رتا تھا کہ کچھ وقت آرام کے باوجود سیال اس کی گھوڑی کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتے۔

ایک اور وجہ ”مردانگی“ ہو سکتی ہے جس کا تقاضا تھا کہ وہ ہندوں کی طرح نہ بھاگے بلکہ مردوں کی طرح دشمنوں کا مقابلہ کرے۔ بیلو کی شاعری سے ہٹا چلتا ہے کہ مرزا، صاحبان کے بھائیوں اور ان کے ساتھیوں کو جان سے مارنا چاہتا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ جب مرزا کے سستانے کے دوران شیر وہاں پہنچا تو مرزا نے ایک ہی تیر میں اسے مار بھی گرایا تھا۔ صاحبان کے خیال میں ممکن ہے کہ یہ تیر اندازی کے جوہر دکھانے کا مناسب موقع نہ ہو اور شاعر اس بارے میں کوئی بھی جواز کیوں نہ پیش کرے لیکن حقیقت یہی ہے کہ صاحبان نے اپنے عاشق سے غداری کی اور اپنے بھائیوں کے ہاتھوں اسے مروا دیا لیکن اس کے باوجود وہ خود بھی زندہ رہا۔ محققین اس بارے میں کچھ بھی کہیں لیکن فی زمانہ صاحبان کے جرم کی شدت کو کم کرنے کے لیے یہ

ماہنامہ سرگودشت

استدلال بھی پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ظاہری طور پر خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ من کی بھی خوبصورت تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے خون بہایا جائے۔ وہ حتا کے بجائے اپنے ہاتھوں کو خون سے نہیں رنگتا چاہتی تھی جبکہ وہ ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئی تھی کہ دونوں جانب سے مرنے والا اس کا اپنا ہی ہوتا۔ ایک طرف اس کی محبت مرزا تھا تو دوسری جانب اس کا بھائی۔ وہ جانتی تھی کہ مرزا کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا اور اگر مرزا نشانہ لے گا تو نشانہ بننے والا اس کا اپنا بھائی ہی ہوگا۔ بھائی پر اعتماد اسے ایک بہت بڑی غلطی پر مجبور کرتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اس کا بھائی اس پر ترس کھائے گا اور انہیں معاف کر کے گلے لگے گا۔ اسی خیال سے وہ مرزا کو جگانے سے پہلے اس کا تیر کمان بٹا دیتی ہے لیکن بھائی اس کی سوچ کے برعکس مرزا پر حملہ کر دیتا ہے اور مرزا مارا جاتا ہے۔ صاحبان یہ برداشت نہ کر سکی اور اس نے تلوار اپنے سینے میں اتار کر خودکشی کر لی۔

پنجاب کی سرزمین سے تعلق رکھنے والی رومانوی داستانوں میں مرزا صاحبان کا قصہ وہ واحد کہانی ہے جس میں مرد کا نام پہلے آتا ہے اور عورت کا بعد میں۔ دوسری کہانیوں یعنی ہیر راجا اور سوئی میمنوں میں لڑکی کا نام پہلے لکھا جاتا ہے۔ کسی پنوں کو بھی اسی صف میں شامل کیا جاتا ہے اور پنجاب کی لافانی رومانوی داستان ہی قرار دیا جاتا ہے لیکن مصدقہ حقائق سے ثابت ہے کہ کسی پنوں کی کہانی سندھ اور بلوچستان کی داستان ہے، پنجاب کی نہیں۔

یہ تمام داستانیں محبت کرنے والوں کی موت پر ختم ہوتی ہیں لیکن پنجابی اس المناک انجام کو محبت کرنے والوں کی فتح قرار دیتے ہیں۔ ان کرداروں پر لا تعداد لوگ گیت لکھ گئے ہیں جنہیں نہایت محبت و عقیدت سے گایا جاتا ہے اور سنا جاتا ہے کیونکہ محبت نہیں سکتی بلکہ ان محبت کرنے والوں کے دنیا ترک کرنے سے ان کی محبت امر ہو گئی ہے۔

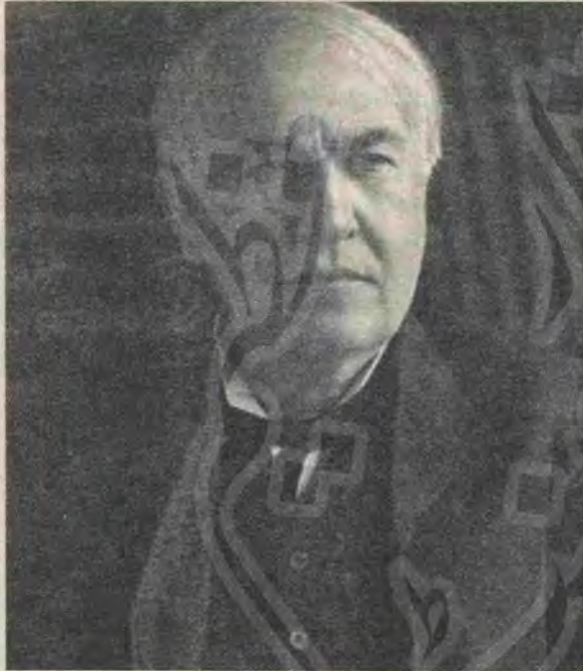
اسی قسم کے خیالات کا اظہار وارث شاہ کے کلام ہیر میں بھی ملتا ہے جو ہیر کی محبت کو اسی انداز سے دیکھتے ہیں جیسے خدا سے حقیقی محبت۔ جب وارث شاہ محبت کے مضمون کو شروع کرتا ہے تو پہلے خدا سے مدد مانگتا ہے۔ یہی ریت ہے پنجاب کی اور پنجابیوں کی، جہاں مرنے والوں کی محبت کو زندہ سمجھا جاتا ہے اور اسے حقیقی محبت کی روح گردانا جاتا ہے۔

ناقدین کا کہنا ہے کہ جیسے ہر معاشرے میں اخلاقیات کی جانچ کے لیے دو معیار ہوتے ہیں ایسے ہی پنجابی معاشرے میں بھی ہیں۔ ان معیاروں کے تحت ہر شے کو دوڑاویوں سے



عشق شش جہت

عافیہ فاروقی



عشق اپنے آپ میں شش جہت ہے۔ عشق صرف دودلوں کے ملن کا نام نہیں۔ عشق جاندار کے علاوہ ہی جان بستوں سے بھی ہوجاتا ہے۔ کسی کو تحصیل علم سے عشق ہوتا ہے تو کسی کو اپنے پیشے سے۔ اور کسی کو قدرتی مناظر سے۔ ایسے ہی چند باکمال شخصیات کا تذکرہ جنہیں عشق کسی اور چیز سے تھا مگر ناکامی کے بعد قسمت نے کسی اور طرف ہانک دیا۔

عشق کی ایک اور شاخ کا تذکرہ

عشق کے ہزار پہلو ہوتے ہیں۔ ایسے ہزاروں لوگ گزرے ہیں جنہیں اپنے مقصد کوئی ضروری نہیں ہے کہ عشق صرف انسان سے ہو۔ خدا سے بھی ہوتا ہے، کسی جانور سے بھی اور اپنے کام سے بھی۔



اور مزے آسمان کی طرف کمان کا رخ کر کے کوئی تیر چلا تاکہ مسرت و شادمانی کا یہ بند برتن ٹوٹے۔ جہاں تک مرزا اور صاحبان کا تعلق ہے تو وہ آج بھی اپنے اپنے علاقوں میں حکمران ہیں لیکن صدیاں گزرنے کے باوجود سیال، ہیر اور صاحبان کا ذکر کرتے ہوئے بھیجتے ہیں کیونکہ اتفاق سے دونوں ہی ان کی بیٹیاں تھیں۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے لیکن قابل حیرت امر یہ ہے کہ کھرل بھی مرزا صاحبان سے اجتناب برتتے ہیں۔

مرزا صاحبان کا مقبرہ تحصیل جڑانوالہ کی یونین کونسل واہ آباد کی حدود میں چک 484 جی بی (ج ب) جھنڈ والی میں نہایت خستہ حال میں موجود ہے۔ ان قبروں کی نشو و نما بحال کی جاتی ہے اور نہ ہی مقامی آبادی اپنی عورتوں کو اس مقبرے پر حاضری کی اجازت دیتی ہے کیونکہ انہیں خوف ہے کہ اس طرح وہ مرزا صاحبان کی تقلید کریں گی، اس پابندی کی حمایت میں وہ جواز پیش کرتے ہیں کہ مقبرے کے ارد گرد کی ایسے واقعات پہلے ہی رونما ہو چکے ہیں۔

2009ء میں دانا آباد یونین کونسل کے ناظم مارے رشید کھرل نے بتایا کہ پچاس برس پہلے مزار کے متولی پیلو میراٹی کی بیٹی اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی تھی۔ پیلو میراٹی یہ خبر سن کر انتقال کر گیا اور اس کی قبر بھی مزار کے نزدیک ہی موجود ہے۔ اس واقعے کے بعد علاقے کے رہائشی اس نتیجے پر پہنچے کہ مقبرہ پر حاضری سے عورتوں کے اپنے گھروں سے فرار کے مزید واقعات رونما ہو سکتے ہیں چنانچہ انہوں نے اپنی خواتین کے مزار پر جانا بند کر دیا۔

جھنڈ والی کے رہائشی حیات کھرل نے اس پابندی کی حمایت کرتے ہوئے بتایا کہ آٹھ سال پہلے یعنی 2004ء میں اسی گاؤں کے رہنے والے اکرم عرف اکری کی بیٹی مزار سے واپسی پر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ ایک اور رہائشی شہادت علی کھرل نے انکشاف کیا کہ ان کے بزرگوں کے خیال میں اس مقبرے کو ہمارا کر دیا جاتا چاہیے کیونکہ یہ مرزا صاحبان کی ”گندی آرام گاہ“ ہے۔ ایک اور رہائشی قاسو کھرل کا کہنا تھا کہ مرزا صاحبان کی یادگار مٹا دی جانی چاہیے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ پنجاب اور پنجابی ثقافت کی آبرو کھلانے والے مرزا صاحبان کی قبروں سے اتنی نفرت کیوں کی جاتی ہے؟ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو مرزا صاحبان اور ہیر کے بغیر سیالوں اور کھرلوں کی حیثیت ایک عام سے قبیلے یا برادری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

دیکھا جاتا ہے۔ ایک انتہائی نزدیک سے اور دوسرا ذرا فاصلے سے، جہاں ایک طرف تو اخلاقی اقدار ہیر کو رکھانے پر مجبور کرتی ہیں اور دوسری جانب اس کے مزار پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں، چراغ جلائے جاتے ہیں اور دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ سکی، ہیر، سوخی، صاحبان اور ان جیسے بے شمار دوسرے لوگوں نے اسی دو غلط معیار کے خلاف جنگ کی ہے چنانچہ اسی لیے پنجابی ادب اور تہذیب ان کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔

پنجابی کے لہجہ گلوکار عالم لوہار مرحوم نے مرزا صاحبان کی داستان اپنے رنگ میں گا کر امر کر دیا ہے۔ عالم لوہار کا کہنا ہے کہ ”اگر کوئی لہجہ اچھٹ جائے تو اسے پسینہ لگایا جاسکتا ہے لیکن بھٹے آسمان کو کیسے سیاجائے؟ اسی طرح شوہر مر جائے تو دوسرا مل سکتا ہے لیکن محبوب کے مرنے پر بھلا کیسے زندہ رہا جاسکتا ہے؟

اور شاید یہی ایک بہادر (اور کبھی حد تک باغی) پنجابی عورت کا حوصلہ ہے جو اسے بے وقوفی کی آخری حدوں تک لے جا کر اس طرح کا ڈٹن دیتا ہے کہ جب وہ اپنے محبوب سے تحفہ مانگتی ہے تو کہتی ہے ”میرے لیے آسمانوں سے ایک شرٹ بناؤ اور اسے زمین پر رکھ کر سیو“ مرزا صاحبان میں پنجابی عورت کی یہ فرمائش بدرجہ اتم موجود ہے اور عالم لوہار نے اسی جذبے کو اجاگر کیا ہے۔

ایک اور پنجابی گلوکار ہرچمن مان نے بھی مرزا صاحبان کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا ہے لیکن اس کی بنیاد پیلو کا قصہ ہی ہے۔ گانوں کے علاوہ برصغیر پاک و ہند میں مرزا صاحبان پر کئی فلمیں بھی بنائی گئیں جن میں سے 1957ء میں بننے والی فلم نے بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ اس فلم میں بھارتی اداکار شمی پور نے مرزا، اداکارہ شیا مانے صاحبان، رام سنگھ نے میرا و مدن پوری نے شیر کا کردار ادا کیا۔

آج کے پنجابی ادب میں راٹھاجا کو اس کی بانسری، سوخی، کوکے گھڑے (جس پر وہ ہجیرے ہوئے دریائے چناب کو پار کیا کرتی تھی) اور مرزا کو اس کی بہادری و دلیری کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال معروف شاعر میر نیازی مرحوم کی نظم کا ایک بند ہے۔

جتاں کرو جھجھ دوستو، توڑو موت و اجل
پہڑ مرلی اورا بھجیا، کدھ کوئی چیکھی تان
مار کوئی تیر اور مرزا، کچھ کے دل آسان
دوستو! اس مایوسی اور اداسی کو کم کرنے کے لیے کچھ کرو،
راٹھجا اپنی بانسری نکال اور کوئی دھڑ تان فضا میں بکھیر۔

عاشق کو اپنے محبوب کے علاوہ کسی اور کا دھیان نہیں رہتا۔
یہ جنونی اور ایب نارل لوگ جب کام کرنا شروع
کرتے ہیں تو انہیں کھانا پینا بھی یاد نہیں رہتا۔
ایسے لوگوں میں تاریخ کے بہت بڑے بڑے نام
ہیں۔

یہ لوگ اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب بھی نہیں رہے
بلکہ ناکام ہی ہوتے ہیں ”ناکامیوں نے اور بھی خود سر
بنادیا۔ اتنے ہوئے ذلیل کہ خود دار ہو گئے۔“
انہوں نے اپنی ناکامیوں سے توانائی حاصل کی۔
طاقت پائی، بدل نہیں ہوئے اور اپنے مقصد اپنے کام سے
عشق کرتے رہے اور اس عشق نے انہیں وہ مقام عطا کر دیا
کہ ساری دنیا ان کے ناموں اور کاموں سے واقف ہے۔



گلوکار ایلس پریلے

ہم نے ایسے چند کامیاب لیکن ناکام لوگ تلاش کیے
ہیں۔ آئیں، آپ بھی ہمارے ساتھ شیئر کریں۔
دنیا کا یہ کامیاب ترین شخص بے تحاشا ناکام ہوا۔
اس کو غلطیوں اور تجربات کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ یہ وہ
شخص تھا جس نے اپنے کام سے عشق کی مثال قائم کر دی
تھی۔

کون نہیں جانتا کہ تھامس ایڈیسن کون تھا؟

اس نے پوری دنیا کو اپنی سیکڑوں ایجادات کے تحفے
دیے ہیں۔ بلب، مشینیں، سلائی مشین اور نہ جانے کیا کیا۔
کہا جاتا ہے کہ اس کی ایجادات کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔
اور سیکڑوں چیزیں ایجاد کرنے والا ہزاروں بار ناکام
ہوا۔ اس کی ناکامیوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ اس
نے ایک بار اپنی ناکامیوں کے حوالے سے ایک سوال کے
جواب میں کیا خوبصورت بات کہی ہے۔

”کون کہتا ہے کہ میں ناکام ہو رہا ہوں۔ میں ناکام
نہیں ہو رہا۔ بلکہ میں نے ایسے ہزار طریقے ڈھونڈ لیے ہیں
جو کارآمد نہیں ہیں۔“

یعنی وہ ناکام راستوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے
رہا تھا اور جب نوسو ننانوے راستوں کے بعد ہزاروں
راستے پر پہنچا تو پوری دنیا میں اس کے نام کی دھوم مچ گئی۔
اس نے پوری دنیا کو اپنی ایک اور ایجاد کا تحفہ دے دیا تھا۔
یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ بچپن میں وہ بہرا تھا۔
اپنی کلاس میں اس کی پوزیشن بہت خراب تھی۔ اس
کے استاد اس کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ یہ بچہ آگے
چل کر کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔
اس کا کہنا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ وہ بہرا تھا، ورنہ
لوگوں کی بدول کرتی باتیں اور ان کے دل شکن تبصرے اسے
کبھی آگے نہیں بڑھنے دیتے۔

اسی لیے وہ تبصرے اس نے سنے ہی نہیں اور اپنے
کاموں میں مصروف رہا اور آج ہم اس کا نام عزت اور
احترام سے لیتے ہیں۔

موسیقی سے شوق رکھنے والا ہر شخص اس کو جانتا ہے۔
پوری دنیا میں اس کے کروڑوں پرستار تھے۔ وہ جدم
سے گزرتا صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ
مزدوروں پر کھڑے رہتے۔

بلاشبہ وہ موسیقی کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا۔ کہا جاتا
ہے کہ ایک بار وہ اپنی سفید گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے کئی
کام سے گیا تھا۔ واپس آیا تو لپ اسٹک والے ہونٹوں کے
نشانات نے اس گاڑی کا رنگ بدل دیا تھا۔
ایلس پریلے بھی عاشق تھا۔

اپنے کام کا، موسیقی کا۔ ایسا جنونی شاید ہی کوئی اور ہو۔
ہو۔ موسیقی کو اس نے اپنا اور حنا بچھونا بنا لیا تھا۔ موسیقی اس کا
شوق نہیں بلکہ عبادت تھی۔

وہ کمال کا آدمی تھا لیکن اس کمال کے رتبے تک پہنچنے
کے لیے اسے بے شمار ناکامیاں برداشت کرنا پڑی تھیں۔
اتنی بدولی ہوئی تھی کہ وہ کچھ عرصے تک گوشہ نشینی میں چلا گیا
تھا۔

اس نے اپنے پہلے الہم میں اپنی جان کی بازی لگا دی
تھی۔ اسے اپنے اس الہم سے بہت سی امیدیں تھیں۔ اس کا
خیال تھا کہ یہ الہم پوری دنیا میں دھوم مچا دے گا لیکن کیا ہوا۔
وہ الہم نقض میں تحلیل ہو گیا۔ اس کا ٹوٹا ہوا ہی نہیں لیا گیا

تھا۔ کسی نے سنا ہی نہیں تھا۔ ایلس کے لیے یہ بہت بڑی
ناکامی تھی۔
اس نے کچھ دنوں کے بعد پھر محنت کی۔ یہ نقد اس نے
بہت دل لگا کر کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بار اس کا یہ نقد
اس کے لیے کامیابیوں کے راستے کھول دے گا۔
لیکن وہ نقد بھی ناکام ہوا۔ لوگوں نے اس پر تبصرے تو
کیے لیکن بہت حوصلہ شکن۔ بددل اور مایوس کر دینے
والے۔

لیکن جن کو اپنے مقصد سے عشق ہوتا ہے، وہ ایسی
باتوں کی کب پروا کرتے ہیں۔ اس نے بھی حوصلہ نہیں ہارا۔
ناکامیاں اسے تمیز کرتی رہیں اور بالآخر وہ اپنے عہد اور
بعد کے عہد کا سب سے بڑا گلوکار بن کر سامنے آ گیا۔

ایک بے مثال مصور



مصور وان گوگ

مصور سے دلچسپی رکھنے والے وان گوگ کو اپنا
آئیڈل سمجھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پوری دنیا میں مصوری میں
کتنی کے چند ہی نام لیے جاسکتے ہیں اور ان میں سے ایک
نام بلاشبہ وان گوگ کا ہے۔

وان گوگ صحیح معنوں میں ایک بہت بڑا فنکار تھا۔
اور صحیح معنوں میں ناکامیاں اس کے مقدر میں آئی
تھیں۔ نہ جانے اس نے کتنی محروم زندگی گزاری تھی، کتنی
ناکامیاں اس کے حصے میں آئی تھیں۔

اس کا عشق صرف رنگوں سے تھا۔ دل فریب رنگ۔ وہ
جب کپڑوں پر رنگ بکھیرتا تو رنگ بولنے لگتے تھے۔ آج اس
محروم فنکار کی ایک ایک تصویر لاکھوں کروڑوں میں فروخت

ہوتی ہے۔
جبکہ ابتدا میں یہ حال تھا کہ کوئی اس کو مصور ماننے کے
لیے تیار ہی نہیں تھا اسی لیے وہ نفسیاتی مریض بن کر رہ گیا
تھا۔

اس نے ایک بار غصے اور جھلالت میں آ کر اپنی نہ
جانے کتنی تصویریں جلا ڈالی تھیں۔ تصویروں کو ایک جگہ جمع
کر کے اس نے آگ لگا دی تھی۔

جب ان تصویروں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے تو ان کا
جل جانا بھی بہتر ہے۔ اگر وان گوگ کہ وہ تصویریں باقی رہ
جاتیں تو مصوری کی دنیا کو نہ جانے کتنی نایاب تصویروں کا
مزید خزانہ مل جاتا۔

اس شخص نے مفلسی کی زندگی گزاری اور مفلسی ہی میں
مر گیا اور آج اس کی بنائی ہوئی ایک ایک تصویر کروڑوں میں
بک جاتی ہے۔

بے مثال مصنف

اس نے اپنے اسکول میں پہلا مضمون لکھا جو زیادہ پسند
نہیں کیا گیا۔ اس کے ٹیچر نے کہا کہ وہ لکھنے کے بجائے کسی
اور شعبے کی طرف دھیان دے۔

اس نے پھر ایک کہانی لکھی۔ بہت سوچ سمجھ کر۔ اس
کے پڑوس میں ایک صاحب رہا کرتے تھے، جن کی حرکتیں
بہت عجیب ہوتی تھیں۔



مصنف اسٹین بک

اس نے ان صاحب کو مرکزی کردار بنا کر ان پر ایک کہانی لکھ ڈالی۔ اس میں جذبات نگاری اور مشاہدے کا کمال تھا۔

اس کے استادوں نے وہ کہانی پڑھ کر اس کے بارے میں فیصلہ دے دیا کہ وہ آگے چل کر ایک بڑا کہانی کار بن سکتا ہے۔

یہاں تک تو اس کی کامیابی ہے۔ اس کے بعد جب وہ بڑا ہوا اور اس نے تحریر کو اپنا ذریعہ معاش بنانا چاہا تو ناکامیاں اس کا مقدر بن گئیں۔

وہ کہا کرتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک ہی عشق کیا ہے اور وہ عشق ہے میرا لکھنا۔ میں لکھے بغیر رہ نہیں سکتا۔ میری تحریر میری محبوبہ ہوتی ہیں۔ میں اپنی محبوبہ کو ہر طرح سنوارا کرتا ہوں۔ اس کے غرے برداشت کرتا ہوں اور جب وہ مجھے خوبصورت لگتی ہے تو میں اسے دوسروں کو دکھانے لے آتا ہوں۔

لیکن اس کے ساتھ بد قسمتی یہ رہی کہ اس کی محبوبہ کی کسی نے قدر نہیں کی۔

ناکامیاں اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔

اس نے ایک ناول لکھا۔ پبلشر کے پاس لے گیا۔ اس نے ریجیکٹ کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس ناول میں ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے جو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

یہ اس کی پہلی ناکامی تھی۔ پھر ناکامیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

کیا آپ یقین کریں گے کہ وہ تیس بار ناکام ہوا ہے، تیس بار۔ اور وہ پھر پھر کر رہ گیا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا ”گرچہ لکھنا میرا عشق ہے۔ وہ تو میں ترک نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کون ہوگا جو اپنی زندگی سے دور ہونا چاہے گا؟ لیکن میں اب اپنے اس شوق کو اپنا پروفیشن نہیں بنا سکتا، مجھے کچھ اور سوچنا ہوگا۔“

لیکن اس وقت اس کی بیوی نے اس کی حوصلہ افزائی کی اس نے کہا ”تم تیس بار ناکام ہوئے ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تم ایک بار اور کوشش کرو۔“

اور جب اس نے آئینوں میں بارکوش کی تو اس کے ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے بعد اسٹیفن کنگ آپ کے سامنے ہے۔

کتنے پڑھنے سے دلچسپی رکھنے والا ایسا کون ہے جو اس کو نہیں جانتا۔

مقبول مصنفہ

اس بچی نے پریوں، شہزادیوں اور جادوگروں کے خواب دیکھے تھے۔

اس کی بچپن سے خواہش تھی کہ وہ ہواؤں میں اڑتی پھرے۔ پراسرار مقامات پر جائے۔ طرح طرح کے انوکھے واقعات اس کے ساتھ پیش آئیں۔

لیکن اس کے حالات ایسے تھے کہ وہ بازار سے کوئی گڑیا بھی نہیں خرید سکتی تھی۔ کچھ بھی نہیں تھا اس کے پاس۔ ملک کے ایک فلاحی ادارے نے اس کی پرورش کی تھی۔ ایسی لڑکی جب جوان بھی ہو جائے تو کون اس کی طرف دیکھتا ہے؟

پھر کسی نے کسی طرح اس کی شادی بھی ہو جاتی ہے اور طلاق بھی ہو گئی۔ اب وہ مکمل ٹوٹ چکی تھی۔ زندگی نے اسے بہت دکھ دیے تھے۔ اب دکھوں کے ازالے کا وقت آ گیا تھا۔

اس نے خدا سے دعا کی ”یا خدا! مجھے لکھنے کی توفیق دے۔“

پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔ وہی پراسرار کہانیاں جو زندگی بھر اس کے خوابوں کا حصہ رہی تھیں لیکن کسی نے بھی ان کہانیوں کو قبول نہیں کیا۔

لوگ کہا کرتے ”تم کن پکروں میں بڑی ہو، یہ سائنسی دور ہے۔ آج کل یہ الف لیلا والی کہانیاں نہیں چلتیں، کچھ اور لکھ کر لاؤ۔“

لیکن وہ کچھ اور تو لکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ اس کے بس ہی میں نہیں تھا اس نے تو ہمیشہ ایسے ہی جزیروں اور انوکھی دنیاؤں کے خواب دیکھے تھے۔

وہ ان خوابوں میں ایسے کرداروں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ان سے عشق تھا اس کو۔ یہ کردار، اس کی محبت تھے، اس کی زندگی تھے۔

وہ اپنے عشق کو کسی طور اُچھوڑ نہیں چھوڑ سکتی تھی اسی لیے اس نے دوسری کہانی لکھی۔ اور اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی کہانی کا ہو چکا تھا۔

اس کہانی کا بھی وہی ماحول تھا، وہی پراسرار ماحول۔ لیکن وہ بدل نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ عشق کرنے والوں کے یہاں مایوسی گناہ ہے۔ انہیں مسلسل آگے بڑھنا چاہیے۔ بقول شاعر ”عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ ہم جس میں ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کر سکتے۔“



جے کے رولنگ

وہ اپنی تحریروں سے عشق کرتی رہی۔

بالا خر اس کا یہ جنون، یہ عشق رنگ لے آیا۔ اب کی بار اس نے اسی ماحول کی جو کہانی لکھی، وہ انتہائی مقبول ہوئی۔ کہتے ہیں کہ خدا کے یہاں ہر قبولیت کا ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ اس کا وقت آ گیا تھا۔ وہی پبلشر جو ایسی غیر حقیقی کہانیوں کا مذاق اڑاتے تھے، وہی اس کے پیچھے ہو گئے اور اس کی سیریز ”ہیری پورٹر“ اپنے عروج اور شہرت کی انتہا کو پہنچ گئی۔

پوری دنیا میں ایسا کون سا بچہ ہے یا جوان ہے جو ہیری پورٹر کو نہیں جانتا؟ اس سیریز کی خالق جے کے رولنگ کو تو شاید کم ہی لوگ جانتے ہوں لیکن ہیری پورٹر کو سب جانتے ہیں۔ اور اب کچھ ایسے لوگ جن کا عشق کچھ اور تھا لیکن زندگی نے انہیں ان کے عشق سے محروم رکھا اور وہ کسی اور میدان میں کامیاب ہوئے۔

کتابوں کا عاشق

ایسی ایک خوبصورت مثال ڈیوڈ میلن ہیں۔

وہ کتابوں کا عاشق تھا۔

بچپن ہی سے کتابیں اس کی زندگی کا حصہ بن گئی تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بڑا ہو کر بہت مشہور پبلشر بنے گا۔ مشہور لوگوں کی کتابیں شائع کیا کرے گا۔

وہ اپنے والدین سے مکتونوں کے بجائے کتابوں ہی کی فرمائش کیا کرتا اور وہ بھی اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اس کے لیے کتابیں لایا کرتے۔

والدین کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ڈیوڈ کو آگے جا کر کیا بننا ہے۔ صرف کتابوں کے شوق سے تو بات نہیں بنے گی۔ وہ اس سے دریافت کرتے تو وہ کہہ دیتا۔ کتابیں، صرف کتابیں۔ میں کتابیں چھاپوں گا، آپ لوگ دیکھ لیجئے گا کہ یہ

کتابیں مجھے کیا کچھ دیتی ہیں۔

اس کے والد نے اس سے وعدہ کر لیا کہ اس کے پبلشر بننے پر وہ اس کی مدد کریں گے لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ جوان ہونے تک اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔

اب ڈیوڈ کو اپنی زندگی خود بنانی تھی۔ وہ کتابوں کے پکڑ میں رہتا لیکن صرف کتابوں سے دلچسپی رکھنے والوں کو کہاں نوکری ملتی ہے۔

پھر جب اس کی پریشانی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو اس نے ایک چھوٹی سی فرم میں ملازمت کر لی جس کا پاس ایک نرم مزاج انسان تھا۔

اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ڈیوڈ کو اپنے کام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اس نے ایک دن ڈیوڈ سے دریافت



ڈیوڈ میکیل

کیا ”آخر تم کام پر کیوں دھیان نہیں دیتے؟ تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے؟“

”جناب، میرے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ میرا شعبہ کتابیں ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یا تو کتابیں خود چھاپوں یا کسی بڑے پبلشر کے یہاں کام کر لوں۔“

”ہوں.....“ پاس نے ایک گہری سانس لی ”سمجھ گیا۔ میرا ایک دوست پبلشر ہے۔ زیادہ بڑا اور مشہور تو نہیں ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہارا کام وہاں بن جائے۔“

اس کے پاس نے اسے اپنے پبلشر دوست کے پاس بھیج دیا۔

پبلشر نے اس سے کہا ”دیکھو، ہمارے یہاں پبلشنگ ہاؤس میں تو کوئی کام نہیں ہے لیکن اتنا ہو سکتا ہے کہ گھر، گھر

پرخطر عشق

تسنیم رضامہکری

وہ پوری دنیا کو فتح کر لینے پر کمربستہ تھا۔ ظلم کا نشان کہلاتا تھا۔ تاریخ نے اسے جابروں کا سرخیل قرار دیا ہے۔ لوگ اسے ہٹلر کے نام سے پہچانتے ہیں مگر اس ظالم شخص کے سینے میں بھی دل تھا۔ اس نے بھی پیار کیا تھا اور اپنی محبوبہ کو حاصل بھی کر لیا لیکن قسمت کو تو کچھ اور منظور تھا۔ یہ پیار ناکام ثابت ہوا اور ناکامی کی سمت اسے موت نے دھکیلا تھا۔

ہٹلر کے عشق کا قصہ پُر لطف



یہ ایک عجیب محبت کی عجیب داستان ہے۔ ایک ایسے شخص کی داستان جسے پوری دنیا ظالم و جابر کے طور پر جانتی ہے یعنی ایڈولف

عشق ناکام
نمبر

ہٹلر۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی شخصیت کا یہ پہلو بہت نمایاں تھا۔ لیکن اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ ایک مصور تھا، شاعر تھا اور محبت کرنے والا تھا اور ایسے شخص کی محبت میں پاگل ہونے والی کا نام تھا ایوا براؤن۔

کر تا رہتا۔ مختلف ساز اور مختلف صورت کی موسم بٹیاں۔ اس کا موسم بٹیوں کا شوق یا پیار تو اپنے عروج پر تھا لیکن اس کی مانی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کا یہ پیارا سے زیادہ فائدے نہیں پہنچا رہا تھا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کو کھانے پینے کی بھی دشواری ہونے لگی۔ بالآخر اس نے اپنے باپ کی ڈائری نکالی جس میں طرح طرح کی چیزیں بنانے کے طریقے لکھے ہوئے تھے۔

اس نے تو تھ پیٹ کا انتخاب کیا اور پڑنے طریقوں میں کچھ اور شامل کر کے ایک نیا تو تھ پیٹ بنا کر بازار میں بیٹنا شروع کر دیا۔

اس تو تھ پیٹ کا نام اس نے اپنے نام پر رکھا تھا۔ کولکیت..... کیونکہ اس کا پورا نام ولیم کولکیت ہے۔ اس نے موسم بٹیوں کا کاروبار 1806ء میں شروع کیا تھا اور تو تھ پیٹ بنانے کا کام 1873ء میں۔ اب پوری دنیا میں ایسا کون ہے جو کولکیت کو نہیں جانتا۔

نوکیا کا خالق

فن لینڈ کے ایک شہر میں کاغذ بنانے کی ایک فیکٹری تھی۔ کاغذ کا معیار بھی اچھا تھا۔ ریاضت بھی تھی، محنت بھی تھی، اس کے باوجود وہ فیکٹری نقصان میں جا رہی تھی۔ ایک سال، دو سال..... پانچ برس۔ وہ فیکٹری نقصان ہی میں جاتی رہی۔ مالکان چونکہ صنعت کاغذ سازی کی وجہ سے اس فیلڈ میں آئے تھے اسی لیے وہ اس فیکٹری کو سنبھالنے کی لگتا کر کوشش کرتے رہے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

فیکٹری نقصان ہی میں جاتی رہی۔ آخر کار مجبور ہو کر انہوں نے ایک دوسرا بزنس شروع کر دیا۔ لطف یہ ہے کہ اس بزنس کا کوئی تعلق بھی کاغذ کی صنعت سے نہیں تھا۔

یہ ایک الگ ہی کام تھا جس کا انہیں کوئی خاص تجربہ بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اس میدان میں کود پڑے تھے۔ پھر خدا نے ان کا ساتھ دیا اور ان کے بنائے ہوئے موبائل سیٹ نے اپنی ساکھ قائم کرنی شروع کر دی۔ یہ واقعہ ہے 1980ء کا۔ اور آج پوری دنیا کے موبائل استعمال کرنے والے کے ہاتھ میں ”نوکیا“ کا موبائل ضرور ہوتا ہے۔

انہوں نے اس جگہ کے نام پر اپنے موبائل کا نام رکھا تھا یعنی نوکیا نام کی بستی کے نام پر۔



جا کر کتا میں فروخت کیا کرو..... یعنی سبز میں بن جاؤ۔“ ڈیوڈ نے فوراً یہ آفر قبول کر لی۔ بہر حال اس طرح بھی اس کا تعلق کتا یوں سے تو رہا تھا۔ لیکن وہ بہت بُری طرح کا کام رہا۔

وہ جب دروازوں پر دستک دیتا اور خواتین باہر آتیں تو سبز میں کو دیکھ کر اس سے پہلا سوال یہی کرتیں ”کیا تمہارے پاس کوئی پرفیوم ہے؟“

وہ بہت بددل ہو کر بتاتا ”نہیں میڈم، میں پرفیوم فروخت نہیں کرتا، میرے پاس کتا ہیں ہوتی ہیں۔“ خواتین اسے شرمایا کرتیں۔

وہ بہت بددل ہو گیا اور ایک دن اس نے سوچا کہ کیوں نہ پرفیوم ہی بیٹنا شروع کر دے۔ اس کا عشق تو کچھ اور تھا اور یہ شعبہ اس کے لیے بالکل مختلف تھا۔

پھر بھی اس نے جھٹکا کر خود اپنا بنایا ہوا پرفیوم بیٹنا شروع کر دیا اور یہاں سے اس کی قسمت نے اس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔

اس کا پرفیوم مقبول ہوتا چلا گیا اور آج پوری دنیا میں پرفیوم کا ایسا کون سا شوقین ہے جو AVON برانڈ کو نہیں جانتا۔ ڈیوڈ کہا کرتا ”یہ ٹھیک ہے کہ آج میرے پاس عزت، دولت سب کچھ ہے لیکن میں اپنے عشق میں تو ناکام رہا ہوں تا..... وہ عشق جو مجھے کتا یوں سے تھا۔“

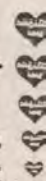
تو تھ پیٹ کا بانی

اور اب ایک دوسری کہانی بھی بڑھ گئی۔ ایک شخص تھا ولیم۔ سیدھا سادا لیکن بہت ممتی تو جوان۔ وہ جب بے روزگار تھا تو اس زمانے میں اسے موسم بٹیوں سے پیار تھا۔ وہ رنگ برنگی خوبصورت موسم بٹیاں جو سال گراہوں پر روشن کی جاتی ہیں۔

وہ موسم بٹیاں جو ہر خوشی کے موقع پر اور مقدس تہواروں میں جلائی جاتی ہیں۔ جن کی روشنی اسے بہت پاکیزہ اور اعلیٰ آجلی محسوس ہوتی۔

وہ سوچا کرتا کہ موسم بٹیاں خوشیوں کے اظہار کا ایک خوبصورت ذریعہ ہیں تو وہ بھی موسم بٹیوں کا کاروبار کرے گا۔ اور بڑے ہو کر اس نے واقعی موسم بٹیاں بنانی شروع کر دیں۔ رنگ برنگی خوبصورت موسم بٹیاں جو بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کرتیں۔

اسے چونکہ موسم بٹیوں سے پیار تھا اس لیے اس نے موسم بٹیوں کی ساخت میں بھی جدت پیدا کر دی۔ وہ ان پر ہر بات



ایوا کی پیدائش 6 فروری 1912ء کو جرمنی کے شہر میونخ میں ہوئی تھی۔ وہ ایک اسکول ٹیچر فریڈرکس کی دوسری بیٹی تھی۔ اس کی ماں کا نام فرانسکا تھا۔ ایوا کی بڑی بہن ایس 1904ء میں پیدا ہوئی اور اس کا چھوٹا بھائی 1915ء میں پیدا ہوا تھا۔

ایوانے ابتدائی سے اپنے گھر کے حالات عجیب دیکھے تھے۔

والدین کے درمیان مالی معاملات پر تناؤ کی کیفیت رہتی۔ دونوں کے درمیان جھگڑا ہوتا رہتا جس کو ایوا کا حساس ذہن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔

بالآخر 1921ء میں اس کے والدین کے درمیان کسی بات پر علیحدگی ہو گئی۔ یہ اور بات ہے کہ آگے چل کر دونوں پھر ایک ساتھ ہو گئے تھے۔

ایوانے میونخ میں اپنی ابتدائی تعلیم پائی۔ اس کے بعد ایک سال کے لیے بزنس اسکول میں پڑھتی رہی۔

پڑھائی کے اعتبار سے وہ زیادہ ذہین نہیں تھی۔ مگر اس میں دیگر خوبیاں ضرور تھیں جیسے وہ بہت اچھی انتہیلٹ تھی۔ ایک اچھی فوٹو گرافر تھی۔

بعد میں بی بی شوق اسے نازی پارٹی تک لے گیا اور ہٹلر سے ملاقات کا سبب بن گیا۔ صرف سترہ برس کی عمر میں وہ نازی پارٹی کے آئیٹل فوٹو گرافر ہاف مین کی اسٹنٹ بن گئی تھی۔

ہاف مین کا اسٹوڈیو بہت بڑا تھا۔ وہاں کئی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ ایوا کی بڑی بہن بھی اسی اسٹوڈیو میں ملازم تھی۔

وہیں ایوا کو کمروں کے بارے میں مکمل معلومات ہوئی۔ اسے بتایا گیا کہ کس رینج کے کیمرے کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ کس کی کیا لمٹ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ زندگی عام انداز سے گزر رہی تھی کہ ایک دن سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ یہ وہ دن تھا جب ہٹلر ہاف مین کے اسٹوڈیو میں آیا تھا۔

ایوا اسے دیکھ کر مبہوت رہ گئی تھی۔ اس نے ہٹلر کے بہت چرچن رکھے تھے لیکن ملنے کا اتفاق پہلی بار ہوا تھا۔ ہٹلر ایوا سے پچیس برس بڑا تھا جبکہ ایوا ابھی صرف سترہ برس کی جوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ چونکہ ایک اچھی

انتہیلٹ بھی تھی اس لیے اس کا جسم بھی بہت خوبصورت تھا۔ ایوانے اس زمانے میں ماڈلنگ بھی کی تھی۔ جبکہ ہٹلر میں ایسی کوئی ظاہری خوبی نہیں تھی۔ وہ ایک دہلا پتلا انسان تھا۔ اس کے باوجود اس میں کوئی خوبی ضرور ہوگی جس نے ایوا کو پاگل بنادیا تھا۔

ایوانے ہٹلر میں اپنے لیے کشش محسوس کی اور اسی کی ہو کر رہ گئی۔

ہٹلر اس زمانے میں رائیل نام کی ایک لڑکی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ہٹلر اس لڑکی کو بہت پسند کرتا تھا۔ رائیل سے اس کی بہت گہری جذباتی وابستگی تھی۔

18 ستمبر 1931ء کو رائیل اپنے اپارٹمنٹ میں مردہ پائی گئی۔ اس نے خودکشی کر لی تھی۔ ہٹلر اس وقت کسی دوسرے شہر میں تھا جہاں اسے رائیل کی موت کی خبر دی گئی۔ ہٹلر کو اس کی موت کا بہت دکھ ہوا تھا۔

اس نے رائیل کو اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا لیکن رائیل کی موت نے اس کی خوشیاں غارت کر دیں۔ ایسی ٹوٹی اور بکھری ہوئی کیفیت میں اسے ایوا مل گئی۔ اگر ایک طرف ایوا اس کے لیے پاگل ہو رہی تھی تو دوسری طرف ہٹلر کو بھی اس سے آسیت ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔

ہٹلر کو ایوا میں رائیل کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ کسی وجہ سے خود ایوانے بھی خودکشی کی کوشش کی تھی۔ یہ واقعہ گیارہ اگست 1932ء کا ہے۔ اس نے اپنے باپ کے پستول سے خود کو گولی مار لی تھی۔

ویسے مورخ یہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ حرکت ہٹلر کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔

محبت واقعی ایک دیوا کی ہے۔ اس کھیل میں نیک نامی اور بدنامی نہیں دیکھی جاتی۔ اپنی پوزیشن کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو پالنے اور حاصل کر لینے کی خواہش ہوتی ہے۔ ذرا سی دیر کے لیے سبھی اور کسی طرح بھی سی۔

ایوا کو فوری طور پر اسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دی۔ بالآخر ڈاکٹر زاس کی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایوا کی اس حرکت نے ہٹلر کو اس کے اور قریب کر دیا۔ وہ ہر طرح اس کا خیال رکھنے لگا اور دونوں ایک دوسرے

کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔ گویا محبت پروان چڑھنے لگی۔ ایوا اس وقت بھی فوٹو گرافر کے طور پر کام کر رہی تھی۔ چونکہ وہ نازیوں کی آئیٹل فوٹو گرافر تھی اس لیے اسے ہٹلر کے ساتھ جگہ جگہ جانے کے مواقع ملتے رہے تھے۔ اور یہی محبت کو پختگی عطا کر رہی تھی کہ ایوا کا تبادلہ.... ہاف مین کے پرہیز میں ہو گیا۔

یہ زمانہ ہٹلر کے عروج کا تھا۔

فتوحات، سیاست، حکمرانی، جنگیں۔ اس کی مصروفیات اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ شاید اس کے پاس اپنے آپ کے لیے کبھی وقت نہیں تھا۔

ایوا سے بھی وہ بہت کم ملا کرتا۔ یہ صورت حال ایوا کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ہٹلر کی مصروفیات اس کے لیے اس کی سو کن بن گئیں تھیں۔

بالآخر اس نے ہٹلر کی مصروفیات سے دل برداشتہ ہو کر ایک بار پھر خودکشی کی کوشش کی۔ اس بار اس نے خواب آور گولیاں کھائی تھیں مگر اس بار بھی اس کی جان بچائی گئی۔ ہٹلر اس کے لیے بہت فکر مند رہا کرتا تھا۔ ایک طرف کاروبار پر سلطنت تھا تو دوسری طرف کاروبار محبت اور اسے دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلانا تھا۔

ہٹلر نے ایوا کی دل جوئی اور اس کو اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے ایوا اور اس کی بہن کو میونخ میں ایک خوبصورت اپارٹمنٹ خرید کر دیا۔

اور دوسرے سال اس نے دونوں بہنوں کے لیے پریس گاؤں نامی ایک علاقے میں ایک ولا خرید دیا تھا۔ اس سے یہ بات سامنے آئی کہ ہٹلر بھی ایک عام انسان ہی کی طرح تھا۔

محبت، نفرت، دکھ اور خوشیوں کے جذبے اس کے ساتھ بھی تھے۔ وہ بھی کسی کے ناز نہ کھاسکتا تھا۔ کسی کی دل جوئی کر سکتا تھا اور کسی کو اپنا بنانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ہٹلر کی ایک رشتہ دار عورت تھی جس کا تعلق مرنے والی رائیل سے تھا۔ وہ اس ولا کی مگر اس بن کر آگئی جو ولا ہٹلر نے ایوا کے لیے خریدا تھا۔

ہٹلر اس عورت پر بہت اعتماد کیا کرتا۔ پھر خدا جانے کیا ہوا کہ وہ عورت ولا چھوڑ کر چلی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ایوا پسند نہیں تھی۔ اس لیے اکثر اس کے اور ایوا کے درمیان کھٹ پٹ ہوا کرتی۔

ہٹلر کے نظریات مرد اور عورت کے حوالے سے بہت قدامت پسندانہ تھے۔ اس کی فلاسفی یہ تھی کہ مردوں کو میدان جنگ میں جا کر شجاعت دکھانی چاہیے۔ ایک جنگ جو کی طرح زندگی گزارنی چاہیے۔ جبکہ عورت کا کام صرف گھر سنبھالنا ہے۔

(یہی نظریہ ہمارا سماجی نظریہ بھی ہے کہ مرد گھر سے باہر کاڑتے دار ہے اور عورت کا کام گھر چلانا ہے)

ہٹلر خود کو پُرانے زمانے کے ایسے ہیرو کی طرح پیش کرنا چاہتا تھا جس کو پورے شہر کی عورتیں پسند کرتی ہوں۔

اس کا خیال تھا کہ اس میں بے پناہ کشش ہے اور اسے اپنی اس خوبی کو سیاسی کامیابیوں کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

اسی لیے اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ وہ یہ کہا کرتا کہ اگر وہ کسی ایک کا ہو کر رہ گیا تو سیاسی طور پر بہت سی طاقت ور خواتین اس سے دور ہو جائیں گی اور اس کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔

مگر چہ وہ ایوا کے لیے وقف ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس تعلق کا بھی اظہار نہیں کیا تھا۔

کہنا یہ چاہیے کہ وہ دونوں ہی کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی دینا نہیں چاہتے تھے۔

اسی لیے دونوں کے کمرے الگ الگ تھے۔ اس سلسلے میں بھی بے انتہا احتیاط برتی گئی تھی۔ صرف ایک موقع پر وہ دونوں ایک ساتھ دیکھے گئے تھے۔

اور وہ موقع تھا 1936ء کے موسم سرما کے اولمپک کا، جب وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ جرمنی کے لوگ جنگ عظیم تک ان دونوں کے تعلقات سے نا آشنا تھے۔

انہیں اس کا علم جنگ کے خاتمے کے بعد ہوا تھا۔

ایوا اپنے کام سے کام رکھنے والی عورت تھی۔ اس نے کبھی ہٹلر کے سیاسی اور سرکاری معاملات میں مداخلت نہیں کی۔

خود ہٹلر کو بھی یہ پسند نہیں تھا۔ وہ اس سے کہا کرتا، میں نے تم سے محبت کی ہے، کیا تمہارے اطمینان کے لیے یہ کافی نہیں ہے؟

اگر ایوا کی موجودگی میں سیاسی گفتگو کے لیے کچھ لوگ آجاتے تو ایوا کو اس کمرے میں رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایوا خود بھی ایسی باتوں سے دور رہنا چاہتی تھی۔ وہ

نازی پارٹی کی ممبر ہی نہیں تھی۔ اس کا شوق، خوبصورت لباسوں، جیولریز، کھیل کود اور فلوں کا تھا۔
بنیادی طور پر وہ ایک کلنڈری لڑکی تھی جو ہنر کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

ایک دلچسپ واقعہ اس وقت پیش آیا جب جرمنی کی حالت کو دیکھتے ہوئے میک آپ وغیرہ کے سامان پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔

جرمنی کی معاشی حالت جنگ کی وجہ سے بہت خراب ہو چکی تھی۔ یہ پابندی اسی لیے لگائی گئی تھی کہ خواتین کو فضول خرچی سے روکا جاسکے۔

ایوا چونکہ ایک عورت تھی، اور وہ بھی فیشن اسٹیل قسم کی ماڈل۔ اسے یہ پابندی ناگوار گزری۔ اور پہلی بار اس نے ہنر سے اس معاملے پر بحث کی۔

اس کی ضد تھی کہ عورتوں پر سے یہ پابندی ہٹائی جائے۔ ہنر اس کی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے اس نے پابندی مکمل طور پر تو نہیں ہٹائی لیکن نرم کر دی گئی۔

ہنر کی تاریخ لکھنے والے اسپتیر میورس نے اس واقعے کا بہت دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ایوا بہت غصے میں تھی جبکہ ہنر اس کو منانے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔

تھا۔ بلا خرابی ہنر سے اپنا مطالبہ منوائی لیا تھا۔ ہنر سے دوستی اور تعلقات کے باوجود ایوا ہاف مین کے لیے کام کرتی رہی۔ اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بے شمار تصاویر آٹاریں اور وہ بھی نازی پارٹی کے خاص خاص لوگوں کی۔

اس وقت اس نے بہت عقل مندی سے کام لیا تھا۔ وہ قیمتی تصویریں ہاف مین کے ہاتھوں میں نہ دامن فروخت بھی کرتی رہی اور لوگوں سے شناسائی بھی پیدا کرتی رہی۔ ہنر سے تعلقات نے اسے نازی پارٹی کے اندر کے لوگوں تک رسائی دے دی تھی۔

وہ ایک طرف ہاف مین کے لیے کام کر رہی تھی تو دوسری طرف وہ ہنر کی سیکرٹری بھی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ ہر مقام پر احتیاط کا مظاہرہ کرتی رہی تھی۔ اس کی سب سے پہلی احتیاط تو یہی تھی کہ وہ عوامی مقامات پر ہنر کے ساتھ بہت کم دیکھی جاتی۔

اس کے علاوہ ہنر نے اسے جو اپارٹمنٹ تھے کے طور پر دیا تھا، اس میں اس کا آنا جانا بھی خفیہ طور پر ہوا کرتا۔

وہ آنے جانے کے لیے عقبی زینہ استعمال کیا کرتی تاکہ نگاہوں میں نہ آ سکے۔

تین جون 1944ء کو ایوا کی بہن نے ہنر کے ایک اعلیٰ فوجی آفیسر سے شادی کر لی۔ اس شادی میں ہنر اور ایوا دونوں ہی شریک ہوئے تھے۔

لیکن وہ آفیسر یعنی ایوا کا بہنوئی ہنر ہی کے ہاتھوں اپنے انجام کو اس وقت پہنچا جب وہ اپنی بیوی کو لے کر جرمنی سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

ان دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایوا کی سفارش پر اس کی بہن کو تو چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس فوجی آفیسر کو گولی مار دی گئی تھی۔

یہ واقعہ اپریل 1945ء کا ہے۔ اور سائز برگ کی پہاڑی پر ہنر نے ایک مکان خریدا تھا۔ جس کا احاطہ بہت بڑا تھا۔

ہنر نے اس مکان کو ایک قلعے کی شکل دے دی، وہ ایوا قلعہ تھا کہ باہر والوں کو اس کے اندر کے حالات معلوم ہی نہیں ہو سکتے تھے۔

ہنر نے اس قلعہ نما مکان میں ایوا اور کچھ ایسے لوگوں کو رکھا ہوا تھا جو ان کے لیے خدمات انجام دیا کرتے۔

لیکن ایوا اس قلعے میں اپنے آپ کو قید محسوس کرنے لگی تھی۔ باہر کے حالات معلوم ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ اس قلعے نما مکان میں کئی کمرے تھے۔ لیکن ان دونوں نے اپنے لیے ایک ایک کمرہ مخصوص کر رکھا تھا۔ اس میں ایک لائبریری بھی تھی۔

ہنر شام سے رات تک کا وقت اسی لائبریری میں گزارا کرتا۔ دونوں کے درمیان یا تو گہری خاموشی رہتی یا پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہتیں۔

ایوا شراب نوشی کی عادی تھی۔ جبکہ ہنر چائے پیا کرتا تھا۔ لائبریری میں ایوا شراب کی اور ہنر چائے کی چسکیاں لیتے رہتے۔

اور جب سونے کا وقت ہوتا تو دونوں اپنے اپنے کمروں میں چلے جایا کرتے۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ دونوں ایک ساتھ ایک کمرے میں سوئے ہوں۔

دراصل دونوں اب ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ ان کے درمیان قربت کے لمحات کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ اس مکان میں معزز مہمانوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا

تھا۔ ایسے وقت ایوا مہمان نوازی کے فرائض انجام دیا کرتی۔

وہ کبھی کبھی اپنے دوستوں اور اپنے رشتے داروں کو بھی مکان میں بلایا کرتی اور خوب ہنگامے ہوتے۔ رقص اور موسیقی سرفہرست رہتی۔

ہنر نے ایوا کے ان معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی تھی۔

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہنر ایوا کے معاملے میں کتنا حساس تھا۔ اسے ہر وقت ایوا کی فکر رہتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اسی لیے اس نے وصیت میں ایوا کے لیے اچھی خاصی رقم مخصوص کر دی تھی۔

ایوا سے اس کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایوا جب کبھی باہر جاتی اور اسے واپسی میں دیر ہو جاتی تو ہنر ایک عام آدمی کی طرح اس کے لیے پریشان رہا کرتا تھا۔

ہنر ایک عام آدمی نہیں تھا۔ اسی لیے اس کی محبت بھی عام نہیں تھی اور اس کی موت بھی عام نہیں تھی۔ اس نے ایوا کے لیے بہت سے خواب دیکھ رکھے ہوں گے لیکن موت کا دائرہ ان کے گرد تک ہوتا جا رہا تھا۔

ایوا کو یہ معلوم تھا کہ ہنر کے ساتھ رہنے کا مطلب موت ہے۔ اس کے باوجود اس نے ہنر کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہیں کیا تھا۔

سرخ فوج نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ موت سامنے تھی لیکن ان دو محبت کرنے والوں کو موت سے کوئی ڈر نہیں تھا۔

انہوں نے ایک غیر معمولی زندگی گزاری تھی اور ایک غیر معمولی انجام ان کے انتظار میں تھا۔

ایک دن پہلے ہنر نے ایوا کے سامنے زہریلی گولیوں کا تجربہ اپنے کتوں پر کیا تھا۔ کتے گولیاں کھا کر ذرا سی دیر میں ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

ایوا جانتی تھی کہ اس طرح کی موت خود اس کا بھی مقدر بن چکی ہے لیکن محبت نے ایسی باتوں کو کب پروا کی ہے۔

بلا خرابی اپریل 1945ء میں ہنر نے برلن میں اپنے وہ بنگلہ دکھائے جو اس نے اپنی حفاظت کی غرض سے تعمیر کروائے تھے۔

ہنر کا کہنا تھا کہ اس کے لیے موت بہتر ہے بجائے اس

کے کردہ دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو۔ سرخ فوج نے برلن کو گھیر رکھا تھا۔

ہنر نے ایوا سے کہا ”ابھی بھی موقع ہے، تم یہاں سے جاسکتی ہو۔ تمہارے لیے بہت زندگی باقی ہے۔ تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا ہے۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا“ ایوا نے جواب دیا ”میں نے آپ کے ساتھ ہی مرنے اور جینے کا عہد کر رکھا ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ ہنر نے ایک گہری سانس لی ”اب یہ بتاؤ، کیا تمہاری کوئی خواہش ہے؟“

”ہاں۔“ ایوا نے اپنی گردن ہلا دی ”یہ ٹھیک ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں، ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ اس کے باوجود میں ابھی تک ایوا براؤن ہوں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ میری موت کے بعد مجھے ایوا ہنر کے نام سے یاد کیا جائے۔“

”سمجھ گیا۔ تم شادی کرنا چاہتی ہو؟“

”ہاں، ایک عورت کی اس سے بڑی خواہش اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کی شادی ہو جائے اور وہ اپنے شوہر کے نام سے پہچانی جائے۔“

ان کی شادی 28 اور 29 اپریل کی درمیانی رات کو ہوئی تھی۔ کتنی کے چند لوگ اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔ ان میں ایک گولز بھی تھا۔

کاغذی کارروائیوں کے بعد ایوا براؤن ایوا ہنر ہو چکی تھی لیکن یہ غیر معمولی شادی دوسرے ہی دن ناکامی میں تبدیل ہو گئی اور اس عشق کی ناکامی کا سبب وقت کے بدلنے دھارے بنے۔ سرخ فوج کی آمد ظالم سماج بن گئی۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ 30 اپریل کی رات ہنر کے اسٹاف نے ہنر کے کمرے سے گولی چلنے کی آواز سنی۔ وہ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے مگر کہاںی فتم ہو چکی تھی۔

ایوانے زہریلا اسپول کھالیا تھا۔ جبکہ ہنر نے اپنی کینفی پر پستول رکھ کر خود کو مار لیا تھا۔ اس طرح ہنر اور ایوا براؤن کی محبت کی کہانی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ایک رات بھی وہ اکٹھے گزار نہ سکے۔

یہ محبت کی ایک ایسی المناک داستان ہے جس کا کردار یورپی دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن وہ موت کو فتح نہیں کر پایا۔

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ جتائیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بہنکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندمی ایک تہلکہ خیز کہانی



آکنہ شہانہ افسانہ کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیجا جائے جبکہ میں آری میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس دور میں میرے لیے واحد اچھی یاد سوبرا ہے جو میرے دل کا حصہ تھی لیکن وہ میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حوالی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ سفیر، مونا اور ندیم جیسے دوست ملے لیکن ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر دشمنی اور رد بدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہ جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس طویل قامت شخص نے پی کیپ پہن رکھی تھی جس کے نیچے اس کے خدو خال چھپ گئے تھے۔ مگر اس کی آواز آگ سے پہچانی جا رہی تھی۔ یہ آواز سننے

ہوئے مجھے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ وہ زریبکی کوشیف عرف عبدالرحمن تھا۔ وہ بغیر نشانات کی مکمل فوجی وردی میں میرے سامنے تھا۔ لیکن ایک چھوٹی پہاڑی کے سب سے اوپر ہی مجھے تھا اور اس کی چنی سے مسلسل دھواں

۳ اب آپ مزید افادات ملاحظہ فرمائیے

کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ میں زریں کو لے کر میر کے لیے لکھا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں جومری کی طرف جاتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ جب اس کے بچنے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ یہ قید ہو چکے ہیں۔ زریں کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زریں کا جابر نہ ہو سکی۔ بھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ وہ ڈاکٹر کا فنانس تھا۔ اس نے مجھے ہا کر لیا اور کہا کہ اگر تم مجھے پراسرار وادی تک پہنچاؤ تو میں مرشد سے بھی گلو خلاصی کر ادوں گا۔ اس کے بعد شانے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا تھا۔ وہ کتا مونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ ہم اس بنگلے میں پہنچے جہاں وہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، مونا و سادھنا کو عبداللہ والے بنگلے پر پہنچانے کا انتظام کیا پھر شہلا کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بیک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں جائیزہ بریف کس حاصل کر لوں۔ اپنے بنگلے پر پہنچی۔ ہم بیک میں سیف سے بریف کس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلے کہ شہلا نے پستول سے ویم کوشٹا پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلوایا ہے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی براہمد کر لیا تھا۔ وہ عورت کی عزت کو لوٹنے والے لوگوں کے کہیں سزا سنائے آئے تھے کہ ایک جیب آدھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوش کو بچھا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے انوارا کر لیا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری ٹیکٹ پر ایک چپ چکادیا تھی۔ جومیرے بارے میں مطلع کر رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو دلدانے کے لیے فرار کر دیا۔ تب فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو باطل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے اس کو بلوایا۔ وہ دور درہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شانے میرے پستول سے فتح خان کو کوشٹا پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "مارتھ... بکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے ہی سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، سبھی ماٹیک سے اعلان ہوا کہ جومیری ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں نکل میں آیا۔ وہاں امین بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پٹنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے کس کر دیا اور امین کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی گولی میں پہنچے تو فون آ گیا۔ آواز مرشد کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے انکار کا کہی کہ یہاں شہلا نہیں رہتا مگر پیغام پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی کہ میری موجودگی سے وہ آگاہ ہو گیا تھا۔ ہم دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ پھر اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کس مانگا۔ اس نے بریف کس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کس ڈھلاں پر رکھ دیا۔ اندازہ درست تھا۔ وہ دھماکا سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ ویم کا فون آیا کہ سویرا راستے سے لاپتا ہو گئی ہے۔ بعد میں فون آیا کہ اسے فتح خان نے انوارا کر لیا تھا پھر اسے حویلی پہنچا دیا۔ میں نے شہلا کا نشانہ کا اور یافت کر لیا اور رات کے اندھیرے میں گھر کی تلاش لینے پہنچ گیا۔ باہر ویم وغیرہ کو پہرے پر بٹھا دیا تھا کہ مجھے خطرے کا احساس ہوا کیونکہ ویم وغیرہ کے موبائل سے جواب نہیں آ رہا تھا پھر کمرے میں آ کر کس کا گولہ گرا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش میں آیا تو فتح خان کی قید میں تھا۔ اس نے مجھے ایک گاڑی میں بند کر کے روانہ کر دیا۔ گاڑی طویل سفر کے بعد رکی تو سامنے کرٹل کھڑا تھا۔

خارج ہو رہا تھا۔ درج حرارت متنی سے کہیں نیچے تھا اور اندر موجود لوگ آگ جلائے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ میں معمولی گرم کپڑوں میں مشغول رہا تھا لیکن اس غیر متوقع صورت حال نے مجھے کچھ دیر کے لیے ماحول سے بے خبر کر دیا تھا۔ چوٹی اوپر سے ہوا رکی۔

مجھے فتح خان نے شہلا کا چارہ ڈال کر پکڑا اور پھر ہا معلوم لوگوں کے حوالے کر دیا۔ وہاں میری ملاقات نادر علی سے ہوئی۔ اس نے مجھ سے مصالحت کی بات کی لیکن ساتھ ہی مجھے کہیں روٹا گی کا اذن سنایا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اصل میں نادر علی کی قید میں بھی نہیں تھا۔ ورنہ وہ مجھے بے بسیجی کے بجائے دوسری دنیا بھیجتا پسند کرتا۔ جب منکر نکیر کے ساتھ روانہ ہوا تو میرا خیال تھا کہ اب میرا سامنا اس شخصیت سے ہو گا جس نے مجھے انوارا کر لیا تھا۔ مگر یہاں میرے استقبال کے لیے راجا عمر دراز کا سیکورٹی انچارج موجود تھا اور میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ یہاں کیسے تھا؟ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی تھی کہ وہ دشمنوں سے مل گیا تھا یا پہلے ہی دشمنوں کا آدمی تھا اور راجا عمر دراز کو دھوکا دے رہا تھا۔ اس کی آواز پہچانتے ہی میرے ذہن میں ایک لمحے کو وہ منظر آیا جب میں نے خانہ بدوشوں کے قبیلے میں مہرو کی جھلک دیکھی تھی اور اس وقت اسے اپنا وہم سمجھا تھا۔ جب کرٹل زریبکی یہاں ہو سکتا تھا تو مہرو اس خانہ بدوش قبیلے میں کیوں نہیں ہو سکتی تھی؟ یہ سوچ رہا تھا اور خاموش تھا وہ بھی خاموشی سے میرے ریوٹل کا جائزہ لے رہا تھا۔

”خوب میں تمہیں زریبکی کوشیف کہوں یا عبدالرحمن؟“

”جو تمہاری مرضی.... مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آؤ اندر یہاں بہت سردی ہے۔“

میں اس کے ساتھ اندر آیا۔ ہمارے پیچھے دونوں گارڈ بھی تھے۔ لیکن بہت بڑا نہیں تھا، اس میں شاید دو ہی کمرے تھے۔ ہم لاؤنج میں داخل ہوئے، یہاں آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور خوشگوار حرارت موجود تھی۔ زریبکی نے ایک کرسی نما صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھو۔“

میں بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے میز پر ایک چھوٹی ٹرے رکھی جس میں چند سینڈوچز تھے اور پھر پائے سے کافی کاگ بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ ”کھانا شروع کر دو مجھے پتا ہے تم

بھوکے ہو۔“

اس طویل سفر نے میرا پیٹ بالکل خالی کر دیا تھا اور رواگئی سے پہلے ہی مجھے نام نہاد سامنا تھا دیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ یہ آڈے اور بنیر کے سینڈوچز تھے اس لیے حرام کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ گوشت کے ہوتے تو میں ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ میں نے کھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ گورکھ دھندہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”کون سا گورکھ دھندہ؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

”یہی کہ بہ ظاہر تم راجا عمر دراز کے محل میں انچارج ہو اور تم نے اس کی ایک ملازمہ سے شادی کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ یہ ملازمہ فتح خان کے ہاتھوں عبرت ناک حالات سے گزری تھی اور اس کی زندگی بچانے میں ایک کردار میرا بھی تھا۔ اس لحاظ سے تمہیں فتح خان کا جانی دشمن ہونا چاہیے تھا۔“

”یہ پرائی بات ہو چکی ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ غالباً یہاں اسے مہرو کا ذکر پسند نہیں آیا تھا۔ ”لیکن دوسری طرف مجھے اسی فتح خان نے باقاعدہ جال بچھا کر پکڑا اور میرے ایک اور جانی دشمن نادر علی کے حوالے کر دیا۔ اس نے حیرت انگیز سلوک کرتے ہوئے مجھے اس دنیا سے رخصت کرنے کے بجائے اس گاڑی میں بند کر کے روانہ کیا اور میں توقع کر رہا تھا کہ اس شخص سے طوں کا جو اس چکر کے پیچھے ہے تو میرا سامنا تم سے ہو گیا۔ اب میں کیا سمجھوں؟“

میرے ساتھ آنے والے دونوں کمانڈر اسی مستعدی سے کیمین میں دو الگ جگہوں پر موجود تھے وہ بیٹھے تھے لیکن ان کی شارٹ میں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ پوری طرح چوکے تھے۔ ان کے انداز میں طویل سفر کی تھکاوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا مجھے وہ تربیت یافتہ کمانڈر لگ رہے تھے۔ زریبکی کے علاوہ کوئی دوسرا کیمین میں نظر نہیں آیا تھا وہ یقیناً اکیلا تھا۔ زریبکی نے میرے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کر اپنے لیے واڈا کی بوتل سے ایک جام بنایا اور دوبارہ آکر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے ایک چمکی لی اور کھردری آواز میں بولا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”کوئی خیال نہیں ہے۔“ دشمنوں کی چیمین میں تمہاری موجودگی بتا رہی ہے کہ تم کسی طرف ہو اور اب تک ہمیں دھوکا دیتے آئے تھے۔“

”یہ غلط ہے میں نے راجا صاحب کو دھوکا نہیں دیا اور

نہ انہیں کوئی نقصان پہنچایا۔ میں کبھی ان کا وفادار رہا ہی نہیں اس لیے میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔“

”تمہارے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہے؟“ میں نے طنز کیا۔

”تم اس بات کو نہیں سمجھو گے۔“ اس نے کہا۔ ”یوں سمجھ لو میں کچھ خاص مقاصد کی وجہ سے یہاں آیا اور اتفاق سے راجا جمر دراز سے ملاقات ہو گئی اس نے مجھے ملازمت کی پیشکش کی اور میں نے قبول کر لی۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”راجا جمر دراز کی ایسے ہی راہ چلنے شخص سے ملاقات کر کے اسے جاب کی پیشکش نہیں کر سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں مانتا ہوں میں نے پلاننگ کے تحت جاب حاصل کی لیکن میں اسے نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔“

”اوکے راجا جمر دراز کے لیے مجھے تمہاری ٹیک نیٹی پر یقین آ گیا ہے اب یہ بتاؤ کہ مجھے کس لیے اغوا کیا گیا ہے؟ کیا یہ بھی تمہاری طرف سے خیر سگالی کے جذبے کا اظہار ہے؟“

اس نے میرا طنز بہ لہجہ نظر انداز کیا اور آہستہ سے بولا۔ ”شہباز ابھی تم ناواقف ہو۔ یہ معمولی کھیل نہیں ہے۔ تم جلد سب جان جاؤ گے۔“

”اس چکر کے پیچھے کون ہے؟“

”اس سے بھی جلد تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔“ اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ”اب تم آرام کرو گے۔ صبح تمہیں پھر روانہ ہونا ہے اور ایک طویل سفر کرنا ہے۔“

”ایک.... منٹ.... مجھے اب کہاں..... جانا ہے؟“

میں نے رک رک کر کہا حالانکہ میں روانی سے کہنا چاہتا تھا مگر میری زبان انکڑی رہی تھی اور جب میں نے اٹھنا چاہا تو مجھ سے اٹھا بھی نہیں گیا تھا۔ میری سمجھ میں ذرا دیر سے آیا۔ ”تتم.... تم نے کھانے.... میں کچھ....“

”ہاں تم طویل سفر کر کے آئے ہو اور کل صبح تمہیں دوبارہ ایک طویل سفر پر روانہ ہونا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں تم تازہ دم ہو جاؤ۔“

کاٹی یا سینڈ وچز میں کوئی زود اثر دوا تھی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو چکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب مجھے اس کمرے میں منتقل کیا جو جین کے اندر تھا۔ یہاں صرف ایک بیڈ اور دو معمولی سی کرسیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف کھڑکی تھی لیکن اس میں مضبوط

سلاخیں لگی تھیں۔ دیواریں، چھت اور فرش سب لکڑی کا تھا۔ مجھے جاگ آتی تو صبح ہو چکی تھی اور کھڑکی کے شیشوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ سورج بادلوں کے پیچھے روپوش تھا لیکن دن نکل آیا تھا۔ مجھ پر ایک ہلکا سا بڑا تھا اور اس کمرے میں بھی ایک آتش دان چل رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد وقتے وقتے سے ایک ایسی آواز آرہی تھی جیسے کوئی فرش پر کوئی چیز مار رہا ہو۔ گتے کی آواز میں لرزش ہی بھی آ جاتی تھی۔ پھر ایسی آواز آتی جیسے اس چیز کو فرش سے ہٹا کر نکالا گیا ہو۔

کیبن مکمل طور پر لکڑی کا بنا ہوا تھا اس لیے فرش بھی لکڑی کا تھا۔ اس آواز کے علاوہ خاموشی تھی لیکن کچھ دیر بعد ایک ہلکی سی کھڑکائی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد مجھ میں آیا کہ یہ کسی ریڈیو کی آواز ہے جس پر کوئی بار بار خطاب کر رہا ہے۔ میرے جسم پر رات والا لباس تھا اور پیروں میں جوتے بھی تھے۔ میں اتر کر دروازے تک آیا۔ اب آواز صاف آرہی تھی۔ کوئی انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ ”بیتزر.... بیتزر ڈیو ریڈی۔“

بولنے والا کسی ریڈیو کو کارباز رہا تھا مجھے خیال آیا کہ مرحوم سوویت یونین کو بھی ریڈیو سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ کہیں یہ کال کرل زریسکی کے لیے تو نہیں تھی اس کا تعلق سوویت فوج سے تھا۔ کیبن میں خاموشی تھی۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور میں نے کرل کی آواز سنی وہ ریڈیو کال کا جواب دے رہا تھا۔ ”بیتزر ہیر.... اور۔“

”بیتزر پارسل کب بھیجا جائے گا اور۔“ دوسری طرف سے اسی کھڑکائی آواز نے سوال کیا۔

”آج بھیجا تھا لیکن موسم پرندوں کی اڑان کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ جیسے ہی موسم صاف ہوتا ہے پارسل بھیج دیا جائے گا اور۔“

”اسے جلد از جلد بھیجے گا حکم ہے اور اینڈ آل۔“

دوسری طرف سے کہہ کر کال ختم کر دی گئی۔ لازمی بات تھی کہ یہ ذکر خیر اس خاسکار کا تھا جسے کہیں پارسل کرنے کی تیاری کی جارہی تھی۔ نہ جانے اس کو میرسز کو آڈر کرنے والا کون تھا جسے میرا پارسل درکار تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے رہہ کر ڈیوڈ شا کا خیال آ رہا تھا۔ کیونکہ اس سارے کھیل کے پس پشت مہرے اسی کے تھے۔ صرف کرل زریسکی کی اس کھیل میں شمولیت میرے لیے غیر متوقع تھی لیکن ڈیوڈ شا کے لیے اس جیسے مہرود کو توڑ لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا بلکہ اس کا پورا امکان تھا کہ ڈیوڈ شانے ہی اسے راجا جمر دراز کے مکمل میں

بھیجا ہوا اور وہ اس کے کام کر رہا تھا۔ کم سے کم فتح خان سے اس کا تعلق جوڑ جاٹ تھا جو اس کے ہونے والی یا ہو جانے والی بیوی کی بے آبروئی کا براہ راست ذمے دار تھا۔ میں واپس آ کر بیئر پر لیٹ گیا۔ کیونکہ میرے پاس کرنے کے لیے سوائے غور و فکر کے کچھ نہیں تھا اس لیے میں نے یہی شروع کر دیا۔

میرے دشمن دو طرح کے تھے۔ ایک مرشد اور نادر جنہیں مجھ سے کوئی مفاد نہیں تھا اور وہ میری اور میرے دوستوں کی جان کے دشمن تھے۔ دوسرے طرح کے دشمن میری جان کے گاہک نہیں تھے بلکہ مجھے اپنے کسی مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے جیسے ڈیوڈ شا اور فتح خان وغیرہ۔ اب سے پہلے یہ میرے دونوں دشمن الگ الگ سرگرم عمل تھے اور اگر میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے تھے تو اکیلے ہی اٹھاتے تھے۔ لیکن اس بار ایسا لگ رہا تھا کہ کسی وجہ سے میرے تمام دشمنوں نے میرے خلاف ایک کر لیا ہے۔ نادر علی، فتح خان، شہلا اور کرل زریسکی مجھے اغوا کر کے نہیں پہنچانے کے لیے ایک ہو گئے تھے۔ اگر اب تک مرشد اور ڈیوڈ شا سامنے نہیں آئے تھے لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ وہ بھی اس معاملے میں کہیں نہ کہیں شامل تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ میرے ان دشمنوں کو کس نے بچا کر دیا تھا؟ کیا وہ شخص ڈیوڈ شا تھا یا اس کے پس پشت بھی کوئی اور شخصیت تھی؟ اس نے مجھے کیوں اغوا کر لیا ہے؟ اور سب سے اہم سوال مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا؟ سرد ترین موسم بتا رہا تھا کہ میں پاکستان کے کسی شالی علاقے میں ہوں جہاں تک سڑک کے ذریعے رسائی ممکن تھی۔ مجھے اس سے بھی آگے کہیں بھیجا جانا تھا لیکن موسم راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ میری منتقلی یقیناً پہلی کاپڑ کے ذریعے کی جانی۔ کرل زریسکی نے جن پرندوں کا ذکر کیا تھا ان سے مراد نیکی کا پڑ ہی تھے۔ میں سوچوں میں گم تھا کہ دروازہ کھلا اور کرل زریسکی کی صورت دکھائی دی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”گڈ مارنگ۔“

”ابھی تک تو گڈ ہی ہے۔“ میں نے اس سے اتفاق کیا تو اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

”تمہارا رویہ کچھ عجیب سا نہیں ہے؟“

”میرے رویے میں تمہیں کیا عجیب لگ رہا ہے؟“

”تم کچھ زیادہ ہی مطمئن اور خوشکون ہو۔“

”اگر میں کچھ کم مطمئن اور پریشان رہوں تو اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟“ میں نے سوال کیا لیکن میں نے محسوس کیا

کہ میرے اطمینان سے کرل شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔

”کیا تمہیں امید ہے تمہارے ساتھی تمہیں چھڑانے کے لیے یہاں تک آئیں گے؟“

”مجھے ایسی کوئی امید نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ بے چارے تو ابھی مجھے اسلام آباد کی حدود میں تلاش کر رہے ہوں گے۔“

”آؤ ناشتا کرو۔“ اس نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

”ضرور لیکن اس سے پہلے مجھے ساتھ روم جانے کا موقع ملے گا؟“

”بالکل۔“ اس نے کہا۔ لاؤنج میں منکر مگر موجود تھے کرل کے حکم پر وہ مجھے کیبن کے عقبی حصے میں موجود لکڑی کے بنے چھوٹے واش روم میں لے گئے۔ یہ صاف ستر تھا لیکن بانی جان لیوا حد تک سرد تھا۔ نہ جانے انہوں نے اسے پانی کی شکل میں کیسے رکھا تھا ورنہ اسے ٹورف بن جانا چاہیے تھا۔ میں واپس آیا تو میرا حشر ہو گیا تھا۔ اتنا سرد پانی میں نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا اور واپس آنے کے بعد میں تقریباً دس منٹ آتش دان کے سامنے ہاتھ پیٹتا رہا تب کہیں جا کر ان کی حالت نارمل ہوئی تھی۔ اس بار بھی کھانے میں سینڈ وچز اور کافی تھی۔ یہ آسانی سے اور فوراً بن جانے والی چیز ہے جس کے اجزاء تازے ترکیبی یعنی ڈبل روٹی، بیٹر اور انڈے خاصی دیر تک محفوظ رکھے جاسکتے ہیں۔ اس موسم میں ان کے خراب ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لہذا وہ وافر مقدار میں یہاں ذخیرہ کیے جاسکتے تھے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی اور نہ کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ مجھے کھانے میں نیند کی دوا دے رہا تھا اور میں نہ کھاتا تو وہ مجھے کسی دوسرے طریقے سے سلا دیتا۔

کرل اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی فرش میں ایک چھوٹا سا چاقو گڑا ہوا تھا۔ وہ شاید چاقو فرش پر مارنے کا شغل کر رہا تھا۔ آواز اسی کی آرہی تھی۔ منکر گھبراہٹ بھر آرام کے بعد بالکل تازہ دم اور چوک نظر آ رہے تھے۔ صورت سے وہ وسط ایشیائی لگ رہے تھے۔ ممکن ہے ان کا تعلق براہ راست کرل زریسکی سے رہا ہو۔ ”تمہارے آدی ہیں؟“

”ہاں یہ میری یونٹ میں رہے ہیں میرے ساتھ ہی آئے ہیں۔“

”تم ایک پلان کے تحت راجا جمر دراز تک آئے تو کسی کے بے رول پر تو ہو گے۔“

”تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

صاف ظاہر تھا اس کا بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سینڈ وچر سے فارغ ہو کر میں نے کافی کاک سیبلا۔ یہ سچ اور سیاہ کافی تھی۔

”یہ جگہ کہاں ہے؟“

”چترال میں ایک جگہ ہے۔“ اس نے بتایا تو میں حیران رہ گیا۔ بے شک میں نے کوئی بارہ تیرہ گھنٹے سفر کیا تھا لیکن اتنی جلدی چترال تک رسائی آسان نہیں ہے اور وہ بھی اگر لواری نل مل گئی ہو۔ لیکن یہ سفر سولہ سترہ گھنٹے سے پہلے طے نہیں ہوتا ہے۔ بس تو دو دن سفر کرتی ہے۔ اس کا مطلب ہے انہوں نے غیر معمولی رفتار سے ڈرائیونگ کی تھی۔ اس اطلاع نے مجھے حیران ہی نہیں فکر مند بھی کر دیا تھا۔ چترال پاکستان کے انتہائی شمال میں چین اور افغانستان کی پٹی کے ساتھ واقع ہے یہ نہایت دشوار گزار پہاڑی سلسلہ ہے جو آگے جا کر سٹو مرتضیٰ پامیر سے جاملتا ہے۔ یہاں سال کے چھ مہینے برف جھی رہتی ہے اور ہر قسم کی آمد و رفت بند ہوتی ہے۔ بانی چھ مہینوں میں برف نہیں ہوتی ہے لیکن آمد و رفت پھر بھی دشوار رہتی ہے۔ اس سے آگے صرف چین اور افغانستان تھے۔ مجھے بھلا کہاں آگے بھیجا جا رہا تھا؟

یہ جاننے کے بعد کہ کرل زریب کسی کس کے لیے کام کر رہا تھا اس کی میری نظر میں نادر علی اور فتح خان جیسی اہمیت نہیں رہی تھی اور نہ اس کی اہمیت رہی تھی کہ وہ راجا عمر دراز سے غداری کر رہا ہے اہمیت اس شخص کی تھی جس نے مجھے نہیں منگوایا تھا۔ اب تک میں سکون سے تھا لیکن یہ جاننے کے بعد کہ مجھے چترال سے آگے نہیں بھیجا جا رہا ہے میں فکر مند ہو گیا تھا۔ مجھے اب کچھ کرنا تھا۔ اگر اس معاملے میں ڈیوڈ شالوٹ تھا تب بھی مجھے ملک سے باہر بلوانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ مجھ سے پاکستان میں ملاقات کر سکتا تھا کیونکہ وطن عزیز آج کل پاکستانیوں کا کم اور ان گوروں کا زیادہ ہو گیا ہے جو دو سو سال سے ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہاں ان کو وہ سہولتیں حاصل ہیں جو خود اپنے ملکوں میں بھی نہیں حاصل ہیں۔

مگر میں نہتا تھا اور میرے تینوں ذہن پوری طرح سچ تھے۔ منکیر کبیر کے پاس مہلک شاد کن تھیں جبکہ کرل کے پاس بھی سروں پوتول دکھائی دے رہا تھا۔ کرل کا انداز بہت مرسکون اور دھیمہ تھا لیکن مجھے یقین تھا اندر سے وہ بھی پوری طرح چوکنا تھا۔ اس کے آدمیوں کے بارے میں مجھے شک نہیں تھا کہ میری کسی بھی حرکت کے نتیجے میں وہ مجھے شوٹ کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ صرف ایک خیال امید افزا

تھا کہ انہیں مجھ کو گرفتار کر کے کہیں پہنچانا تھا اور ظاہر ہے زندہ پہنچانا تھا۔ مجھے مارنے کے لیے کسی کو اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے یہ خیال بھی تھا کہ وہ مجھے مارنے سے ہر ممکن گریز کریں گے۔

کرل زریب کی اپنے نشست پر کسی قدر آرام سے پھیل کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے دونوں آدمی کچھ دیر تو کھڑے رہے پھر وہ بھی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے اور انہوں نے شاد کن میں اپنے پاس زمین پر رکھ لی تھیں۔ مجھے ان کے انداز پر کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔ کرل سمیت وہ تینوں اچانک ہی ریلیکس نظر آنے لگے تھے۔ مجھے لگا جیسے قدرت نے مجھے یہ موقع دیا ہے۔ اگر میں کرل پر قابو پا لیتا اور اس سے پوتول چھین کر اسے یہ غمال بنا لیتا تو اس کے آدمی یقیناً ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے۔ میں نامحسوس طریقے سے اپنے جسم کو اس پوزیشن میں لانے لگا کہ ایک ہی جست میں کرل پر چا پڑوں جو مجھ سے کوئی چھ فٹ کی دوری پر تھا۔ ایک بار اس پر گرنے کے بعد اس کے آدمی مجھ پر گولی چلانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ اس صورت میں کرل کو بھی گولی لگنے کا پورا امکان تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے آدمی پاس آتے میں کرل کو ناک آؤٹ کر کے اس کا پوتول حاصل کر سکتا تھا۔

لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کرل میری توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوتا وہ خود ہی میرا حملہ بجا لیتا اور خود ہی مجھے ناک آؤٹ کر دیتا۔ اپنے انداز سے وہ کوئی کمانڈو قسم کی چیز لگتا تھا اور عین ممکن تھا فوج میں وہ انجیل گروپ میں ہو۔ اگر وہ مجھ پر قابو پا لیتا تب بھی اس کا امکان کم تھا کہ وہ مجھے شوٹ کر دے گا۔ ہاں وہ مجھے بے ہوش کر کے یا بے بس کر کے رکھ سکتا تھا۔ سارے امکانات ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے چانس لینے کا فیصلہ کیا اور اچانک ہی کرل پر چھلانگ لگائی۔ لیکن اس کے بعد جو ہوا وہ میں ساری عمر فراموش نہیں کر سکوں گا۔ یہ ظاہر تو میں نے جیتے کی طرح چھلانگ لگائی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں کرل پر اس کی بے خبری میں لینڈ کروں گا مگر ہوا یہ کہ میں بچھوے کی سی سستی سے کرسی سے اٹھا۔ یہ بالکل ایسا سین تھا جیسے کرکٹ کچھ میں الٹرا سلوموشن میں دکھاتے ہیں۔ میرا جسم سست روی سے میرا ساتھ دے رہا تھا جبکہ میرا ذہن اس سے کہیں آگے تھا۔ میرے خیال میں مجھے سیکنڈ کے ایک تہائی حصے میں کرل پر جا کرنا تھا لیکن میں تیسرے سیکنڈ میں کرسی سے کھڑے ہونے کے بعد ڈگمگا رہا تھا جیسے سوچ رہا ہوں کہ آگے کروں یا پیچھے۔ میرا جسم کسی شرابی کی

طرح ڈول رہا تھا۔ جبکہ ذہن پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ بالآخر میں منہ کے نکل سائے کرا اور میرے سر سے ذرا آگے کرل کے پاؤں تھے۔ ہاتھ بروقت آگے کر لینے سے میرا منہ ناک ایک ہونے سے بچ گئے تھے۔ اگر کوئی اس وقت دیکھتا تو اسے لگتا جیسے میں کرل کے قدموں میں گر رہا ہوں۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں تھی میں مجھنے سے قاصر تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟ میں اس طرح سست کیوں ہو گیا ہوں؟ کیا پھر کھانے میں مجھے بے ہوشی کی دوا دیدی گئی تھی اور اس کا اثر اب ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تو میرا خیال تھا کہ اب مجھ سے اٹھنا بھی نہیں جائے گا اور میں نہیں پڑے پڑے بے ہوش ہو جاؤں گا۔ مگر میں اٹھ گیا۔ مشکل نہیں ہوئی مگر انداز وہی تھا الٹرا سلوموشن والا۔ اسی طرح دھڑے سے میں کھڑا بھی ہو گیا اور مجھے نہ تو مشکل ہوئی اور نہ ہی کسی ناتوانی کا احساس ہوا۔ مجھے پھر بھی نہیں آ رہے تھے اور میں پہلے ہی اس وجہ سے گر تھا کہ میں نے جسم کے رد عمل سے زیادہ کام لینے کی کوشش کی تھی۔ اب میں اس سلوموشن کا عادی ہو رہا تھا اس لیے یہ آسانی اپنے ہیروں پر کھڑا تھا۔

کرل بالکل میرے سامنے کرسی پر اسی طرح آرام سے بیٹھا تھا اور مجھے کسی قدر متحیرانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جواب میں اٹھنے یا کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور میں نے بھی دوبارہ کچھ کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں سمجھ گیا تھا میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے البتہ یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ گڑبڑ کیا ہوئی ہے۔ میں پیچھے ہوا میرے قدم اسی طرح سست روی سے اٹھ رہے تھے۔ چند قدم پیچھے ہٹ کر میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور کرل کی طرف دیکھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

میرا خیال تھا کہ میرے منہ سے الفاظ بھی سست روی سے یا ٹوٹ ٹوٹ کر نکلیں گے۔ مگر یوں کہ میں بالکل ٹھیک تھا۔ کرل نے آرام سے جواب دیا۔ ”ایک دوا کا معمولی سا ڈوز ہے۔ یہ دوا جسم پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالتی ہے سوائے اس کے کہ دماغ کے احکامات کی رفتار سست کر دیتی ہے۔ یہ جسم کے متعلقہ حصوں تک سستی سے پہنچتے ہیں اور نتیجے میں جسم سست رد عمل دیتا ہے۔ جیسا کہ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔“

کرل نے نہایت چالاکي سے کام لیا تھا۔ اس نے مجھے سلانے کے بجائے یہ حیرت استعمال کیا تھا۔ اس کا تعلق دنیا کی ایک بڑی فوج سے رہا ہے اور فوج کے خصوصی شعبوں میں اس قسم کی دواؤں کا استعمال اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں

رہی ہے۔ حد یہ کہ انسانی حقوق کے نام نہاد چیپین بھی اپنی فوج پر خصوصی دواؤں کے تجربے کرتے رہے ہیں۔ کرل نے ایک ایسی ہی دوا کا استعمال مجھ پر کیا تھا۔ شاید آج کسی وقت بھی میری عقلی عمل میں آ سکتی تھی اس لیے اس نے سلانے کے بجائے مجھے یوں بے بس کر دیا۔ اب ایک آدمی خالی ہاتھ سے بھی با آسانی مجھے قابو کر سکتا تھا۔ اسلئے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے کرل سے پوچھا نہیں کہ اس دوا کا اثر کتنی دیر رہے گا۔ اس کا اندازہ مجھے خود ہو جاتا میرا جسم میرے قابو میں آ جاتا۔ لاؤنج میں مجھے وہ ریڈیو نظر نہیں آیا تھا جس پر کرل نے کسی سے بات کی تھی۔

”جب تمہارے پاس ان جیسے تربیت یافتہ آدمی ہیں تو تم نے فتح خان یا نادر علی کی مدد کیوں حاصل کی؟“ میں نے منکیر کبیر کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چوٹا۔ ”نادر علی کیوں ہے؟“

اس بار میں چوٹا۔ ”تم نادر علی کو نہیں جانتے مرشد علی کا بھائی۔“

”میں مرشد کو جانتا ہوں اس کے بھائی کا نام پہلی بار سنا ہے لیکن تمہارے اغوا میں وہ کہاں سے آ گیا؟“

”یہ تمہارے کرگے جانتے ہیں جہاں مجھے رکھا گیا تھا وہاں نادر علی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ یہی دونوں اس کو گارڈ کر رہے تھے۔“

کرل نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تم نے ہماری کمان فتح خان کے ہاتھ میں دی تھی ہم اس کے کہنے پر عمل کر رہے تھے۔“

”تم اس وہیل چیئر والے کو نہیں جانتے؟“ میں نے کہا۔

اس نفی میں سر ہلایا۔ ”فتح خان نے کہا تھا وہ تم سے بات کرے گا اور ہمیں اس کی حفاظت کرنی ہے وہ باہر سے آیا تھا اور تم سے مل کر چلا گیا۔“

کرل کی پیشانی کی ٹھنکین بتا رہی تھیں کہ یہ بات اس کی توقع کے خلاف تھی۔ شاید اس نے فتح خان کی خدمات حاصل کی تھیں اور فتح خان نے اس کے علم میں لائے بغیر نادر علی کو مجھ سے ملاقات کا موقع دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ اتنا بے بس کیوں تھا اور پاگل کی طرح غرانے اور بھوکنے کے بجائے شرافت سے بات کر رہا تھا۔ ظاہر ہے فتح خان نے اسے مجھ سے صرف ملاقات کی اجازت دی تھی۔ وہ



مجھے انگلی لگانے کا مجاز بھی نہیں تھا۔ کرنل خاموش تھا میں اس کا جائزہ لے رہا تھا میں نے اچانک کہا۔

”کرنل میرا کہاں ہے؟“

وہ چونکا۔ ”میں اس سے کیا کہہ دوں کہاں ہے؟“

”میرا مطلب ہے اب وہ راجا کے محل میں تو نہیں ہوگی؟“

”ظاہر اب اس کا وہاں کیا کام؟“

”گو یا وہ پوری طرح تمہارے ساتھ مل گئی ہے۔“

”وہ میری بیوی ہے اور اسے میرے ساتھ ہی ہونا ہے۔“ کرنل نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ لیکن اس کی بات نے میرے اندر ایک نئی سوچ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مہر و راجا عمر دراز کے محل میں نہیں تھی۔ فتح خان کے سابقہ ٹھکانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے خانہ بدوشوں کے درمیان جس عورت کی جھلک دیکھی تھی کیا وہ مہر و بی بی اور کسی خاص وجہ سے وہاں موجود تھی۔ فتح خان اور کرنل کے گٹھ جوڑ کے بعد مجھے اب سب کچھ ممکن نظر آ رہا تھا۔ کرنل نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ”تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”وہ کچھ دن میرے ساتھ رہی ہے اور میں نے اس کی جان بچائی تھی اس لیے پوچھ لیا ورنہ تمہاری بیوی سے مجھے کیا سروکار۔“

وہ مطمئن ہو گیا۔ کہیں کے باہر موسم بدستور سمری اور سرد تھا ہوا میں برف کے ٹکڑے اڑا کر کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتے تو ان کی شدت کا اندازہ ہوتا تھا۔ فی الحال موسم میں بہتری کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے اور اس لیے میری روانگی کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ کرنل نے چالاکیا سے کام لیا تھا اس نے مجھے معمولی گرم کپڑوں میں رکھا تھا جو کہیں کی حد تک گزارے کے قابل تھے لیکن اگر میں کہیں سے نکل جاتا تو چند گھنٹوں میں سردی مجھے منہ کر دیتی اور میں دنیا سے مفور ہو جاتا۔ یہ اس کی ایک احتیاجی تدبیر تھی ورنہ آدی فرار ہونے کا ارادہ کرے تو دنیا کی کوئی جیل اسے نہیں روک سکتی تھی۔ اس لیے کرنل نے صرف اسی پر مہر و سائیں کیا اس نے مجھے ناکارہ بنانے کے لیے دو ابھی استعمال کی اور اب میں صبح معنوں میں اس کا قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ ریڈیو کی کھڑکڑاہٹ ایک بار پھر سنائی دی۔ ”ہیز ڈویور یڈی اور۔“

اس بار میں نے اندازہ کر لیا کہ ریڈیو ایک طرف رکھے دیکھ کر مجھے تھا۔ کرنل نے اٹھ کر دیکھ کر کیا اور

ناک اٹھا کر اس کا بٹن دبایا۔ ”میں ہیز اور۔“

”آدھے گھنٹے بعد پرندہ اڑے گا اور آدھے گھنٹے بعد تمہارے پاس ہوگا اور۔“

کرنل نے مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ”موسم ٹھیک نہیں ہے اور۔“

”موسم دوپہر کے بعد مزید خراب ہوگا اس لیے پارسل کی منتقلی کا فیصلہ کر لیا گیا ہے اور۔“

کرنل نے سوچا اور شانے اُچکا کئے۔ ”او کے۔۔۔ اور ایڈل۔“

مجھے گفتگو کے دوران ریڈیو کی جھلک دکھائی دی تھی۔ یہ فوجی نوعیت کا طویل فاصلوں اور ہر موسم میں کام کرنے والا ریڈیو تھا۔ دوسری طرف سے بلی کا پٹر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور کرنل کو سنا دیا گیا تھا اگرچہ وہ اس کے حق میں نہیں تھا مگر دوسری طرف اس کے بھی آقا تھے اس لیے وہ ان کے فیصلوں کو دیکھیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے موسم کی خرابی کے باوجود مجھے لانے کے لیے بلی کا پٹر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آخر وہ کون تھا اور میرے لیے اتنا بے تاب کیوں تھا؟ کرنل زمین کی اپنے آدھیوں کی طرف دیکھا۔ ”چاکر چوپر کے لیے جگہ تیار کرو۔“

انہوں نے اپنے ہتھیار اٹھائے اور خاموشی سے باہر نکل گئے تھے۔ کرنل میرا دشمن نہیں تھا وہ ایک پروفیشنل تھا۔ جو کام لیتا اسے بہترین طریقے سے انجام دیتا تھا۔ اسے مجھے کہیں پہچانے کا ناسک دیا گیا تھا اور اس نے یہ کام تقریباً کر لیا تھا۔ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کتنا خطرناک آدمی تھا لیکن ساتھ ہی اسے معلوم تھا میں خود کشی نہیں کر سکتا تھا۔ میں آخر تک لڑنے اور کبھی ہمت نہ ہارنے والا انسان تھا۔ اس لیے اس نے مجھے قابو میں رکھنے کی بہترین حکمت عملی اپنائی تھی۔ اس نے کسی بھی مرحلے پر مجھے ڈی گریڈ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی میرے ساتھ کوئی برادری رکھی۔ میرے دوسرے دشمنوں کے مقابلے میں اس کا رویہ خاصا بہتر تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مجھے کسی قسم کی رعایت دیتا اگر میں فرار کی کوشش کرتا تو وہ بے دریغ اپنے ہتھیار استعمال کرتا اور اگر میں اس کے ساتھ سے نکلے لگا تو وہ مجھے شوٹ کر دیتا۔ مجھے وسم اور اس کے آدھیوں کی فکر ہو رہی تھی۔ ”میرے ساتھ تین افراد اور تھے ان کو بھی اغوا کیا گیا ہے؟“

”ان کے بارے میں فتح خان بہتر جانتا ہوگا میں نے

صرف تمہیں لانے کو کہا تھا اس نے تمہارے ساتھیوں کے ساتھ کیا کیا ہے میں اس سے بے خبر ہوں؟“

وسم اور اس کے آدھیوں کا فتح خان کے پاس بھی کوئی مصرف نہیں تھا اس لیے امکان یہی تھا کہ اس نے انہیں قید میں رکھنے یا مار ڈالنے کے بجائے چھوڑ دیا ہوگا۔ دوسری صورت میں اسے معلوم تھا وہ کہیں بھی چین سے نہیں بیٹھ سکے گا میرے ساتھی ایک انتقامی جذبے کے ساتھ اس کے پیچھے بڑھ جائیں گے۔ کس کا شکار ہونے سے پہلے میں عبداللہ کو بتا دیا تھا کہ یہ فتح خان کا کام ہے اس لیے میرے ساتھی اب بھی اس کے پیچھے ہوں گے۔ اس لیے فتح خان کو ان ایا کام نہیں کر سکتا تھا کہ ایک بار میرے یا میرے ساتھیوں کے ہاتھ آنے کے بعد اس کی گلوغلاسی نامکمل ہو جائے۔ دوسری صورت میں ایک دوسرے کو رعایتیں دیتے رہتے تھے۔

”تمہارا فتح خان سے رابطہ کیسے ہوا؟“

”میرا اس سے براہ راست رابطہ نہیں ہے بلکہ مجھے بتایا گیا کہ وہ تمہیں اغوا کرنے کا کام کرے گا اور اس کے بعد میرے آدھیوں کے حوالے کر دے گا۔“ کرنل نے ایک بار پھر دامن بچانے والے انداز میں کہا جبکہ مجھے یقین تھا وہ بھوت بول رہا ہے۔

”پھر بھی تم نے اپنے آدھیوں کو اس کے پاس بھیجا ہوگا تو اس سے رابطہ کیا ہوگا؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے اوپر والوں نے تمام معاملات طے کر دیے تھے۔ میرے آدھی گئے اور تمہیں یہاں لے آئے۔“

اس سے گفتگو کے دوران میں غور بھی کرتا جا رہا تھا۔ ”جہاں مجھے لے جایا جا رہا ہے کیا تم بھی چلو گے؟“

”نہیں۔“ اس نے کسی قدر بے دھیانی سے کہا۔ ”مجھے واپس جانا ہے۔“ وہ کہتے ہوئے یک دم اٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور میری طرف دیکھا۔ ”تیار ہو جاؤ پھر آ گیا ہے۔“

بند کین میں باہر کی آوازوں کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس نے ذرا سار دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو تیز ہوا کے ساتھ واضح طور پر بلی کا پٹر کا شور بھی اندر تک آیا تھا۔ جب وہ دروازہ بند کر کے پلٹا تو میں کرسی پر واپس بیٹھ رہا تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”کیا ارادہ ہے؟“

”ارادہ تو یہ ہے کہ آتش دان کی سلاح تمہارے سر پر رسید کروں لیکن افسوس یعنی دیر میں یہ کام کروں گا تم مجھے اس

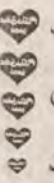
دوران میں چار بار ناک آؤٹ کر چکے ہو گے اور میں ناک آؤٹ ہونا نہیں چاہتا اس لیے دوبارہ بیٹھ گیا۔“

اس کا شک ختم ہو گیا اور وہ مسکرایا۔ ”تم عقل مند آدمی ہو۔“

کرنل نے قاہرہ اور اسٹیل کی بنی ہوئی ہلکی لیکن نہایت مضبوط قسم کی ہتھکڑی نکالی۔ یہ اصل میں ہاتھوں اور جیروں کو بیک وقت جکڑنے والی ہتھکڑی تھی جس میں ایک نالکون جیسے ریشے سے بنی رتی بھی تھی۔ اس میں جکڑے جانے کے بعد آدی نہ تو ایک حد سے زیادہ قدم اٹھا کر چل سکتا تھا نہ ہاتھ اوپر اٹھا سکتا اور نہ ہی دونوں ہاتھ الگ الگ استعمال کر سکتا تھا۔ مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے میں نے پچھلے چرا ہتھکڑی پہن لی۔ کرنل نے مجھے کھینچ کر کھڑا کیا اور کھینچ کر ہی باہر لے جانے لگا۔ باہر نکلنے ہی قیامت خیز ہواؤں اور سردی نے استقبال کیا تھا۔ کہیں سے ذرا نیچے ایک کھلی جگہ بلی کا پٹر کھڑا تھا اور اس کے کٹھے بدستور حرکت میں تھے۔ پائلٹ سیٹ پر ایک آدمی موجود تھا جبکہ دوسرا پچھلا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ کرنل کے دونوں آدھی بھی اس کے پاس تھے۔ میں بہ مشکل قدم اٹھا تا ہوا بلی کا پٹر تک پہنچا تھا ایک تو ویسے ہی میرے اعصاب سست ہو رہے تھے پھر پاؤں بندھے ہوئے کی وجہ سے میں ایک فنٹ سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

بلی کا پٹر چھوٹا تھا اس میں آگے پیچھے چار افراد کے بیٹھے کی گنجائش تھی۔ کرنل نے مجھے پچھلے حصے میں دھکیل دیا۔ یہاں بس دو افراد کے بیٹھے کی گنجائش تھی۔ انجن کا شور کان کے پردے پھاڑ رہا تھا اس لیے گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کرنل دوسرے آدمی کو کچھ کہنے کے لیے بلی کا پٹر سے ذرا دور لے گیا تھا۔ ہوائیں ویسے ہی نہ تھیں اوپر سے بلی کا پٹر کے کٹھے نے ان میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ یہ میرے معمولی کپڑوں اور گوشت سے گزر کر جیسے ہڈیوں میں پوست ہو رہی تھی۔ پائلٹ نے سر گھما کر دیکھا تو مجھے اس کی صورت صاف دکھائی دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دوسرا فرد بھی آ گیا جو بلی کا پٹر کے ساتھ آیا تھا اور شاید اسے بھی ساتھ ہی جانا تھا۔

وہ پستہ قد لیکن بہت گھٹے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس نے اوپر ایسی جیکٹ پہن رکھی تھی جس میں فروا لا ہڈی تھا اور اس قسم کی جیکٹ عام طور سے بہت سرد علاقوں میں رہنے والے اسکیموز پہنتے ہیں۔ ہڈی میں اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی سلائیڈنگ ڈور کھینچ کر بند کر دیا



اور اندر ایک لخت شور میں کسی آگئی تھی۔ اس کا کہیں یقیناً پریشاں نہ تھا۔ دروازہ بند کر کے ہی اندر کا درجہ حرارت بھی تیزی سے اوپر گیا تھا اور ایک منٹ سے بھی پہلے یہ صفر سے اوپر جا چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بیلی کا پٹر ہوا میں بلند ہوا اور ایک طرف پرواز کر گیا۔ میرے ساتھ بیٹھے آدمی نے ہڈ پیچھے کیا اور میری طرف دیکھا تو پلٹ کو دیکھ کر مجھے جو شک ہوا تھا وہ اسے دیکھ کر یقین میں بدل گئے۔

”تم اٹھیں ہو؟“

وہ مسکرایا تو اس کے سیاہ رنگ پر سفید دانت بہت نمایاں نظر آئے تھے۔ وہ اوپر پلٹ دوٹوں سا دھڑکا اٹھا۔ اسے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا انداز اور گھٹا ہوا جسم بتا رہا تھا کہ ان کا تعلق فوج سے یا ایسے ہی کسی ادارے سے تھا۔ وہ بولا۔ ”تم نے ٹھیک پہچاننا شہباز ملک۔“

میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ دشمن ملک کے یہ دو افراد ایک بیلی کا پٹر میں دندناتے ہوئے میرے ملک کی سرحد میں داخل ہونے اور نہایت آرام سے مجھے اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ بے شک یہ علاقہ سرحد کے نہایت نزدیک تھا مگر کیا ہمارے فضائی محافظ اس سرحد کی نگرانی نہیں کر رہے تھے۔ وہ میرے تاثرات سے بھانپ گیا تھا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ ”تم حیران ہو کہ ہم یہاں کیسے آئے؟“

”ہاں۔“

”کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“ وہ طنز سے لہجے میں بولا۔

”تم میری باتیں کر رہے ہو۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ مجھے کیوں اغوا کر لیا ہے؟“

”تمہیں اس کا جلد بتا چل جائے گا۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”تمہاری تلاش میں ہم نے بہت وقت اور پیسا ضائع کیا ہے۔“

جی بات ہے کہ میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ جب میں انڈیا میں تھا تو اور میں نے وہاں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ ان کو نظر رکھتے ہوئے بھارتی سرکار کا میرے پیچھے پڑنا لازمی بات تھی۔ یہی وجہ تھی جب تک میں بھارتی سرزمین پر رہا میں نے گرفتار ہونے کی کوشش نہیں کی اور اگر دوسری طرف سے ایسی کوئی کوشش کی تھی تو میں نے جان پر کھیل کر اسے ناکام بنادیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ایک بار بھارتیوں کے ہتھے چڑھ گیا تو میری گھوغلا سی مشکل ہوگی۔ لیکن جب میں وہاں سے نکلا اور اس بات کو خاصا عرصہ گزر گیا تو میرے ذہن سے بھی بھارتی خطرہ محو ہو گیا۔ میں نے ایک طرح سے

انہیں اپنے دشمنوں کی فہرست سے خارج کر دیا تھا، یہ سوچ کر کہ رات گئی بات گئی مگر بھارتی ببولے نہیں تھے وہ مجھے تلاش کر رہے تھے اور انہوں نے مجھے تلاش کر لیا تھا۔

درحقیقت مجھے تلاش کرنا کوئی بہت دشوار کام نہیں تھا۔ میں بھارت میں جتنے عرصے رہا اور پھر جا بجا دکھائی دیا اس کے بعد میری شناخت کرنا کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔ مشکل کام مجھے تلاش کرنا تھا۔ یہ کام بیوں نے ان لوگوں سے لیا جو مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور مجھے تلاش کر سکتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے کر لیا۔ اب بھارتی مجھے کشاں کشاں لیے جا رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے؟ سوویت یونین کے خاتمے اور سینٹرل ایشیا کے مسلم ممالک کی بے ظاہر آزادی کے باوجود وہاں آج بھی روس کا راج تھا اور اس کی مرضی کے بغیر یہ ممالک نہ تو کوئی بڑا فیصلہ کر سکتے تھے اور نہ ہی کوئی پالیسی بنا سکتے تھے۔ درحقیقت روس نے وہاں اپنے پٹھو حکمران بٹھا دیے تھے جیسے انگریز اس خطے سے جاتے ہوئے حکومت اپنے مہروں کو سونپ گیا تھا۔

روی آشر باو سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے سینٹرل ایشیا میں اپنے کئی فوجی اڈے قائم کر لیے تھے۔ ان اڈوں کو مکمل طور پر بھارتی حکومت چلاتی تھی اور وہاں سارا عملہ بھارتی ہوتا تھا۔ مجھے ایسے ہی کسی اڈے کی طرف لے جا یا جا رہا تھا۔ بیلی کا پٹر پہاڑوں کے درمیان پرواز کر رہا تھا اور پلٹ دانستہ کوشش کر رہا تھا کہ اسے بلند ہونے سے بچائے۔ حالانکہ پہاڑوں کے درمیان بعض اوقات ہوائیں بے قابو رفتار سے چلتی ہیں اور راہ میں آنے والی ہر چیز کو خش و خشاک کی طرح اڑا لے جاتی ہیں۔ موسم ویسے ہی اچھا نہیں تھا اس موسم میں بھارتیوں کا خطرہ مول لے کر یہاں آنا بتاتا تھا کہ وہ میرے لیے کس قدر بے تاب تھے۔ میں مکمل طور پر کٹرل زریں کی کے قابو میں تھا اس کے باوجود انہوں نے موسم بہتر ہونے تک کا انتظار نہیں کیا۔

”تم بننے کسی پر اپنا وقت اور پیسا ضائع نہیں کرتے ہو؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تم ایک ایسی شخصیت ہو جس کے لیے ہم من مانی رقم دینے کو تیار تھے۔“

میں ہنسا۔ ”میں خود کو اتنا اہم نہیں سمجھتا۔“

”ہاں تم اہم نہیں ہو لیکن ہم تمہیں اہم بنادیں گے۔“

اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”تمہارے ملک میں رہنے والے بہت سارے عام سے لوگوں کو بھی ہم نے بہت اہم بنا

دیا ہے۔“

اس کا انداز خطرے کی گھنٹی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اغوا کرانے والا ڈیوڈ شاہوگا۔ جیسے جنگل میں جانے والا شیر یا جتنے کے خطرے کے بارے میں سوچے اور اچانک ہی اسے لگو لگوں کا گردہ گھیر لے جو شیر یا جیتے سے کہیں زیادہ سفاک اور خطرناک درندہ ہے۔ یہ اگر اکیلا شیروں کے ہاتھ لگ جائے تو یوں چیخ و پکار کرتا ہے جیسے اس سے زیادہ مظلوم دنیا میں کوئی نہیں ہے لیکن جب گردہ کی صورت میں ہو اور کوئی اکیلا جانور ان کے ہاتھ آجائے تو یہ اپنی اصلیت پر آجاتے ہیں اس وقت ان کی سفاکی دیکھنے والی ہوتی ہے۔ اسی طرح میں بھارتیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور ان کی اصلیت مجھے پہلے ہی معلوم تھی۔ کیا یہ مجھے بھارت لے جا کر سزا دینا چاہتے تھے یا مجھ سے کچھ اور مفاد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ بھارتی بیٹاؤں نے روز اول سے پاکستان کا وجود دل سے تسلیم نہیں کیا اور ان کی پہلی اور آخری سوچ پاکستان کا خاتمہ ہے۔ اسے نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ آج کل وہ یوں شیر ہو رہے ہیں کہ امریکا نے سوویت یونین کے خاتمے کے بعد بھارت کو بھی گولے لیا ہے اور وہ اس خطے میں وہی رول ادا کرنے کی تیاری کر رہا ہے جو اسرائیل مشرق وسطیٰ میں کرتا ہے۔ اس کا پہلا ہدف پاکستان ہے اور اسے چاروں طرف سے گھیرنے کے لیے بھارت نے آس پاس کے ملکوں میں اپنے کئی فوجی اڈے قائم کر لیے ہیں۔ مجھے یقیناً ایسے ہی کسی اڈے کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

مجھے لے جانے والا مجھ سے واقف تھا یعنی وہ کوئی اہم افسر تھا۔ میں ان کے لیے اتنا اہم تھا کہ انہوں نے عام آدمیوں کے بجائے اسے سببجا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ پھر میں دوا کے زیر اثر تھا اس لیے جسمانی ردعمل ست تھا اور میں کسی ایڈ وکچر کے لائق نہیں تھا۔ یعنی فرار کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اپنا جسمانی ردعمل جاننے کے لیے میں مستقل اپنی شہادت کی اننگی کو تیزی سے حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ تقریباً ہر منٹ بعد میں یہ متفق دوہرا رہا تھا۔ مجھے ناشتا کے ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس دوا کا اثر مزید کتنی دیر قائم رہتا ہے میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ مگر بیلی کا پٹر میں بیٹھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے جسمانی ردعمل میں بہتری آ رہی تھی۔ اگر آنے والے نصف گھنٹے میں اپنے جسم پر اسی فیصد قابو پالوں تو میں کچھ کر

سکتا تھا۔

بیلی کا پٹر جن پہاڑوں سے گزر رہا تھا ان پر برف ہی برف تھی۔ میرا خیال تھا ہم پاکستان کی سرحد عبور کر کے افغانستان میں داخل ہو گئے تھے۔ کیونکہ کٹرل جس زمین میں تھا وہ سرحد کے پاس ہی ہوگا۔ بھارتی اتنے دلیر نہیں تھے کہ میرے ملک کی سرحدوں میں ایک حد سے زیادہ روانہ وارکس آتے۔ وہ مجھے لے کر دس منٹ سے بھی پہلے سرحد کے دوسری طرف جا چکے تھے۔ اب بیلی کا پٹر بلندی پر آ گیا تھا اور زیادہ تیز رفتاری سے پرواز کر رہا تھا۔ یہ نیم فوجی ساخت کا بیلی کا پٹر تھا جو بلندی پر تیز رفتاری سے اڑنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ اس میں اسلحے کی گنجائش نہیں تھی یعنی یہ نہتا تھا اور معمولی سا گن شپ بھی اسے مار گرا سکتا تھا۔ اس لیے بھارتیوں کی کوشش تھی کہ جلد از جلد پاکستان کی فضائی حدود سے نکل جائیں۔

میں صریح پامیر کا شمار دنیا کے بلند ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ پاکستان، افغانستان اور چین کی سرحدوں پر پھیلے اس وسیع صریح کو دنیا کی چھت بھی کہتے ہیں۔ نہایت بلند اور سرد ہونے کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا بالکل مختلف ہے۔ اس میں جانوروں اور نباتات کی مختلف اقسام ہوتی ہیں جو دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتی ہیں۔ بہت بلندی کی وجہ سے یہاں عام پائے جانے والے پودے اور جاندار دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ سال کے چھ سے آٹھ مہینے برف جمی رہتی ہے اور بعض جگہوں پر تو سارے سال ہی برف ہوتی ہے۔ موسم کی شدت کی وجہ سے پامیر میں مستقل آبادیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ چین نے مخصوص مقاصد کے تحت اپنے علاقے میں کچھ شہر بسائے ہیں لیکن افغانستان اور پاکستان میں ایسی کوئی آبادی نہیں ملتی۔۔۔۔۔ یہاں صرف خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ جو سارے سال بلندیوں سے پستیوں کے درمیان سفر کرتے رہتے ہیں۔

کچھ دیر بعد بیلی کا پٹر کی بلندی کم ہونے لگی کیونکہ اونچی پہاڑیاں ختم ہو گئی تھیں اور اب ہلکا پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ میں جہاں بیٹھا تھا یہاں سے بیلی کا پٹر کا فلائنگ پٹیل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آٹمی میٹر میں ہزار میٹر کی بلندی ظاہر کر رہا تھا اور بتدریج اس میں کمی آتی جا رہی تھی۔ جہاں سے بیلی کا پٹر وادیوں سے بلند ہوا تھا وہاں سے افغانستان شروع ہو گیا تھا اور ان لوگوں کو دیکھ لیے جانے اور گرائے جانے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔ جب بلندی کم ہونے لگی تو میرے

خیال میں واخان کا حصہ بھی گزر گیا تھا اور اب آگے میدان آنے والے تھے۔ بلی کا پڑا جکستان میں داخل ہو چکا تھا کیونکہ اس سے آگے یہی ملک پڑتا تھا۔

دس منٹ بعد پہاڑی علاقہ ختم ہو گیا تھا اور نیچا اب نامور میدان تھا۔ ہم ٹیپو پور پر تاجکستان یا پاشائی افغانستان میں تھے۔ پھر بلی کا پڑا کی بلندی تیزی سے کم ہونے لگی اور ذرا بعد بلی کا پڑا ایک چھوٹی سی اتر فیلڈ پر آ رہا تھا۔ یہ کوئی عارضی اور ہنگامی حالات میں کام آنے والی اتر فیلڈ تھی کیونکہ یہاں تو کوئی خاص تنصیبات نہیں اور نہ ہی لوگوں کی سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ پلانٹ بلی کا پڑا کا آجین بند کر کے نیچے آ کر گیا۔ میں نے ساتھ بیٹھے بھارتی سے پوچھا۔ ”یہاں کیوں رکے ہیں؟“

”فیول لینا ہے ابھی مزید سفر کرنا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر تم فرار کا سوچ رہے ہو تو تم کہیں نہیں چل سکتے۔“

روانگی کے وقت سے میری جسمانی حالتیں بہتری آتی تھی یعنی دوا کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ جس وقت یہ بلی کا پڑا کرل زریسکی کے کہیں کے باہر آ کر مڑا تھا اور وہ اسے دیکھنے گیا تھا تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کرل کا فرش میں گڑا ہوا چاقو نکال کر جیب میں رکھ لیا تھا اور واپس بیٹھ رہا تھا کہ اس نے دیکھ لیا مگر اس نے شک نہیں کیا چاقو اس کے ذہن سے نکل گیا تھا ورنہ وہ میری تلاش ہی لے سکتا تھا۔ اگر میری جسمانی حالت بہتر ہوتی تو میں بلی کا پڑا کے روانہ ہوتے ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ کم سے کم اسے نگران کو مار سکتا تھا۔ اس کے بعد اس سے ہتھیار حاصل کر کے پلانٹ کو قابو کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر اس وقت میں اس قابل نہیں تھا کہ چاقو کو موثر طریقے سے استعمال کر سکوں۔ لیکن دوسری طرف خطرہ یہ تھا کہ ایک بار میں ان بھارتیوں کے اڈے پر پہنچ جاتا تو وہاں کچھ کرنے کے قابل ہی نہ رہتا۔ اب میری حالت بہتر تھی۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ میرا جسم کس قدر میرے قابو میں آ گیا تھا یہ تو جب میں کوشش کرتا تب ہی پتا چلتا۔ میں نے ہاتھ یوں فراڈ زری کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے جیسے انہیں سردی سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ لیکن میرے دامن ہاتھ میں چاقو تھا۔ اس کا بلینڈ چاراج سے زیادہ لمبائی نہیں تھا لیکن یہ نہایت تیز اور خطرناک چاقو تھا۔

”برڈون.... برڈون ڈو یو ریڈی۔“ اچانک ہی بلی کا پڑا کے ریڈیو سے آواز آئی۔ آجین بند تھا اس لیے آواز

نہایت واضح تھی۔ ”برڈون اگر تم سن رہے ہو تو جواب دو.... برڈون ڈو یو ریڈی....“

میرے ساتھ بیٹھے بھارتی نے جو میری نگرانی کر رہا تھا چونک کر آگے دیکھا اور وہ ذرا آگے کھسکا تھا۔ یہاں جگہ محدود تھی اور وہ میرے پاس آ گیا۔ میرا ہاتھ جیب سے باہر آیا اور اس میں دبا چاقو اس کے بائیں پہلو کی طرف لپکا۔ میں نے اس کے دل پر وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ وار کو مزید موثر بنانے کے لیے میں اس کی طرف گرا بھی تھا۔ چاقو دیکھتے ہی اس نے لات مار کر مجھے دور کرنے کی کوشش کی تھی مگر مسئلہ وہی تھا یہاں گنجائش ہی نہیں تھی۔ لات میرے پاؤں پر لگی اور میں اس کے اوپر گر گیا۔ اس نے پستول نکال لیا تھا لیکن اسے استعمال کرنے کی جگہ نہیں تھی۔ چاقو کی نوک اس کی پسلیوں تک پہنچ گئی تھی اور جب یہ پسلیوں میں اتری تو اس نے تڑپ کر چیخ ماری اور پھر پستول والا ہاتھ میرے سر پر مارا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ لیا۔ پستول ہلکا ہلکا تھا لیکن تکلیف زیادہ ہوئی تھی۔ اسے خواص قابو میں رکھتے ہوئے میں نے پستول کا رخ فرش کی طرف کر دیا۔

قوت آزمائی میں اس سے کم نہیں تھا پس رفتار میں مات کھارہا تھا۔ چاقو سے بچنے کے لیے وہ محدود سی جگہ میں تڑپ تڑپ کر بیٹھنے سے بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کا دایاں ہاتھ میرے قابو میں تھا ورنہ وہ بلی کا پڑا کا دروازہ کھول کر باہر گر جاتا اور بیچ جاتا۔ بائیں ہاتھ میرے اور اس کے درمیان میں تھا اور وہ اسی سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کا پستول والا ہاتھ موڑ کر نیچے سپٹ سے لگا دیا تھا اور اب وہ فائر کرتا تو کسی کو گولی نہ لگتی۔ عجیب بات تھی اس نے کسی کو متوجہ کرنے کے لیے شور نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس کا منہ آزاد تھا اگر وہ چلاتا تو اس ویران اتر فیلڈ پر بھی کوئی نہ کوئی اس کی فریاد و فغاں کا جواب دینے کو دوڑتا لیکن شاید یہ اس کی انا کے خلاف تھا کہ وہ اپنے قیدی کے خلاف کسی سے مدد طلب کرے۔

اس کی مزاحمت کی وجہ سے چاقو کی نوک پسلیوں سے آگے جانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی پسلیوں کو ضرور چھیل رہی تھی۔ یقیناً تکلیف سے اس کا کمر حال تھا مگر ابتدائی جیٹوں کے بعد وہ خاموشی سے اس اذیت کو برداشت کرتے ہوئے مجھے خود سے دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے مطوم تھا مجھے ایک لمحے کی مہلت بھی مل گئی تو میں چاقو اس

کے دل میں اتار دوں گا اور وہ مر جائے گا۔ اس کا سر آزاد تھا اور وہ کئی بار مجھے سرے مکر مار چکا تھا۔ میں اس کے وارنا کام بنارہا تھا۔ وہ اذیت میں تھا۔ چاقو نے اسے کچھ اور چھیلنا تو اس نے کراہ کر مجھے اپنی زبان کی کلاسیکل گالیوں سے نوازا۔ وہ مادھو اڑیا کی کوئی مقامی زبان بول رہا تھا۔ گالیوں کا اندازہ مجھے نہ ہوا۔

ایک بار اس نے میرے سر پر پھر مکر مارنا چاہی تو میں نے سر نیچے کیا اور اس کی ناک پوری قوت سے میرے ماتھے سے ذرا اوپر لگی اور شاید نوٹ لگی۔ وار اٹھا ہو گیا تھا اور اسے نیپا دان میں تارے نظر آ گئے ہوں گے۔ وہ ذرا ڈھیلا ہوا تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور چاقو اس کی پسلیوں میں داخل کر دیا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی اور اس کے ہاتھ پاؤں اچیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے سست پڑتے ہی میں نے پے در پے وار کیے اور ان میں سے کم سے کم ایک اس کے دل میں اتر گیا تھا اس کے منہ سے آخری کراہ نکلی اور وہ ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ اسے پیچھے دھکیل کر میں نے اس کے مردہ ہاتھوں سے پستول لیا اور اسے سیدھا کر کے بٹھا دیا۔ اب یہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بیٹھا ہو اور زندہ ہو۔ اگر خون نکلا تھا تو وہ جیکٹ کے اندر ہی رہا تھا اس لیے پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔

پلانٹ کافی الحال دور تک پتا نہیں تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے آگے ہو کر ریڈیو بند کر دیا۔ دوسری طرف سے بک بک جاری تھی۔ پھر میں نے نگران کی تلاش کی لیکن اس کے پاس سوائے اس پستول اور اس کے دو عدد فاضل میگزین کے اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے مایوسی ہوئی میرا خیال تھا کہ میری ہتھکڑی کی چابی اس کے پاس ہوگی۔ مگر شاید وہ پلانٹ کے پاس بھی نہیں تھی مجھے جہاں لے جایا جا رہا تھا وہیں انہیں کھولنے کا کوئی بندوبست ہوتا یا پھر مجھے سرے سے کھولا ہی نہیں جاتا اور اس کی بجائے ایسے ہی بھارت پارسل کر دیا جاتا۔ دور سے ایک فیول ٹینکر آتا دکھائی دیا تو میں چوکس ہو گیا۔ ٹینکر کے ساتھ پلانٹ بھی تھا۔ اس نے آتے ہی ٹینک کا دھن کھول کر اس میں ایندھن بھرا ونا شروع کر دیا اگرچہ اس نے ابھی تک اندر تو نہیں دی تھی لیکن اس کا امکان تھا کہ وہ قید دیتا اور مجھے اس کو بینڈز اپ کرنا پڑتا۔ ٹینکر کا ڈرائیور اعلیٰ سے بیٹھا تھا۔ ایندھن خود پلانٹ بھر رہا تھا اور شاید اسے بھی یہ ریڈیو ہی مل رہی تھی اس لیے وہ جلد از جلد اسے بھگتا کر کہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔

جلدی کے پکڑ میں پلانٹ نے اندر کی طرف توجہ نہیں دی۔ بلی کا پڑا کا اگلا حصہ زیادہ تر ششے کا تھا لیکن پچھلا حصہ دھاتی تھا اور دروازوں میں چھوٹے چھوٹے ششے لگے تھے جن سے باہر یا اندر دیکھا جاسکتا تھا۔ پانچ منٹ میں بلی کا پڑا کا ٹینک فل ہو گیا تھا۔ پلانٹ نے بائیں واپس ٹینکر پر رکھا اور اسے پیچھے ہٹنے کو کہا ڈرائیور فوراً ٹینکر لے کر روانہ ہو گیا۔ اس موسم میں باہر کے کام سب کو ہی محل رہے تھے۔ سردی سے ٹھنڈا پلانٹ اندر گھسا اور سیٹ بیٹھ باندھتے ہوئے اس نے ریڈیو کی طرف دیکھا اور چونک گیا۔ ”اسے کس نے بند کیا ہے؟“

سوال اس نے اپنے ساتھی سے کیا تھا لیکن میں نے پتہ تو اس کی گدڑی پر رکھ کر جواب دیا۔ ”میں نے.... اور اب اسے بند ہی رکھنا۔“

وہ ساکت رہ گیا تھا۔ ”وہا....“

”وہ مر چکا ہے اور اگر تم بھی مرنا نہیں چاہتے ہو تو بلی کا پڑا اشارت کرو۔“

”تم مجھے اپنی مرضی پر نہیں چلا سکتے۔“ اس نے بہادری دکھانے کی کوشش کی۔

”مہاشے تم کیا چیز ہو میں یہ بلی کا پڑا بھی چلا سکتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں رکھ بیچ دوں گا۔“

مہاشے جی نے یہ بات سمجھ لی اور اس نے پادل ناخواستہ اپنا اشارت کیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے بلی کا پڑا کے چھوٹے لگے تھے اور ایک ہلکے سے دھچکے سے وہ فضا میں بلند ہو گیا۔ ذرا بلندی پر آتے ہی میں نے اسے حکم دیا۔ ”اپنا رخ جنوب مشرق کی طرف کرو تمہیں وہیں جانا ہے جہاں سے آئے تھے۔ یاد رکھنا تمہیں دیکھنا مجھے جی آئی ہیں اور ہاں اپنا ہتھیار میرے حوالے کر دو بغیر کسی چالاکا کے۔“

مجبوراً اس نے اپنا پستول نکال کر پیچھے پھینک دیا۔ لیکن میں مطمئن نہیں تھا میں نے ذرا آگے ہو کر جہاں تک ممکن ہوا اس کی تلاش کی۔ اوپری جسم سارا دیکھ لیا تھا صرف پیروں کو نہیں دیکھ سکا۔ اگر اس نے وہاں بھی کوئی ہتھیار چھپا رکھا تھا تو میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے بلی کا پڑا کا رخ جنوب مشرق کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے ریڈیو سے غائب ہوتے ہی بلی کا پڑا کی تلاش شروع ہو جائے گی۔“

”اس لیے تم اب نیچی پرواز کرو گے اور اپنا ریڈیو بند ہی رکھو گے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی ایسی ڈیوائس آن ہے جس

سے بلی کا پتھر کی نشان دہی ہو سکے تو اسے بزرگ دو کیونکہ تلاش کرنے کی صورت میں سوائے مرنے اور مارنے کے کچھ نہیں ہوگا۔ میں زندہ تم لوگوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا اور میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔ بچنے کی ایک ہی صورت ہے مجھے واپس وہیں پہنچاؤ جہاں سے لائے تھے اس کے بعد تم واپس جانے کے لیے آزاد ہو گے۔

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا واقعی تم مجھے جانے دو گے؟“

”ہاں میں نے تمہارا کیا چارڈالنا ہے۔ میں کسی کو نہیں مارتا سوائے اس کے جو میرے لیے خطرہ بن جائے۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔“

اس نے چند لمحوں کے لیے سوچا پھر بلی کا پتھر کی چھت پر لگے ہوئے چند سوچر آف کر دیے۔ ان کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”میں نے ٹرانسپورٹر آف کر دیا ہے اب کوئی اس بلی کا پتھر کا سراغ نہیں لگ سکے گا سوائے ریلواری مدد کے۔“

”اس کے لیے تم زمین سے پانچ سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرو گے۔“

اس نے حیرت سے کہا۔ ”تم اس قسم کی ٹیکنیکل باتیں جانتے ہو۔“

”جانتا نہیں تھا حالات نے سکھا دیا ہے۔ اب بھی تجھیں خبردار کر رہا ہوں اگر کوئی ڈیوائس آئے تو اسے آف کر دو بعد میں پچھتانے کا وقت بھی نہیں ملے گا۔“

ویرا کی موت کا سن کر وہ کچھ خوف زدہ نظر آنے لگا تھا۔ شاید وہ ان کا کوئی خاص کمائنڈ تھا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اسے اتنی آسانی سے مار دیا تھا یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس کی بد قسمتی کہ ایک تو وہ بہت بھاری لباس میں تھا جس میں وہ آسانی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا دوسرے وہ محدود سی جگہ میں پھنس گیا تھا۔ اس کے باوجود اس نے بہادری سے مقابلہ کیا تھا اور آخری وقت تک لڑتا رہا تھا۔ اس کے پاس ایک چانس تھا کہ وہ فائر کرتا تو اس کی آواز سن کو کوئی نہ کوئی اس کی مدد کو آ جاتا لیکن نہ جانے کیوں اس نے فائر نہیں کیا تھا شاید اس کا ذہن اس طرف نہیں گیا اور وہ چاقو سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے بالآخر اس کا شکار ہو گیا۔

بلی کا پتھر واپس جا رہا تھا کچھ دیر بعد جانی پہچانی پہاڑیاں نمودار ہونے لگیں۔ میں آتے ہوئے راستوں کا جائزہ لیتا ہوا آیا تھا اور مخصوص نشانیاں ذہن میں رکھی تھیں

اب وہی کام آ رہی تھیں اس کا مطلب تھا کہ پائلٹ پورے راستے پر جا رہا تھا۔ لیکن میں سر دی نہیں تھی لیکن مجھے جہاں اترنا تھا وہاں قیامت کی سر دی ہوتی۔ اس سے ٹھنسنے کے لیے میرے پاس نہ تو جوتے تھے اور نہ کپڑے۔ لیکن سب سے پہلے مجھے اس ہتھکڑی سے نجات حاصل کرنا تھی۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ ”تمہارے پاس لائٹر ہے۔“

اس نے ڈش بورڈ کے ایک خانے سے لائٹر نکال کر مجھے تمنا دیا۔ میں نے سب سے پہلے ہاتھ اور پیروں کے درمیان والی رسی کو جلا کر کاٹ دیا۔ مضبوط ترین تانکوں کی بنی یہ رسی شاید ہاتھی سے بھی نہ ٹوٹی لیکن معمولی سے شعلے نے اسے ٹکڑوں میں بکھلا دیا۔ ہاتھوں اور پیروں کی ہتھکڑیوں کو بھی تانکوں کی رسی سے جوڑا ہوا تھا یعنی زنجیر کی جگہ اس سے کام لیا گیا تھا صرف کلائیوں اور ٹخنوں میں پہنے والے کڑے اسٹیل کے تھے اس لیے نہایت ہلکے ہونے کے باوجود نہایت مضبوط بھی تھے۔ میں نے درمیانی رسیوں کو بھی جلا دیا اور اب میرے ہاتھ پاؤں مکمل طور پر آزاد ہو گئے تھے سوائے اسٹیل کے کڑوں کے جو بدستور کلائیوں اور ٹخنوں میں تھے اور انہیں صرف چابی سے یا کسی دھات کاٹنے والی چیز سے ہولنا سا مسکا تھا۔ کراب سے میری نقل و حرکت میں مزاحمت نہیں تھی۔

یہ کام کرتے ہوئے میں پوری طرح پائلٹ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں نے پائلٹ کا پستول اور چاقو اپنے پاس رکھ لیا اور ہاتھ میں ویرا کا پستول رکھا۔ ہر منٹ بعد میں فلائنگ پستل پرست دیکھتا تھا۔ اب میں نے دوسرا کام شروع کیا اور ویرا کی جیکٹ اُتارنے لگا۔ اس محدود سی جگہ میں اس بھاری جیکٹ کو اُتارنا آسان کام نہیں تھا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح یہ کام کر لیا۔ اس کے بعد اس کے جوتے اور پھر اس کا گرم ترین ٹراؤزر اُتارنا۔ نیچے اس نے سونے یا جامہ پہن رکھا تھا جبکہ جیکٹ کے نیچے گرم جری تھی۔ وہ مر چکا تھا اور اسے ان چیزوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے جوتے بھی خاص قسم کے تھے اور ساز و دِرا سا بڑا تھا لیکن جب میں نے ویرا کی پتلون کے بعد اس کے کموزوں کے ساتھ جوتے پہنے تو مجھے بالکل فٹ آ گئے تھے۔ آخر میں میں نے اس کے دستانے بھی اُتار کر پہن لیے۔ اب میں سر دی کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

پائلٹ کی نظر سامنے تھی لیکن وہ یقیناً محسوس کر رہا تھا کہ پیچھے کوئی کارروائی ہو رہی ہے۔ اس کی جرات نہیں ہوئی کہ وہ پلٹ کر دیکھتا یا کوئی خطرہ مول لینے کی کوشش کرتا۔ اسے خوف

تھا کہ کہیں میں جاں بخشی کا وعدہ واپس نہ لے لوں۔ اب صرف بھاری جیکٹ رہ گئی تھی لیکن ابھی میں اسے پہننا نہیں چاہتا تھا۔ پائلٹ نے خاصی دیر بعد کہا۔ ”تم واپس جا کر فکریں نہ کرو۔ ہمارے آدمی تمہیں پہلے کی طرح چڑھ لائیں گے۔“

”چشم ماروشن دل ماشاد۔“ میں نے کہا۔ ”مطلب ہے کہ ہم انتظار کریں گے اور دیکھیں گے کہ اس بار کون کے پڑتا ہے؟“

”ہم صرف دو افراد ہیں اور ہمیں قابو کر کے تم کسی ڈش بلی کا شکار مت ہونا۔“ وہ بہت صاف اردو بول رہا تھا۔ حالانکہ صورت سے وہ بھی ساؤتھ انڈیا کا ہی لگتا تھا۔

”میں کبھی بھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہا۔ لیکن مجھے اپنے زور بازو سے زیادہ اللہ کی مدد کا بھروسہ ہے کیونکہ میری نیت صاف ہے اس لیے وہ مجھے ہر آزمائش سے بچالے جاتا ہے لیکن تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ جہاں تک دو آدمیوں کا تعلق ہے تو تمہارے دلش میں میں ہی نے پوری پوری مثالیں کا سامنا کیا ہے اور وہاں سے بھی بچ نکلا تھا۔ اگر تم میرے بارے میں جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے؟“

وہ چپ ہو گیا۔ ایک بار پھر ہم بلند ترین برف پوش پہاڑوں کے اوپر چو پرواز تھے۔ یہ پامیر کی پٹی تھی۔ دنیا کے مشہور ترین سیاحوں نے نہیں شاہراہ ریشم کے راستے سفر کیا ہوگا۔ کیونکہ چین اور وسط ایشیا کے دوسرے راستے بھی یقیناً سے گزرتے ہیں۔ آنے والے دنوں میں یہ دنیا کا حساس ترین خطہ بن جائے گا کیونکہ دنیا کی چار بڑی طاقتیں اس پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ امریکا اور چین یہاں موجود ہیں جبکہ روس اور بھارت بھی زیادہ دیر نہیں ہیں۔

یہ نئے خیالات ان چند منٹوں میں میرے ذہن سے گزرے تھے جب بلی کا پتھر دوبارہ پاکستان کی حدود میں داخل ہوا تھا اور اب پائلٹ ان ہی تنگ وادیوں کے درمیان اُتار چڑھ کر اُڑ رہا تھا جہاں اس کے ریلواری پر دیکھ لیے جانے کے امکانات نہیں تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”وہ کتنی گتے دور ہے اب؟“

”مشکل سے پانچ منٹ کا راستہ ہے۔“ وہ فلائنگ الٹک کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا کیونکہ یہاں موسم خراب تھا اور تیز ہوائیں بلی کا پتھر کی ہموار پرواز میں خلل ڈال رہی تھیں اس نے بھی تشویش سے کہا۔ ”موسم خراب ہو رہا ہے ایسے میں لینڈنگ بہت مشکل ہوتی ہے۔“

”تمہیں لینڈنگ کرنی ہے۔“ میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”چاہے یہ کریش لینڈنگ کیوں نہ ہو۔“

”اس صورت میں میرے ساتھ تم بھی مرو گے۔“ اس نے تنہی سے کہا۔ ”موسم دیکھ رہے ہو؟“

موسم واقعی تشویشناک ہو رہا تھا۔ برف کے ٹکڑے اُڑتا ہوا طوفان آ رہا تھا اور حد نظر محدود ہو گئی تھی۔ نیچے زمین صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ واقعی لینڈنگ کا مطلب کریش لینڈنگ بھی ہو سکتا تھا۔ بہر حال میرے لیے اطمینان کی بات تھی کہ میں خطرناک دشمن کی سازش کا کام بنا کر دوبارہ اپنے وطن کی سرزمین پر آ گیا تھا اور اب مجھے مرنا بھی پڑتا تو میرے لیے بڑا سودا نہیں تھا۔ میں نے پائلٹ سے پوچھا۔ ”دوسری صورت کیا ہوگی؟“

”تمہیں نیچے چپ کرنا ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”میں بلی کا پتھر اُتارنے لے جاؤں گا کہ تم رسی کے سہارے نیچے اتر سکو گے۔“

”رسی کے سہارے۔“ میں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”تا کہ میں جیسے ہی بارنگلوں تم بلی کا پتھر اُڑا لے جاؤ اور اس کے بعد مجھے گردا دینا یا پہاڑ سے ٹکرا دینا تمہارے اختیار میں ہوگا۔“

وہ ایک لمحوں کو چپ ہوا پھر کمزور لہجے میں بولا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔“

”تم کیا اور تمہارا وعدہ کیا۔“ میں نے جواب دیا اور پستول اس کے سر سے لگا دیا۔ ”تم بلی کا پتھر نیچے اُتارو گے اور جب تک میں اجازت نہیں دوں گا دوبارہ فلائی نہیں کرو گے۔“

وہ مجبور تھا اس لیے حکم ماننے لگا۔ پانچ منٹ سے بھی پہلے ہم اس پہاڑی کے پاس پہنچ چکے تھے جہاں کرنل زریسکی کا ٹینک تھا۔ بلندی سے ٹینک صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس کے پاس وہ دین بھی کھڑی تھی جس میں مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ ذرا نیچے برف پر وہ نشان بھی دکھائی دے رہے تھے جو کرنل کے ساتھیوں نے پائلٹ کی رہنمائی کے لیے برف پر بنائے تھے یہ اب بھی نمایاں تھے۔ لیکن میرا اس مقام پر لینڈنگ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ ”یہاں سے ذرا آگے چلو ہم کی اور جگہ اتریں گے۔“

”آگے کوئی ایسی جگہ نہیں ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”اس موسم میں کسی ایسی جگہ اُترنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔“

”تم فکرت کرو تم نہیں مرو گے۔“

”اگر مرا نہیں تب بھی کریش لینڈنگ کے بعد میں یہیں پہنچ کر رہ جاؤں گا۔“ اس نے پرتشیش لہجے میں کہا۔ ”اس کے بعد چوڑاؤں کے قابل ہی کہاں رہے گا۔“ ”یہ سب تم سوچ کر رہا کر رہا۔“ تم کسی ٹپک پر نہیں آئے تھے جو تم کو کہیں خطرات کا احساس نہیں تھا۔“

اس نے بلی کا پٹر آگے بڑھایا۔ اس وقت یہ زمین سے کوئی پانچ سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ مجھے امید تھی کہ نیچے جاری ہواؤں کے طوفان کے شور میں کرل زبردستی یا اس کے آدمیوں نے بلی کا پٹر کی آواز نہیں سنی ہوگی۔ اس پہاڑی سے آگے بہت ناہوار اور دشوار قسم کا علاقہ تھا جہاں کسی بلی کا پٹر کا آثار نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھ سے کہا۔ ”یہاں کہیں بھی چوڑا نہیں آتا۔“

”آتر سکتا ہے۔“ میں نے کہا مجھے وہ جگہ نظر آگئی تھی جہاں بلی کا پٹر کا آثار ناہوا جاسکتا تھا۔ یہ وہی سڑک تھی جو آگے تکین والی پہاڑی کی طرف جاری تھی دو پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک مقام پر سڑک کے آس پاس تمام جگہیں کھلی تھیں اور یہاں مختصر سی پٹی پر بلی کا پٹر کے اسکرینک سکتے تھے۔ میں نے پانٹ کو وہ جگہ دکھائی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”بہت مشکل ہے ذرا سی غلطی سے چو پر کے پر کہیں نہ کہیں بکرا سکتے ہیں۔“

”تمہیں یہ رسک لینا ہی پڑے گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تمہارے پاس نیچے کا یہی ایک راستہ ہے اگر تم نے مجھے اتار دیا تو میں تمہیں واپس جانے دوں گا ورنہ۔۔۔“ اس نے عبوراً رضامندی ظاہر کی۔ ”اگر تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔“

”یہ تمہاری پیشہ ورانہ مہارت کا امتحان بھی ہے۔“ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”مجھے اتارو اور انعام میں واپس چلے جاؤ۔“

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر سر ہلا کر بلی کا پٹر کو نیچے اس جگہ لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں پہاڑیوں کے درمیان ہوا بہت تیز تھی اور یہ بلی کا پٹر کھپتے کی طرح اڑا لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر بلی کا پٹر بلیتا نہیں تھا بلکہ فواد کی بنی ٹیوں وزنی مشین تھی اور اس میں ایک بہت طاقتور انجن بھی لگا ہوا تھا۔ کچھ پانٹ کی مہارت تھی اور کچھ

جان بچانے کے لیے اس کی کوشش بالآخر وہ بلی کا پٹر کھوکھلے کے اس مقام پر لے آیا جہاں اس کے اسکرین سڑک سے ٹکے تھے۔ جیسے ہی اسکرین سڑک سے ٹکے میں نے دروازہ کھول دیا۔ طوفانی ہوا کا جھکڑ اندر آیا تھا۔ میں نے دروازہ کی جیکٹ اٹھائی اور نیچے اتر گیا۔ طوفان کا شور ہی کم نہیں تھا۔ انجن بھی سر پر موجود تھا۔ ایک شور قیامت برپا تھا۔ ہوائی پاگلوں کی طرح کچھ اشارے کرنے لگا۔ پہلے میں سمجھا نہیں پھر میری سمجھ میں آیا تو میں نے کھلا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بغیر وہ پرواز نہیں کر سکتا تھا۔

عام موسم میں دروازہ کھلا بھی ہوتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس ہوائی کھلے دروازے کے ساتھ بلی کا پٹر درست انداز میں پرواز نہیں کر سکتا تھا اور پھر درجہ حرارت بھی بہت کم تھا۔ اندر سب ٹھنڈ کر رہا تھا۔ جیسے ہی بلی کا پٹر دروازہ بند ہوا۔ میں نے پتول سے اس کے ایندھن کے ٹینک کا نشانہ لیا اور لگا تار اس وقت تک فائر کرتا رہا جب تک ٹینک میں سوراخ نہیں ہو گیا اور اس سے فوارے کی طرح پھوٹنے والے ایندھن نے آگ نہیں پکڑ لی۔ جیسے ہی اس نے آگ پکڑی میں نزدیکی پہاڑی کی طرف بھاگا۔ اب کچھ بھی ہو سکتا تھا بلی کا پٹر بے قابو ہو کر کچھ بری آ کر سکتا تھا یا اس کا کھوٹا ہونا مجھے چھو بھی جاتا تو میرے پیچھے بے آؤ جاتے۔ اس پہاڑی کے دامن میں مجھے کچھ گڑھے دکھائی دے رہے تھے جن میں گھس کر میں بلی کا پٹر سے کسی قدر محفوظ ہو جاتا۔

ایندھن کی ٹینکی میں آگ لگتے ہی بلی کا پٹر بے قابو ہو کر گھومنے لگا تھا۔ پانٹ نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ میں اسے جانے کی اجازت دینے کے بعد یہ حرکت کروں گا اور یہ اس کی حماقت تھی۔ وہ میرا اور میرے ملک کا دشمن تھا اور یہاں کسی خیر سگالی کے مشن پر نہیں آیا تھا۔ اس نے بین الاقوامی کی سرحدی خلاف ورزی کی تھی اور اگر اسے یہاں مارا گیا جاتا تو کوئی باز پرس نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ یہ ان بھارتی تیاروں کے لیے ایک سبق تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ مجھے آسانی سے اغوا کر کے لے جائیں گے اور میرے ساتھ جو چاہے سلوک کریں گے۔ مگر اٹلان کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے ان کے دوا دی اور ایک بلی کا پٹر ان کے ہاتھ سے گیا تھا اور ابھی جب اس بلی کا پٹر کا ملبر اور لاشیں ملتیں تو ان کو اس کی جواب دی بھی کرنا پڑی۔ دوا کا اثر کم ہونے سے میرا جسمانی رد عمل بہتر ہو رہا تھا اور پھر خطرے کے احساس نے اسے سو فیصد نہیں تو اسی

بند ٹھیک کر دیا تھا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا تھا نہ بلی کا پٹر اتنی دیر سے طرف آیا تھا یا غیبت پانٹ نے بلی کا پٹر اتنی دیر سے لیے اسے جان بوجھ کر مجھ پر گرانے کی کوشش کی تھی۔ عقب سے آتی انجن کی مہیب آواز جیسے سر پر گئی تھی اور پٹھوں کی ہوا صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ مجھے کچھ دور تھے۔ اور وقت نہیں تھا میں نے آگے کی طرف جھٹکے ہوئے جست لگائی اور زمین کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا بلی کے لینڈ کر گیا اسی لمحے بلی کا پٹر کا ترچھا ہوتا ہوا بلی کا پٹر اور برف کے ساتھ ٹکی کا ایک طوفان اٹھا تھا۔ پُر زور تھیں زمین میں دھنسا گیا اور جب یہ رکا تو رُوئے زمین بلی کا پٹر گھوما اور پٹروں سے الگ ہو کر اس کا جسم دور سے پہلے بھڑک اڑا اور وہاں ہی شعلوں میں بدل گیا تھا۔ ٹینکی سے پہلے ہی شعلے نکل رہے تھے گرنے سے رہی تھی کس بھی پوری ہو گئی تھی جلی اور مجھے یقین ہے پانٹ کو اندر سے نکلنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ وہ مارا گیا تھا۔

میں کچھ دیر حیرت ماقدم گڑھے میں دیکھا رہا۔ ممکن تھا بلی کا پٹر میں مزید کوئی خطرناک چیز ہوئی اور وہ پختی تو میں زیادہ دیر نہیں تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد میں گڑھے سے نکلا تو بلی کا پٹر اڑا اور وہاں رہا تھا۔ اس سے شعلوں کے ساتھ گاڑھا ہوا اب بھی اٹھ رہا تھا اور اس کے قریب جانا محال لگ رہا تھا۔ مجھے قریب جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دھوپ کے ساتھ آفتاب چاند نے بتا دیا کہ جلنے والی اشیاء میں انسانی جسم بھی شامل تھے۔ دوسرے اگر پانٹ کسی طرح بچ کر بلی کا پٹر سے نکلے میں کا مایاب رہا تھا تب بھی اسے آس پاس ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہاں دور تک سیدھی زمین تھی یا بلند ہوتے پہاڑ تھے جہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ بالقرض محال وہ بچ گیا تھا تب بھی میری بلا سے، میرا مقصد پورا ہو گیا تھا اور کچھ دیر بعد یہاں کوئی نہ کوئی آ جاتا اور بلی کا پٹر کے آثار دیکھتی یقیناً متعلقہ اداروں کو اطلاع دی جاتی۔

میں نے جیکٹ پہنی جو یقیناً اسی قسم کی سردی کے لیے مخصوص تھی۔ اس کے اندر ذرا سا خون لگا ہوا تھا۔ جسے میں نے برف سے رگڑ رگڑ کر صاف کر دیا۔ اب میں سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے کچھ دیر کے لوگوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ بلی کا پٹر کی نہ سہی لیکن اس کی تباہی کی آواز یقیناً کرل زبردستی تک گئی ہوگی۔ وہ اور اس کے آدمی اس طرف آنے والے ہوں گے۔ اگر اس تک اسے کی اطلاع نہیں بھی پہنچ تھی تب بھی کرل کو واپس

اسلام آباد کی طرف جانا تھا کیونکہ وہ میرے سامنے اس کا ارادہ ظاہر کر چکا تھا۔ یہاں اس کا کام یہی تھا مجھے سرحد پار بھیجنا اس کی دانت میں مکمل ہو چکا تھا اور اس کی ذمے داری بھی ختم ہو گئی تھی۔ اگر بھارتی مجھے قابو نہیں رکھ سکے تو یہ بھی اس کی ذمے داری نہیں تھی۔ لیکن کچھ بھی نہیں جاسکتا تھا کہ یہ اس کی ذمے داری بھی نہیں۔ وہ بھارتیوں کے لیے معاہدے پر کام کر رہا تھا یا صرف مجھے اغوا کر کے حوالے کرنے کا کام دیتے کیا تھا۔

طوفان کی شدت بڑھ رہی تھی اور میرا جسم گرم لباس میں چھپا تھا اس کے باوجود سردی رگ و پلین سرائت کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں نارمل لباس میں ہوتا تو مشکل سے آدھے ایک گھنٹے بعد میرے ہوش و حواس جواب دے جاتے۔ درجہ حرارت منہی دس کے آس پاس تھا۔ مجھے اس سے پہلے اتنی سردی کا تجربہ کم ہی ہوا تھا۔ بلی کا پٹر سڑک سے ذرا ہٹ کر تباہ ہوا تھا۔ اس کی آگ ابھی مدھم نہیں ہوئی تھی اور گاڑھا سیاہ دھواں خاصی بلندی تک پہنچ گیا تھا۔ یہ خاںے فاصلے سے بھی صاف دکھائی دیتا۔ میں سڑک تک آیا اور تکین کی طرف جانے لگا۔ یہاں سڑک بیل کھا رہی تھی۔ دوسری پہاڑی شروع ہوتے ہی سڑک تنگ اور خراب ہو گئی تھی۔ میں نے آس پاس دیکھا یہ ظاہر چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے میں پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ اوپر کچھ درخت دکھائی دے رہے تھے وہاں میں کسی کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکتا تھا اور سرد ہواؤں سے بھی کچھ نہ کچھ بچت ہو جاتی۔

تیز ہوا کے مقابلے میں اوپر چڑھنا آسان کام نہیں تھا۔ مجھے پتھروں اور سوچی سمجھاڑیوں کی مدد لینا پڑ رہی تھی۔ درخت کوئی پچاس گز اوپر تھے۔ نیچے کے درخت یقیناً سڑک بنانے کے دوران میں صاف کر دیئے گئے ہوں گے۔ یہاں بلندی بھی خاصی شایع سندھ سے کوئی دس ہزار فٹ کی بلندی تھی اس لیے ہوا نہایت ہلکی تھی اور ذرا سی مشقت سے سانس پھول رہی تھی۔ میں درختوں میں داخل ہوا تو ہواؤں کی شدت میں ذرا سی کمی محسوس ہوئی تھی اور یہ بھی کافی تھی۔ میں ایک ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں دو درختوں کے درمیان میں ہواؤں سے کسی حد تک محفوظ تھا اور سامنے نیچے دور تک دیکھ سکتا تھا۔ اگرچہ موسم اتنا صاف نہیں تھا۔ برف کے اڑتے کھڑے حد تک صاف و در کر رہے تھے لیکن یہ دھند کی طرح منظر کو اندھا نہیں کر رہے تھے کچھ نہ کچھ نظر آ رہا تھا اور کوئی چیز حرکت کرتی تو وہ صاف دکھائی دیتی۔

رات باہر گزارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے کسی طرح کرنل سے گاڑی حاصل کرنی تھی اور اس کے بعد ہی میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔ کیمین کی طرف سے مکمل خاموشی تھی نہ کوئی باہر آیا تھا اور نہ کوئی اندر گیا تھا۔

میری چھٹی جس دھیمے شروں میں خطرے کا الارم بجائے گی۔ دشمن کی طرف سے اتنی خاموشی بھی ٹھیک نہیں ہوتی ہے۔ اگر کرنل اور اس کے ساتھیوں کو یہی کاہلی کا چاہی کا ہوا نہیں چلا تھا تب بھی انہیں ریڈیو پر تو اطلاع مل گئی ہوتی کہ یہاں سے جانے والا بمیلی کا پٹر دوسرے پار کرنے کے بعد بھی اپنی منزل پر نہیں پہنچا اور انہیں غائب ہو گیا ہے۔ اس صورت میں کرنل کو حرکت میں آنا چاہیے تھا۔ مگر وہ سکون سے کیمین میں بیٹھا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کرنل نے بمیلی کا پٹر کی واپسی کا سوچا ہی نہ ہو اور وہ سمجھ رہا ہو کہ جب بمیلی کا پٹر تاجستان کی سرحد پار کر گیا تھا تو اس کے دوبارہ یہاں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر سوال نہیں پیدا ہوا تھا میں خود آ گیا تھا اور بمیلی کا پٹر یہاں سے کچھ دور پڑا تھا۔ اب تو اس کے بلے کی آگ بھی بجھتی ہوگی۔

وقت گزر رہا تھا اور میں اب حرکت میں آنے کے لیے بے چین تھام رہی تھی ابھی تک گرم ترین لباس کے باوجود ایک جگہ بیٹھے بیٹھے جسم اڑ گیا تھا۔ میں وقفے وقفے سے اٹھ کر جسم کو حرکت دینا تب کہیں جا کر جسم حرکت میں آنے کے قابل ہوتا تھا۔ پھر اندھیرا چھانے لگا۔ بادل اتنے تھے کہ ان میں سورج کی پوزیشن کا معمولی سا احساس تھا۔ جب مشرقی افق تاریک ہونے لگا تب ستوں کا صبح سے پتا چلا۔ سورج غروب ہوتے ہی ماحول یک دم تاریک ہو گیا تھا۔ روشنی کم ہوتے ہی میں نیچے اتر آیا۔ اوپر کیمین کی کھڑکیوں سے روشنی جھلک رہی تھی یعنی وہاں کرنل اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ میں ایسے زاوے سے جانے لگا کہ اگر کوئی کھڑکی سے دیکھے تو میں اسے آسانی سے دکھائی نہ دوں ویسے اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ روشن کیمین میں کھڑے ہو کر کوئی رات کی تاریکی میں مجھے دیکھ سکے۔ سرخی جیکٹ جودن میں مجھے نمایاں کر رہی تھی اب تاریکی میں مل کر مجھے چھپا رہی تھی۔ سرگ سے اوپر جانے کے بجائے میں نے پہاڑی کے بائیں طرف سے چڑھنا شروع کیا اس کے لیے مجھے سڑک عبور کرنا پڑی تھی اور تازہ برف پر میرے قدموں کے نشانات بن گئے تھے لیکن صبح سے پہلے یہ کسی کی نظر میں نہیں آتے اور اس وقت تک میں کچھ نہ کچھ گزر رہا تھا۔

چھوٹی موٹی خشک جھاز یوں اور ٹنڈ منڈ درختوں کی آگ لیتے ہوئے میں کیمین کے پاس پہنچا۔ یہ عقی حصہ تھا اور اس طرف وہ کرا تھا جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ اس میں ایک کھڑکی تھی جس پر فولادی سلائیں لگی تھیں۔ میں دبے قدموں پہنچا ہوا کھڑکی کے نیچے آیا اور پہلے اندر کی کن لٹی۔ پھر سر پر ہٹاتے ہوئے بہت احتیاط سے اندر جھانکا۔ کرنل کے دونوں ساتھی وہاں موجود تھے ایک بستر پر دراز تھا اور دوسرا ایک کرسی پر بیٹھا ہوا پاؤں ہلا رہا تھا۔ کرنل یقیناً لاؤنچ والے حصے میں تھا۔ میں دبے قدموں چلتا لاؤنچ کی عقی کھڑکی کی طرف آیا۔ یہاں چھوٹا سا کچن تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا تو کرنل مجھے آنکھ دان کے سامنے آرام کرسی پر لیٹا دکھائی دیا۔ اس کے اطمینان سے ظاہر تھا کہ اسے میری کوئی پروا نہیں تھی اس کی بلا سے میں پورا بھارتی اڈہ تیار کر کے فرار ہو گیا ہوں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ معاوضے پر کام کر رہا تھا۔ اس نے جس کام کا معاوضہ کیا تھا وہ کر دیا تھا آگے اس کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ میں ممکن تھا کہ مجھے بھارتیوں کے حوالے کر کے اس نے ریڈیو بھی آف کر دیا ہو۔ اگر وہ بھارتیوں کے لیے مستقل کام کر رہا ہوتا یا اسے میرے فرار کی اطلاع مل گئی ہوتی تو وہ اتنے سکون سے نہ بیٹھا ہوتا۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے پائل کر کے وہ یہاں رکے گا نہیں بلکہ چلا جائے گا لیکن وہ بدستور یہاں موجود تھا۔

کیمین کا دروازہ اندر سے بند تھا اور اگر کھلا بھی ہوتا تب بھی دروازہ کھلتے ہی کرنل ہوشیار ہو جاتا اور اس کے بعد اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ مجھے کرنل کو قابو کرنا تھا اس کے بعد اس کے دونوں گرگے خود ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کرنل کو قابو میں کرنے کی کوئی تدبیر کروں کہ وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک طرف دگی اپنی گرم جیکٹ پہنی تو میں سمجھ گیا کہ وہ باہر آنے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا کونے تک آیا۔ سامنے والے حصے میں جانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اس کا بھی امکان تھا کہ کرنل ہاتھ روم جاتا اور میں فوراً اس کی نظروں میں آ جاتا۔

میں کی طرف چلا گیا۔ یقیناً فطرت کی پکار خاصی تیز تھی اور اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ ہاتھ روم میں کس کس نے دروازہ کھل کر لیا اور میں دبے قدموں ہاتھ روم کی طرف بڑھا۔ کیمین کی کھڑکیوں سے آتی روشنی دیکھنے میں مدد کر رہی تھی۔ میں ہاتھ روم کے دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اندر کرنل کی مصروفیت کی اطلاع باہر تک آ رہی تھی۔ پھر وہ خود باہر آ گیا اور میں نے اس کی پشت پر پتھول رکھ دیا۔

”کرنل جالالی مت دکھانا۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”ورنہ مرحوم بھلاؤ گے۔“ وہ دم بہ خود رہ گیا تھا۔ اپنی پشت پر پتھول کے دباؤ سے زیادہ شاید یہاں میری موجودگی اس کے لیے ناقابل یقین تھی کیونکہ اپنے طور پر اس نے مجھے پارسل کر دیا تھا اور اس کی نظروں کے سامنے بھارتی مجھے نے کروانہ بھی ہو گئے تھے۔ ”تم... تم... واپس آ گئے۔“ اس نے مشکل سے کہا۔ ”ہاں تمہارے بغیر دل نہیں لگا۔“ میں نے کہا۔ ”ہاتھ اوپر کرلو۔“

اس نے ہاتھ اوپر کیے اور میں نے اوپر سے لے کر نیچے تک اس کی تلاشی لی۔ پتھول اس کی جیکٹ میں تھا۔ میں نے اسے اپنی جیکٹ میں ڈال لیا۔ اب میرے پاس تین پتھول ہو گئے تھے اور میں اچھا خاصا چلتا پرتا اسلحہ خاندن بن گیا تھا۔ کرنل نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ ”کیا چاہتے ہو تم؟“ ”یہ میں تمہیں اندر چل کر بتاؤں گا۔“ میں نے اسے آگے دھکیلا۔ ”انتہا خیال رکھنا کہ تمہیں زندہ رکھنا میرے نزدیک بالکل بھی ضروری نہیں ہے اس لیے مرنے کی کوشش مت کرنا۔“

”تم بیچ نہیں سکو گے وہ تمہیں پھر پکڑ لیں گے۔“ ”وہ مجھے پہلے بھی نہیں پکڑ سکے تھے میں راستے سے بھاگ آیا ہوں۔“ میں نے اسے مطلع کیا۔ ”بمیلی کا پٹر کا ملہ یہاں سے کوئی نصف کلومیٹر مشرق میں موجود ہے۔“ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ”چو پر کریش ہو گیا... کیسے؟“ ”جیسے ہوتا ہے اور وہ جو مجھے لے آئے تھے خود پر لوک دھار گئے۔“

”شہباز یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے تم نہیں جانتے تم کن سے دشمنی مول لے رہے ہو؟“ میں نے اسے آگے دھکیلا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ وہ شہدے دعوت میں لے جا رہے تھے اور میں نے بھاگ کر اچھا نہیں کیا؟“

”وہ تمہیں پھر لے جاسکتے ہیں۔“ ”بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی ابھی تو اندر چلو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ بادل نا خواست حرکت میں آیا۔ ہم کیمین میں آئے تو ایک خوشگوار حرارت کے احساس نے استقبال کیا لیکن مجھے حرارت سے زیادہ دوسری چیزوں کی فکر تھی جو کیمین کے دوسرے کمرے میں تھیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”ان دونوں کو آواز دے کر بلاؤ۔ بغیر کوئی اشارہ کیے۔“

اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”آغا... بمشتر۔“ دونوں کمرے سے نمودار ہوئے اور مجھے کرنل کے پیچھے دیکھ کر سنا کہ وہ گئے تھے۔ ”دونوں ہاتھ اوپر کر کے اور سامنے دیواری طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“ میں نے حکم دیا۔ ”جس نے پیچھے دیکھنے یا ہاتھ نیچے کرنے کی کوشش کی اس کے سر میں سوراخ ہو جائے گا۔“ انہوں نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی میں نے دوسرا حکم دیا۔ ”اب اپنا پایاں ہاتھ استعمال کرو اور اپنے پاس موجود ہتھیار نکال کر نیچے پھینک دو۔“

انہوں نے اس بار بھی حکم کی تعمیل کی۔ مگر مجھے اطمینان نہیں تھا میں ممکن تھا کہ ان کے مونے گرم لباسوں تلے مزید ہتھیار چھپے ہوں اور وہ موقع ملنے پر انہیں استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ اس لیے میں نے انہیں لباس اُتارنے کا حکم دیا۔ انہوں نے برہنہ سے کرنل کی طرف دیکھا۔ یہ ان کی تذلیل تھی لیکن کرنل خود گن پوائنٹ پر تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”مرنے کے مقابلے میں کچھ دیر کے لیے بے لباس رہ لینا زیادہ آسان ہے۔“

انہوں نے مجبوراً اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ میں نے انہیں کمرے میں چلنے کا حکم دیا اور خود کرنل کے پیچھے رہتے ہوئے ان کے ساتھ کمرے میں آیا میں نے وہاں کی تلاشی لی کہ کوئی اسلحہ یا ایسی چیز تو نہیں تھی جس سے وہ خود کو آزاد کرالیتے اور پھر کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کرنل میرے ساتھ ہی تھا اور خلاف توقع وہ پوری تابع داری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے اس کرسی پر بٹھا جس پر اس نے مجھے بٹھایا تھا اور خود آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرنل کی نظر میری جیکٹ میں چاقو کے وارے ہونے والے سوراخوں پر تھی۔ میں نے کہا۔ ”تم کو بعد میں پتا چل گیا ہوگا کہ میں چاقو چھپا کر لے گیا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”تمہارے جانے کے خاصی دیر پہلے

مجھے احساس ہوا کہ جا قو عاقب ہے۔ پاکست نے راستے میں ریڈیو بند کر دیا ہو گا اس لیے میں اسے کال بھی نہیں کر سکا۔
”ہاں“ جب وہ فونل لیتے آتے تب اس نے ریڈیو آن کیا تھا۔
”مگر اتنی دیر میں تم اپنا کام کر چکے تھے۔“ کرنل نے کہا۔

”ہاں“ جا قو چھوٹا لیکن بہت کام کا ثابت ہوا۔ میرا مگر ان فوراً مارا گیا تھا۔ پاکست البتہ کرنل میں ہلاک ہوا۔
”شہباز تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔“ اس نے انہوں سے سر ہلایا۔ ”اس سے معاملات بہت خراب ہو جائیں گے۔“

”یقیناً دشمنوں کے معاملات بہت خراب ہو جائیں گے۔“ میں نے خوشدلی سے کہا اور پھر سنجیدہ ہو گیا۔ ”کرنل میں جانتا چاہتا ہوں اس سارے چکر کے پیچھے کون ہے؟“
”تم جانتے ہو۔“ اس نے جواب دیا۔
”تمہارا مطلب ہے بھارتی ہیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں تم نے خود دیکھا تھا تمہیں لے جانے والے بھارتی تھے۔“
”اس میں مجھے بھی کوئی شک نہیں ہے لیکن مجھے بلوانے والے صرف بھارتی ہیں، یہ بات میرا ذہن قبول نہیں کر رہا ہے، بھارتی میرے دشمن ہیں مجھے انہیں انکار کرنے کے بجائے مر وانا پسند کریں گے۔“

”ممکن ہے تم انہیں زندہ ہی مطلوب ہو۔“ کرنل نے جلدی سے کہا۔
میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ”گویا تم سچ نہیں بولو گے؟“

”سچ بس ایک ہی ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

میں تشدد کے ذریعے اس سے حقیقت اگلو نہیں سکتا تھا۔ پھر میرے پاس اتفاقاً تو بھی نہیں تھا مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا تھا۔ اس سے پہلے کہ بھارتی یا کوئی اور مصیبت نازل ہو جاتی۔ بلی کا پٹر کی تباہی زیادہ درجہ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ اب تک بھارتی بلی کا پٹر کو اپنے اڑے کے آس پاس ہی تلاش کر رہے ہوں گے کیونکہ ان تک ری فیلنگ کی رپورٹ پہنچ گئی ہوگی۔ جب انہیں بلی کا پٹر وہاں نہیں ملے گا تو وہ دوسرے امکانات پر غور کریں گے اور ریڈیو بند ہونے والے واقعے سے کڑیاں ملاتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں

گے۔ میں نے اٹھ کر ٹھکانا شروع کر دیا۔

”کرنل سچ ایک ہی ہوتا ہے لیکن وہ تمہاری زبان سے نکل نہیں رہا ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے، ورنہ میں لٹکوانے کی کوشش کرتا۔“ میں کہتے ہوئے اس کی پشت کی طرف آیا اور اس سے پہلے وہ ہوشیار ہوتا میں نے پتھول دستہ پوری قوت سے اس کی گدی پر مارا۔ میں ہلکا وار کرنا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ وہ سخت جان فوجی تھا اور میں محسوس تھا اس پر اتنا اثر نہ ہوتا۔ پوری قوت سے وار کرنے میں صرف یہ خطرہ تھا کہ وہ مر جائے یا مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میرا دھنک تھا اور اس نے مجھے بدترین دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ کرنل چشم زدن میں بے ہوش ہو کر آگے جھکا اور کرسی سے لڑھک کر فرش پر رواں ہو گیا۔ میں نے اس کی نبض کا معائنہ کیا جوست لیکن مستقل چل رہی تھی اور اس کے دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مزید تسلی کے لیے میں نے ایک کونے میں رکھی رسی سے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے۔ اب وہ ہوش میں آنے کے بعد بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس سے فارغ ہو کر میں نے کیمین کی تلاشی لی اور سب سے پہلے پیٹ پوجا کی۔ بھوک سے میرا برا حال تھا۔ وہاں ڈبل روٹی، دودھ، انڈے اور مکھن پیر بھی محفوظ رہ جانی والی خوراک وافر مقدار میں تھی۔ میں نے کھانے کے بعد راستے کے لیے بھی کچھ چیزیں پیک کر لیں۔ کھانے کے دوران میں کیمین کی تلاشی لیتا رہا تھا۔ وہاں اسلحے کا نام پر صرف وہی دو شارٹ گنیں تھیں جو کرنل کے آدمیوں کے پاس تھیں یا پھر وہ پتھول تھے جو میں نے کرنل کی اور اس کے آدمیوں سے حاصل کیے تھے۔ اتنے پتھول بیکار تھے لیکن میں نے وہ بھی ساتھ رکھ لیے۔ شارٹ گن اور ان کے فاضل بلش بھی تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ قسم کا اسلحہ ساتھ لے جاؤں گا۔ دشمن کو جتنا ہتہا کر سکوں اتنا ہی میں محفوظ رہوں گا۔

ایک چھوٹی سی الماری کا تالا تو اس میں سامنے ہی خاصی بڑی رقم رکھی دکھائی دی اور یہ ڈالرز کی صورت میں تھی۔ میں نے گڈیاں اٹھا کر دیکھیں یہ دس ہزار ڈالرز والی گڈیاں تھیں اور ان کی کل تعداد بیس تھی۔ یعنی یہ دو لاکھ ڈالرز کی رقم تھی۔ پاکستانی روپے میں یہ رقم کوئی ایک کروڑ ستر لاکھ روپے بنتی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کرنل نے اتنی بڑی رقم یہاں رکھی تھی شاید یہ رقم اس نے میرے بدلے حاصل کی تھی پہلے مجھے خیال آیا کہ میں یہ رقم ساتھ لے جاؤں یا کم سے کم آٹھ

دین میں ڈال جاؤں۔ تاکہ کرنل اس سے محروم ہو جائے مگر میں نے یہ خیال مسترد کر دیا۔ رقم خاصی بڑی تھی اور میں محسوس تھا اس کی واپسی یا پھر اس کا بدلہ لینے کے لیے کرنل مجھ سے بچھے آتا اور میں پہلے ہی دشمنوں سے بیزار تھا۔ ان مجھ سے کسی کوشش کر رہا تھا اضافہ نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے رقم جوں کی توں چھوڑ دی البتہ کرنل کی تلاشی کے دوران اس کی جب سے کوئی چودہ ہزار کی رقم ملی تھی وہ میں نے بلا تکلف لے لی کیونکہ راستے میں مجھے لازمی ضرورت پڑتی اور ان لوگوں نے میری جیب میں ایک روپیہ نہیں چھوڑا تھا۔ پھر میں نے کرنل کی بیٹی روکس اتاری۔ آخر میں کرنل کی تلاشی لی اور اس کی ایک جیب سے وہ چالیس جیس سے میرے ہاتھ چڑوں میں پڑی جھٹکریاں کھل گئیں۔ اس مصیبت سے بھی جان چھوٹی تھی۔ کیونکہ یہ زبردستی کے کڑے ہاتھ پیروں میں پھنس رہے تھے۔

کیمین میں اور کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ میں نے دین کی چابیاں تلاش کیں لیکن وہ مجھے کرنل سمیت کیمین سے دبست نہیں ہو سکی تھیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کیمین وہ دین میں نہ لگی ہوں۔ میں باہر دین کے پاس آیا تو مجھے وہی عجیب سا احساس ہوا تھا جو ادھر پہنچنے سے دین دیکھ کر ہوا تھا لیکن میں اسے اس وقت بھی نہیں سمجھ سکا۔ دروازہ کھول کر دیکھنے پر چابیاں سامنے نظر آئیں تو میں نے سر پیٹ لیا۔ یہاں کون چابیاں سمیٹا تھا پھر ہے جبکہ چوری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ میں نے پہلے ڈیزل کی پوزیشن دیکھی۔ ٹینک تین پوٹلی فل تھا اور دین کے درمیانی حصے میں چار کیمین والے تین جری کیمین رکھے تھے۔ یہ سب ڈیزل سے بھرے ہوئے تھے۔ گویا مجھے راستے میں شاید ہی کیمین ایندھن بھرانے کی ٹیمیر ہی ضرورت پیش آتی۔

میں نے دین اشارت کی اس کے انجن کو چوک دینا پڑی تھی سردی کی وجہ سے جام ہو رہا تھا لیکن یہ غصہ تھا کہ اگر سردی میں چوک سے اشارت ہو گیا۔ انجن کو چلنا چھوڑ کر کیمین میں آ گیا۔ میں نے سب سے پہلے ریڈیو اٹھا کر اسے کرنل پر دے مارا۔ مزید دو تین بار جوتے تلے کھینچے سے وہ بالکل تیار ہو گیا اور اب اس کی حرمت وہاں بھی نہیں ہو سکتی تھی یہاں یہ بھی بنا ہو گا۔ کرنل بدستور بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اسے کرنل پڑا ل کر میں نے سامان اور اسلحہ سمیٹا اور باہر دین میں لے کر ڈالا۔ انجن کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ نہایت بہترین حالت میں روانہ ہونے سے پہلے میں نے صرف کیمین کا دروازہ

بند کیا تھا۔ اسلحہ اور دوسری ساری چیزیں میں نے عقبی خانے میں ڈال دیں تھیں۔ اس موڑ سے ڈرا پہلے وین روک کر میں پیدل وہاں تک گیا جہاں نیم تاریکی میں مجھے بلی کا پٹر کا جلا ہوا ڈھانچا دکھائی دیا تھا۔ ابھی تک اس حادثے کا احوال لینے نہیں آیا تھا اور یہ اس لحاظ سے اچھا ہوا کہ اگر سرکاری لوگ آگئے ہوتے تو وہ مجھے روک سکتے تھے۔ کیونکہ یہاں سے گزرنے کا بہ ظاہر ایک سیڑی راست تھا۔ میں واپس آیا اور دین میں اس جگہ کے پاس سے نکلتا چلا گیا۔

مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ میں جڑال کے کس حصے میں تھا سوائے اس کے کہ یہ حصہ سرحد سے بہت قریب تھا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید ان لوگوں نے راستوں کی تلاش کے لیے کوئی نقشہ رکھا ہو۔ میں نے ڈیش بورڈ کے خانے میں ہاتھ مارا تو ایک ٹارچ کے نیچے مجھے کوئی کاغذ محسوس ہوا تھا۔ میں نے اسے باہر نکالنا چاہا تو کھلنے پر یہ ایک چھوٹا سا نقشہ ثابت ہوا تھا جو پاکستان کے شمالی حصے کے بارے میں تھا۔ اس میں سڑکوں کی وضاحت کی ہوئی تھی۔ نقشے میں چین سے سڑک کی وضاحت بھی کی گئی تھی جو اس کیمین تک آتی تھی۔ میں نے دین ایک طرف روک دی اور کچھ دیر مغز ماری کرنے کے بعد نقشہ میری سمجھ میں آ گیا۔

رات کا وقت تھا لیکن خوش قسمتی سے موسم صاف تھا آسمان پر بادل تھے لیکن تیز ہوا کی وجہ سے دھند کا نام و نشان نہیں تھا۔ سڑک پر برف بھی لیکن اب یہ جم کر ختم ہو گئی تھی جس پر دین کے خصوصی ٹائر بہت اچھی طرح گرپ کر رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے رفتار اتنی رکھی تھی کہ ٹائر سلیپ کرنے کی صورت میں دین کو سنبھال لوں۔ مجھے جلدی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کر میں خطرہ مول لے کر ڈرائیو کرتا۔ ایک مناسب جگہ روک کر میں نے سوائے ایک شارٹ گن اور دو عدد پتھولوں اور ان کے فاضل ایونینشن کے باقی سارا اسلحہ سڑک کے ساتھ ایک گہری کھائی میں پھینک دیا۔ پتھول میں نے جیکٹ میں رکھ لیے تھے جبکہ شارٹ گن اگلی نشست کے سامنے والے حصے میں اس طرح رکھی تھی کہ باہر سے کوئی دیکھے بھی تو اسے نظر نہ آئے۔ شروع کے ایک دو گھنٹے میں مجھے خطرہ لگا رہا تھا کہ کیمین دشمن سے سامنا نہ ہو جائے۔ کیمین وہ گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ یہ تو ان کو معلوم تھا کہ فرار کے لیے میں کون سا روٹ منتخب کروں گا۔

لیکن جب کیمین کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی تو میں کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ یہ میری بہت ہی بڑی خوش قسمتی تھی کہ میں

بھارتی رندوں کی قید میں جانے سے پہلے فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ ایک بار میں ان کی قید میں چلا جاتا تو میری گلو خواسی بہت ہی مشکل ہو جاتی۔ اب مجھے ہوشیار رہنا پڑے گا۔ میرے دشمنوں میں ایک خطرناک دشمن کا اضافہ ہو گیا تھا اور یہ یوں زیادہ خطرناک تھا کیونکہ اس کے پاس ریاست کی طاقت تھی اور ریاستی دہشت گردی اور بڑی ممالک میں مداخلت کا وسیع رنج یہ بھی تھا۔ اس ناکام کوشش نے بھارتیوں کو سخت مشتعل کر دیا ہو گا اور وہ پہلے سے زیادہ کوشش کرتے رہے۔ مجھے گرفتار کرنے یا اس دنیا سے رخصت کرنے کی۔

چار گھنٹے بعد میں ایک جگہ رک گیا۔ مسلسل ڈرائیونگ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ وین کا مکین اندر سے گرم تھا اور باہر کے موسم کا پتہ بھی نہیں چل رہا تھا۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر دین روکی اور انجن چلتے رہنے دیا۔ مکین میں کھانے کا سامان سمیٹنے کے دوران میرے ہاتھ ایک بڑے سائز کا تھرماس بھی لگا تھا اور میں نے اسٹیل کے ایک گیمب سمیت اسے اٹھالیا۔ کیتلی بھر کافی بنائی اور تھرماس میں بھری۔ بغیر شکر اور دودھ کی یہ کافی مجھے اس رات میں تازہ دم رکھتی تھرماس اچھی کوئی کا تھا اور یہ کم سے کم دس بارہ گھنٹے تک کافی کو گرم رکھ سکتا تھا۔ ایک گھنٹے کے آرام اور دو گھنٹے کافی نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔

روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک بار پھر نقشے کا جائزہ لیا تو مجھے ایک چیز دکھائی دی۔ یہ راستہ اسی وادی کے پاس سے گزرتا تھا جہاں برٹ شائن ہیرے چھپائے تھے اور پھر خود بھی اسی وادی میں اپنی آخری سائیس لیں تھیں۔ اب اس کی بٹی عذاب میں گرفتار تھی۔ فتح خان نے اسے بارودی جیکٹ پہنا دی تھی اور اس کے پاس شاید چالیس گھنٹے سے زیادہ کی مہلت باقی نہیں رہی تھی۔ نقشہ دیکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ اگر میں راستے میں ایک دن اس وادی میں رک کر ہیرے تلاش کرنے کی کوشش کروں تو شاید مجھے ہیرے مل جائیں۔ میرے پاس ہنٹ تو تھی۔ شامل میں سب سے بڑا تھ۔ یہی برٹ شا کے آخری الفاظ تھے۔ اگر ہیرے مل جاتے اور امین کی جان بچنے کی اور کوئی صورت باقی نہیں رہتی تو میں یہ ہیرے فتح خان کے حوالے کر کے اسے بچا سکتا تھا۔

جیسے جیسے میں ڈرائیو کرتا ہوا وادی کے قریب ہوتا جا رہا تھا یہ خیال میرے ذہن میں جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ مجھے کل کے دن ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ اس سے زیادہ وقت امین

کے پاس نہیں تھا۔ مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ برٹس حکومت اسے بچانے کے لیے فتح خان کو تاون ادا کرنے پر راضی ہو جائے گی۔ اس میں صرف بین الاقوامی جرائم کی پیدہ گیاں ہی ملوث نہیں ہوتیں بلکہ سیاسی معاملات بھی آسکتے تھے۔ جہاں تک میرے علم میں تھا کہ دنیا کے دوسرے خطوں کی نسبت اس خطے کے لیے مغربی حکومتوں کی پالیسی مختلف تھی۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں اگر مغربی ممالک کے باشندے انہیں ہوتے تھے تو ان کو رہا کرانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی اور اکثر اوقات انہیں کاروں کو منہ مانگا تاون ادا کیا جاتا تھا۔

لیکن اس خطے میں مغربی طاقتیں براہ راست جنگ میں ملوث تھیں اور اگر وہ یہاں اپنے مغویوں کو چھڑانے کے لیے تاون کی ادا نہیں کریں تو اس سے ان کا تاثر خراب ہوتا۔ ان مغربی حکومتوں کے ووٹرز ان سے سوال کر سکتے تھے کہ جب تاون ہی دے کر اپنے آدمیوں کو چھڑاتا ہے تو اس خطے میں جنگ پر اربوں ڈالرز کیوں خرچ کیے جا رہے ہیں؟ اس لیے وہ یہاں تاون کی ادا نہیں کریں گے۔ گریز کرتے ہیں اور دوسرے طریقوں سے اپنے مغویوں کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ان کی یہ کوششیں ناکام رہتی ہیں۔ ایسے کئی واقعات میری نظروں سے گزرے ہیں جب انہیں کاروں نے مغربی سیاحوں (عام طور سے انہیں سیاح ہی ظاہر کیا جاتا ہے) کو اپنے مطالبات پورے نہ ہونے پر قتل کر دیا اور اکثر ان کے قتل کی ویڈیو بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہوتی تھیں۔

اس لیے اگر امین کو بچانا تھا تو مجھے ہی کوشش کرنا تھی یا فتح خان کو رحم آجاتا اور وہ اسے بخش دیتا۔ دوسری صورت بھی محال لگ رہی تھی اس لیے اب مجھے ہی کچھ کرنا تھا۔ صبح چار بجے میں وادی کے پاس پہنچ گیا تھا اور یہاں موسم اتنا سرد نہیں رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ ایک تو بلندی زیادہ نہیں تھی دوسرے آس پاس بلند پہاڑ بھی نہیں تھے جبکہ چترال میں بلندی بہت زیادہ تھی اور اس کے آس پاس پہاڑ مزید بلند تھے۔ صبح کا وقت پاس ہونے کی وجہ سے وادی کی طرف جانے والے نالے میں پانی زیادہ نہیں تھا لیکن جیسے جیسے دن چڑھتا اور درجہ حرارت بڑھتا تھا پانی نالے میں خاصا پانی آ جاتا اور وادی کا آخری ہفتہ ہونے کی وجہ سے اب موسم بدل رہا تھا۔ ابھی تاریکی تھی اور میں گاڑی نالے میں آتا رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا یہ بڑی ہی تنگی اور ڈرائسٹ سائیس خراب ہوتی ہی اُلٹ جاتی۔

اس لیے میں آرام کرنے کے ساتھ صبح کا انتظار کرنے

لگا۔ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں دشمنوں کا خیال موجود تھا۔ وہ اگر اتفاق سے بھی آجاتے تو مجھے سوتے سے گرفتار کر کے بہت خوش ہوتے۔ میں نے اپنے انڈوں اور ڈبل روٹی مکھن سے ناشتا کیا۔ کافی خلاف توقع تیزی سے ٹھنڈی ہوئی تھی اور اب برائے نام ہی گرم رہی تھی بہر حال اس کی خون کی روانی تیز کرنے کی صلاحیت برقرار تھی۔ کافی نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ مجھے جاگتے ہوئے میں گھٹنے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ مگر یہ پہلا موقع نہیں تھا جب میں دن رات در بدر پھرتا رہا اور سونے یا آرام کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

چھ بجے مشرقی افق سے روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ اگر آسمان پر جگہ پادل نہ ہوتے تو روشنی ذرا پہلے ہو جاتی۔ میں نے گاڑی کو احتیاط سے نالے میں اتارا۔ یہ طاقتور انجن اور فور ڈریبل ڈرائیو تھی جس نے اس لیے با آسانی نالے میں اتر گئی۔ ابھی پانی کی تھا مگر بعد میں پانی زیادہ ہو جاتا تو دین اس میں ڈوب سکتی تھی یا پانی اس کے انجن میں گھس جاتا۔ تقریباً دو سو گز آگے جا کر جب مجھے حدیث نہیں رہا کروں پہل سے نظر آسکتی ہے تو میں نے اسے ایک طرف دیوار پر چڑھا دیا اور پینڈر بیک لاک کر دیا۔

مجھے یاد تھا کہ اسی نالے میں ذرا آگے جا کر جہاں نالا ایک پیچھے سے گر رہا تھا وہیں میں نے وہ جپ کھڑی کی تھی جو فتح خان نے مجھے بڑی دقت دی تھی وادی تک سفر کے لیے۔ لیکن جب میں ایک گھنٹے بعد اس پیچھے تک پہنچا تو وہاں کسی جیب کا نام نشان نہیں تھا۔ یقیناً فتح خان یا اس کے ساتھی اسے نکال لے گئے تھے اور میں ممکن ہے فتح خان اس پر فرار ہوا ہو۔ میں نے چابی چھپا دی تھی لیکن فتح خان جیسے آدمی کے لیے کسی گاڑی کو بغیر چابی کے کھولنا اور اشارت کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ پیچھے سے اب پانی کا اچھا خاصا آبشار گر رہا تھا۔ گرمی کے دنوں میں اس نالے میں اس طرح سبز گرائمن نہیں تھا کیونکہ یہ پانی سے لبا لب بھر جاتا ہو گا۔ سردی کی وجہ سے یہ خالی تھا اور اس میں سفر کرنا بھی ممکن تھا۔

نالے میں ٹی بی بڑھ گئی تھی اسی تناسب سے سردی بھی لگ رہی تھی لیکن یہ پھر بھی چترال کی سردی سے خاصی کم تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ دن میں یہاں درجہ حرارت صفر سے اوپر آ جاتا ہو گا۔ کھانے کا سامان اور شارٹ مین ایک چھوٹے سے قہلے میں تھے۔ اسے میں نے پشت پر لاد لیا۔ تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد میں وادی میں داخل ہو رہا تھا۔ بادلوں کو چیرتے

..... سورج کی روشنی نے زمین تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اس وجہ سے موسم خوشگوار لگنے لگا تھا۔ میں سیدھا وادی کے درمیان میں موجود پتھر لے علاقے کی طرف گیا۔ اس کا اوپر کی حصہ ٹھوپ کی زد میں آ گیا تھا جس سب سے اوپر والے پتھر پر چڑھا اور یہاں سے میں نے سورج کی پوزیشن دیکھ کر شمال کا اندازہ لگایا۔ شمالی ڈھلان وادی میں سب سے بڑی ڈھلان تھی اور اس پر تقریباً ایک کلومیٹر کے رقبے میں گھنا جنگل لگا ہوا تھا۔

میرا دل ڈوب گیا اتنے بڑے جنگل میں ایک درخت تلاش کرنا جس کا تناسب سے بڑا ہو جو سے میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا کیونکہ سوئی پھر بھی دھات کی ہوتی ہے اور جو سے کے ٹکڑوں سے الگ ہوتی ہے۔ یہاں اس ڈھلان پر سارے ہی درخت باؤن گز کے تھے اور ان میں سب سے بڑے تنے کا فیصلہ کرنا ہی مشکل ترین کام تھا۔ کم سے کم ایک دن میں یہ کام مکمل نہیں تھا۔ بہر حال مجھے کوشش تو کرنا تھی۔ میں نے کھانے کا سامان پتھروں کے درمیان رکھا۔ اس وقت مجھے خوش گوار حیرت ہوئی جب مجھے اس چھوٹے سے غار میں پُرانا سامان مل گیا جب میں برٹ شا کے ساتھ یہاں مقیم تھا اور اس میں سے اہم رہی تھی۔ میں نے رتی کا لچھا لیا اور اس کے سرے پر ایک بلی کیل باندھ لی۔ کھنڈر کے باہر پانی کے تالاب تھے۔ زمین سے آنے والے اس پانی میں الٹھی شامل ہو رہی تھی اس لیے تالاب کے آس پاس جمع پتھروں پر سفیدی چڑھ گئی تھی۔ میں نے ایسے ڈھیر سارے چھوٹے چھوٹے پتھر جمع کر کے جیکٹ کی جیبوں میں بھر لیے اور شمالی ڈھلان کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں نے شمالی ڈھلان پر دائیں طرف سے آغاز کیا۔ میں بڑے تنوں والے درخت تلاش کر رہا تھا اور دل ہی دل میں برٹ شا کو برا بھلا کہہ رہا تھا جسے ہیرے چھپانے کے لیے یہی جگہ مل گئی تھی۔ ایک کلومیٹر کے رقبے میں کوئی ہزاروں درخت تھے اور ان میں سے ایک تہائی بڑے تنوں والے تھے۔ ان کے تنوں کا قطر کم سے کم بھی چھ فٹ تھا اور اونچائی سو فٹ یا اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس جنگل کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ ابھی اسے ٹبر ما فانی کی دیمک نہیں لگی تھی۔ آبادی سے دور ہونے کی وجہ سے یہاں چرواہے بھی کم آتے ہوں گے۔ جنگل میں خود بہ خود ہواؤں یا طوفانوں سے گر جانے والے درخت یا ان کی سوکھی شاخیں تک دیسی ہی پڑی تھیں۔ مجھے جو سب سے بڑا تھ دکھائی دیا۔ میں نے اس پر

یہاں سے میں اوپر کی طرف بڑھا۔ مجھے جوتا پہلے والے سے بڑھوسوں ہوتا میں اسے رسی سے تاپ کر دیکھ لیتا اور اگر وہ پہلے والے سے بڑا نکلتا تو میں اس پر سفیدی سے اگلا نمبر ڈال دیتا۔ ڈھلان کے اوپری تک میں کھینچے کھینچے ایسے ایک درجن تنے مل گئے جن میں ہر ایک دوسرے سے بڑا تھا۔ نمبر لکھنے کے ساتھ ساتھ میں جن درختوں کے پاس سے گزرتا تھا۔ ان پر سفید پتھر سے لیکر مار دیتا تھا اس طرح مجھے پتا چل جاتا کہ میں اس جگہ کو دیکھ چکا ہوں۔ اوپر پہنچنے میں مجھے ایک ٹھنڈا لگا اور اس دوران میں میں نے کوئی بیس گز کی چوڑائی میں درختوں کو دیکھا تھا۔ ایک کلومیٹر کی چوڑائی ایسے پچاس عدد بیس گز تھے اور اس لحاظ سے مجھے پورا جنگل چیک کرنے کے لیے پچاس گھنٹے درکار تھے اس کے بعد ہی میں فیصلہ کر سکتا تھا کہ سب سے بڑا تناکس درخت کا ہے۔

میں پریشان ہو گیا۔ میرے پاس پچاس گھنٹے کا وقت نہیں تھا زیادہ سے زیادہ آج رات تک کا وقت تک تھا اور مجھے کل صبح تک لازمی واپس اسلام آباد پہنچنا تھا تاکہ فتح خان سے بات کر کے اس سے بارودی جیکٹ کو ڈی ایٹمی ویٹ کرنے والا کوڈ لے سکوں اور وہ بھی اس صورت میں جب مجھے ہیرے مل جائیں اور فتح خان سے سودے بازی کر سکوں۔ اب میرے پاس روشنی کے صرف آٹھ گھنٹے تھے اس کے بعد یہاں تاریکی چھا جاتی تھی اور میرے پاس صرف ایک نارنجی تھی جس سے میں راستہ تلاش کر سکتا تھا ہیرے نہیں... بہر حال پریشان ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوتے ہیں مسئلہ کوشش سے حل ہوتے ہیں اس لیے میں نے وقت ضائع کیے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

اوپر سے نیچے آتے ہوئے میں نے پھر جلد غنائیا تھا۔ کیونکہ آرتز زیادہ آسان تھا اس میں توانائی اور وقت دونوں کم لگتے تھے۔ مگر صرف آنا نہیں تھا اسی طرح مجھے دوبارہ اوپر بھی جانا تھا۔ آنے والے تین گھنٹوں میں آنے اور جانے کے درودو چکر مکمل کر چکا تھا اور اس دوران میں صرف سو گز کی پٹی میں اوپر سے نیچے تک درختوں کو دیکھا تھا۔ جیسے جیسے میں بڑے تنے تلاش کر رہا تھا ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب تک جو سب سے بڑا تناکس تھا اس کا محیط کوئی چوبیس فٹ تھا یعنی یہ تقریباً سات ساڑھے سات فٹ قطر کا درخت تھا۔ میں نے

شکر ادا کیا کہ یہ سب دیوار قسم کے سیدھے تنے والے درخت تھے اگر یہ صنوبر یا چنار جیسے درخت ہوتے جن کا ٹائیز ایڈرا ہوتا ہے تو انہیں پتا نہی دشوار ہو جاتا۔ اس کے باوجود یہ کام ناممکن حد تک دشوار لگ رہا تھا۔ چار گھنٹے بعد میں تھک کر چور ہو گیا تھا وہ یہ جسمانی سے زیادہ ذہنی تھکن تھی کیونکہ اب تک کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔

اب جو بھی سب سے بڑا تناکس تھا میں اس کا یہ غور معائنہ کرتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ برٹ شائے تنے میں ہی ہیروں کا باکس چھپایا ہوگا۔ زمین میں چھپانے کا رہا کیونکہ اتنے عرصے میں زمین میں بہت تبدیلی آ جاتی ہے اور خاص طور سے پہاڑوں میں یہ تبدیلی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈھلانوں کی مٹی ہمیشہ ہلکی رہتی ہے۔ پھر درختوں کی جڑیں زمین میں پھیل کر اس کی شکل ہی بدل دیتی ہیں۔ اس لیے برٹ شائے زمین میں ہیرے نہیں چھپائے ہوں گے اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو یہاں کی تقریباً پتھر جیسی سخت زمین ٹھوکر کچھ چھپا سکتا۔ اس کے لیے سب سے بہترین جگہ درخت کے تنے میں ہونے والے قدرتی سوراخ ہوتے ہیں۔ کیڑے کوڑوں یا پرندوں کے بنائے یہ سوراخ ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ ان میں اگر کوئی چیز چھپائی جاتی تو وہ اس وقت تک محفوظ رہتی ہے جب تک یہ درخت محفوظ ہوتا ہے۔ کوئی زمینی یا موسمی تبدیلی چھپائی ہوئی چیز کو متاثر نہیں کر سکتی ہے۔

اس لیے میری توجہ کامز کمز تھے اور ان کا اتنا اوپری حصہ تھا جہاں ایک آدمی کی رسائی آسانی سے ہو سکے۔ دو بجے میں ٹھنڈی طرف آیا اور ڈبل روٹی بنی اور کھن سے بچ گیا۔ میرے پاس سفید پتھر ختم ہو گئے تھے میں نے وہ حج کیے اور دوبارہ مشن اسپرٹیل میں مصروف ہو گیا۔ میں نے اوپر نیچے اتنا سفر کیا کہ زندگی میں کبھی ایک دن میں اتنا سفر پہیل نہیں کیا ہوگا۔ اس کے باوجود شام ہونے تک میں نے یہ مشکل ایک تہائی جنگل دیکھا ہوگا۔ ابھی دو تہائی حصہ باقی تھا کہ شام ہوئی اور تاریکی میں کام ناممکن تھا۔ میں نیچے آتے ہوئے تھک ہار کر ایک تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹھکن سے زیادہ مایوسی نے میرے ذہن اور جسم پر قبضہ کر لیا تھا۔ امن کے لیے میری کوشش ناکام رہی تھی۔ اس کے پاس کل دوپہر دو بجے تک کا وقت تھا اس کے بعد بارودی جیکٹ خود یہ خود پھٹ جاتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس پر کیا ضرر رہی تھی اور اسے بچانے کے لیے کیا کیا جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے رابطہ کرنے

کی کوشش کی ہوگی اور مجھ سے رابطہ بھی نہیں ہوا ہوگا۔ اس کیل چھین لیا گیا تھا لیکن اس کے پاس عبداللہ کی کوئی کافون نمبر تھا۔

شام ہوتے ہی سردی کی شدت میں ایک لحظہ اضافہ ہوا تھا اور رات بغیر آگ کے اس کھلی جگہ گزرتا نا ناممکن تھا۔ مجھے خیال آیا کہ نیچے جاتے ہوئے لکڑی جمع کرتا جاؤں۔ میں اٹھا تھا کہ درخت کے تنے کے ساتھ زمین پر جہاں پاؤں رکھا تھا چانک میرا پاؤں زمین میں ڈھس گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ یہاں زمین میں کوئی سوراخ تھا۔ اس پر پتے اور مٹی اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ اس کا منہ بند ہو گیا تھا۔ میرے پاؤں کا دباؤ آیا تو یہ تھوٹ گئی۔ شکر ہے سوراخ بڑا نہیں تھا ورنہ میرا پورا پاؤں ہی چلا جاتا اور شاید ٹوٹ بھی جاتا۔ اس کے بعد میں بے یار و مددگار یہاں پڑا رہ جاتا اور کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ میں کہاں تھا؟

میں نے سنبھل کر نارنج کی روشنی میں سوراخ دیکھا۔ یہ دو جڑوں کے درمیان والی جگہ میں قدرتی طور پر بن جانے والا سوراخ تھا۔ یہاں جڑیں پھیلنے کے لیے الگ ہوئیں تو ان کے درمیان میں خلا آ گیا۔ یہ خلا خاصا اندر تک چلا گیا تھا۔ میں نے درخت کا معائنہ کیا اور اس کا تناکس خاصا بڑا پایا۔ مجھے لگا میں نے اب تک جو درخت دیکھے تھے ان میں سب سے بڑا اتنا ہی کا تھا۔ میں نے رسی اٹھائی اور تناکس پر دیکھا۔ یہ واقعی سب سے بڑا تناکس تھا۔ جو آخری بڑا تناکس دیکھا تھا محیط میں یہ اس سے بھی کوئی ایک فٹ بھر بڑا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال سرسرا نے لگا۔ کہیں برٹ شائے نہیں تو ہیرے نہیں چھپائے تھے۔ میں نے آس پاس کوئی لکڑی تلاش کی جو اس سوراخ میں جا سکے مگر وہاں کہیں ایسی لکڑی نہیں تھی۔ البتہ درخت پر کوئی سات آٹھ فٹ کی اونچائی پر ایک چھوٹی اور لمبی شاخ لٹکی ہوئی تھی۔ اس تک رسائی کے لیے میں تنے پر چڑھ جاتے ہوئے اوپر چڑھتا تھا۔ میں ٹوٹا ہوا اوپر چڑھا ایک جگہ میرا ہاتھ جم گیا اور میرا دوسرا ہاتھ جو شاخ کی طرف بڑھ رہا تھا اپنی جگہ جم ہو گیا۔

مجھے لگا جیسے دور نہیں کوئی چھینکا ہو۔ حج حج کوئی چھینکا تھا یا یہ میرا وہ تھا۔ میں نے شاخ تو ڈری اور نیچے اتر آیا۔ سوراخ میں جہاں تک ممکن ہوا میں نے شاخ گھسا کر دیکھی۔ مگر اس خلا میں کچھ نہیں تھا۔ میں کھڑا ہو گیا اور ڈھلان سے نیچے اترنے لگا۔ میں نے لکڑیاں جمع کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور جب ڈھلان کے نچلے حصے میں پہنچا تو دوبارہ ویسی ہی

چھینک جیسی آواز سنائی دی۔ اس بار یہ آواز واضح آئی تھی اور میں نے ہسٹول نکالنے ہوئے نارنج بچا دی۔ یہاں میرے علاوہ بھی کوئی تھا اور اگر کوئی تھا تو وہ یقیناً چھپ کر میری نگرانی کر رہا تھا لیکن کسی کو کیا معلوم کہ میں یہاں وادی میں تھا۔

میں آگے جانے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ وادی میں کھلی جگہ دیکھ لیے جانے کے زیادہ امکان تھے۔ بہ نسبت تاریک جنگل کے۔ میں دیے قدموں حرکت کر رہا تھا کیونکہ اب آواز سے ہی پتا چل سکتا تھا کہ میں کہاں تھا؟ اگر میں خاموش رہتا اور یہاں کوئی میری نگرانی کر رہا تھا تو اس کے لیے پتا چلانا ناممکن تھا کہ کہاں ہوں؟ میں درمیانی ڈھلان تک آیا اور پھر اس نالے کی طرف جانے لگا جو اس وادی سے باہر لے جاتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں اس نالے میں تھا۔ یہاں سفر کا مزید مشکل ثابت ہوا ایک تو تاریکی مکمل ہو چکی تھی اور دوسرے نالے میں پتھروں کا ڈھیر تھا جن پر چلنا آسان کام نہیں تھا۔ کچھ دیر سفر کے بعد جب میں تیسری بار گرا تو میں نے نارنج روشن کر لی۔ مونے کپڑوں کی وجہ سے مجھے چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن تیسری بار گرنے سے پتلون گھٹنے سے پھٹ گئی تھی اور پانی میں جانے سے اس کا پتا بھی گھسلا ہو گیا تھا۔

مجبوراً میں نے نارنج روشن کر لی۔ ویسے اس محدود نالے میں کوئی آسانی سے نظروں میں آئے بغیر میرا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔ چلتے چلتے میں اچانک پلٹ کر پیچھے نارنج کی روشنی ڈال لیتا تھا۔ اگر کوئی دیے قدموں تعاقب کر رہا تھا تو میری نظر میں آ جاتا لیکن اب تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ میرا وہ نہیں تھا۔ پہاڑوں میں نامانوس قسم کی آوازیں آتی ہیں۔ بہر حال اب میں وادی سے نکل آتا تھا اور نالے میں سفر کر رہا تھا رات ہوتے ہی اس میں پانی کی مقدار خاصی کم ہو گئی تھی کیونکہ سردی کی وجہ سے اوپر پانی جم گیا ہوگا اور نالے میں کم آ رہا تھا۔ جیسے پتھروں اور ریت سے اعزازہ ہو رہا تھا کہ دن میں یہاں خاصا پانی بہتا رہا تھا۔

نارنج ایک ہی تھی اور اس میں اضافی سیل بھی نہیں تھے۔ یہ سیل مسلسل استعمال سے کمزور پڑ رہے تھے اور میری کوشش تھی کہ نارنج کی روشنی ختم ہونے سے پہلے میں دین تک پہنچ جاؤں۔ اس لیے میں تیز چل رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد نارنج کی روشنی برائے نام رہ گئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ مکمل طور پر ختم ہوئی اچانک ہی آسمان صاف ہو گیا اور چاند نکل آیا۔ یہ نویں یا دسویں کا چاند تھا اس لیے اس کی روشنی اچھی خاصی



تھی۔ شمال کی طرف سے تیز... سرد ہوا چلنے لگی تھی اور شاید بادل بھی اسی وجہ سے جھپٹے تھے۔ میں نے مرحوم ویرانا کا دل ہی دل میں نگرہ اٹا کیا جس کے گرم پڑوں نے مجھے اب تک سردی سے محفوظ رکھا تھا۔ جواب میں میں نے اس کے لیے شاعرانہ قسم کی چٹا مہیا کر دی تھی۔ پھر بھی میں اس کا شکر گزار تھا۔

مزید کچھ سفر کے بعد میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں میں نے وین کھڑی کی تھی اور مجھے کچھ دیر کے لیے شہ ہوا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر شہ ہو رہا ہے یا میں کسی غلط جگہ وین تلاش کر رہا ہوں۔ کیونکہ وہاں وین نہیں تھی۔ مگر ذرا سی تحقیق نے واضح کر دیا کہ نہ تو میری آنکھیں دھوکا دے رہی تھیں اور نہ میں غلط جگہ آیا تھا ریت پر وین کے ٹائزوں کے نشانات واضح تھے۔ کوئی اسے دوبارہ سڑک کی طرف لے گیا تھا اور اس کام کو زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اگر یہ کام صبح یادوں میں ہوا ہوتا تو ریت پر ٹائزوں کے نشانات نہ ملتے پانی انہیں برابری کر دیتا۔ وین شاید آدھے گھنٹے پہلے یہاں سے ہٹا لی گئی تھی۔ وین کو غائب پاتے ہی وہ تمام خدشات جنہیں میں اب تک اپنا دہم قرار دیتا آیا تھا یک دم تقیہ لگاتے اور حقیقت کا روپ دھار کر میرے سامنے آگئے تھے۔

میں شروع سے زیر نگرانی تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کیے گئے تھے کہ میں وادی کی طرف آؤں اور ہیرے تلاش کرنے کی کوشش کروں۔ میں ٹالے کی طرف پلٹا تھا کہ ٹالے کی جانب سے ایک فائر ہوا اور گولی آ کر میرے پیروں کے پاس لگی۔ پھر وہ منحوس آواز سنائی دی جسے سن کر میرے کان پک گئے تھے۔

”شہباز خان! ہلا مت... ہاتھ اوپر کر لو... تم میرے کو نہیں دیکھ رہے پر میں تیرے کو دیکھ رہا ہے۔“

میں نے ہاتھ اوپر کر لیے اور بلند آواز سے بولا۔ ”فتح خان مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ میرے پیچھے تم ہو۔“

”تم کو شک ہوا؟“ اس نے عیاری سے پوچھا۔

”جب میں نے کسی کے جھپٹنے کی آوازیں سنی۔“

”وہ بد بخت میرا آدمی تھا غلطی سے سوار لگی۔ اب زندگی بھر نسوار نہیں کھائے گا۔“

”انتا ظلم۔“ میں نے افسوس سے کہا۔

”تم اس کا نہیں اچھا لگا کرو۔“ اس نے لٹا کر کہا۔ ”تم نے اب تک ہاتھ اوپر نہیں کیا۔“

فوراً ہی ٹالے کی طرف سے دوسرے نمودار ہوئے انہوں نے مجھے تھک کر میری تلاش لی اور سارا اسلحہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ ان میں سے ایک نے مجھے دھکا دیا۔ ”چلو خدا کی خوار...“

”دیکھو تو تیرے دو۔“ میں نے چلتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں مجھے ٹالے کے اوپر لائے جہاں وہ وین موجود تھی جسے میں ٹالے میں چھوڑ کر گیا تھا اور وین کے پاس فتح خان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے وین کا عقبی دروازہ کھولا۔ ”ابھی تم ادھر تشریف رکھو۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔“

”فتح خان میرے صرف ایک سوال کا جواب دو۔ کیا تم لوگ شروع سے میرے پیچھے تھے؟“

”اس سوال اور دوسرا تمام سوال کا جواب تم کو ملے گا لیکن یہاں نہیں ابھی اندر بیٹھو۔“

فتح خان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ میری بات کا جواب نہیں دے گا۔ وہ خوش تھا کہ ایک بار پھر مجھ پر حاوی آگیا۔ مجبوراً میں دوبارہ اس درجے میں داخل ہوا اور پیچھے سے دروازہ بند ہو گیا۔ فتح خان نے میرے اندازے کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک منٹ بعد وین ہلکے سے دھچکے کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ اس ساؤنڈ پر وف باکس میں باہر کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اور اندر کا درجہ حرارت بھی وین کے چلنے کے ایک منٹ بعد نارمل ہو گیا تھا۔ یہاں ہیننگ کا سسٹم موجود تھا۔ اسے کہتے ہیں کھانا پیا کچھ نہیں اور گلاس توڑا بارہ آنے۔ میں نے اتنی کوشش کی سرحد پار کرنے کے بعد واپس بھی آگیا لیکن ہوا کیا دوبارہ چوہے کی طرح پکڑ لیا گیا۔

وین کا سفر زیادہ دیر جاری نہیں رہا تھا جبکہ میرا خیال تھا میں دوبارہ کمین کی طرف جا رہا تھا جہاں ایک بار پھر بھارتیوں کو مدعو کیا جانے لگا کہ آئیں اور اپنی امانت لے جائیں۔ وہ ایک بار پہلے ہی ملے جا چکے تھے مگر میں بھاگ آیا تھا۔ اب دوبارہ ان کے حوالے کیا جانے والا تھا مگر وین تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد رکی اور عقبی خانہ کھلا۔ فتح خان اور اس کے دونوں آدمی چوکے تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھار یوں جھ پرتان لیے تھے جیسے انہیں خدشہ ہوا بھی میں کسی فلمی ہیرو کی طرح حرکت میں آ جاؤں گا اور ان کی ایسی کم تہی کر دوں گا۔ حالانکہ میں نے کبھی فلمی ہیرو بننے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ میں جانتا تھا ایسا وہ سب صرف فلم کے سیٹ

پر ہی ممکن ہے۔ عام زندگی میں اس قسم کی کوئی کوشش عرف عام میں خود کشی کہلاتی ہے۔

وین ایک چھوٹی سی کوشی میں کھڑی تھی۔ تاریکی میں آس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میرا خیال تھا یہ جگہ ویرانے میں ہے اور یہاں باقاعدہ آبادی نہیں ہے۔ سردی کی شدت وہی تھی۔ گرم پڑوں میں ہونے کے باوجود میں ایک لمحے کو کاپ کر رہ گیا تھا۔ کوشی کے سامنے چھوٹا سالان اور ڈرائیو دے تھا جس میں وین کھڑی تھی۔ کوشی زیادہ بڑی نہیں تھی کم سے کم سامنے سے ایسا ہی لگ رہا تھا دو منزلہ تھی لیکن کورڈ ایریا شاید چارمرلے سے زیادہ نہیں تھا۔ یہ فتح خان کا کوئی ٹھکانا تھا۔ ابھی میں معائنہ ہی کر رہا تھا کہ ایک طرف سے ایک مقامی شخص نمودار ہوا۔ فتح خان غرا بولا۔

”کدھر مر گیا تھا دروازہ کھول کر...“

”دیکھت جاؤ ہو رہا ہے خان جی۔“ اس نے پشتو میں کہا۔ ”بند نہیں ہو رہا تھا۔“

”ابھی ہو شیار ہٹا سومت جانا۔“ فتح خان اندر جاتے ہوئے بولا۔ اس کے ایک ساتھی نے مجھے اپنی رائفل سے ٹھوکا دیا کہ میں بھی فتح خان کی پیروی کروں۔ کوشی اندر سے بھی بہت شاندار ثابت ہوئی تھی۔ سامنے نشست گاہ تھی جس میں اخروٹ کی لکڑی کا بنا ہوا خوب صورت صوفیٹ رکھا تھا۔ اگر یہ باہر کی ملک میں ہوتا تو اس کا شمار نوادرات میں ہوتا۔ فرش پر بے حد دیر قائلین تھا۔ لیکن سب سے اچھی چیز آتش دان میں جلتی آگ تھی جس نے اندر کا ماحول خوشگوار کر دیا تھا۔ میں فتح خان یا اس کے آدمیوں کی اجازت کے بغیر ہی صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ میرے پیچھے موجود شخص غرایا۔

”کیا کرتا ہے کدرا ہو جا۔“

”جابر بکواس بند کر اور جا کر کچھ بیٹے کولا۔“ فتح خان نے اسے گھر کا اور میری طرف دیکھا۔ ”تم کیا پوچھو؟“

”دل تو تمہارا خون بیٹے کو چاہ رہا ہے لیکن ایک تو وہ حرام ہے اور دوسرے تم بیٹے نہیں دو گے اس لیے فی الحال جائے کافی میں سے جوں جائے چلے گا۔“

فتح خان نے جابر کو جانے لانے کے حکم کے ساتھ دفع ہو جانے کو کہا اور وہ دم دبا کر چلا گیا۔ البتہ دوسرا چوکس انداز میں نشست گاہ کے ایک کونے میں اس طرح کھڑا ہو گیا کہ میں پوری طرح اس کی زد میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے ہاتھ پیر کرنے کے باوجود فتح خان کچھ مشکوک تھا۔ اگر میرے کچھ اندازے درست تھے تو اسے اس سے زیادہ ہی پریشان ہونا

اسد ہم وہ جنوں جولان گدائے بے سرو پا ہیں کہ بے سر پنچہ مڑگاں آہو پشت خار اپنا وزن: مفاہیلین، مفاہیلین، مفاہیلین، مفاہیلین

بحر: ہرج منجمن سالم

غالب نے اس وزن میں بہت کم شعر کہے ہیں۔ اس وزن میں ان کی مشہور ترین غزل ”غفال کیوں ہو، زباں کیوں ہو“ ہے۔ یہ شعر لغاتی پر مبنی ہے جس میں چند در چند رعایات لفظی و معنوی نے فی شان پیدا کر دی ہے۔ طباطبائی نے ”اسد“ اور ”آہو“ کی لطیف رعایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ”سر پنچہ“ مڑگاں، جنوں جولان، پشت خار، گدائے بے سرو پا وغیرہ رعایتیں بھی قابل لحاظ ہیں لیکن ”بے سرو پا“ اور ”سر پنچہ“ میں ایک ڈھری رعایت بھی ہے اور اس شعر میں غالب کا محبوب فن، قول محال (Paradox) بھی اپنی پوری کیفیت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ شعر کا ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ میں آہ گدائے بے سرو پا ہوں کہ میرے پاس پشت خار بھی نہیں ہے اور وحشت کا یہ عالم ہے کہ آہ ہو سے بھی آگے نکل گیا ہوں۔ لہذا آہ کی مڑگاں کا سر پنچہ میرے لیے پشت خار کا کام کرتا ہے۔ اس بے کیف معنوں میں قول محال یوں پیدا ہو گیا ہے کہ ایک طرف اپنی جنوں جولانی میں یہ تیزی دکھائی ہے کہ آہ سے بھی آگے نکل گئے ہیں اور دوسری طرف بے سامانی کا یہ رنگ ہے کہ ”سرو پا“ بھی نہیں رکھتے۔ قول محال یہ ہے کہ سر اور پاؤں نہ ہونے کے باوجود گرمی رفتار اس قدر ہے کہ باید و شاید۔ ظاہر ہے کہ سرو پا نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وجود ہی باقی نہیں ہے اور جب وجود ہی نہیں تو رفتار بھی نہیں۔ پھر میں بے سرو پا ہوں لیکن مڑگاں آہو کا سر پنچہ میرے کام آتا ہے۔ لفظ ”پنچہ“ ہی کافی تھا ”سر پنچہ“ کہہ کر بے سرو پا کی ایک انوکھا لطف بخش دیا ہے کہ اپنا سر نہ سہی، لیکن مڑگاں آہو کا ”سر پنچہ“ تو موجود ہے۔ اسی ”سر“ پنچہ کی مناسبت سے ”پشت“ خار کا لفظ بھی قابل لحاظ ہے۔

اقتباس: تنقید غالب از شمس الرحمن فاروقی

چاہیے تھا جتنا کہ وہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”حیرت ہے تم مجھے یہاں لے آئے جیسے میرا خیال تھا مجھے دوبارہ بھارتیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

فتح خان نے ایک گنڈی سی گالی دی۔ ”میں ان کے باب کا نوکر نہیں ہوں ایک بار ان کا کام کر دیا اب ہمیشہ کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہے۔“

”یہ تو تم کہہ رہے ہو لیکن تم نے اللہ واسلے کام تو کیا نہیں ہوگا اور جو پیسے دیتے ہیں وہ آدمی کو اپنے باب کا غلام ہی سمجھ لیتے ہیں۔“

فتح خان نے دوسری گالی زیادہ وزنی دی تھی۔

”.... غلام سمجھنے والوں کی میں ان کو بھی دکھانے لگا۔“

کچھ دیر میں جابر فتح خان کے لیے جام و سیر اور میرے لیے چائے بنا کر لے آیا تھا۔ یہ بس نام کی چائے تھی کیونکہ اس میں دودھ، چینی اور پتی پتیوں وافر مقدار میں ڈالی گئی تھیں۔ اس کی واحد خوبی اس کی گہری تھی اس لیے میں نے پینا شروع کر دی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ فتح خان مجھے یہاں کسی قسم کی گفتگو یا ڈیل کے لیے لایا تھا سبھی میں اس کے ساتھ یہاں بیٹھا تھا ورنہ کسی کو شہری میں قید پڑا ہوتا۔ فتح خان نے اپنے لیے جام بنایا اور اس سے شعل کرتے ہوئے کچھ غور و فکر فرماتے لگا۔ ایک طرف لگی دیوار سیر کا کاک رات کے نو بجاری تھی۔ میرا زادراہ وادی میں رہ گیا تھا اور اگر ساتھ ہوتا تب بھی مجھے کھانے پینے کی اجازت کہاں ملتی۔ کھانا پیاکہ کا ہضم ہو گیا تھا اور اب بھوک سے پیٹ کے چوبے بھی کچھ بڑھال سے تھے۔

”شہباز خان تم جانتا ہے امین کے پاس صرف سولہ گھنٹے کا ٹیم رہ گیا ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اسی لیے میں نے سوچا کہ ایک کوشش کر کے دیکھ لوں۔ ممکن ہے مجھے بہرے مل جائیں۔“

”میں بھی یہی سمجھ رہا ہے پر تم کو کیسے پتا کہ ہیرا ادھر ہی چھپا ہے۔“

”مجھے پتا نہیں ہے لیکن جہیں یاد ہوگا کہ برٹ شاہ تہماری نیت خراب ہونے سے پہلے اسی ڈھلان کی طرف گیا تھا۔ اس لیے میں نے وادی میں اسی جگہ کا انتخاب کیا۔“

”تم نا کام رہا۔“ فتح خان کے لیے میں ہاپوٹی تھی۔

”ہاں۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”فتح خان میں نا کام رہا لیکن مجھے حیرت ہے تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں اس وقت وادی میں ہوں۔“

”میرا چھٹی جس نے بتایا۔“ وہ بولا۔ ”مجھے کرنل زریسکی نے بتا دیا تھا کہ تم بھاگ آیا ہے اور میں اسی وقت روانہ ہو گیا تھا پر تم راستے میں نہیں ملا تو مجھے وادی کا خیال آیا۔“

وہ جھوٹ بول رہا تھا کرنل خود لاعلم تھا کہ میں بھارتیوں کی قید سے بھاگ آیا ہوں یا وہ ظاہر ایسا ہی کر رہا تھا۔ اس لیے کرنل اسے مطلع نہیں کر سکتا تھا۔ میرے وہاں سے نکلنے کے بعد کم سے کم دو ڈھائی گھنٹے سے پہلے کرنل کو ہوش نہیں آیا ہوگا۔ ریڈیو میں نے تباہ کر دیا تھا اس لیے وہ فتح خان کو فوری مطلع نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ بعد میں کسی طریقے سے مطلع کرنے میں کامیاب بھی رہا تھا تب بھی فتح خان اتنی تیزی سے میرے پیچھے نہیں آ سکتا تھا ورنہ وہ اتنی جلدی وادی تک پہنچ سکتا تھا۔ اتنی صفائی سے چھپا کرنا اور پھر اتنی منصوبہ بندی سے مجھے پکڑ لانا ظاہر کرتا تھا کہ وہ شروع سے میرے پیچھے تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے بھارتیوں کے حوالے کرنا بھی ایک ڈھونگ تھا اور فتح خان جانتا تھا کہ میں واپس بھاگ آؤں گا۔

”فتح خان مجھے بھارتیوں کے حوالے کرنے کا کیا مقصد تھا کیا انہوں نے تمہارے آگے رقم ڈال دی تھی؟“

فتح خان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”میں ان کو جو تے کی نوک پر رکھتا ہے۔ میرا مجبور دوسرا تھا۔“

”یو ڈیو شا.... اس نے اس کام کے لیے کہا تھا اور تم اسے انکار نہیں کر سکتے تھے۔“

اس نے مجبور انداز میں سر ہلایا۔ ”تم جانتا ہے میں ڈیوڈ شا کو انکار نہیں کر سکتا ہوں۔“

”لیکن یہ طے ہے کہ تم لوگوں نے بھارتیوں سے اس کام کا اچھا خاصا معاوضہ وصول کر لیا ہے۔ میں نے خود کرنل کے پاس دو لاکھ ڈالر کی رقم دے دی ہے۔“

”تم نے وہ رقم قبضے میں نہیں کی....؟“ فتح خان کے پچھلے سوال سے زیادہ حیرت تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”تمہیں اب تک جان جانا چاہیے کہ دولت بھی میری منزل نہیں رہی۔ تم فتنی بھر ہیروں کے پیچھے پاگل ہو رہے ہو اس کے لیے اتنی جی دوجہد کی۔ انڈیا میں مجھے اس سے کہیں زیادہ بہرے حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ میں تو ہیروں کی وادی سے ہو کر آیا تھا۔ وہاں صدیوں سے جمع ہونے والے قیمتی ترین ہیرے موجود تھے۔“

فتح خان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”شہباز خان تم مجھے

بے وقوف بناتا ہے۔“

”خدا نے تمہیں جو بنایا ہے اس نے اسی نے بنایا ہے میری کیا مجال کہ اس کی تحقیق میں ترمیم کا بھی سوچوں۔“

”وہاں جج بہت سارے بہرے تھے؟“

”ہاں شاید ایروڈ ڈالر ز مالیت کے ہوں گے لیکن خدا کے لیے اب وہاں جانے اور بہرے حاصل کرنے کے بارے میں مت سوچئے لگنا۔ ان منحوس ہیروں کی خاطر انڈین حکومت نے اپنے سینکڑوں شہری مار دیے اور بہرے اب اس کے قبضے میں ہیں۔“

فتح خان نے گہری سانس لی۔ ”شہباز خان مجھے یہی بہرے مل جائیں میرے لیے یہی کافی ہے۔“

”امین کی خاطر میں نے کوشش کی تھی لیکن افسوس میں بھی نا کام رہا۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان اس لڑکی کو چھوڑ دو۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔....“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں نے قسم کھایا تھا کہ اگر مجھے ہیرا نہیں ملا تو میں اس لڑکی کو نہیں چھوڑوں گا۔“

”تم نے قسم کھائی تھی یا تمہیں تمہارے گرو ڈیوڈ شانے حکم دیا کہ امین کو زندہ نہیں رہنا چاہیے؟“

”تم جو چاہے مجھے پر اگر امین کو بچانا ہے تو میرے کو رقم یا بہرے میں سے ایک چیز چاہیے۔“

”تب میں یا کوئی بھی امین کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

..... میں نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے تم بھی اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہو اس لیے یہاں بیٹھے ہو۔“

وہ چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم یہاں بیٹھے ہو اگر تمہیں بہرے مل جائیں یا برٹش حکومت تمہیں تاوان ادا کر دے تو تم اتنی جلدی اسلام آباد پہنچ کر کیسے جیکٹ کو ڈی ایلیٹی ویٹ کرنے والا کوڈ بتاؤ گے۔“

”تم نگر نہ کرو اس کام کے لیے میرا ایک آدمی اسلام آباد میں موجود ہے میری سفارت خانے والوں سے بات ہوگئی ہے اور ان کا ایک نمبر مستقل میرے آدمی کے لیے خالی رہے گا۔ وہ آخری ایک منٹ میں بھی کال کر کے جیکٹ کو ڈی ایلیٹی ویٹ کر سکتا ہے۔“

میں نے سنا کی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”فتح خان تم جج ہوشیار ہوتے جا رہے ہو آگے پیچھے ہر چیز کا خیال رکھتے ہو۔“

دنیا کے ابتدائی لوگ گیتوں، درد و محبت سے لبریز کی تاریخ اتنی سہل نہیں کہ آسانی سے قلم اٹھایا جائے۔ فن نگری کی تشکیل سے بہت پہلے یہ عالم وجود میں آ چکے تھے۔ ہزار ہا سال تک یہ لوگ گیت زبانی یا دواشت کے طریقے سے ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا رہے، ان گیت گیت آہستہ آہستہ معدوم ہوتے گئے اور قریباً ساڑھے تین ہزار سال مسیح میں جب سیریلوں نے پہلی بار رسم الخط ایجاد کیا تو ساری دنیا میں ایک انقلاب سا آ گیا۔ رفتہ رفتہ مختلف ممالک نے اس فن سے فائدہ اٹھایا اور اپنے اپنے رسم الخط ایجاد کئے۔ رسم الخط کی ایجاد کے بعد زبان و بیان کے فن پر مسلسل زور دیا جانے لگا اور قدیم روایات و حکایات کو قلم بند کیا جانے لگا۔ موجودہ صدی میں دنیا کی لوگ رچناؤں کا سلسلہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اس موضوع پر کچھ لکھنا، طویل و وسیع مطالعہ طلب کرتا ہے۔

تین ہزار سال مسیح کے بعد جب اہل میرے اور اہل مصر نے ان قدیم گیتوں کو حرف بند کرنا شروع کیا تو ان گیتوں کا بیشتر حصہ معدوم ہو چکا تھا۔ باقی رہے کچھ گیتوں اور کچھ روایتوں کو حرف بند کرنے میں ان دو قوموں نے بڑی جاں فشانی سے کام لیا۔ ابتدا میں نقل کیے گئے سیریل زبان کے باقی ماندہ گیت کی حد تک طویل حکایتی نظموں پر مشتمل ہیں۔ یہ نظمیں بڑی تعداد میں علم دینیات و علم کائنات سے متعلق ہیں اور ان میں ایک حصہ حمد و مناجات کا ہے جو دیویوں اور دیوتاؤں کے تصور کو ظاہر کرتے ہیں۔ اہل مصر کے ابتدائی لوگ گیت نہیں سوچا اس قبل مسیح میں چھی آدھ کے سپاہیوں کی زبانی گائے گئے مگر ج تو یہ ہے کہ ان دو قوموں کے عروج سے بہت پہلے گیت وجود میں آ چکے تھے اور وہ گیت اس لیے محفوظ نہ رہ سکے کہ انسانوں کے پاس نقل کر لینے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہی میں ان معدوم گیتوں سے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں حاصل ہو سکتیں مگر کسی حد تک ہم ان کے اشکال کو ضرور محسوس کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم فن تحریر، ساج و فطرت اور مادی ضرورت کے پس منظر کا صحیح خاکہ تشکیل دے سکیں۔ اور اس کے لیے ہمیں لوگ گیتوں میں پوشیدہ علم دینیات اور علم کائنات اور مظاہر فطرت کو کریدنا، داخلی اور خارجی نظام کی گتھیوں کو سمجھنا ہوگا۔

مرسلہ: فیاض اختر، راولپنڈی

وہ مسکرانے لگا۔ ”شہباز خان اب تو تم بھی مجھے ماننے لگا ہے۔“
 ”یہ سچ ہے گزشتہ کچھ عرصے سے تم مجھے چکرانے والی چالیں چل رہے ہو۔ لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں تمہاری ہر چال کے پیچھے ایک ہی مقصد ہوتا ہے کسی طرح میرے توسط سے میرے حاصل کرنا۔“
 فتح خان کی مسکراہٹ کا فور ہو گئی تھی۔ ”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں سو فیصد نہیں جانتا یہ دعویٰ تو تم خود بھی نہیں کر سکتے کہ اپنے عزائم کے بارے میں سو فیصد جانتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس بار تم نے جو چال چلی وہ میں کسی حد تک سمجھ گیا ہوں۔“

”کیا سمجھ گئے ہو؟“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
 ”فتح خان تم ایک بگ گیم کا ایک چھوٹا حصہ ہو۔ یہ بگ گیم کون کھیل رہا ہے تم اس سے ناواقف نہیں ہو کیونکہ تم اس کا ایک حصہ ہو۔ بے شک چھوٹا سہی۔ اس کھیل کا اصل کھلاڑی ڈیوڈ شاہ ہے اور تم اس کے مقصد سے بھی ناواقف ہو لیکن اس کے ساتھ ہی تم اپنا کھیل بھی کھیل رہے ہو جس سے ڈیوڈ شاہ واقف ہے یا شاید ناواقف ہے۔ بہر حال وہ تم پر ظاہر نہیں کر رہا ہے۔“

فتح خان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ میری بات اسے کہیں نہ کہیں گئی ہے پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”تم کیا جانتے ہو؟“

”فتح خان کہانی وہاں سے شروع کرتے ہیں جب تم نے برٹ شاہ کی موت کے بعد اپنے دوسرے پلان پر عمل درآمد شروع کیا اور امین کو جینک پہنا دی۔ یہ تمہارا اپنا کھیل تھا لیکن برٹس سفارت خانے تک جانے کے بعد یہ صرف تمہارا کھیل نہیں رہا بلکہ اس میں ڈیوڈ شاہ بھی شامل ہو گیا۔ ڈیوڈ شاہ کی سب سے بڑی خواہش یہی ہو سکتی ہے کہ امین نہ رہے تاکہ اس کی جاگیر اور خطاب کو کوئی خطرہ بھی نہ رہے۔ دوسری طرف اسے تمہارا خیال بھی ہو گا وہ کل کر تمہاری مخالفت نہیں کر سکتا ہو گا کیونکہ اس سر زمین پر تم اس کے سب سے زیادہ قابل مہرے ہو۔ لہذا اس نے تمہیں چکر دینے کے لیے ایک اور چکر چلایا اور اس نے تم سے کہا کہ شہباز ملک بھارتیوں کو مطلوب ہے۔ اگر تم کی طرح اسے پکڑ کر بھارتیوں کے حوالے کر دو تو وہ تمہیں برٹس حکومت سے تاوان دلا دے گا۔۔۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟“

وہ غور سے سن رہا تھا اس لیے میں نے اچانک پوچھا تو اس نے غیر ارادی طور پر سر ہلا دیا۔ پھر وہ گزبوا گیا۔ لیکن میں نے اس کا رد عمل نظر انداز کر دیا اور بات جاری رکھی۔ ”تم نے ڈیوڈ شاہ کی بات مان لی لیکن ساتھ ہی امین بدو بست کیا کہ میں بھارتیوں کی قید میں نہ جانے پاؤں۔ پہلے تو میں تمہاری منصوبہ بندی کی داد دوں گا جو تم نے شہلا کی مدد سے مجھے ٹریپ کیا۔ مگر اس سے پہلے اجازت پا کر ایک سوال کروں گا۔“

”کیسا سوال؟“
 ”شہلا نے مجھے جو بریف کس دیا تھا اس میں ٹائم بم تھا اور میں ایک منٹ کے فرق سے بچ گیا۔ مجھے مارنا تمہارا مقصد نہیں تھا تب میں اسے کیا سمجھوں۔“

فتح خان کی آنکھوں میں نظر آنے والی حیرانی اصلی تھی۔ ”بریف کس میں ٹائم بم تھا۔۔۔؟“
 ”بالکل اگر میں اسے ایک کھائی کے کنارے نہ رکھ دیتا تو آج اپنی قبر میں پڑا ہوتا۔“

اس نے لٹی میں سر ہلایا۔ ”یہ شہلا کا کام ہے میں نے اسے ایسا کرنے نہیں کہا۔ وہ پہلے بھی کتنی رہی تھی کہ تمہارا کام تمام کر دوں۔۔۔ بکتیا کی پٹی۔“

”ٹھیک ہے میں تمہاری بات تسلیم کر لیتا ہوں کہ یہ شہلا کا کام ہے لیکن وہ ہے تو تمہارے ساتھ ہی۔ تم نے اس کی مدد سے مجھے ٹریپ کیا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ تمہارے لیے ہی کام کر رہی ہے۔“

”یہ درست ہے لیکن جہاں تک تمہیں ختم کرنے کی کوشش کا تعلق ہے اس کا انفرادی فعل تھا۔“

”میں یہ بھی تسلیم کر لیتا ہوں لیکن مستقبل میں تمہارا یہ عذر نہیں مانا جائے گا تم شہلا کے ذاتی عزائم سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے بڑی خوب صورتی سے چار ڈال کر مجھے اس جگہ پہنچا دیا جہاں شہلا کا ٹھکانا ہے۔ وہاں سے مجھے یوں پکڑا لیا جیسے پیر کے لالچ میں آنے والا چوہا ٹریپ میں پکڑا جاتا ہے۔ تم نے میرے ساتھیوں کے ساتھ کیا کیا تھا؟“

”ان کو وہیں چھوڑ دیا تھا ان سے مجھے کوئی مطلب نہیں تھا۔ بعد میں تمہارے آنے والے آدمی انہیں لے گئے تھے۔“
 ”بات آگے بڑھانے سے پہلے میں ایک سوال اور کروں گا؟“ میں نے کہا فتح خان میری داستان میں پوری طرح دلچسپی لے رہا تھا شاید وہ جانتا چاہتا تھا کہ میں کس حد

تک حالات سے باخبر ہو گیا تھا۔
 ”کرو۔“

”تم جانتے ہو کرنل زربسکی اور مہر دین کیا رشتہ ہے اس کے باوجود تمہارا اس سے تعلق میری سمجھ میں نہیں آیا؟“
 ”اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات ہے۔ کرنل اور میرا تعلق شروع سے تھا۔ بعد میں اسے مہر دین آگئی اور اس کے ساتھ جو ہوا تھا وہ ماضی میں ہوا تھا اس لیے کرنل اور میرے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔“
 ”مہر دین تمہارے خون کی پیاسی ہو رہی تھی اس نے اتنی آسانی سے تمہیں کیسے معاف کر دیا؟“

”یہ اس کا اور کرنل کا معاملہ ہے۔“ وہ پلے پروائی سے بولا۔ ”میں نے اس سے کہا جو پہلے ہو چکا ہے اس کا ذکر بیکار ہے آئندہ کوئی شکایت ہو تو کہنا۔“

”کرنل بھی جالاک اور مفاد پرست آدمی ہے اس نے بھی ماضی پر مبنی ڈال دی ہوگی۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی مہر دین اس خانہ بدوش قبیلے میں کیا کر رہی تھی جو ٹھیک اس جگہ موجود ہے جہاں مہر دین کا اپنا قبیلہ آباد تھا؟“

فتح خان جو کئی جام پینے کے بعد خاصا سرور میں آ گیا تھا اور بڑے موڈ میں میری بات سن رہا تھا ایک دم اس کا چہرہ بدل گیا وہ پتھر لے انداز میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”یہ بات تم کیسے جانتا ہے؟“

”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا میں اسے حیران کرنے کے جوش میں پھنچ رہا تھا یہی بول گیا تھا۔“ میں نے اتفاق سے اسے دکھایا تھا۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں اسے پکڑ بھی لیتا لیکن اسی وقت شہلا کے بارے میں اطلاع آ گئی اور مجھے وہاں جانا پڑا۔ اس کے بعد جو مواد مجھے تم سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔ کرنل اس بات سے لاعلم تھا کہ تم نے نادر علی کو مجھ سے ملنے کا موقع دیا تھا۔“

”اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔“ فتح خان نے نالائے والے انداز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ مہر دین کا خانہ بدوش قبیلے میں ہونا کسی بہت خاص اہمیت کا حامل تھا۔ کیونکہ اس نے خود موضوع ختم کر دیا تھا اس لیے میں نے بھی اسے نظر انداز کر دیا۔ بعد میں اس معاملے کو بھی دیکھا جاسکتا تھا۔

”لیکن میرا تو ہے۔“ میں مسکرایا۔ ”نادر بھی اپنے بھائی کی طرح مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے وہ مجھ سے صلہ کرنا چاہتا ہے۔“

”شہباز خان بہتر ہو گا ان لوگوں سے صلہ کرو تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا میرا مطلب ہے تم ان کے ذہن کا نہیں ہے ورنہ اب تک یہ دونوں بھائی مٹی میں مل چکا ہوتا۔“
 ”یہی تو مسئلہ ہے لیکن میں ان کے سامنے سرتو نہیں جھکا سکتا اور ندان پر اقرار کر سکتا ہوں وہ بچو فطرت رکھتے ہیں ڈنک مارنے سے باز ہی نہیں آ سکتے۔“

”خیر یہ تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔“ فتح خان بولا۔ ”میرا مسئلہ مرشد ہے میں اسے نہیں چھوڑے گا۔ وہ میرے بچا زاد بھائی شہباز خان کا قاتل ہے اور اس کا بدلہ لینا میرا فرض ہے۔“

”لیکن تم جو کر رہے ہو اس سے مرشد کا کچھ نہیں بگڑتا۔“

”میں سمجھ گیا ہے اور تم جلد دیکھے گا مرشد کو ایسا جھکا لگے گا کہ وہ قدموں میں گرے گا اور اس کا اپنا لوگ اسے گدی سے اتار کر پھینک دے گا۔“

”پھر اس گدی پر نادر کو بٹھا دیا جائے گا جو مرشد سے زیادہ ہی ذہن ہے میرا۔“

فتح خان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”شہباز خان فکر مت کرو ایک بار مرشد کا ٹانگہ لگ جائے اس کے بعد نادر بھی زیادہ دن نہیں رہے گا۔ ہاں تو تم کہہ رہا تھا۔“

”کرنل زربسکی کے آدمی مجھے لے گئے اور اس نے مجھے قابو میں رکھنے کے لیے پہلے تو بے ہوش کرنے والی دوا دی اور پھر ایک ایسی دوا دی جس سے میرا جسم حسست ہو گیا۔ اس نے اسی حالت میں مجھے بھارتیوں کے سپرد کر دیا لیکن اس نے دو کام کیے ایک تو دوا کی مقدار کم رکھی تھی جس سے میرا جسم جلد میرے قابو میں آ گیا۔ دوسرے اس نے مجھے جان بوجھ کر ایک چاقو فراہم کر دیا۔ اس کے بعد میرا کام آسان تھا۔ تم لوگوں نے اپنا معاہدہ پورا کر دیا۔ بھارتی مجھے لے کر دہلی کی سرحد پار کر گئے اور اس کے بعد میں نے انہیں قابو کر لیا۔ تمہاری توقع کے عین مطابق اور انہیں واپس لے آیا۔ کرنل نے کمال اداکاری کی اور آخر تک انجان بنا رہا۔ اس نے مجھے شک کا موقع دیے بغیر وہ سب کیا جو تم لوگوں کی پلاننگ تھی۔“

فتح خان چونکے بغیر انجان بن کر بولا۔ ”کیا پلاننگ تھا ہمارا۔۔۔؟“

”یہی کہ میں کرنل سے کہیں اور زوارہ حاصل کروں اور اس کے بعد جب واپسی کا سفر کروں تو راستے میں مجھے

ماہنامہ سرگزشت
 اگست 2012ء

وادی کا خیال آنے گا۔ مزید نشان دہی کے لیے کرنل نے وین میں نقشہ بھی رکھ دیا تھا جس میں خاص طور سے وضاحت تھی کہ یہاں آنے والا راستہ وادی کے پاس سے گزرتا ہے۔ ٹانگ بھی برقی تھی۔ ایمن کے پاس چالیس گھنٹے سے بھی کم کا وقت رہ گیا تھا اور میں ایک آخری کوشش کر سکتا تھا۔ جیسا کہ میں نے کی۔ تم لوگوں نے اس حد چالاکی کی کہ وین کا رخ سڑک کی طرف کر کے کھڑا کیا اور اس میں چابی بھی لگی رہنے دی تھی۔ جس وقت بھارتی مجھے لے جا رہے تھے وین کا رخ کبین کی طرف تھا اور اس محدود جگہ اسے ٹھہرانے میں وقت لگتا۔ تمہارا مقصد تھا وین لے کر بھاگ نکلوں لیکن میں پہلے کبین میں پہنچ گیا۔“

”خ خان نے سر ہلایا۔ ”پراسوس ہیرا پھر بھی نہیں ملا۔“ میں بھی یہی جانتا ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا؟“

”اب وہ بھی بتا دو۔“

”خ خان تمہیں شبہ تھا کہ برٹ شامرنے سے پہلے مجھے کچھ بتا گیا ہے کہ تم میریوں کی جگہ کے بارے میں اشارہ ضرور دے گیا ہے۔ اب تم مجھ سے براہ راست یہ بات معلوم نہیں کر سکتے تھے۔ زبردستی کرنے کا مطلب ہوتا محلی دشمنی اور تمہاری اس پالیسی کا پردہ چاک ہو جاتا تو تم نے میرے سلسلے میں اپنا رکھی ہے۔ یعنی اوپر اوپر سے دوستی جتانے رہو اور اندرون خانہ میری جڑیں کاٹنے کا کام کرتے رہو۔“

”ٹھیک ہے میں نے یہ منصوبہ بنایا لیکن کامیابی تو پھر بھی نہیں ملا۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”میرا خیال تمہیں اب بھی شبہ ہے کہ میں تمہیں دھوکا دے رہا ہوں حالانکہ تم پوری طرح مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہے جب میں وادی میں پاٹھوں کی طرح اوپر نیچے بھاگ دوڑ کر رہا تھا تو تم اور تمہارے ساتھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ اگر میں ہیرے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو تم اسی وقت مجھے گھر لیتے۔ مگر جب میں ناکام رہا اور تمہارے ساتھی کے چھینکنے کی وجہ سے ہوشیار ہو کر وادی سے نکل بھاگا کہ تم نے دوسرے مقابل منصوبے کے تحت مجھے قابو کر لیا۔“

”خ خان کچھ دیر مجھے غور سے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر مخصوص عمارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”شہباز خان تم سب جانتا ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی جانتا ہے۔ اب کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم پہلے سے جاننے کے بعد ہم سب کو بے خوف بنا رہا ہو؟“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں جانتا ہوں کہ ہیرے کہاں ہیں لیکن میں جان بوجھ کر تمہیں نہیں بتا رہا ہوں؟“

”ہاں میرا یہی خیال ہے۔“ خ خان نے سر ہلایا۔ ”تم جان گیا ہے کہ ہیرا کدھر ہے۔“

”اگر میں جان گیا ہوں تو مجھے ایمن کے لیے بار کنگ کر لینی چاہیے تھی۔“

”نہیں تم آخری لمحے تک بار کنگ نہیں کرے گا۔“ خ خان نے یقین سے کہا۔ ”تم کو امید ہے میں ایمن کو چھوڑ دے گا یا برٹش حکومت تاوان ادا کر دے گا۔“

”تم غلط فہمی کا شکار ہو میں نے پورے خلوص نیت سے ہیرے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں ناکام رہا۔ ویسے تم تسلیم کرتے ہو کہ ڈیوڈ شا سے تمہاری یہی ذیل ہوئی تھی کہ تم مجھے پکڑ کر بھارتی حکومت کے حوالے کرو گے۔ اس کے بدلے ڈیوڈ شا برٹش حکومت پر تاوان کی ادائیگی کے لیے دباؤ ڈالے گا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”پر ڈیوڈ شانے پکا وعدہ نہیں کیا تھا کہ کام لازمی ہوگا۔“

”اسی سے اس کی نیت کا اندازہ کر لو۔“

”میں جانتا ہے لیکن اسے صاف جواب نہیں دے سکتا، نہ اسے مجبور کر سکتا ہے۔ اس نے بتایا کہ برٹش گورنمنٹ کی پالیسی نہیں ہے۔ یہاں اغوا ہونے والے کسی فرد کا تاوان نہیں دیا جاتا ہے۔“

”ہاں! انہیں مرنے دیا جاتا ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”اپنی گندی سیاست کی بیہوش چڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ خطہ ویسے ہی ان کی سیاست کا نشانہ بنا ہوا ہے۔“

”اب ایمن ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہے کہ مجھے ہیرا مل جائے۔“

میں کچھ سوچ رہا تھا میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”خ خان ڈیوڈ شا، یہ تو جان گیا ہوگا کہ میں بھارتیوں کی قید میں آنے سے پہلے فرار ہو گیا ہوں۔ لیکن کیا وہ یہ جانتا ہے کہ میں اب تمہاری قید میں ہوں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”وہ نہیں جانتا ہے۔“

”بھارتیوں نے میرے بدلے تم لوگوں کو کیا ادا کیا ہے؟“

”ایک ملین ڈالر۔“ خ خان نے سوچ کر کہا۔ ”اس میں سے آدھے مجھے ملے اور آدھے کرنل کو ملے۔“

”لیکن اس کے پاس صرف دو لاکھ ڈالر تھے۔“

”یہ وہ رقم نہیں ہے ادا کی جانے والی رقم روس کے ایک بینک میں گئی ہے۔“

”بینک میں۔“ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”خ خان تمہارا روس کے کسی بینک میں اکاؤنٹ ہے؟“

”ہاں! اگر مجھے ہیرے مل جائیں تو میں وہیں چلا جاؤں گا۔ وہاں مجھے کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے، پکڑنے والے تمہیں ہر جگہ سے پکڑ سکتے ہیں۔ تم کبھی بھی سو فیصد محفوظ نہیں ہو گے۔“

”وہ بعد کا بات ہے بعد میں دیکھا جائے گا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”اگر ڈیوڈ شا کو معلوم ہو جائے کہ ایک طرف تو تم لوگوں نے مجھے بھارتیوں کے حوالے کر دیا تھا اور دوسری طرف مجھے بچ نکلنے کا موقع بھی دیا تو اس کا رد عمل کیا ہوگا؟“

”خ خان مسکرایا۔ ”شاید وہ کچھ نہ بولے اور شاید اس کا رد عمل اچھا نہ ہو۔ پر میرے کو اس کا پروا ہوتا تو میں یہ کام کیوں کرتا ہوں مجھے استعمال کرتا ہے تو میں اسے استعمال کر رہا ہوں۔“

میں ہنسا۔ ”تم نے اور کرنل نے چالاکی سے کام لیا۔ نوٹ بھی کیا ہے اور مجھ پر احسان بھی کر دیا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ تم نے میرے ساتھ کوئی برائی کی ہے۔“

خ خان نے اپنے آدی کو کھانے کے لیے لانے کو کہا۔ میرا خیال تھا اس وقت روکھی سوکھی کھانے کو ملے گی۔ مگر خلاف توقع کچھ دیر میں ہمارے سامنے بھنا ہوا مرغ تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ میں کچھ دسکھی میں تلا گیا تھا۔ کئی وقت کی ڈنل روٹی اور انڈوں کے کھانے کے بعد یہ مین و سلوٹی تھا۔ مرغ خاصا بڑا تھا اس لیے ہم دونوں کا ہی پیٹ بھر گیا تھا۔ کھانے کے بعد خ خان نے دوبارہ بوتل سنبھال لی اور میرے لیے کافی لانے کا حکم دیا۔ اس کا ایک آدی شاید ان کاموں کا ماہر تھا۔ مرغ بقیہ پہلے ہی تیار ہو گیا تھا اور اوون میں رکھا تھا۔ وہ گیا اور بس ٹائنٹ نکال لیا۔

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ میں نے خ خان سے پوچھا۔

”ارادہ بتا دیا ہے اگر میرے کو تاوان نہیں ملا تو ایمن نہیں بچے گا۔“

”اسے مار کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

”نہ ملے پر وہ بھی نہیں بچے گا۔ تم کو پتا نہیں ہے تم اُدھر قید پڑا ہے لیکن انگلینڈ اور دنیا بھر میں میڈیا نے ایمن کے

لے ایک ہنگامہ کر دیا ہے۔ بہت شور ہو رہا ہے۔“

یہ میرا ہی کام تھا۔ مانی کی مدد سے وی وی جنکو کو اطلاع دی تھی اور اب اس کے نتیجے میں ایمن کا کیس میڈیا میں آ گیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ مغربی ممالک کی حکومتیں میڈیا کے آگے اپنی پالیسی نہیں بدلتی ہیں، وہ جانتی ہیں میڈیا کی حیثیت ایک عارضی طوفان سے زیادہ نہیں ہوتی ہے جو بس چند دن دھوم مچاتا ہے اور پھر یوں غائب ہو جاتا ہے جیسے بھی آہا نہیں تھا۔ ان کی نظریں ہمیشہ مستقبل میں ملک کے مفاد پر مرکوز رہتی ہیں۔ اگر وہ محسوس کریں کہ کسی پالیسی پر عمل کرنے سے ان کے ووٹز ناما ض ہو جائیں گے لیکن یہ ملک کے مفاد میں ہے تو وہ ووٹز کی پروا کیے بغیر اپنی پالیسی پر عمل کرتی ہیں چاہے اس کے جواب میں ان کی حکومت کیوں نہ چلی جائے۔ اس لیے یہ سوچنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ ایمن کا کیس میڈیا میں جانے سے اس کی جان بچنے کی امید پیدا ہوگی۔ مگر میرے بس میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ خ خان بھی میرے قبضے میں نہیں تھا۔ انہیں اس کے قبضے میں تھا۔ اس کا آدی میرے لیے چائے لے آیا تھا اور اس بار دودھ اور چینی کھی گئی۔ خ خان نے اچانک پوچھا۔ ”شہباز تم ایمن کو بچانے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

”میں اس کو بچانے کے لیے اپنی جان تک داؤ پر لگا سکتا ہوں۔“

”سچ کہتا ہے۔“ خ خان نے بے یقینی سے کہا۔ ”تم اس سے محبت بھی نہیں کرتا ہے۔“

”میں اس سے وہ محبت نہیں کرتا ہوں جو آدی کو اپنی عورت سے ہوتی ہے لیکن وہ میری دوست ہے۔ آدی دوست کے لیے بھی تو جان دے سکتا ہے۔“

”اگر میں تم سے کہے کہ اس کے بدلے میں تم کو مار دیتا تو تم مان جاؤ گے؟“ خ خان نے کہا اور چانک پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔ اس کا لہجہ بدل گیا تھا اور اس میں سختی اور سفاکی آ گئی تھی۔ میں مسکرایا۔

”خ خان تم کوئی کام بے سبب نہیں کرتے ہو تو ایمن کے بدلے مجھے مارنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟“

”تم میرے لیے خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔“

”حالانکہ میں نے کبھی تمہارے کاموں میں ٹانگ نہیں اڑائی ہے تم ہی ہو جو ہمیشہ میرے معاملے میں مداخلت کرتے رہے ہو۔ تمہیں مجھ سے جو نقصان ہوئے وہ ہمیشہ غیر ارادی

ہوتے تھے جبکہ تم ہمیشہ جان بوجھ کر مجھے نقصان پہنچاتے رہے۔ اس لحاظ سے تو تم میرے لیے خطرناک ہو۔“

اس نے غمی میں سر ہلایا۔ ”تم نہیں جانتا کہ تمہاری وجہ سے میرے کو کتنا نقصان ہوا۔ وہ وقت جو میں میرے تلاش کرنے میں لگا سکتا تھا تمہارے پیچھے لگا۔“

میں نے شانے اچکائے۔ ”فتح خان میں نے کبھی نہیں کہا اتیل مجھے مار۔“

”تم بات بدل رہا ہے ابھی کہہ رہا تھا کہ امین کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔“

”میں بات نہیں بدل رہا، اگر تم مجھے مارنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو میں تمہارے قبضے میں اور بے بس ہوں۔ مجھے مارنے کے لیے تمہیں امین کا نام استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”نہیں شہباز خان میں تمہیں خالی ہاتھ دینا سے نہیں بھیجنا چاہتا ہے۔ میں چاہتا ہے کہ تمہارے قتل کی کچھ تلافی کر کے بھیجے۔“

”یعنی تم امین کو چھوڑ کر میرے قتل کی تلافی کرنا چاہتے ہو۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں بات ہے۔“

”لیکن تم نے امین کو نہیں چھوڑا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مرنے کے بعد مجھے کیا پتا چلے گا کہ تم نے اسے چھوڑ دیا ہے یا نہیں۔“

فتح خان نے میری بات پر غور کیا۔ ”تم چاہتا ہے میں پہلے اسے چھوڑ دے پھر تم کو مارے۔“

”ہاں تاکہ مجھے اطمینان رہے میں جس کام کے لیے جان دے کو تیار ہوا تھا وہ ہو گیا ہے۔“

فتح خان سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں پہلے ایسا کرے گا اب تم آرام کرو۔“

”انسان اپنی زندگی کے آخری وقت میں آرام کیسے کر سکتا ہے؟“ میں نے کہا تو میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور میں اسے خوف کی لہر سمجھا تھا لیکن جب یہ سنسنی رفتہ رفتہ پورے جسم پر حاوی ہونے لگی تب مجھے پتا چلا فتح خان میرے ساتھ ہاتھ کر گیا تھا چائے میں کوئی خواب آور دوا تھی۔ میں نے اٹھنا چاہا لیکن ہاتھ پیروں کی سنسنی اتنی بڑھ گئی تھی کہ مجھ سے ہلا بھی نہیں گیا۔ رفتہ رفتہ یہ سنسنی ذہن پر بھی طاری ہو گئی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک خالی کمرے میں بچے

قالین پر پڑا تھا۔ دروازے کی ساخت سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں اسی کونجی میں تھا کیونکہ اس میں ایسے ہی دروازے لگے تھے۔ یہ کیل یا دیواری کتھیاہت مغبوط لکڑی سے بنے تھے اور انہیں کوئی رستم زماں ہی توڑ سکتا تھا۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو میرے اندازے کے عین مطابق ہاتھ روم کا دروازہ ثابت ہوا۔ ہوش میں آنے کے بعد مجھے پتہ نہیں آئے تھے اور نہ ہی طبیعت میں خرابی محسوس ہوئی تھی ہاں ہاتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں وہاں چلا آیا۔ ہاتھ روم بھی نہایت محفوظ قسم کا تھا۔ اس میں ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جس سے زیادہ سے زیادہ درمیانے سائز کی بلی نکل سکتی تھی۔ وہ بھی اگر بلی آبادی بڑھانے کے موڈ میں نہ ہو۔ واش روم بھی بہترین قسم کا تھا اور یہاں گرم پانی آ رہا تھا۔ نہ جانے فتح خان کی اپنی کونجی تھی یا اس نے حسب معمول کسی ایسی جگہ کو تیار کیا تھا جس کا مالک شہر میں ہوتا تھا۔ چونکہ دار مجھے اسی کونجی کا لگا تھا شاید فتح خان نے اسے لالچ دے کر ساتھ ملا لیا تھا اور اب دھڑلے سے کونجی استعمال کر رہا تھا۔ میں ہاتھ روم سے باہر آیا تو فتح خان کے دونوں آدمی کمرے میں موجود تھے۔

”چلو خان جی نہ بلایا ہے۔“

”چلو۔“ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں شارٹ منٹوں سے رخ اور پوری طرح چسکے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی صبح کا وقت تھا میں کم سے کم اٹھ کھڑے تو سوچا تھا۔ دوا کے اثر کے علاوہ جھکن بھی تھی کیونکہ میں ڈیڑھ دن سے جاگ رہا تھا۔ وہ دونوں مجھے اسی نشست گاہ میں لائے۔ میز پر ناشتا سجا ہوا تھا اور یہ شاندار روایتی قسم کا ناشتا تھا۔ دیسی مٹی میں بنے پراٹھے تھے۔ اُبلے اور تلے ہوئے اٹھے تھے۔ مکھن کے ساتھ شہد اور پیڑ بھی تھا۔ میں نے صوفے پر پیرم دراز فتح خان کی طرف دیکھا۔

”یہ تو لگ رہا ہے کسی سزائے موت کے مجرم کے لیے آخری ناشتا آیا ہے۔“

فتح خان اس وقت سگریٹ نوشی کر رہا تھا اس نے سر ہلایا۔ ”تم ایسا بھی سمجھ سکتا ہے۔“

میں نے ناشتے کا آغاز کیا۔ ”تم نے کہا تھا کہ امین کی جان بخش دو گے؟“

”ہاں میرا آدمی کام کر رہا ہے ابھی اس کی کال آئے گی۔“

”مجھے یہاں کہیں فون نظر نہیں آ رہا ہے اور موبائل کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تم فکرت کرو میرے پاس یہ ہے۔“ فتح خان نے جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا سیٹلائٹ فون نکال کر دکھایا۔ ”اس کے ساتھ میں کے ٹو کی چوٹی سے بھی کسی سے رابطہ کر سکتا ہے۔“

”تمہارے لیے کیا مسئلہ ہے تم ایک فون کال کر کے اپنے آدمی کو حکم دو گے اور وہ برٹش سفارت خانے کال کر کے جیکٹ کو ناکارہ بنائے والا کوڈ بتا دے گا۔“

”ہاں لیکن میرے آدمی کو اپنی حفاظت کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔ وہ گورا بہت تیز ہوتا ہے۔ وہ کال کا سراغ لگا کر میرے آدمی تک آ سکتا ہے۔“ فتح خان نے کہا۔ ”پھر ایک چکر اور بھی ہے میرے کو شہر ہے میرا آدمی کوڈ بتا دے گا تب بھی امین نہیں بچے گا۔“

میں چونک گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے وہ اسے مرنے دیں گے؟“

”ہاں یہ گورا لوگ بہت.... ہوتا ہے۔“ فتح خان نے روانی سے ایک گولی استعمال کی۔ ”ضرورت پڑنے پر مظلوم بننے کے لیے اپنی ماں کو بھی مروا سکتا ہے۔ پھر ڈیوڈشا بھی ہے۔“

”اصل مسئلہ وہی ہے اور وہ امین کو مروانا چاہتا ہے۔“

”میں نے خود دیکھا ہے سفارت خانے کا لوگ اس کے سامنے خاندانی ملازموں کی طرح ہوتا ہے۔“

”تب تم نے اس کا کوئی حل سوچا ہوگا؟“

”وہی جو تم نے کیا تھا۔“ فتح خان سکرایا۔ ”میں نے اپنے آدمی کو لگا دیا ہے وہ یہ کوڈ ٹی وی چینل کو بھیجے گا اور پھر سفارت خانے کال کرے گا۔“

”یہ تم نے ٹھیک کام کیا ہے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”ابھی کیا وقت ہوا ہے؟“

”سات بجے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”ابھی سات گھنٹے کا وقت ہے اس کے بعد ہی جیکٹ پھٹے گا۔“

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”اگر ڈیوڈشا اس معاملے میں ملوث ہے تو وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ کوڈ غلط بتایا تھا اور اسے لگاتے ہی جیکٹ پھٹے گا۔“

فتح خان بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ”ہاں ایسا ہو سکتا ہے میڈیا والا بھی کچھ نہیں کر سکتا ہے بلکہ وہ اٹنا میرے خلاف بولے گا کہ میں جان بوجھ کر غلط کوڈ بتایا ہے۔“

”میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے اگر تم مان لو۔“

”کیا ترکیب ہے؟“

”مجھے ڈیوڈشا سے بات کرنے دو۔“

فتح خان چونکا۔ ”اس سے بات کر کے تم کیا کرے گا؟“

”؟“

”میں ظاہر کروں گا کہ میں نے تم پر قاپو یا کر کوڈ حاصل کر لیا ہے اور میں امین کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں میں اسے لالچ دوں گا کہ اگر اسے میرا تعاون چاہیے تو وہ اس معاملے میں ٹانگ اڑانے سے باز رہے۔“

”تمہارے خیال میں وہ باز آ جائے گا؟“ فتح خان کا لہجہ استہزا سیہ تھا۔

”کیا کیا جا سکتا ہے آدمی کے بارے میں۔“ میں نے پراٹھا ٹھٹھتے ہوئے کہا۔ ”سوچا تو میں نے یہ بھی نہیں تھا کہ کبھی تم میری جان لینے کو کہو گے اور میں دے دوں گا۔“

فتح خان نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”شہباز خان کیا تم سنجیدہ ہے؟“

”یہ تو تم پر ہے کیا تم میری جان لینے میں سنجیدہ نہیں ہو؟“

”میں سو فیصد سنجیدہ ہے اگر میں نے امین کو چھوڑا تو تم کو نہیں چھوڑے گا۔“

”تب میں بھی سنجیدہ ہوں۔ شاید تم حیران ہو کہ میں اتنا خاموش کیوں ہوں جان بچانے کے لیے کوشش کیوں نہیں کر رہا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میری تم سے ذیل ہو گئی ہے اگر تم امین کو چھوڑ دو گے اور وہ فتح جانے کی تو میں بغیر کسی مزاحمت کے خود کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔ اگر تم نے ذیل پوری نہ کی تو میں اپنی جان بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

فتح خان سے سر ہلایا اور سیٹلائٹ فون پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ ”میں ڈیوڈشا کا نمبر مل رہا ہے وہ اس نمبر کے بارے میں نہیں جانتا ہے تم بھی اسے نہیں بتائے گا کہ یہ میرا فون ہے اور تم میرے پاس ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون لے لیا۔ یہ عام موبائل فون کی نسبت موٹا اور بھدرا تھا اس کی اسکرین بھی بالکل سادہ تھی جس میں صرف نمبر لکھا ہوا آ رہا تھا میں نے یہ نمبر ذہن نشین کر لیا۔ اگرچہ فی الحال اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہو سکتا تھا مستقبل میں کوئی فائدہ ہو بھی جاتا۔ آنے والا وقت تو اللہ کے ہاتھ میں تھا ہم صرف اندازے لگا سکتے ہیں کہ ایسا ہوگا اور دیکھا ہوگا۔ ڈیوڈشا نے

”ڈیوڈ شامیں بات کر رہا ہوں اگر تم آواز سے پہچان سکو“

”شہباز تم....“ اس نے وقف کر کے کہا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں جہاں بھی ہوں آزاد ہوں اور اس قابل ہوں کہ تم سے بات کر سکوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ڈیوڈ شامیں میرے پاس وقت کم ہے اس لیے براہ راست بات کروں گا۔ میں نے فتح خان پر قابو پا کر جیکٹ ڈی ایگٹی ویٹ کرنے والا کوڈ معلوم کر لیا ہے۔ میں وہ کوڈ برطانوی سفارت خانے کو بھیج رہا ہوں اور ساتھ ہی میڈیا کو بھی دے رہا ہوں۔“

”تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ حسب معمول ہر دھماکا

”ڈیوڈ شامیں یہ کر سکتے ہو کہ اس معاملے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالو گے۔“

”میری طرف سے کوئی....“

”میری بات مت کاٹو۔“ میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کیا کر رہے ہو اور تمہاری کوشش کتنی کامیاب جا رہی ہیں؟ اس لیے میں نے تمہیں کال کرنے کی زحمت کی ہے۔“

”تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا؟“

”فتح خان سے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔“

ڈیوڈ شامیں ہوا گیا وہ شاید دی ویل میں تجزیہ کر رہا تھا کہ میری اس کال کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ میں سکون سے انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”شہباز ملک اس کے بدلے مجھے کالے گا؟“

”میرا تعاون....“

”میں کیسے یقین کر لوں۔“

”میں تمہیں یقین دلانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں لیکن اگر ایمن کو کچھ ہوا تو اس پر پورا یقین کر لو کہ تم میرا تعاون ہمیشہ کے لیے کھودو گے۔“

”اگر یہ ذیل ہے تو مجھے منظور ہے ایمن کو کچھ نہیں ہوگا لیکن اگر تم بعد میں مکرے تو وہ زندہ نہیں رہے گی۔“ ڈیوڈ شامیں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اس نے صاف دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے بعد میں تعاون سے گریز کیا تو وہ ایمن کو نہیں چھوڑے گا۔ فتح خان نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”وہ مان گیا ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن اس شرط پر کہ میں بعد میں اس سے تعاون کروں گا ورنہ وہ ایمن کو نہیں چھوڑے گا۔“

”تم زندہ رہے گا تو اس سے تعاون کرے گا۔“

”ہاں یہ تو ہے لیکن بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی تو ایمن بچ جائے پھر آگے اس کی حفاظت کرنے والا وہی ہے جو سب کی حفاظت کرتا ہے۔“ میں نے لمبے دروانی سے کہا۔ میرا ناشتا تقریباً مکمل ہو گیا تھا آخر میں میری پسند کی چائے تھی۔ فتح خان میری پسندنا پسند سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے ایسی چائے عوائی تھی۔ فتح خان نے سیٹلا بیٹ فون پر اپنے آدمی سے رابطہ کیا اور اسے حکم دیا۔

”برٹش ایگٹیسی کال کرو اور خود کوڈ بتاؤ جب کام ہو جائے تو مجھے کال کرنا۔“

میں نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ”سنو فتح خان تم جو کہو گے وہ ایک طرف ہوگا کیا میں خود تصدیق نہیں کر سکتا کہ ایمن محفوظ ہے یا نہیں۔“

”میں تصدیق کر ادے گا۔“ اس نے یقین دلایا۔

وقت گزرتا گیا ایک گھنٹے بعد میں نے کہا۔ ”تمہارا آدمی کتنی دیر لگے گا تصدیق کرنے میں۔“

”زیادہ دیر نہیں لگے گا یہ کام بہت نازک ہے وہ کئی بار کوڈ کی تصدیق کرنے کا اور دوسری طرف سے بھی بار بار پوچھا جائے گا۔ ایک نمبر بھی غلط ہو گیا تو....“ فتح خان کی بات ادھوری رہ گئی اس کے سیٹلا بیٹ فون کی تیل بجی۔ اس نے کال ریسویکی اور دوسری طرف سے کئی جانے والی بات سن کر کال کاٹ دی اس نے میری طرف دیکھا۔

”کام ہو گیا ہے ایمن کی جیکٹ ڈی ویگنی ویٹ کردی گئی ہے تم جاہو تصدیق کر سکتے ہو۔“

”وہ کیسے.... سفارت خانے کال کر کے....؟“

اس نے فنی ٹی سر ہلایا۔ ”ان کو اس نمبر کا پتا چل جائے گا میرے پیچھے تو وہ اب بھی پڑیں گے۔“

”پھر کیسے تصدیق ہوگی کہ ایمن کی جیکٹ اتر گئی ہے؟“

”میرے ساتھی تصدیق کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن کیا تم مجھے ان سے بات کرنے کی اجازت دو گے؟“

”دے گا پر تم صرف بات کرے گا اس کے علاوہ کوئی اشارہ نہیں دے گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ میں نے کہا اور فتح خان نے مجھے فون دے دیا۔ میں نے عبداللہ والی کوشی کا نمبر ملایا اور اتفاق سے کال عبداللہ نے ریسویکی۔ میری آواز سن کر وہ چلا یا۔

”آپ.... کہاں ہیں جناب؟“

”چلاؤ مت.... میری بات غور سے سنو میں منٹ بعد دوبارہ کال کروں گا اس وقت تم تصدیق کرو کہ برٹش سفارت خانے میں موجود ایمن کو پہنائی جیکٹ اتر گئی ہے یا نہیں اور وہ ٹھیک ہے۔“

”میری بات....“

”بعد میں پہلے یہ کام کرو۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

فتح خان نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ ”تم نے ٹھیک بات کیا۔“

”فتح خان میں تم سے معاہدے کا پابند ہوں مگر تم نے اچانک ہی دشمنی کا یہ باب ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی وجہ بتا سکتے ہو۔“

”نہیں۔“ اس نے قطعی لہجے میں کہا۔ ”لیکن یوں سمجھ لو کہ میں کچھ ایسا کام کر رہا ہوں جس میں تم لازمی ٹانگ اڑائے گا اگرچہ اس کا تمہارا یا تمہارے ساتھیوں کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے میرے ہاتھ سے نکل گئے ہیں اب میرے پاس یہ آخری چانس رہ گیا ہے۔ اسے میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

مجھے حیرت ہوئی ایسا کون سا کام ہو سکتا تھا جس میں فتح خان کو خطرہ تھا کہ میں لازمی ٹانگ اڑاؤں گا اور اس کا مجھ سے یا میرے ساتھیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پھر وہ کام ایسا تھا جس میں فتح خان کو ہیروں کا مقابلہ مل جانے کی امید تھی۔ مجھے بھلا کیا ضرورت ہے اپنے پھنڈے چھوڑ کر پرانے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی۔ تم جانتے ہو میری ایسی فطرت نہیں ہے۔“

”میں جانتا ہے لیکن یہ بھی جانتا ہے کہ تم اس معاملے میں لازمی ٹانگ اڑانے کا اور مجھے بہت مشکل ہوگا۔ ورنہ میں آسانی سے یہ کام کر لے گا۔“

فتح خان سے گفتگو کے دوران میرا ذہن سوچتا جا رہا تھا کہ ایسا کون سا معاملہ تھا۔ مگر فی الحال میرے ذہن میں ایسا کوئی معاملہ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے میں منٹ بعد عبداللہ کو کال کی۔ میری آواز سننے ہی اس نے کہا۔ ”جناب میں نے

تصدیق کر لی ہے اس شام کی جیکٹ ڈی ایگٹی ویٹ ہونے کے بعد اتر گئی ہے اور وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“

”یہ تم نے اچھی خبر سنائی۔ یہ بتاؤ کہ وسم اور دوسرے لوگ ٹھیک ہیں؟“

”ہاں وہ سب خیریت سے ہیں اور ہم آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔“

”تم لوگ بیمار میں اپنی توانائیاں ضائع مت کرو۔“

میں نے مشورہ دیا۔ ”اگر زندہ رہا تو جلد لوٹ آؤں گا۔“

”لیکن آپ ہیں کہاں؟“

”مجھے لو دشمن کی قید میں ہوں۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی پھر موبائل فتح خان کی طرف بڑھا دیا جو اس نے جیب میں رکھ لیا۔ وہ بخیر ہو گیا تھا۔

”شہباز خان مجھے افسوس ہے۔“

”افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں نے تمہیں کبھی دوست نہیں سمجھا جو مجھے افسوس ہو۔“

اس نے سر ہلایا اور اپنا پتول نکال لیا۔ ”انٹھوار باہر چلو“

وہ غالباً اس جگہ کو خون سے صاف رکھنا چاہتا تھا۔ فتح خان کا ایک آدمی دروازے کی طرف بڑھا لیکن جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا اچھل کر اندر آ پڑا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ بلند ہو رہا تھا۔ دوسرا آدمی دروازے کی طرف لپکا تھا مگر اسے وہاں تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا گولی اس کے سر میں لگی اور وہ لٹکی طرح کھومتا اور سر سے خون اچھالتا ہوا ایک صوفے پر جا گر اس کا پتول اچھل کر میرے سامنے میز کے ساتھ آ پڑا۔ جو نیچے پڑا تھا وہ لائٹ براؤن رنگ کے قالین کو سرخ کر رہا تھا۔ دوسرا صوفوں کو اپنے خون سے رنگ دے رہا تھا۔ فتح خان اس جگہ کو خون آلود ہونے سے بچانا چاہتا تھا لیکن ایک منٹ سے کم وقت میں نشست گاہ میں خون ہی خون نظر آنے لگا تھا۔ فتح خان کے ہاتھ میں پتول تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کہ دروازے کی طرف سے ایک فائر اور ہوا اور اس بار فتح خان کے ہاتھ سے پتول اڑ گیا۔ اس نے چلا کر گالی دی۔ اس کے ہاتھ سے خون ٹپک رہا تھا لیکن زخم زیادہ خطرناک نظر نہیں آ رہا تھا۔ باہر موجود شخص بے آواز ہتھکڑیوں سے فائر کر رہا تھا اس لیے فائرنگ کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ جب اس نے فتح خان کو کبھی نہتا کر دیا تو اندر قدم رکھا۔ میں اور فتح خان دونوں حیران رہ گئے تھے۔

چاروں طرف کتابوں کی شیشے والی الماریاں لگوا لی تھیں۔
گھر کی کے سامنے جھولنے والی کرسی رکھوا لی تھی۔ ناشتے
کے بعد کا بیشتر وقت مطالعے یا بیوی دیکھنے میں گزرتا تھا۔
بچے اس وقت کا کالج اسکول گئے ہوتے تھے اور بہوئیں گھر
کے کاموں میں مصروف ہوتی تھیں۔ صبح اوپر رہتے تھے
جبکہ چھپے پورشن میں شفیع کے ساتھ میں تھا۔ یہ
بننا پورشن تھا۔ باہر سے
آنے والے بھی
نہیں روکتے

صبح میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوتی اور ان
دونوں میں سے کوئی آ جاتا۔ وہ کوئی ایسی بات بتائے آتا تھا
جو دن میں بھول جاتا تھا۔
صبح فجر پڑھ کر لان میں چھل قدمی کر کے ناشتے کے
بعد میں اپنے کمرے میں آ جاتا جو بیگم کے بعد بیڈروم سے
زیادہ اسٹڈی روم لگتا تھا۔ میں نے بڑا بیڈنگ لگا کر
سنگل بیڈ لگا دیا تھا۔ سنگل روم کی
چند راستہ کھیلنے کے لیے
لی اور کچھ صوف کی
الماری لگی تھی

عشق نامتناہی

جناب مدیر اعلیٰ
مودبانہ آداب!

میں نے پہلی بار لکھنے کی کوشش کی ہے۔ غلطیاں بھی یقیناً ہوئی
ہوں گی، اسے درست کر لیں۔ اس میں ہر بات درست ہے۔ میں نے
صرف نام اور مقام بدلے ہیں، واقعات میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔
امید ہے یہ اشاعت کے قابل ٹھہرے گا۔

صبیح یارخان
(کراچی)

عشق نامتناہی
نمبر

رومی نے اندر جھانکا۔ ”دادا جان میں
آ جاؤں؟“
”آ جاؤ۔“ میں نے پینٹنگ چیریز پر جھولتے
ہوئے کہا وہ میری اجازت سے پہلے اندر آ چکی تھی۔ ”آج
صبح سویرے دادا کی یاد کیسے آ گئی؟“
رومی کا جوش سے چمکتا چہرہ، سرخ ہوتی رنگت اور تیز
چلتی سانس بتا رہی تھی کہ اسے کسی خاص بات کا علم ہوا تھا
اور وہ مجھے بتانے کے لیے بے چین تھی اور یہ خاص بات
یقیناً نومی کے بارے میں تھی۔ رومی کی ساری خاص باتیں
نومی کے بارے میں ہوتی تھیں۔ رومی صبح یارخان کی سب
سے چھوٹی اولاد ہے جو میرے سب سے بڑے
صاحبزادے ہیں۔ ان سے چھوٹے شفیع یارخان ہیں اور
نومی ان کا دوسرا بیٹا ہے۔ تیسرے صاحبزادے رفیع یار
خان انگلینڈ میں ہیں اس لیے ان کی بیٹیوں اولادیں بھی
وہیں آباد ہیں۔ مل ملا کر تینوں بیٹیوں کی کوئی گیارہ اولادیں
ہیں اس لیے گھر میں ہمہ وقت رونق رہتی ہے۔ کوئی بارہ

سال پہلے اٹھارہ گریڈ کے آفسر کی حیثیت سے ریٹائر
ہونے کے بعد میں ایک فارغ اور آرام دہ زندگی گزار رہا
ہوں۔ بیگم نے عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن پانچ
سال پہلے چپکے سے نکل گئیں۔ تب سے اکیلے جی رہے
ہیں۔ صاحبزادوں سے کبھی بے تکلفی نہیں رہی۔ یہ قول بیگم
گھر میں بھی سرکاری افسر بنے رہتے تھے۔ اس وجہ سے
بچوں سے ایک فاصلہ رہا۔ یہ فاصلہ پوتوں پوتیوں سے بھی
رہا۔ سوائے رومی اور نومی کے۔
ان دونوں کی بچپن سے مجھ سے دوستی رہی۔
دوسرے بچوں کے برعکس وہ بے تکلفی سے میرے پاس گھس
آتے تھے اور میری بات ماننے کے بجائے مجھے اپنی باتوں
پر چلاتے تھے۔ ڈرنے کے بجائے میرے غصے سے لطف
اندوز ہوتے تھے۔ ہاں کبھی جج جج خفا ہوتا تو سب بھول کر
مجھے منانے کی فکر میں لگ جاتے تھے۔ اپنی ہر بات اور ہر
مسئلہ جب تک مجھ سے شیر نہیں کر لیتے ان کا کھانا ہضم نہیں
ہوتا تھا۔ انہیں نیند نہیں آتی بلکہ اکثر ایسا ہوتا کہ رات بارہ



تھے۔ کسی زمانے میں گلشن میں یہ چار سو گز کا پلاٹ بہت سستل رہا تھا اس وقت لے لیا اور ریٹائرمنٹ تک اس پر گھر بھی بنوا لیا تھا۔ ربيع شادی کے بعد اگلینڈ چلا گیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا تھا۔ اس کے بعد رومی اور نومی کا وقت شروع ہو جاتا۔ اگر وہ نہیں آتے تو میں خود ان کی تلاش میں نکل جاتا تھا۔ عصر کی نماز پڑھ نزدیکی پارک کی طرف چلا جاتا یا چھٹی ہوتی تو گھر آ جاتا۔ تمام بچوں سے مل بیٹھنے کا موقع اسی وقت ہی ملتا تھا۔ مغرب کے بعد سب لاؤنج میں جمع ہوتے، اوپر سے فصیح اور اس کے بیوی بچے بھی آ جاتے تھے۔ یہ محفل رات کے کھانے تک چلتی تھی اس کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ مجھے شروع سے دیر تک گانے کی عادت تھی اس لیے میں وی وی دیکھتا یا مطالعہ کرتا اور جب نیند آتی تو سو جاتا۔ نیند کے بارے میں میرا شروع سے خیال رہا ہے کہ اس کا انتظار فضول ہے جب اسے آتا ہوگا تو خود آ جائے گی۔ انسان کو زبردستی یا دواؤں کی مدد سے سونے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

اس صبح ناشتے کے بعد میرا کچھ آرام کا موڈ ہو رہا تھا اور میں ہینکنگ چیئر میں جمول رہا تھا کہ رومی آگئی۔ وہ آ کر میرے عیروں کے پاس قالین پر بیٹھ گئی اور مستی خیز لہجے میں بولی۔ ”دادا جان آپ کو کچھ پتا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے اعتراض کیا۔

”نومی کسی لڑکی کے چکر میں ہے۔“ رومی نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔ میں چونک کر سیدھا ہونگا۔

”کسی لڑکی کے چکر میں؟.... کیا مطلب؟“

”آپ لڑکی کے چکر کا مطلب نہیں سمجھتے دادا جان۔“ رومی نے انفسوس سے سر ہلایا۔

”مطلب تو سمجھتا ہوں لڑکی۔“ میں نے خفا ہو کر کہا۔ ”میرا مطلب ہے نومی اس قسم کا لڑکا نہیں ہے۔“

”نومی لڑکا ہے۔“ رومی نے سادگی سے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے نومی لڑکا ہے اس لیے کسی لڑکی کے چکر میں پڑ سکتا ہے۔“ میں نے کہا اور مجھے غصہ آنے لگا تھا میں اپنے پوتے کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”وہ آج کل موبائل پر چپ چپ کر باتیں کرتا ہے“

ایس ایم ایس کرتا ہے۔ پہلے میں اس کا موبائل پوز کر لیا تھی لیکن اب وہ اپنے موبائل کو ہاتھ بھی لگائے نہیں دیتا۔

”اگر وہ تمہیں موبائل نہیں دیتا ہے تو اس کا مطلب ہے تم اس پر اتنا بڑا الزام لگا دو۔“ میں نے ملامت سے کہا۔

”یہ الزام نہیں ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”آپ کے خیال میں، میں اتنی سی بات پر ایسا الزام لگا رہی ہوں۔ مجھے تو آپ کو بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔“

حالانکہ اس شرم نہیں غصہ آ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ نومی کو چکر لے آئے اور زبردستی میرے سامنے اقرار جرم کرائے۔ ”بس صرف اس وجہ سے تمہیں شک ہے یا تم نے اسے کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے یا کوئی اور شہوت بھی ہے۔“

وہ کسی قدر شرمندہ ہوئی۔ ”نہیں بس یہی وجہ ہے، میں نے اور تو کچھ نہیں دیکھا ہے۔“

”ٹھیک ہے تب میں معلوم کر لوں گا۔“ میں نے دوبارہ جھولنا شروع کر دیا۔

”دادا جان، آپ صرف معلوم نہیں کریں اسے سیدھا کریں۔ اس نے انجی یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے اور وہ پڑھنے کے بجائے ان چکروں میں پڑ گیا ہے۔“

”بیٹا جی پہلے یہ بات ثابت تو ہونے دو اس کے بعد اسے سیدھا کریں گے۔“

”آپ دیکھ لیجئے گا بالآخر یہی بات نکلے گی۔“ اس نے یقین سے کہا۔

میں نے شام کو عصر کے لیے جاتے وقت نومی کو بلایا۔ ”آؤ بر خوردار نماز پڑھنے چلتے ہیں۔“

وہ فوراً فکر مند ہو گیا اور فریادی لہجے میں بولا۔

”میں نے کیا کیا ہے دادا جان....؟“

”کچھ نہیں میرے بیٹے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”بہت دن ہو گئے دادا بپتے ساتھ نہیں نکلے ہیں۔“ لیکن اسے یقین نہیں آیا تھا۔ وہ راستے میں بھی پریشان رہا اور پھر اس نے یقین سے کہا۔ ”ضرور رومی نے کوئی لگائی بھجائی کی ہے۔“

”گوا چور کی ڈانگی میں کوئی تنکا ہے۔“

”بالکل بھی نہیں دادا جان۔“ اس نے جلدی سے

جواب دیا۔ نماز کے بعد ہم پارک کی طرف چلے گئے اور ایک بیچ پر بیٹھ گئے۔ نومی مضطرب تھا کہ ابھی میں اسے فردا کے ستاؤں کا اور اسے صفائی پیش کرنا پڑے گی۔ لیکن اس کے بجائے میں نے اس سے کپ شپ شروع کر دی۔ اس سے یونیورسٹی کا حال احوال لینے لگا اور درمیان میں اپنے زمانہ طالب علمی کے قصے بھی سناتا گیا۔ ذرا دیر میں اس کی پیشکش دور ہو گئی اور وہ بے فکری سے باتیں کرنے لگا پھر اس نے بتایا۔ ”دادا جان، ہمارا گروپ گرمیوں کی چھٹی میں ناردرن ایریا جانے کا پروگرام بنا رہا ہے۔“

”اچھا تم نے بتایا نہیں تھا؟“

”دادا جان ابھی سب سے چھپایا ہے خاص طور سے اس چیل رومی نے ورنہ وہ ضرور ٹانگ اڑائے گی۔ ماما اور پاپا کو بہکا دے گی اور مجھے اجازت نہیں ملے گی۔“

”بھلا کی آگئی۔“ بہکا دے گی.... یہ تو شیطان کا کام ہے۔“

”تو وہ کسی سے کم ہے۔“ نومی نے دانت پیسے۔

”اس کے ڈرے میں اپنے دوستوں سے بھی چھپ کر بات کرتا ہوں اور اسے اپنے موبائل کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا وہ میرے ایس ایم ایس پڑھ لے گی۔ ایک بار اسے میرے پروگرام کی ہینک پگنی تو وہ میری زندگی حرام کر دے گی۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے اس سے اتفاق کیا۔

”دادا جان، پلیز اسے مت بتائیے گا۔“ نومی نے احتجاج کیا۔

”تم فکر مت کرو بر خوردار اسے نہیں بتاؤں گا اور تم بے فکری سے تیاری کرو اگر اجازت کا مسئلہ ہوا تو میں تمہارے ماما پاپا کے فیصلے کو ویٹو کر دوں گا۔ رومی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ڈنکے کی چوٹ پر جاؤ۔“

نومی کا چہرہ چمک اٹھا۔ ”تھیک ہے دادا جان۔“

رات کو کھانے کے بعد رومی پر ہم ہی میرے سر پر موجود تھی۔ ”دادا جان وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔“

”بھئی مجھے تو چ لگ رہا ہے۔ وہ تمہارے خوف سے اپنا پروگرام چھپا رہا تھا۔“

”وہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ رومی نے ضدی لہجے میں پاؤں پیچ کر کہا۔ اس نے نومی کو اندر آیا۔

”یہ خود جھوٹی ہے دادا جان، بچپن سے میری جھوٹی شکایتیں کر کے مار پڑوائی آئی ہے اور اب بے عزتی کرانی ہے۔“

”تم ہو ہی اس قابل۔“ رومی غرائی۔

”دادا جان....“ نومی نے فریادی لہجے میں کہا۔ ”اب یہ میری کردار کشی پر آ رہی ہے۔“

”رومی۔“ میں نے تنبیہ کی۔

”سوری دادا جان۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میرا یہ مطلب نہیں ہے لیکن اس نے مجھ سے کیوں چھپایا؟“

”تم میری بزرگ ہونا جو تمہیں ہر بات بتاؤں اور اپنی جان عذاب میں ڈالوں۔“

اس سے پہلے کہ جھگڑا مزید بڑھتا میں نے دونوں میں صلح کرادی۔ رومی کو اب بھی یقین نہیں تھا لیکن وہ مجبور تھی جب میں دادا بپتا تو انہیں میری بات ماننا ہی پڑتی تھی۔ میں رومی کے اضطراب کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ پاگل لڑکی کو یوں پسند کرنے لگی تھی۔ دونوں بچپن سے ساتھ رہے ایک ساتھ کھلتے تھے اور ہر کھیل میں پارٹنر بننے لگے تھے۔ ایک طرح سے قدرت انہیں لائف پارٹنر کے طور پر تیار کر رہی تھی۔ نومی کا مجھے اندازہ نہیں تھا لیکن رومی خواب دیکھنے لگی تھی اور اسی وجہ سے نومی کے سلسلے میں اتنی حساس ہو رہی تھی۔ نومی کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ مگر رومی اپنی محبت اور محبت کے شک کی وجہ سے مجبور تھی۔ بہر حال، ان کا جھگڑا ختم ہوا تو انہوں نے ایک دوسرا موضوع تلاش کر لیا۔

”دادا جان.... کبھی آپ نے محبت کی ہے؟“

میں اس اچانک حملے سے گزبوا کیا تھا۔ سوال رومی نے کیا تھا۔ وہ اپنی جھجھلاہٹ کا رخ میری طرف موڑ رہی تھی۔ ”بھئی.... وہ تمہاری دادی سے کی تھی شادی کے بعد....“

”نہیں دادا جان، ہم شادی سے پہلے والی محبت کی بات کر رہے ہیں۔“ نومی نے رومی کا ساتھ دیا۔ بر خوردار اچھا صلہ دے رہے تھے جان بچانے کا۔ ان کے مشترکہ حملے سے بچنے کے لیے مجھے دادا بپتا پڑا تھا۔ میں نے لہجہ بدل کر کہا۔

”میرا خیال ہے یہ سوال آپ دونوں کو زیب نہیں دیتا، ٹھیک ہے ہم ہم دونوں والی بے تکلفی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ حداد بھول جائیں۔“

”سوری دادا جان۔“ دونوں ایک آواز ہو کر بولے

”گڈ“ میں نے کہا۔ ”آپ کا سوال اُدھار رہا اس کا جواب کبھی بعد میں دوں گا۔“ وہ دونوں خوش ہو گئے، نوی نے چمک کر کہنا چاہا۔

”اس کا مطلب....“ میں نے گھورا تو اس کی زبان بند ہو گئی۔ ”کوئی مطلب نہیں ہے اب آپ دونوں جانتے ہیں۔“

رومی اٹھارہ سال کی تھی اور گریجویٹن کے پہلے سال میں تھی۔ جبکہ نوی نے ابھی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ اس نے نہ جانے کتنے کورس کر رکھے تھے۔ اب وہ ایم سی ایس کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی وہ کسی سافٹ ویئر ہاؤس میں کام بھی کر رہا تھا۔ صبح یونیورسٹی جاتا تھا اور شام کو جاب پر چلا جاتا تھا۔ اس روز چھٹی تھی اس لیے وہ گھر پر تھا۔ رومی اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف بات کر جاتی تھی ورنہ نوی گھر میں ہوتا تو وہ بھی حد میں رہتی تھی۔ بات ان کی آپس کی چپقلش سے شروع ہوئی تھی لیکن اس نے میرے اندر سوئی برسوں پرانی چپقلش جگا دی تھی۔ اس وقت میں نے ان کو ٹال دیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا ایک بار دو بار ٹالنا جاسکتا تھا مستقبل ٹالنا بہت مشکل تھا۔

اگرچہ میں نے سوچ لیا تھا کہ انہیں ممکن حد تک ٹالنا رہوں گا یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بھول جاتے۔ مگر ایک فون کال نے ٹرڈ کر دی۔

میں عصر کی نماز پڑھ کر گھر آیا کیونکہ چھٹی کا دن تھا اور سب گھر میں موجود تھے۔ لان میں چائے پی جا رہی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا چند منٹ بعد رومی اندر سے کارڈ لیس لے کر آئی۔ ”دادا جان آپ کی کال ہے، فرانس سے کوئی سلویا بات کر رہی ہیں۔“

فرانس سے کوئی سلویا بات کر رہی تھی یہی چونکا نے کے لیے کم نہیں تھا لیکن اس سے زیادہ وہ لوگ میرے تاثرات دیکھ کر چوک گئے۔ میں نے معتبر لہجے میں کہا۔ ”سلویا....“ اور رومی سے کارڈ لیس لے لیا۔ ”ہیلو... بون بات کر رہا ہے۔“

”ظالم اتنی جلدی بھول بھی گئے۔“ وہی شوخ کھنکشی آواز آئی جسے میں نے تقریباً نصف صدی قبل پہلی بار سنا تھا۔ ”تم نے تو کہا تھا مارتے دم تک نہیں بھولو گے۔“

”سلویا.... یہ تم ہو۔“ میں نے بے یقینی سے کہا اور بچوں سے ذرا دور چلا گیا، اس کم بخت کارڈ لیس کی آواز کچھ زیادہ ہی تیز تھی اور پھر وہاں موجود سب لوگ کچھ زیادہ ہی ہمتن گوش تھے۔ اوپر سے سلویا کی بے تکلفی.... وہ آواز بھی ویسی ہی تھی۔ جذبول کے اظہار میں ہر جوش اور سرباک، حالانکہ یہ قصہ نصف صدی پرانا ہو گیا تھا۔

”ہاں، بیچ ڈیز میں سلویا ہوں.... وہی سلویا جو آدھی صدی پہلے تمہاری محبوبہ تھی۔“

وہ کم بخت فون پر ہی سارے انکشافات کرنے پر تھی ہوئی تھی شکر ہے اب میرے آس پاس کوئی نہیں تھا، پھر میں نے دیکھا رومی غائب تھی اور وہ بیٹھنا اندر کسی ایکسٹینشن سے کان لگائے کھڑی ہو گئی۔ ”سلویا اب تم کہاں ہو اور اتنے عرصے بعد میری یاد کیسے آئی؟“

”میں فرانس میں ہوں، گرینی بنی گئی ہوں اور اب مرنے سے پہلے ایک بار پھر تم سے ملنا چاہتی ہوں اور ان جگہوں کو دیکھنا چاہتی ہوں جہاں میں نے تین سال گزارے تھے۔“

میرا دل رک گیا۔ ”مرنے سے پہلے.... کیا مطلب؟“

”مطلب یہ فرانس میں عورتوں کی ایوریج عمر ہے اوپر جا چکی ہوں اور کسی وقت بھی خاتمہ ہو سکتا ہے۔“ وہ ہنسی۔ ”تم فکر مت کرو مجھے کچھ ہوا نہیں ہے۔“

”تو تم یہاں آ رہی ہو؟“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”کب.... اور تمہیں میرا یہ نمبر کہاں سے ملا؟“

”انٹرنیٹ سے.... آن لائن فون ڈائریکٹری میں تمہارا نام ڈالا تو یہ نمبر نکل آیا۔ میں نے نمبر ملایا تو تم سے بات ہو گئی.... دیکھا آج کل کسی کو تلاش کرنا کتنا قدر آسان کام ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے بے خیالی سے کہا۔ ”جیسے نصف صدی پہلے کی کوکھو دینا کس قدر مشکل کام تھا۔“

”قوت ملی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ پھر ہنسی۔ ”ہم نے زندگی سے اپنا اپنا شیئر لے لیا ہے اس لیے شکوہ کس بات کا؟“

”کل کی قلائت ہے۔“

”تم نے سیٹ پہلے بک کر لی تھی؟“ میں نے کسی نہ رحمت سے کہا۔

”ہاں.... اگر تمہارا نمبر نہیں ملتا تو میں تمہیں وہاں کرعاش کر لیتی۔ کراچی کوئی بہت بڑا شہر تو نہیں ہے۔“ وہ کرکتی تھی وہ اتنی ہی خود اعتماد تھی۔ ہر کام تیزی سے اور اچانک کرنے والی۔ وہ ایک تیز اور ترقی کا عزم رکھنے والی قوم کی فرد تھی۔ جتنی دیر میں ہم سوچتے ہیں اتنی دیر میں وہ کام کر جاتی تھی۔ سلویا نے کال کاٹ دی تھی میں اس کی طرف آیا۔ سب منتظر تھے کہ میں انہیں سلویا کے بارے میں بتاؤں۔ ”سلویا میری یونیورسٹی فیلو تھی، ایکسچینج پروگرام کے تحت فرانس سے ایم فل کرنے یہاں آئی تھی۔ میرے ساتھ ہی ماسٹر میں داخلہ لیا تھا۔“

”آپ نے بھی ذکر نہیں کیا بابا جان؟“ شفیق نے کہا۔ ”یونیورسٹی میں بے شمار فیلوز تھے جن کا میں نے تم سے ذکر نہیں کیا اس وقت غیر ملکی طلباء بھی بڑی تعداد میں آتے تھے۔“

شفیق اور فصیح تو مطمئن ہو گئے ان کی بیویاں بھی سادہ تھیں۔ اس طرح دوسرے بچے بھی آسانی سے مان جانے والے تھے لیکن مجھے یقین تھا رومی اور نوی اتنی آسانی سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ میری توقع کے عین مطابق وہ رات کے کھانے کے فوراً بعد نازل ہو گئے تھے۔ رومی نے چالاکی سے کام لیا تھا اور میرے لیے پسندیدہ الائچی والا سبز قہوہ بنا کر لے آئی تھی۔ ”دادا جان، یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔“

”دادا جان، آپ کیسے ہیں؟“ نوی نے سعادت مندی سے پوچھا۔

وہ دونوں مشترکہ طور پر مجھے قہوہ پلانے اور میری خدمت دریافت کرنے نہیں آئے تھے۔ ان کا مقصد سلویا کے بارے میں جانا تھا اور وہ اس سے میرے رشتے کا کوئی لگانے آئے تھے۔ مجھے ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہائے کیونکہ میں خود ہتھیار ڈالنا چاہتا تھا۔ نصف صدی کے اس بوجھ میں کسی کو شریک کرنا چاہتا تھا اور اپنے بچوں سے بہتر شریک اور کون ہو سکتا تھا؟

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ کے لان میں بیٹھا تھا۔ یہ شعبہ اردو کی عمارت تھی۔ میں نے اردو ادب کے لیے ماسٹر میں داخلہ لیا تھا۔ ایک آمر نے ملک کے اقتدار پر شب خون مارا تھا اور پھر دارالحکومت عوام سے دور لے گیا تھا۔ ہنگے تازہ تازہ ختم ہوئے تھے اور شہر کی فضاؤں میں اُداسی تھی۔ میں گریجویٹن کے بعد فارغ تھا لیکن نوکری کے بجائے میں نے ماسٹر میں داخلہ لے لیا۔ کلاسز شروع ہوئے ایک ہفتہ نہ تھا اور نئے طلباء کی آمد جاری تھی۔ ان میں غیر ملکی طلباء اور طالبات بھی تھے جو اردو سیکھنے آئے تھے۔ میرے ساتھ بیٹھے عمار حسن شکوہ کر رہے تھے کہ مقامی لڑکیوں کو تو چھوڑو غیر ملکی خواتین میں بھی ایک ڈھنگ کی صورت نہیں ہے۔ اسی لمحے ہماری توجہ اس غیر ملکی خاتون کی طرف گئی۔ اس کا رنگ و روپ بتا رہا تھا کہ وہ غیر ملکی ہے۔ اس نے سفید اسکرٹ اور اسی رنگ کا پلاؤز پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ پنڈلیوں تک آ رہا تھا اور پلاؤز ہاف سلو تھا۔ بہت دل کش نقوش اور نہایت مناسب جسامت تھی۔ گھٹھکریالے بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں موجود بیک بتا رہا تھا وہ بھی طالبہ تھی اور شاید ہمارے شعبے کی تھی۔ ورنہ اس جگہ کیوں پائی جاتی؟ میں نے عمار سے کہا۔

”لو بھائی تمہارا شکوہ دور ہو گیا۔“

”ممکن ہے یہ ہمارے شعبے کی نہ ہو؟“ کمال شاہ نے امید ویاس کے ساتھ کہا۔

”بھائی معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے اسے تسلی دی اور پھر کہا۔ ”بلکہ ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔“

وہ ہماری طرف ہی آ رہی تھی۔ شاید اسے کسی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ وہ پہلے بھی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب ہے نئی تھی۔ اس نے پاس آتی ہی پُر زور انداز میں ”السلام علیکم“ کہا۔ ہم سب نے اتنا ہی ہرجوش جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے فرامیسی میں لمبی چوڑی بات کی۔ فرامیسی مختصر بات نہیں کر سکتے۔ ان کا شمار دنیا کی چند باتونی اقوام میں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کی فرامیسی ہمارے سروں سے گزر گئی۔ عمار نے کہا۔ ”یہ تو فریج ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”تو فریج....“

”میں تو خود اردو جانتا۔“ اس نے انک انک کر کہا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”اب ہم آپ کی مدد

www.pdfbooksfree.pk

اگست 2012

ماہنامہ سرگزشت

وہ ہیں بیٹھی اور اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام سلویا ہنار تھا اور وہ فرانس کے شہر لیون سے آئی تھی۔ لیون یونیورسٹی اور ہماری یونیورسٹی کے درمیان طلبہ کا تبادلہ ہوا تھا وہ اسی کے تحت یہاں آئی تھی۔ اس نے اردو ادب کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ پڑھنے کی حد تک اسے اردو اتنی ہی آتی تھی جتنی کہ ہمیں آتی تھی اور اس نے اچھا خاصا اردو ادب پڑھ رکھا تھا۔ عمار حسن نے شاید امتحان کے لیے اس سے کچھ سوالات کیے تو اس نے اتنے مفصل جواب دیے کہ ہم اس کے دعوے کے قائل ہو گئے۔ وہ صرف بولنے میں کمزور تھی۔ وہ ایک دن پہلے یہاں آئی تھی اور غیر ملکی طلبہ کے ہاسٹل میں رکی تھی۔

”میں چاہتی ہوں مجھے چند اچھے دوست مل جائیں، جو یہاں کے معاملات میں میری مدد کریں اور مجھ سے دوستی میں جس کی غرض نہ رہیں۔“ یہ بات اس نے اتنی سادگی سے کہی کہ ہم سب بغلیں جھپکتے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ایک صاف گو معاشرے کی فرد تھی اس لیے یہ بات کہہ گئی۔ ہمارے ہاں کوئی لڑکی بھی آزاد خیال کیوں نہ ہو اس قسم کا سوال لڑکوں سے نہیں کر سکتی تھی۔ بے شک وہ دل میں خیال بھی کرتی ہو مگر شرم و حیا کے ساتھ ہماری مخصوص معاشرتی منافقت بھی اس کی زبان بند کر دیتی۔ یہی منافقت ہم لڑکوں میں بھی تھی۔ ہم زبان سے لڑکیوں کو کوئی اور کلاس فیو قرار دیتے لیکن ہمارے نزدیک ان کی اولین حیثیت ایک عورت کی ہوتی۔ سلویا کی بات نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”میں سب کی بات نہیں کرتا لیکن اپنی حیثیت میں یقین دلاتا ہوں کہ اس حوالے سے تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

وہ مسکرائی تو اس کے بہت خوب صورت اور چمکیلے دانت نمایاں ہونے لگے۔ عمار کچھ دیر بعد بولا۔ ”مس سلویا تم نے بہت کڑی شرط لگا دی ہے لیکن ہم بھی پاکستانی ہیں جب کسی سے عہد کرتے ہیں تو جان دے کر بھی نبھاتے ہیں۔“

بالشبہ وہ حد درجے خوب صورتی رکھتی تھی۔ اپنے نقوش میں اور اپنے بدن میں۔ لیکن اس روز ہم تینوں نے اس سے جو عہد کیا تھا اس پر آخر تک قائم رہے۔ وہ خود بخود

... ہمارے گروپ کا حصہ بن گئی۔ ہم تینوں کے ساتھ واحد لڑکی تھی۔ پھر غیر ملکی اور دانش بھی تھی اس لیے ہمیں حاسدوں کی بہت ساری بکواس بھی سنتا پڑی تھی۔ ہماری ہماری لڑائی ہوتی اور ایک بات تو کمال شاہ نے ایک لڑکی سے سرچھاڑ دیا تھا جس نے سلویا کے حوالے سے نہایت ناگوار بات کی تھی۔ حالانکہ چند دنوں میں ہم جان گئے تھے کہ وہ کردار کی اتنی ہی شریف تھی جتنی ہماری کوئی لڑکی ہو سکتی ہے۔ پہلے دن وہ اسکرٹ پہن کر آئی تھی کیونکہ اس کے پاس مقامی لباس نہیں تھے۔ اگلے دن ہم نے اسے لے جا کر سب سے پہلے شاپنگ کرائی اور اسے لباس بھی دلوائے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ مقامی لباس میں ہی یونیورسٹی آئی۔

وہ ایک آزاد معاشرے کی پروردہ تھی اس لیے اس کی چال ڈھال اور ہنسنے بولنے کا انداز ویسا ہی آزادانہ تھا۔ یہ بات ہمارے ہاں ان لوگوں کو ختم نہیں ہوتی تھی جو اپنے ذاتی کردار کی گندگی نظر انداز کر کے یہی گندگی منہ کے راستے دوسروں پر اچھالتے تھے۔ ان کے نزدیک سلویا ایک آبرو باختہ لڑکی تھی اور اس کا کردار ٹھیک نہیں تھا۔ لڑکیوں کے بجائے تین لڑکوں سے گیدرنگ کر کے اس نے لڑکیوں کو بھی اپنے خلاف کر لیا تھا اس لیے اب اسے سوائے ہم تینوں کے کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ ابا ششم کے لڑکے اس کی قربت حاصل کرنا چاہتے تھے اور جب انہیں ناکامی ہوتی تو وہ گلیا حرکتوں پر اتر آتے تھے شروع میں اس وجہ سے بہت جھکڑے ہوئے، پھر سلویا نے ہمیں روک دیا۔

”سنو، جب میں پروا نہیں کرتی ہوں تو تم کیوں کرتے ہو؟“

”کیونکہ ہمارے ہاں عزت کا مسئلہ زندگی و موت کا مسئلہ ہوتا ہے۔“ کمال شاہ نے وضاحت کی۔ ”اس پر خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں اور بعض اوقات تو نسل در نسل نقل ہوتے ہیں۔“

سلویا حیران ہوئی تھی۔ ”میرے خدا... لیکن ایسا یقیناً تم اپنی عورتوں کی عزت کی وجہ سے کرتے ہو۔ لیکن میں پاکستانی اور مسلمان نہیں ہوں بلکہ کرچن اور فرانسیسی ہوں ہمارے ہاں عزت کا معیار تمہارے ہاں سے مختلف ہے۔“ ”یقیناً ایسا یہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ہم فرانس

میں ہوتے اور وہاں تم سے دوستی ہوتی۔ کوئی تمہارے اور ہمارے بارے میں اس قسم کے جملے کہتا تو شاید جھکڑے کی بات نہیں آتی۔ وہاں ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں ایسی باتوں کو چچڑا اسی سے لے کر دی کی تک اہمیت دیتے ہیں۔“

”مگر تم لوگ میری خاطر جھکڑا مت کرو۔“ اس نے مسکرائے۔ ”میں چند سال کے لیے آئی ہوں پھر چلی جائی گی۔ تم لوگوں کو نہیں رہنا ہے۔“

”لیکن تم کیا تاثر لے کر جاؤ گی کہ ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں تم لوگوں کے ساتھ خود کو اتنا ہی محفوظ تصور کرتی ہوں جتنا اپنے ملک اور شہر میں تھی۔“ سلویا کے اصرار پر ہم نے لوگوں کی باتوں کا نوش برا چھوڑ دیا۔ اگرچہ یہ بہت مشکل کام تھا پہلے ہمارے پرنسپل سے زبانیں ذرا خاموش رہتی تھیں خاص طور سے کمال سے سب ڈرتے تھے وہ ڈر وہ خاندان سے تھا اور پھر ہاتھ پھوٹ بھی تھا۔ کم میں اور عمار بھی نہیں تھے مگر ہم پہلے زبان سے سمجھاتے تھے۔ اب ہوا یہ کہ ہم نے لوگوں کی باتوں کا نوش لینا چھوڑا تو ان کی زبانیں مزید مکمل کیں اور پہلے ذرا ڈر کر چپ رہتے تھے اب وہ بھی بولنے لگے۔ بعض اوقات تو ہمارے لیے خط کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اگر سلویا نے قسم نہ دے رکھی ہوتی تو شاید اسپتال اور تھانے تک کی نویت آ جاتی۔ پھر باتوں کا یہ طوفان رفتہ رفتہ ختم ہوا۔ دوسرا سمر ختم ہوتے ہوئے لوگ تقریباً چپ ہو گئے تھے۔

اچانک پتا چلا کہ کمال کی شادی طے کر دی گئی ہے۔ اسے خود اچانک پتا چلا تھا اس نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ان کے خاندان میں شادیاں وفات کی طرح ہوتی ہیں اچانک اور ناگہانی۔ کمال کے لیے اس کی بچا کی بیٹی لی گئی تھی جو عمر میں اس سے چار سال بڑی تھی اور اس نے سکول کا مٹ بھی نہیں دیکھا تھا۔ سلویا حیران تھی۔ ”تم اس سے شادی کر لو گے؟“

”مجبوری ہے بابا کا فیصلہ ہے۔“ سلویا کے لیے یہ سب ناقابل یقین تھا۔ یہاں ماں پاتے بڑے لڑکے کی شادی اس سے پوچھتے بغیر اور اس کی مرضی کے خلاف کر رہے تھے اور وہ چون بھی نہیں کر رہا

تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ تو اس سے کہیں زیادہ ہوسکتا تھا۔ سلویا کمال کی شادی میں گئی تھی۔ اس نے وہاں بہت انجوائے کیا تھا مگر اسے مقامی رسم و رواج خاص طور سے عورتوں کی حالت اور بے بسی نے شاک بھی پہنچایا تھا۔ واپسی میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

”ہماری آزادی۔۔۔“

”یہ آزادی ہے؟“ وہ تعجب سے بولی۔

”ہاں مردوں اور بڑوں کو سب کرنے کی آزادی۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے ہاں شخصی آزادی ہے تو ہمارے ہاں خاندانی آزادی ہے۔ وہاں تم اپنی بربادی کا فیصلہ خود کرتے ہو اس لیے مطمئن ہو۔ یہاں ہماری بربادی کا فیصلہ دوسرے کرتے ہیں اس لیے ہم غیر مطمئن ہیں۔“

سلویا سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، بربادی تو ہر صورت ہے۔ ہمارے ہاں بھی لوگوں کے ہاتھ آخر میں خسارہ ہی آتا ہے۔“

”ہمیں بس یہ اطمینان ہے کہ ہمارے ساتھ جو ہوا اس میں ہمارا قصور کم ہے۔ ہم کسی کو الزام تو دے سکتے ہیں۔“

اس نے سر دھڑا بھری۔ ”ہم کسی کو الزام نہیں دے سکتے۔“

”شخصی آزادی کے بہت سے فوائد ہیں تو بہت سے نقصانات بھی ہیں۔ جیسے معاشرتی پابندیوں کے بہت سے فوائد ہیں تو نقصانات بھی ہیں۔“

”لیکن میں نے اتنی شدید پابندی کا سوچا بھی نہیں ہے۔“ وہ جھرمجھری لے کر بولی۔

”کمال شاہ اور اس کا خاندان صرف ایک مثال ہے ورنہ ہمارے ہاں اس سے بھی بدتر مثالیں ہیں اور تمہیں بہت سے معتدل خاندان بھی ملیں گے جہاں پابندی اور آزادی دونوں ہوتی ہیں۔“

”جیسے تمہارا گھر ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم نے بتایا کہ تمہارے والد علی گڑھ سے پڑھے ہوئے ہیں اور انہوں نے پاکستان موومنٹ میں بھی حصہ لیا تھا۔“

”اسی وجہ سے وہ ہجرت کر کے یہاں آنے پر مجبور ہوئے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”تمہارے ہاں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں؟“

”ہاں، میری دونوں بہنیں کالج میں پڑھ رہی

ہیں۔ تعلیم کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں تبدیلی آ رہی ہے۔“

اس نے ہنسی کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم مجھے اپنے گھر لے چلو گے۔ تم نے آج تک مجھے اپنے گھر چلنے کو نہیں کہا۔“
مجھے شرمندگی ہوئی۔ یہ حقیقت تھی میں نے ایک بار بھی اسے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا۔ ”دراصل ہم روز ہی مل لیتے ہیں اس لیے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ لیکن اب لے چلوں گا۔ اس اقرار کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”میں ضرور چلوں گی۔“ وہ خوش ہوئی۔

اس سے پہلے بھی مجھے کئی بار خیال آیا کہ اسے اپنے گھر لے جاؤں لیکن اماں بی بی کا سوچ کر ہمت جواب دے جاتی۔ جتنی قدامت کمال شاہ کے سارے خاندان میں تھی اتنی قدامت اکیلی اماں بی بی میں عورتوں کے حوالے سے تھی۔ ان کا تعلق ایک روایتی نواب خاندان سے تھا جس میں مرد و شترے بہار ہوتے تھے لیکن عورتوں پر کسی غیر محرم کی نظر پڑ جانا قیامت سے کم نہیں ہوتا تھا اور اس چیز کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ دین تو مرد و عورت کے لیے یکساں ہے۔ مگر اماں بی بی کے خاندان میں پردے اور غیر مردوں سے میل جول کے حوالے سے اس کا اطلاق صرف عورتوں پر ہوتا تھا۔ اماں بی بی اس ماحول کی تربیت یافتہ تھیں۔ پھر ان کی شادی ابا جان سے ہو گئی جو عورتوں کے لیے نہایت روشن خیال تھے اور عملی طور پر سرسید کی تحریک کے مبلغ تھے۔ انہوں نے تو اماں بی بی کی دوبارہ تربیت کرنے کی کوشش کی یعنی انہیں پڑھانا چاہا تھا لیکن اماں بی بی نے ان کی ساری کوششیں ناکام بنا دیں۔ تھک ہار کر ابا جان نے اپنی کوششوں کا مرکز اپنی اولاد کو بنا لیا۔ انہوں نے ہماری تعلیم و تربیت پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی اور آج ہم جس مقام پر تھے وہ سب ابا جان کی محنت اور تربیت کا اثر ہے۔ میرے دو بڑے بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہت اچھے مقام پر تھے۔ اسی طرح میری دونوں بہنیں کالج میں پڑھتی تھیں۔ جب ابا جان نے انہیں اسکول میں داخل کر لیا تو اماں بی بی نے بہت واڈا بھایا۔ لڑکیوں کی تعلیم انہیں گوارہ نہیں تھی لیکن ابا جان نے ان کی ایک نہیں سنی۔ تعلیم کے معاملے میں اماں بی بی کی نہیں چلی تھی لیکن گھر تو ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے انہوں نے مخصوص ماحول بنایا تھا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو گھر میں نہایت مؤدب اور

تسلطی بن کر رہنا پڑتا تھا۔ لڑکیوں پر پابندیاں شدید تھیں جن میں اوڑھنے پہننے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، سونے جانے پر نظر رکھی جاتی تھی۔ اماں بی بی کی سخت مزاجیہ کی طرح بیٹیوں کی عمرانی کرتی تھیں۔ ابا جان ان کی پابندیوں پر جبر ہوتے تھے لیکن ایک حد سے زیادہ ان کے معاملے میں دخل بھی نہیں دے سکتے تھے، ورنہ اماں بی بی ہتھے سے اکھڑ جاتی تھیں اور ان کا نوابی خون جوش میں آ جاتا تھا۔ انہوں نے ابا جان سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر انہوں نے لڑکیوں کی تربیت کے معاملے میں مداخلت کی تو ان کا مراہوامتدینہ دیکھیں گے۔

یہ سب بتانے کا مقصد اسے گھر کے ماحول کو بیان کرنا ہے جہاں سلویا جانے کی بات کر رہی تھی۔ اماں بی بی غیر مسلموں کے معاملے میں اتنی سخت تھیں کہ گھر میں آنے والا جعدار ایک حد سے آگے نہیں آ سکتا تھا اور وہ غلطی سے بھی کسی چیز کو چھو لینا تو وہ پھر گھر میں نہیں رہتی تھی۔ غیر مسلموں کے بارے میں ان کا پختہ عقیدہ تھا کہ وہ مجسم ناپاک ہیں۔ سلویا کے ساتھ گھر میں جو ہوتا اس کا مجھے اندازہ تھا لیکن اب یہ میری اتنا مسئلہ نہیں تھا اور میں خود سلویا کو دعوت دے چکا تھا اور وہ قبول بھی کر چکی تھی۔ میں نے ابا جان سے بات کی۔ وہ بھی متشکر ہو گئے۔ ”بیٹا مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن تم اپنی ماں کو جانتے ہو۔“

”جی ابا جان... لیکن میں اسے زبان دے چکا ہوں اب یا تو وہ یہاں آئے گی یا پھر میں کہیں اور چلا جاتا ہوں اور اسے وہاں بلا لوں کہ یہ میرا گھر ہے۔“

”خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ ابا جان نے سوچ کر کہا۔ ”میں تمہاری ماں سے بات کرتا ہوں۔“

حسب توقع اماں بی بی یہ سنتے ہی مجھے سے اکھڑ گئی تھیں کہ میرے ساتھ پڑھنے والی ایک غیر ملکی لڑکی گھر آ رہی تھی۔ انہوں نے فوراً انکار کر دیا۔ ”وہ اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔“

”اماں بی بی۔“ میں نے ملتی لپکتی لپکتی کہا۔ ”وہ بہت اچھی لڑکی ہے بالکل ہماری مشرقی لڑکیوں کی طرح۔“

”مشرقی لڑکی... غیر مردوں کے ساتھ پڑھ رہی ہے اور یہاں اکیلی رہتی ہے۔“ اماں بی بی نے طنز کیا۔ ”پھر بھی شریف ہے۔“

”اماں وہ فراہمی ہے اور وہاں کے معاشرے کے

”میرے شریف ہی ہے۔“
”میرے جیسے جی اس گھر میں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے۔“ اماں بی بی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
”ٹھیک ہے۔“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”اللہ آپ کا سایہ بچے ہمارے سر پر رکھے لیکن اب یہ میری زبان کا معاملہ ہے میں اسے گھر بلا چکا ہوں۔ اگر یہ گھر آپ کا ہے تو میں اپنے لیے الگ گھر کا بندوبست کرتا ہوں۔“
اماں بی بی فکر مند ہو گئیں۔ ”تو گھر چھوڑ کر چلا جائے گا؟“

”مجبوری ہے اماں بی بی... اس مقدس جگہ کوئی ناپاک ہستی قدم نہیں رکھ سکتی ہے حالانکہ ہمارا مذہب چھوٹ جات نہیں سکھاتا ہے اور غیر مسلموں سے تو ہمارے جی بھی مل جوں رکھتے تھے۔“

اماں بی بی نرم پڑ گئیں۔ ”وہ تو الگ ہی ہستی ہیں۔“
”اماں بی بی ہم مسلمانوں کا یہ تو الیہ ہے کہ جب اسلام پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو ہم انہیں الگ ہی ہستی قرار دیتے ہیں حالانکہ وہ ہی ہمارے لیے اسلام لائے گئے۔ مگر آپ نے فیصلہ سنا دیا ہے اور مجھ میں سرتابی کی مجال نہیں ہے۔“

”اب تم اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ اپنے فیصلے خود کر لے گے۔“ اماں بی بی غصے سے بولیں۔
”میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر رہا ہوں۔“

ابا جان نے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں وہاں سے مل آیا۔ کچھ دیر میں ابا جان نے مجھے طلب کیا۔ ”تمہاری ماں ان کی ہے لیکن اس کی شرط ہے کہ وہ نشست گاہ تک نہ دور رہے گی اور گھر کی کوئی عورت اس سے نہیں ملے گی۔“

”یہ تو گھر بلا کر بے عزتی کرنے والی بات ہے۔“
”اس نے احتجاج کیا۔“ اس سے تو بہتر ہے کہ میں اسے خانہ انکار کر دوں۔“

بڑی مشکل سے اماں بی بی مامیں کہ وہ گھر بھی دیکھ لے گی اور بھوں سے بھی لے گی۔ اماں بی بی نے اپنے لیے صرف ایک اجازت دی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اتنا کہ بہت تھا۔ سلویا کو گھر لانے سے پہلے میں نے ڈھکے پڑھنے میں اپنے گھر کے ماحول کے بارے میں بہت

کچھ بتا دیا تھا، ویسے وہ کمال شاہ کا گھر بھی دیکھ چکی تھی اس لیے اس نے خاص زور دیا تھا۔ حالانکہ کمال شاہ کے گھر میں اسے پوری عزت کی تھی اور وہاں عورتوں نے بھی اس کی خوب آؤ بھگت کی تھی۔ لیکن یہاں اماں بی بی کی طرف سے خدشہ تھا کہ ان کا رویہ اسے دل برداشتہ کرے گا۔ اماں بی بی کی وجہ سے بہنیں بھی اس سے ٹھیک سے نہیں ملیں گی۔ بہر حال، اسے گھر لانے کی اجازت مل گئی تھی۔ یہی بڑی بات تھی۔

اقرار کو میں اسے لینے ہاسٹ پہنچا۔ وہ تیار تھی مجھے حیرت ہوئی جب میں نے اسے فراک اور چوڑی دار پاچا لے کے ساتھ بڑی سی چادر میں لپیٹ لیا اور اس نے چادر اس طرح اوڑھ لی تھی کہ سوائے اس کے چہرے کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اسے لے کر گھر پہنچا تو وہ سب سے پہلے اماں بی بی کو سلام کرنے لگی۔ دونوں بہنیں اسے اندر لے گئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ دس پندرہ منٹ میں ہی واپس آ جائے گی اور پھر میری بہنوں کے ساتھ رہے گی۔ جس کی اماں بی بی نے بڑی مشکل سے اجازت دی تھی۔ میں جان بوجھ کر اسے ذرا دیر سے لایا تھا تاکہ وہ پھر کے کھانے کے بعد میں جلد اسے واپس لے جا سکوں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ خود بھی زیادہ دیر وہاں رکنا پسند نہیں کرے گی کیونکہ اسے محسوس ہو جائے گا کہ یہاں اسے دل سے خوش آمدید نہیں کہا گیا ہے۔

مگر آدھے گھنٹے بعد میری چھوٹی بہن کوثر میرے کمرے میں آئی۔ اس کے چہرے پر بڑے شریہ قسم کے تاثرات تھے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”بھائی یہ آپ کس جادوگر کی کو لے آئے ہیں۔“
”کیوں خیریت؟“

”اس نے اماں بی بی کو چند منٹ میں یوں قابو کیا ہے کہ اب وہ اسے اپنے پاس سے اٹھنے نہیں دے رہی ہیں، صدقے واری جا رہی ہیں۔“

کوثر کے ساتھ اسامی آ گئی۔ وہ اپنی ہنسی روک رہی تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”بیٹا جان مجھے تو کوئی اور ہی پکڑ لگ رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے اسے گھورا۔
”کہیں آپ کسی خاص مقصد سے تو نہیں لائے ہیں ان صاحبہ کو۔“

”تم دونوں چڑیلوں کے دماغ میں بس اتنی سی بات
اسکتی ہے۔“ بھی وہ میری یونیورسٹی فیلو ہے اور بس۔“
سلویانے کھانا بھی عورتوں والے جسے میں کھایا۔
اس پر مجھے مزید حیرت ہوئی تھی کہ اماں بی نے اس کے
ساتھ بیٹھ کر کھا کیسے لیا۔ کھانے کے بعد بھی وہ خاصی دیر
اماں بی کے ساتھ رہی مگر کوثر اور اماں بھی اس کے ساتھ لگی
رہی تھیں۔ جب وہ جانے لگی تو اماں بی نے اسے سو روپے
کے ساتھ ایک سوٹ، ایک چادر اور ایک چپل تحفے میں دی
تھی۔ اماں اور کوثر نے اسے چوڑیاں اور کچھ جیولری گفٹ کی
تھی۔ وہ بہت خوش تھی، سارے راستے وہ میرے گھر
والوں کی تعریف کرتی رہی تھی۔ یونیورسٹی میں اتر کر میں
اسے ہاسٹل تک چھوڑنے گیا۔ رکشے میں شور کی وجہ سے
بات نہیں ہوئی تھی یہاں میں نے پوچھا۔ ”اماں بی اور
دوسرے تم سے ٹھیک سے ملے؟“
”وہ اتنی محبت سے ملے کہ میں بتا نہیں سکتی۔“ اس
نے سادگی سے کہا۔ ”جب اماں بی نے مجھے گلے لگایا تو پتا
نہیں کیا ہوا میں خود پر قابو نہیں رکھ سکی رودی، پھر تو انہوں
نے مجھے گلے لگا کر اتنا پیار کیا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ شاید اس
لیے کہ میری ماما کا اس وقت انتقال ہو گیا تھا جب میں
صرف تین سال کی تھی۔ مجھے پاپائے پالا میں نے اماں بی کو
اپنے بارے میں بتایا۔ جب انہیں پتا چلا کہ میں نے بھی نہ تو
شراب پی اور نہ کبھی سو کر گوشت کھایا تو وہ بہت خوش ہوئی
تھیں۔ انہوں نے میرے لباس کی بھی بہت تعریف کی۔“
جب میں گھر واپس آیا تو میں نے اماں بی کو اس کی
تعریف کرتے پایا کہ وہ فرانس جیسے آزاد خیال ملک کی لڑکی
ہونے کے باوجود کتنی باوقار ہے کتنی اچھی طرح خود کو
ڈھک چھپا کر آئی تھی۔ شکل صورت کی کتنی اچھی ہے۔ اپنی
خوب صورتی کو کس طرح سنہیال کر رکھتی ہے۔ آج کل کی
لڑکیوں کی طرح نمائش کرتی نہیں پھرتی ہے۔ میں نے
اماں بی سے پوچھا نہیں کہ کیا وہ دوبارہ اس گھر میں آسکتی
ہے۔ انہوں نے خود مجھ سے کہا۔ ”سنجھ اسے کہنا اس کا جب
دل چاہے یہاں آجایا کرے، اب یہ اس کا اپنا گھر ہے۔“
”اماں بی، وہ کرشناں ہے۔“ کوثر نے دبی زبان
میں کہا تو اماں بی نے اسے گھورا۔
”تو اپنی زبان بند رکھ۔“
میں نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔ ”ٹھیک ہے بی اماں“

میں اسے کہہ دوں گا۔“
ان دنوں ہمارا فائل سسٹر چل رہا تھا اس کے بعد
میرا ارادہ تو کوئی نوکری کرنے کا تھا۔ سلویا نے غلغلہ مچا دیا
تین سال کے اسکا لرشپ پر آئی تھی۔ کمال شاہ نے ہمارے
اُدھورا چھوڑ دیا تھا اور تیسرے سسٹر میں ہی اپنی نئی نوکری
دہن کے پاس چلا گیا تھا اس کا کہنا تھا جب اس کا دل بھر
جائے گا تو وہ دوبارہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لے گا۔ عمار
حسن بھی وقت گزاری کے لیے پڑھ رہا تھا۔ اس کے باپ
کی ٹیکسٹائل مل تھی۔ اس کے بعد سلویا اور مجھے موقع نہیں ملا
تھا کہ اسے اپنے ہاں لے جاتا۔ ہمارے فائل سسٹر ہو گئے
جس دن ہم نے آخری پیپر دیا سب ہی اداس تھے۔
کنینٹن میں بیٹھے جائے اور سمو سے کھاتے ہوئے سلویانے
شکوہ کیا۔ ”میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔“
”ایسا نہیں ہے تم ہم سے ملنے آتے رہیں گے۔“
عمار نے اسے قلمی دی۔ اس نے قلمی میں سر ہلایا۔
”جھوٹ مٹ بولو تم اپنے باپ کے دفتر میں بیٹھو
اور شام کو کلب چلے جاؤ گے جہاں حسین لڑکیوں کے
جمبرٹ میں تمہیں یاد بھی نہیں رہے گا کہ سلویا نام کی کوئی
دوست بھی ہے۔“
عمار ٹھیک گیا کیونکہ سچ سچ اس کا ارادہ ایسا ہی
تھا۔ سلویانے میری طرف دیکھا۔ ”تم کیا کرو گے؟“
”میرے ابا جان کی کوئی مل نہیں ہے اس لیے میں
کوئی نوکری تلاش کروں گا۔“
”میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ آجائے
لیکن یہ مانتا نہیں ہے۔“ عمار نے سلویا سے شکایت
کی۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔
”تم عمار کی بات کیوں نہیں مان رہے؟“
”مجھے میں اس کا دوست رہنا چاہتا ہوں ماتحت نہیں
بننا چاہتا۔“
”یہ بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سلویانے میری تائید
کی۔ ”تم لوگوں کا رویہ نان پروفیشنل ہے۔ یہاں لوگ
دوستی اور ذمے داریوں کو الگ الگ نہیں رکھتے ہیں۔“
”میں ایسا نہیں ہوں۔“ عمار نے احتجاج کیا۔
”جب تم کام میں مجھے رعایت دو گے اور یہ بھی ٹھیک
نہیں ہوگا۔ اس لیے میں تمہاری نوکری قبول نہیں کر سکتا۔“
”مجھے سے ملنے آؤ گے؟“ سلویانے مجھ سے پوچھا۔

”کوشش کروں گا۔“ میں نے صاف گوئی سے
”اور نہ بننے میں ایک بار تو ضرور آؤں گا۔“
میں نوکری کی تلاش میں لگ گیا اور سلویا سے ملنے کا
رجحان سمجھتا تھا۔ پہلی بار میں کوئی دس دن بعد اس سے ملنے
کا ارادہ کر رہا تھا۔ وہ کمزور اور پچھلی ہو رہی
تھی۔ ”کیا۔۔۔ تم بیمار ہی ہو؟“
اس نے سر ہلایا۔ ”باری کا بخار آیا تھا دو دن پڑی
تھی۔ اب بھی حالت سنبھل رہی ہے۔“
”تم میرے گھر چلو ابھی تمہیں آرام کی ضرورت
ہے اور تم یونیورسٹی آ رہی ہو۔“
”ابھی چار دن کی چھٹی ہوئی ہے میرا بہت نقصان
ہوا ہے اسے بھی پورا کرنا ہے۔“
”لیکن اس طرح تمہاری طبیعت بھر خراب نہ ہو جائے۔“
”میں اپنی حکومت کے خرچ پر یہاں آئی ہوں اور
میرا فرض بنتا ہے میں ایم فل کر کے واپس جاؤں۔“
”اچھی بات ہے لیکن صحت کی قیمت پر۔۔۔“
”کچھ نہیں ہوتا مجھے میں بہت سخت جان ہوں۔“ وہ
برائی سے بولی۔ ”جب میں پیدا ہوئی تو دوسری جنگ
عظیم کا پہلا سال تھا اور جب جنگ ختم ہوئی تو میں پانچ
سال کی تھی۔ مجھے یاد نہیں لیکن اس دوران میں اتنا سخت
وقت بھی دیکھا ہے کہ کئی دن کو مجھے دودھ نہیں ملتا تھا۔“
اب میں روز اس سے ملنے جاتا تھا، اس کی طبیعت
بھی سنبھل چکی تھی۔ وہ کمزوری کے باوجود کلاسز آئیڈنڈ کر رہی تھی۔
پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا ایک دن میں گیا تو وہ
اچھانٹ میں نہیں تھی پتا چلا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں
ہے۔ میں ہاسٹل پہنچ گیا۔ وہاں مردوں کو لانی سے آگے
بانے کی اجازت نہیں تھی لیکن سلویا کو پیغام بھیج دیا اور وہ
اپنی ہوئی آئی۔ اسے پھر بخار ہو رہا تھا اور کمزوری کی وجہ
سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ آنکھیں اندر چلی گئی تھیں۔ میں
پریشان ہو گیا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ آرام کرو لیکن
تم۔۔۔“
”مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔“
”تم نے شاید آئیڈنڈ نہیں دیکھا ہے۔“ میں نے کہا اور
اس کی ایک سے بغیر اس کا سامان منگوایا اور اسے
اندرونی اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ یہیں ڈاکٹر کو بلا کر اسے

کیو پڈ

محبت کے اس دیوتا کو یونانی ایروز (Eros) اور
رومن کیو پڈ (cupid) کہتے ہیں لیکن اس کا رومن نام
زیادہ معروف ہوا۔ یہ ایفرودائٹ کی آوارگیوں کا نتیجہ تھا اور
اس کے مارے سے تعلقات کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اسی
لیے اسے محبت کا دیوتا تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دیوتا اندھ تھا۔
اس کی تصویر ایک معصوم بچے کی نگلی تصور ہوتی ہے جس کے
ساتھ ایک ترش اور ہاتھ میں کمان بنائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں
کہ اس کے ترش میں دو طرح کے تیر ہوتے تھے سب سے
اور آہنی۔ ان تیروں سے کیو پڈ، دیویوں، دیوتاؤں اور انسانوں
کے سینوں کو نشانہ بنایا کرتا تھا۔ کیو پڈ کے سنبھلے تیروں
کا نشانہ بننے والے اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن
لوہے کے تیروں کا نشانہ بننے والے ناکام رہتے ہیں۔
کیو پڈ، سائیکی (psyche) سے محبت کرتا تھا
لیکن اس کے پاس صرف رات کے وقت جایا کرتا تھا کیونکہ
دن بھر ماں اسے اپنی نگاہوں سے اجڑ نہیں ہونے دیتی
تھی۔
اسے پندرہ اولمپیز دیوتاؤں کا سب سے آخری دیوتا
قرار دیا جاتا ہے تاہم بعض کے مطابق اولمپیز کی تعداد
صرف بارہ تھی جبکہ بائی ان کے ماتحت دیوتا تھے اور ان کی
طاقت و حیثیت اولمپیز کی نسبت بے حد کم تھی۔
مرسلہ: طاہر محمود، منڈی بہا الدین

دیکھایا تو اس نے نمونہ تشفی کیا۔ اماں بی نے سلویا کا چارج
سنہیال لیا تھا۔ خاصی دیر تک وہ اسے ڈانٹتی رہی تھیں کہ
جب اس کی ایسی حالت تھی تو وہ پہلے ہی کیوں نہیں ہمارے
گھر آگئی تھی؟
”میں آپ لوگوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔“
”بیٹیاں بھی ماں باپ کو پریشان نہیں کرتی
ہیں۔“ اماں بی نے محبت سے کہا۔ کوثر نے میرے کان میں
سرگوشی کی۔
”اتنی محبت سے اماں بی نے کبھی ہم سے بھی بات
نہیں کی۔“
ڈاکٹر نے کم سے کم ایک ہفتہ مکمل آرام اور سادہ غذا
کا مشورہ دیا۔ سلویا پریشان ہو گئی۔ ”میرا بہت نقصان ہوگا
میں اتنا عرصہ بستر پر نہیں لیٹ سکتی۔“

”میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟“

اس نے یو چھا۔ ”تم

”اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ اس سیت سے اس

”میں ناامید نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں امان

بی کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں ان سے دوبارہ بات کروں گا۔“

سلویا کا چہرہ بھر سے چمک اٹھا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی ذرا سی بات پر اُداس ہو جانے والی اور پھر کسی معمولی سی بات پر خوش ہو جاتی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا کہ اگر اماں بی کا انکار برقرار ہوتا تو میں خود کو سنبھال لوں گا مگر سلویا کا کیا ہوگا۔ وہ یہ صدمہ برداشت کر سکے گی؟ وہ بالکل بین کی حد تک محبت کرنے لگی تھی۔ ان دنوں اس کے تھیس کا آخری حصہ چل رہا تھا اور وہ بہت زیادہ معروف تھی اس لیے میں نے اس سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ اتوار والے دن اس سے ملنے جاتا تھا لیکن اب ہم باہر نہیں نکلتے تھے بس یونیورسٹی کے سبزہ زاروں میں کچھ وقت ساتھ گزار لیتے تھے۔ ان ہی دنوں میں نے ابا جان سے بات کی۔ حسب توقع وہ راضی تھے لیکن مسئلہ اماں بی کا تھا اور بچوں کی شادی کا معاملہ اماں بی کے ہاتھ میں تھا۔ ابا جان مشورہ دے سکتے تھے لیکن آخری فیصلہ اماں بی کا ہوتا۔

”وہ انکار کر چکی ہیں۔“

”تو بس پھر صبر کرو بر خوردار۔“ ابا جان نے کہا۔

”ابا جان۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”کوئی وجہ تو ہو، وہ پہلے اماں بی کو اتنی پسند کی کہ اسے بیٹی کا درجہ دے دیا۔ جب کہ وہ غیر مسلم بھی ہے۔ اب وہ مسلمان ہونے کو تیار ہے تو اماں بی اسے بہن نہیں بنارہی ہیں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔“

”بیٹا تم اپنی اماں بی کو جانتے ہو بچپن سے دیکھتے آئے ہو ان کے کسی فیصلے میں کوئی منطوق نہیں ہوتی ہے۔ وہ صرف ذاتی پسند ناپسند پر فیصلہ کرتی ہیں اور پھر اس پر قائم ہو جاتی ہیں۔“

”چاہے اس سے ان کی اولاد کو نقصان ہو؟“

”ہاں، وہ ایسی ہی ہیں۔ اگر ان کی مرضی ہوگی تو سلویا مسلم نہ ہو تب بھی وہ اس سے رشتہ کر دیں گی، ورنہ اس کے مسلمان ہونے کی بھی ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔“

”میں اماں بی سے پھر بات کرتا ہوں۔“

”کر لو بیٹا لیکن مجھے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔“

”میں پھر بھی کروں گا اور وہ نہ مانیں تو....“

”تو تم اپنے طور پر....“

”ابا جان۔“ میں نے احتجاج کیا۔ ”آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں میں کوئی فیصلہ آپ لوگوں کی مرضی کے بغیر نہیں کروں گا۔“

میں نے اماں بی سے پھر بات کی اور انہوں نے پھر اتنی ہی شدت سے انکار کر دیا۔ ”صبح جب میں ایک بار صبح کر چکی ہوں تو تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس موضوع پر دوبارہ بات کرنے کی؟“

”اماں بی.... یہ میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“

”ہوگا۔“ وہ بے پروائی سے بولیں۔ ”میری طرف سے ہر صورت میں انکار ہے۔“

”آخر اس انکار کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟“ میں نے زنج ہو کر کہا۔

”ہاں، اس کا رنگ و روپ مختلف ہے ہمیں اپنی اگلی نسل ایسی نہیں چاہیے۔“

میں اماں بی کی اس بات پر ششدر رہ گیا تھا ہر چیز چھوڑ کر انہوں نے یہ نقطہ نکالا تھا۔ ان کا انکار نہ بدلنا تھا اور نہ بدلا۔ میں نے سلویا سے دوبارہ ذکر نہیں کیا۔ اس نے ایم فل مکمل کر لیا اور جس دن اسے ڈگری ملی تھی اس سے دو دن بعد اس کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ میں اسے ائیر پورٹ چھوڑنے گیا۔ وہ بہت حوصلے سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی صرف مجھے حوصلہ دینے کے لیے۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا، وہ سارے راستے روٹی جائے گی لیکن اس وقت وہ مسکرا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”صبح میں نے تمہارے ساتھ تمہارے ملک میں بہت اچھا وقت گزارا لیکن ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔“

”شاید۔“ میں نے کہا۔ ”سلویا مجھے معاف کر دینا میں اپنی ماں سے بغاوت نہیں کر سکتا اور ان کی مرضی....“

”تمہیں معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے اور میرے دل میں اماں بی کے لیے احترام میں کوئی کمی نہیں آئی بس میں نے اسے تقدیر کا لکھا سمجھا لیا ہے۔“

میں اس کے حوصلے اور ظرف پر شرمندہ تھا۔ ایک طرف اسے صرف اس لیے مستز دکر دیا گیا تھا کہ اس کا رنگ و روپ ہم سے مختلف تھا۔ دوسری طرف وہ ہمیں تصور وار نہیں ٹھہرا رہی تھی۔ میں نے طیارے پر سوار ہوتے اس کی آخری جھلک دیکھی جو ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہو گئی۔

ہوئی۔

☆☆☆

نوی اور رومی دم بہ خود بیٹھے تھے پھر نوی نے کہا۔ ”ماں بی گاؤں ادا جان! اس زمانے میں والدین ایسے ہوتے تھے کہ ”بر خوردار بعض اب بھی ہوتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”دادا جان۔“ رومی نے کہا۔ ”میں نے دیکھا ہے آپ دادی جان سے بہت محبت کرتے تھے ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔“

”ہاں، وہ میری بیوی اور میرے بچوں کی ماں تھیں۔ میرے دکھ دکھ کی ساسی اور ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دینے والی تھیں۔“

”لیکن وہ محبت جو آپ سلویا....“

”بیٹا جی.... وہ بھی محبت تھی اور یہ بھی محبت ہے۔“

میں نے بات کاٹ کر کہا۔ ”اگر آدمی کسی ایک فرد سے محبت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے سے محبت نہیں کر سکتا ہے اور میں نے آپ کی دادی جان کو شادی کے بعد بتا دیا تھا کہ میں سلویا سے محبت کرتا تھا اور وہ ساری عمر مجھ پر پورا اعتماد کرتی رہیں۔“

رومی شرمندہ ہو گئی تھی، اس نے شاید آئینہ دیکھ لیا تھا چند دن پہلے اس نے نوی پر بلا وجہ شک کیا تھا۔ نوی نے کہا۔ ”دادا جان آپ ائیر پورٹ جائیں گے؟“

”کیوں نہیں بر خوردار.... وہ مجھ سے ملنے آئی ہے۔“

رومی نے شرارت سے نوی کی طرف دیکھا۔ ”ویسے اگر پروادی جان مان جاتیں تو آج تم گورے چنے ہوتے.... دادی کا کچھ تو اثر تم پر بھی آتا۔“

نوی ذرا سانسو لے رہا تھا۔ وہ کھپا گیا۔ ”اپنے بارے میں کیا خیال ہے تم بہت گوری جینی ہو؟“

”اللہ کا شکر ہے بھی غرور نہیں کیا۔“ وہ اتر کر بولی۔

”دادا جان میں بھی چلوں گی۔“

نوی نے منع کیا اس پر دونوں کا جھگڑا ہوا جو بالآخر لڑائی بد اخلاقت سے ختم ہوا کہ دونوں جائیں گے۔ فلائٹ صبح ال بجے پہنچ رہی تھی اس لیے ہم نو بجے گھر سے نکل گئے۔ سلویا کے لیے کرا پہلے ہی سیٹ کر دیا گیا تھا۔ راستے میں وہ

مجھ سے سلویا کے بارے میں پوچھتے رہے اور اپنے طور پر اندازے لگاتے رہے کہ وہ کیسی ہوگی جب وہ مجھ سے پوچھتے تو میرے پاس ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ وہ بہت حسین اور اچھی تھی۔ ”ماں بی آپ لوگ خود دیکھ لیں گے۔“

”اب تو وہ بالکل بدل گئی ہوں گی۔“ نوی نے کہا۔

”لیکن وہ اب بھی خوب صورت ہوں گی۔“ رومی نے یقین سے کہا۔ ”گوریاں خود کو بہت سنبھال کر بیٹھتی ہیں۔“

رومی کی بات پر میں مسکرانے لگا۔ ہم فلائٹ کی آمد سے نصف گھنٹہ پہلے ہی ائیر پورٹ پہنچ گئے تھے جبکہ سلویا کو آرائیڈ لڈو لڈو سے باہر آتے آتے ایک گھنٹہ مزید لگ گیا تھا۔ ہم ڈیڑھ گھنٹے سے انتظار کر رہے تھے۔ پھر مسافروں کی آمد شروع ہوئی۔ رومی اور نوی ہر بوڑھی سفید قام عورت کے بارے میں دریافت کرتے تھے کہ وہی سلویا ہے اور میں انکار میں سر ہلاتا۔ بھر سلویا باہر آئی۔ وہ بہت تبدیل ہو گئی تھی، بال سفید ہو گئے تھے اور چہرے پر جھریاں تھیں، جسم دبلا ہو گیا تھا لیکن مجھے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح اس نے بھی نصف صدی بعد مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور سیدی میری طرف آئی۔ اس نے پاس آتے ہوئے گرم جوش سے پکارا۔ ”صبح.... ڈیزر۔“

رومی اور نوی ہٹا ہٹا کر گئے تھے اور جب میں نے سلویا سے ہاتھ ملا کر اس کا ان سے تعارف کرایا تو ان کی حالت دیکھنے والی تھی۔ سلویا ان کی طرف متوجہ نہیں تھی وہ نہایت بے تکلفی سے مجھ پر تہرہ کر رہی تھی کہ میں کتنا بدل گیا تھا۔ میں ہنسا۔ ”اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ہاں میں بھی بدل گئی ہوں۔“ وہ ہنسی۔ اس نے صرف ایک شولڈر ریک اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اس سے بیک لے لیا اور ہم بارنگ میں نکل آئے۔ راستے میں وہ اپنے بارے میں بتاتی رہی۔ اس نے یہاں سے جانے کے تین سال بعد شادی کر لی تھی۔ یہ شادی اس نے ایک مرکزی مسلمان احمد سے کی تھی اور وہ خود بھی مسلمان ہو گئی تھی۔ رومی نے چونک کر پوچھا۔ ”آپ مسلمان ہو گئی تھیں؟“

شاید رومی کا مطلب تھا کہ وہ مسلمان ہو گئی تھی تو اس کا اثر اس کے لباس پر کیوں نہیں آیا تھا۔ ”ہاں، لڑکی میں مسلمان ہوئی تھی منافق نہیں۔“

میں شرمندہ ہو گیا اس نے برسوں بعد شاید ہم پر طنز

اصول عشق

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
آداب و نیاز

عشق ناکام نمبر کا اشتہار دیکھا تو خیال آیا کہ میں اپنے حالات زندگی بھی لکھ دوں۔ میں نے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے صرف نام مقام بدل دیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ سجاد کی روح اور کاشف کو شرمندگی ہو۔ میں نے دوبار محبت چاہی۔ دونوں ہی بار ناکامی میرا مقدر ٹھہری۔ کیسے یہ آپ خود ملاحظہ کریں۔

شابینہ
(کراچی)



بعد انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سن کر نہ تو مجھے گہرا صدمہ ہوا تھا اور نہ ہی میں روئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو کا قطرہ بھی نہیں نکلا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نہ تو میرے دل کے کسی کونے میں اس کے لیے نفرت ہے اور نہ محبت..... میں نے اس طرح

یہ آج کی نہیں، بلکہ سات مہینے پہلے کی بات ہے جب مجھے شذو آدم سے اطلاع ملی کہ میرے شوہر سجاد کا ایک ماہ بیمار رہنے کے



اذیت ناک علاج کے دوران بے چارگی میں نہیں گزارنا چاہتی مجھے وہ موت آسان لگتی ہے جو چانک آجائے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم علاج کراؤ گی....“

”نہیں پلیز.... میں بس تمہاری یہ بات نہیں مان سکتی۔“

میں نے سمجھ لیا وہ نہیں مانے گی۔ اس لیے دوبارہ کہا بھی نہیں، ہم بس اپنی باتیں کرتے رہے اُن دنوں کی باتیں جب وہ یہاں تھی۔ پھر باتیں بھی ختم ہو گئیں۔ وہ تھک گئی تھی۔ میں نے اسے سونے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد قریبی بیلے کی جھڑیوں کے ساتھ دیکھ کر روئی نکل آئی اور میرے زانوں پر سر رکھ کر روئی تھی۔ میں بہت پہلے اسے دیکھ چکا تھا۔ میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس نے سر اٹھا کر گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”دادا جان ایسا کیوں ہوا؟“

”قدرت کی مرضی.... ہم اس کے آگے بے بس ہیں۔“

”کاش.... کاش....“ وہ کہتے ہوئے چپ ہو گئی لیکن میں سمجھ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”دادا جان اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے یہ ہماری سمجھ کا تصور تھا کہ ہم گرینی کو سفید فام سمجھ رہے تھے جبکہ وہ سیاہ فام ہیں۔“

”اسی کی تو ساری اہمیت ہے میری بیٹی۔“ میں نے سر آہ بھری۔ ”اگر وہ سفید فام ہوتی تو اماں بی انکار نہ کرتیں۔ ان کے نزدیک صرف سیاہ فام ہونے سے نسل خراب ہو سکتی تھی۔ سلویا سیاہ فام نہیں ہے صرف اس کی ماں سیاہ فام تھی اس کا باپ ایک سفید فام تھا اسی وجہ سے وہ صرف مائل رنگت کی تھی لیکن ہمارے لیے تو سیاہ فام ہی تھی۔“

”دادا جان آپ سلویا سے....“

”نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ وہ محبت نہیں ہے جو ملنے اور چمکنے سے مشروط ہوتی ہے۔ ہم اس عمر میں آکر اپنے بچوں کو شکل میں ڈالنا پسند نہیں کریں گے۔ بے شک تم سلویا سے پوچھ لیتا وہ بھی یہی جواب دے گی۔“

روئی تھکے قدموں سے اندر جانے لگی جیسے محبت کی بازی میں نے نہیں اس نے ہاری ہو۔



کیا تھا لیکن اس کا چہرہ طنز سے پاک مسکراہٹ لیے ہوئے تھا۔ روی بھی کھسی گئی۔ سلویا نے اپنا نام نہیں تبدیل کیا تھا جیسے اس نے اپنا لباس تبدیل نہیں کیا تھا لیکن وہ ہم سے بہتر مسلمان تھی وہ کسی کو دھوکا نہیں دے رہی تھی۔ اس کے چار بچے تھے اور وہ چاروں حافظ قرآن تھے۔ اب اس کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تک جوان ہو گئے تھے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں اسے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ وہ خوش ہوئی جیسے وہ اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے ساتھ خوش تھی ایسے میں بھی مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ احمد دس سال پہلے مراکش میں ایک کار کے حادثے میں انتقال کر گیا تھا۔ ہم گھر پہنچے جہاں سب نہایت اشتیاق سے سلویا کا انتظار کر رہے تھے اور اسے دیکھ کر باقی سب کا رونگٹا بھی ردی اور نوی سے مختلف نہیں تھا۔ بہر حال، حیرت سے قطع نظر سب اس سے گرم جوشی سے ملے اور آؤ بھگت کی۔ میری دونوں بہویوں اور لڑکیاں اس سے فوراً بے تکلف ہو گئی تھیں کیونکہ وہ ان سے زیادہ اچھی اردو بول رہی تھی۔ اس کے اعزاز میں ایک ڈشز بنائی گئی تھیں اور اس نے کھانے کے دوران اعتراف کیا کہ وہ فرانس میں ان کھانوں کو ترس گئی تھی۔ وہ اب تک ہمارے روایتی کھانوں کا ذائقہ نہیں بھولی تھی۔ دوپہر میں اس نے آرام کیا اور شام کو گھر والوں کے ساتھ گپ شپ لگاتی رہی۔ میں محفل میں موجود تھا لیکن ستار ہاؤس مسکراتا رہا۔

رات کے کھانے کے بعد جب سب آرام کرنے چلے گئے تو میں سلویا کو لے کر لان میں نکل آیا۔ موسم اچھا تھا تیز اور خشک ہوا چل رہی تھی جو کراچی کا خاص تھنہ ہے۔ ہم لان چیمبرز پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر پرائی باتیں ہوتی رہیں پھر میں نے سلویا سے پوچھ لیا۔ ”اب سچ بتا دو تمہیں اسنے عرصے بعد مجھ سے ملنے کا خیال کیسے آیا اور تم نے فون پر مرنے والی بات کیوں کی تھی؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے آہستگی سے کہا۔ ”تم بہت چالاک آدمی ہو۔“

”تمہیں میں بہت چالاک نہیں ہوں، لیکن تمہیں جانتا ہوں۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں تم سے نہیں چھپاؤں گی۔ مجھے برین ٹیومر ہے دوسرا علاج ہے لیکن میں علاج نہیں کرا رہی۔ میں زندگی کے آخری لمحات

سے اس کی موت کی خبر سنی تھی جیسے کسی پڑوسی یا محلے میں موت ہو گئی ہو۔

نہ تو میں کراچی جیسے شہر سے جا کر اس کی تجھیز و تدفین میں شرکت کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی اس کی قفل میں۔ میں نے ہاں اطلاع بھجوا دی تھی کہ میں نہیں آ رہی ہوں۔ میں نے سجاد کی موت کی خبر رشتے داروں کو بھی نہیں دی تھی۔ میرے گھر والوں میں ایک بھائی تھا جو کینیڈا میں بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میری ایک بہن لندن میں جا رہی تھی اور شوہر اور بچوں کو بھی پال رہی تھی۔ وہ لوگ جانتے تھے میری محبت کی شادی بڑی طرح ناکام ہو چکی ہے۔ لیکن اس نے نہ تو مجھے طلاق دی تھی اور نہ میں نے خلع مانگی تھی۔ بس وہ ایک دن مجھ سے اتنا کہہ کر چلا گیا تھا کہ میں ٹنڈو آدم جا رہا ہوں، وہاں میرے دوست احباب اور میری دنیا ہے۔ میں اپنی موت تک وہیں زندگی گزار دوں گا۔ اب مجھے کسی کو اطلاع دے کر کرنا بھی کیا تھا؟ کون تھا جو پرسا دیتا؟ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب بھی کینیڈا یا لندن سے فون آئے گا تب میں انہیں رسی طور پر تباہ دوں گی کہ میں بیوہ ہو چکی ہوں۔

دس برس قبل وہ ٹنڈو آدم سے کراچی اپنا مستقبل بنانے آیا تھا والدین کی موت کے بعد آیا تھا، ورثہ میں اسے آبا کی مکان اور زمین ملی تھی۔ جو کھیتی باڑی کی تھی۔ اس نے سندھ ہی میں گرجو بنو کیا تھا۔ وہ صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ ذہین بھی تھا۔ خوبصورت، وجہ اور دراز قد۔ کسی عورت کے تصوراتی شہزادے کی طرح، وہ کسی ہیرو سے کم نہیں تھا۔

مجھے کراچی میں ورثے میں دو کمرے کا نہایت کشادہ، پرسکون فلیٹ ملا تھا۔ میرے بھائی اور بہن نے اپنا اپنا فلیٹ فروخت کر دیا تھا۔ میں نے اپنا فلیٹ اس لیے فروخت نہیں کیا تھا کہ مجھے اسی شہر میں رہنا تھا۔ وطن عزیز میں رہنا تھا۔ میری بہن اور میرے بھائی نے کہا تھا کہ میں ان کے پاس چلی آؤں۔ ”شاہین! اس ملک میں کیا رکھا ہے؟ کوئی مستقبل نہیں ہے، کوئی زندگی نہیں ہے۔“

میں نے ان سے کہا کہ ابو کو اس ملک سے بڑی محبت تھی۔ کہتے تھے کہ اس ملک کو بنانے کے لیے عظیم قربانیاں دی گئیں ہیں۔ کیا ان کو بھلا دیں اور اپنا وطن عزیز چھوڑ جائیں؟ کیا میں نے یہاں جو رہنے کا فیصلہ کیا تھا وہ غلط تھا یا صحیح؟ میں نہیں جانتی۔۔۔۔۔۔ مجھے سجاد کے خیالات بھی بہت پسند تھے۔ وہ کہتا تھا کسی غیر ملک، غیر مذہب اور غیر قوم میں جا کر غلامی

کرنا اسے بالکل پسند نہیں ہے۔ وہ امریکا اور یورپ جانا چاہتا تو جاسکتا تھا لیکن کیا نہیں تھا۔

جس روز اس کی موت کی خبر ملی تھی، اس رات میں دیر تک سو نہ سکی تھی۔ میں اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ آخر وہ میرا شوہر تھا لیکن مجھے رونا کیوں نہیں آ رہا تھا؟ اور میں خوشی بھی کیوں محسوس نہیں کر رہی تھی کہ آخر مجھے ساری زندگی کے لیے اس سے چھٹکارا مل گیا؟ اب میں ایک آزاد بچی ہوں۔ بیوہ ہو چکی ہوں، میں کسی بھی شخص کا ساتھ تمام کر اپنا گھر بسا سکتی ہوں۔ ابھی تو میں نہ صرف نوجوان بلکہ بے حد پُرکشش بھی ہوں۔ کہ لوگ راہ چلتے مجھے نڈیادی نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں انجانے اور پرانکندہ خواہش کا عکس نظر آتا ہے۔

کوئی سات مہینے کے بعد آج چاک اور غیر متوقع طور پر کالج کے پرنسپل غلام محمد جو جیو کا خط آیا۔ ان کے خط کے الفاظ مجھے سوئے نہیں دے رہے تھے اور ایسا لگ رہا ہے کہ وہ میرے سامنے کھڑے کہہ رہے ہوں۔

”شاہین بیگم! وہ طویل عرصے تک بیمار ہے، میں جب کبھی ان کی عیادت کو جاتا تھا، وہ مجھ سے کہتے تھے کہ۔۔۔۔۔۔ اس دنیا میں صرف تین چیزوں سے محبت رہی، علم، وطن عزیز۔۔۔۔۔۔ اور میری اہلیہ شاہین۔۔۔۔۔۔ جو میرے من کی اتھاہ گھرائیوں میں بسی ہوئی ہے، قفس ہے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے آپ کی ایک زبردست پینٹنگ بنائی۔ وہ بڑے اچھے اور ماہر مصور تھے۔ اس شہر کے بڑے بڑے مصوران کی رائے اور رہنمائی کے لیے آتے تھے۔ انہوں نے جو آپ کی پینٹنگ بنائی تھی اسے دیوار پر اپنے بستر کے سامنے آویزاں کر دیا۔ تاکہ سوئے سے پہلے اور بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے آپ کو دیکھیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے وہ ہر وقت آپ کو ہی دیکھا کرتے اور مجھ سے یہ کہتے کہ غلام بھائی! یہ عشق جنون ہے، محبت کیا ہوتی ہے، جنون کیا ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ صرف محبت کی آہ میں جلنے والے۔۔۔۔۔۔ فراق میں ترپنے والے ہی جانتے ہیں۔

انہوں نے وفات سے قبل جو اشیا چھوڑی ہیں اس کے بارے میں وفات سے ایک دن قبل کہا تھا کہ شاہین کو بلا کر انہیں دے دی جائیں تاکہ میری روح کو سکون اور طہائیت مل سکے۔ ہم نے ان کی ساری چیزیں اکٹھی کر رکھی ہیں تاکہ آپ کو یہاں بلا کر آپ کے حوالے کر دی جائیں۔ جب آپ آئیں گی، ہم آپ کے اعزاز اور ان کی یاد میں ایک

جلے منعقد کر دیں گے۔ اس جلے میں آپ کے مرحوم شوہر کی چھوٹی چھوٹی عمر یادگار چیزیں آپ کے حوالے کی جائیں گی۔ مرحوم کے طالب علم آپ کے انتظار میں ہیں۔ انہیں مایوس نہ کیجئے، اس لیے بھی کہ آپ کے شوہر ایک عظیم اور بلند مرتبہ انسان تھے۔“

اس سے پہلے جب پرنسپل غلام محمد کا خط تقریر کا آیا تھا اور انہوں نے لکھا تھا کہ عدت کے بعد ضرور آئیں۔ لیکن میں کسی وجہ سے غنڈہ آدم جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ میں نے پروگرام بنانے کی بڑی کوشش کی پرنسپل کو یقین دلانا چاہا کہ میں صحت کی خرابی کے باعث آ نہیں سکتی۔ دوسری بات یہ کہ میں نے بھی کراچی سے باہر قدم نہیں نکالا۔ اتنا طویل سفر اکیلے کیسے کر سکوں گی؟ مگر اب جو خط آیا میرے لیے کوئی حیلہ بہانہ نہ رہا۔ میں نے انہیں فون کر کے کہہ دیا کہ انشاء اللہ آؤں گی۔

رات میں نے بستر پر دراز ہونے کے بعد اپنے دل کو ٹھوٹا۔ اپنے وجود میں جھانکا پھر میرے اندر کی سوئی ہوئی عورت بڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ماضی حال بن گیا۔ سجاد عرصے سے بیمار تھا۔ اس نے مجھے دو تین مختصر سے خط لکھے تھے کہ۔۔۔۔۔۔ میں سخت بیمار ہوں، مرنے سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایک دن کے لیے، پورا دن نہ رہو، ایک گھنٹے کے لیے سہی۔

معلوم نہیں کیوں میں اتنی خالم، سفاک اور بے رحم بن گئی تھی؟ میں نے اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا، نہ ہی میرا دل پہنچا۔ میں اس قدر کمزور ہو جاؤں گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک برس پہلے کی بات ہے کہ وہ مجھ سے جھگڑا کر کے ٹنڈو آدم چلا گیا۔ اس نے جاتے جاتے یہی کہا تھا کہ اب وہ لوٹ کر بھی نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی بات پوری کر دکھائی تھی۔ ضدی تھا، ہٹ کا لکھا تھا۔ سجاد کا غصے سے دھنسا چہرہ آج بھی میری نظروں کے سامنے تھا۔ جب بھی وہ کسی بات پر طش میں آتا، اس کا چہرہ آتش فشاں بن جاتا۔ قابو میں نہ رہ پاتا۔۔۔۔۔۔ اس کے چہرے کے نقوش بوڑھے آدمی جیسے ہو جاتے اور وہ اپنی عمر سے بڑا دکھائی دیتا۔ وہ بیروں کا مریض اور ناتواں دکھائی دیتا۔ پھر وہ ایک روز کسی اجنبی کی طرح چلا گیا تھا۔ جس دن وہ جا رہا تھا، وہ اور بوڑھا دکھائی دیا۔ گھر اور میری زندگی سے نکل جانے کی دھمکی وہ دیتا رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی جج نہیں جانا تھا۔ اس لیے کہ وہ دو تین دن کسی دوست کے ہاں گزار کر واپس

آ جاتا اور مجھ سے صلح کر لیتا۔ گلے شکوے دور ہو جاتے۔۔۔۔۔۔ لیکن جب وہ آخری بار جانے لگا تو میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اسے جانے دیا۔ میں نے اسے اس لیے نہیں روکا کہ اس وقت میں خود غصے سے بھری ہوئی تھی۔

وہ مجھ سے رات دن جو کہتا رہتا تھا، وہ ناقابل برداشت تھا۔۔۔۔۔۔ اگر وہ مار پیٹ کرنا تو میں برداشت کر لیتی لیکن اس نے طعنے دیے جس میں مجھے اپنی تدبیل اور چمک بھی محسوس ہوئی۔ عورت سب کچھ کر سکتی ہے۔ کتنا ہی بڑا زخم اور کسی ہی نہیں کیوں نہ ہوں وہ برداشت کر لیتی ہے لیکن شک برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ایک شگلی مزاج شوہر تھا۔ شگلی مزاج کے ساتھ نباہ کرنا انتہائی اذیت ناک اور کرب انگیز تھا۔۔۔۔۔۔ وہ مجھے ہمیشہ میری پہلی محبت کا طعنہ دیتا تو ایسا لگتا میرے وجود پر جیسے کسی نے انکارے ڈال دیے ہوں، نشاط انگیز لمحات میں، میں ہمیشہ خود سپردگی، والہانہ پن اور گرم جوشی سے پیش آتی۔ کبھی بھی محسوس اور سر میں درد محسوس کر کے بے دلی سے پیش آتی تو فوراً کہتا شاید تم اپنی زندگی میں پہلے آنے والے شخص کی یاد میں گم ہو۔۔۔۔۔۔ حالانکہ یہ بات نہ ہوتی۔۔۔۔۔۔ میں اس سے کتنی کہ تم جو قسم کہو کھانے کے لیے تیار ہوں، بات صرف یہیں تک محدود نہ تھی۔ جب کبھی اتفاق سے کھانے میں نمک زیادہ پڑ جائے، یا باغیر نمک نہ ہو، جب میں رات کو اس کے کپڑے استری کر کے اور جوتوں کو پالش کر کے نہ رکھوں، جب میں کبھی دفتر سے اس کی واپسی پر جڈ باتی انداز سے استقبال نہ کروں یا بناؤ سنگار کر کے انتظار نہ کروں، ہر موقعے پر اور ہر خرابی کا اس کے نزدیک یہی سبب تھا کہ میں اپنی پہلی محبت کے خیالوں میں ڈوبی ہوئی ہوں۔

پہلی محبت۔۔۔۔۔۔ پہلی محبت۔۔۔۔۔۔ پہلی محبت۔۔۔۔۔۔ اس پہلی محبت کا ذکر سن کر میرے کان پک گئے تھے۔ اس وقت میرا دل کرتا تھا کہ کاش! پہلی محبت والا میرے سامنے آ جائے، میں جگن سے چھری اٹھا کر پوری قوت سے اس کے سینے میں گھونپ دوں۔ میں نے سجاد کو یقین دلانے کے لیے ہرگز اس پہلی محبت کو نہیں بھٹلایا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ جس طرح اور بہت ساری لڑکیوں کی زندگی میں کوئی نہ کوئی پہلا مرد آتا ہے اسی طرح میری زندگی میں بھی ایک لڑکا آیا تھا۔ یہ میری دادان جوانی کی بھول تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے میں نے نو جوانی کی دلہیز اور شباب کی حدود میں پہلا قدم رکھا تھا۔ اس وقت میری

مقتدی ہوئی تھی اور نہ شادی۔ میری زندگی میں رہا تھا۔ بس ایک سنے کی طرح میری زندگی میں آیا تھا۔ سنے کون نہیں دیکھا؟ کسی کے سنے پورے ہو جاتے ہیں پانپون کی مالا نوٹ کر بکھر جاتی ہے۔ میرے سنے بھی اجاڑ ہو گئے تھے۔ لیکن مجھے اس کا دکھ اور افسوس نہ تھا۔ اس لیے کہ وہ محبت سے بہت سارے فائدے اٹھاتا چاہتا تھا۔ میں نے اسے دو ایک مرتبہ من مانی کرنے دی۔ ایک بار وہ حد سے تجاوز کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ناصر فحجر کر دیا بلکہ اس کے منہ پر تھپڑ بھی رسید کر دیا۔ اس نے جبر سے کام لیا تو اسے دھکا دے کر چلی آئی تھی۔ اس کے باوجود دل کے کسی کونے میں اس کے لیے محبت محسوس کرتی رہی تھی۔ اس کے بھٹکنے میں تصور میرا اپنا بھی تو تھا۔ اس لیے کہ میں اس سے اس وقت ملنے جاتی تھی جب وہ گھر میں اکیلا ہوتا تھا۔ دوسرا یہ کہ میرا لباس جو اس قدر رنگ و چست ہوتا تھا، بے جاابی کی حد کو چھوئے لگتا تھا۔ یوں بھی میرا بدن بھڑکیا تھا، میں جھپٹی تو وہ بھٹکنے پر آ جاتا تھا۔ میں بے بات بھول گئی تھی کہ مرد اور ناگ کی فطرت ایک سی ہوتی ہے کہ بس وہ ذرا سا موضوع ملنے پر بڑس لیتا ہے۔ میں بے لباس..... بلکہ ہلڑکی کی اسے پہننے سے کہ اس کے دل کے کسی گوشے میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ مرد اسے توجہ سے دیکھے اور اس کے حسن و شباب کو سراہے۔

سجاد وجیسا شوہر نصیب سے ملتا ہے۔ بہت کم عورتوں کو ایسا خوبصورت اور محبت کرنے والا رفیق سفر ملتا ہے۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے سجاد کو پسند ہی نہیں بلکہ حد سے زیادہ چاہا تھا۔ اس کی بھولی میں اپنی تمام محبت ڈال دی تھی۔ اس لیے کہ اس کی بھولی خالی تھی۔ اور پھر اس کی زندگی میں ایک خلا تھا جسے میں نے اپنی محبت سے پر کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ محبت کا بھوکا تھا۔ اسے محبت نہیں ملتی تھی۔ محبت کی بازی ہارنے کے باوجود میں نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا تھا جبکہ پہلی محبت میں ہارنے پر بھی عورت کے پاس بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ اتنا کچھ رہ جاتا ہے کہ اس سے وہ اپنے شوہر کو مکمل پیار دے سکتی ہے۔ معلوم نہیں کس طرح اور کیسے سجاد کو کاشف کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے بارہا یقین دلایا کہ اس شخص نے شادی کر کے اپنا گھر بسالیا ہے۔ پھر بھی اس نے اس بات کو ذہن میں بٹھالیا تھا۔ میرے بارہا یقین دلانے اور قسم کھانے کے باوجود وہ شک میں مبتلا رہا اور اسے وہم ہو گیا تھا کہ کاشف ابھی بھی میرے خوابوں میں آتا ہے۔

وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔ جب اس نے میرے قسم کھانے پر بھی یقین نہیں کیا تو ایک روز میں نے تنگ آ کر بھڈیانی بچے میں کہہ دیا کہ "ہاں..... ہاں..... وہ میرے خوابوں کا شہزادہ ہے..... میں روز اس کے خواب دیکھتی ہوں۔ میں اسے اپنے دل اور خوابوں سے کبھی نہیں نکال سکتی..... عورت کی پہلی محبت جب دل میں بس جاتی ہے تو اس کی جڑیں وجود میں اندر تک چلی جاتی ہیں۔"

یہ سن کر سجاد کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور اس کے کندھے جھکتے چلے گئے۔ اور پھر وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ اب میں تمہاری زندگی میں نہیں آؤں گا۔ بس تم کاشف کے خوابوں میں بھولی رہا کرو۔ اس کے اس غصے اور نفرت کی شاید وجہ یہ تھی کہ میں نے اس دن اسے وہ توجہ نہیں دی جس کی اسے خواہش تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں آج بے جا تھکی ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر روئی اور پچھتائی رہی تھی کہ میں نے کیوں نہیں اس کے جذبات کی فراوانی کا خیال رکھا؟ جب کبھی میں اپنی ساری توجہ اور خود پسیردگی سے پیش آتی تو وہ مجھے پہلی محبت کا طعنہ نہیں دیتا تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں اپنی پہلی محبت کو بھول چکی ہوں۔

اس نے خواب گاہ کو نہایت توجہ سے آراستہ کیا ہوا تھا۔ فرش پر پیش قیمت سرخ ایرانی قالین، ایک بہت بڑا سنگار میز جس میں پورا کرا نظر آتا تھا۔ پھر اس نے روشنیوں کا خصوصی انتظام کیا تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں آہوی لکڑی کے بیڈ لیپ، ہر لیپ کے شڈے کے الگ الگ اور دھیمی دھیمی روشنی جو شعاعوں کی طرح بکھر جاتی تھی۔ خصوصی اور بڑا سا ڈبل بیڈ جس پر بیک وقت چار آدمی بہ آسانی سو سکتے تھے۔ بستر ایسا نرم و گداز اور ریشم جیسا جو پھولوں کی بیج کی محسوس ہوتا تھا۔ چھت پر روشنی کا جال، کمرے میں خصوصی ٹیوب لائٹس ان کی روشنی دو دھیا چاندنی کا بخند دریا۔ اس نے اس خواب گاہ کو پرنس اور شاہی خلوت گاہ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میری تنہائی اور راتیں انتہائی اذیت ناک بن گئیں۔ میں صرف اس کمرے میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں جیسے اکیلی رہ گئی تھی۔ نیند میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں اس کی آغوش میں ہوں..... اس کی محبت بھری باتیں نگوں کی طرح کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میں اس کی ضرورت محسوس کرنے لگی۔ اس کے بوسوں کی بو چھار محسوس ہوتی۔ میں کوئی بوسہ تو نہیں سٹی، جو ان بھی جذبات کی

آگ میں جلنے لگی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ اپنی پیاس کیسے بجھاؤں۔ کیا کاشف کو کسی دن بلاؤں..... رات بھی روک لوں؟ لیکن میں اتنی دور جا کر اپنا وجود میلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے آپ کو اودھ کر کے اپنی نظروں میں گر جانی اور خدا کے حضور اس قابل نہ رہتی کہ سر اٹھا سکوں اور پھر میں نے راتوں کو کمرے کی تمام روشنیوں میں اپنے آپ کو تنہائی نظروں اور ہر زاویے سے دیکھا کہ کہیں میں بے کشش تو نہیں ہو گئی ہوں؟ قسم کے خطوط اور عضو دخل کرنا حسن کھو چکے ہیں لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے اپنے جسم کا خیال رکھا ہوتا تھا۔ پھر کیا بات ہے جو سجاد کو میرا حسن اور پرشاد گداز بدن یاد نہیں آتا اور تڑپاتا، میرا دلہانہ پن، وانگنی، فانی اور خود پسیردگی، میں نے کبھی بھی اس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا اور پھر اب اسے چاہیے کیا تھا، کیا میرا عمر آگیا؟

ایک برس تک اس نے اپنے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی۔ میں اس کے بارے میں بالکل بے خبر رہی۔ بے فکر اور بے سہارا تھی۔ اس کے بارے میں نہیں نہ کہیں سے پتا چلتا ہی رہی، میں نے اس کی واپسی سے ناامید ہو کر ایک فرم میں ملازمت کر لی۔ اسے ساڑی بہت پسند تھی۔ میں اب بھی اس کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس کی پسند کا لباس پہنتی تھی۔ میرے پاس بینک میں خاصی بڑی رقم تھی۔ چھ سات برس ٹھاٹ سے گزر جاتے مگر مجھے اپنے آپ کو مصروف رکھنا تھا۔ اس لیے کہ کرب ناک تنہائی بھگایا کرتی تھی۔ ڈر تھا کہ کسی دن میں کاشف سے میل جول نہ کروں اور غلامت کی دلدل میں نہ جا کروں۔

مجھے اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ میں اس کے مرنے سے پہلے اسے یہ کیوں یقین نہ دلائی کہ میں اسے کاشف سے زیادہ چاہتی ہوں؟

میں نے بس پر ریل گاڑی کو ترجیح دی تھی اس وقت ریل گاڑی کے سیکنڈ کلاس کے زنا نڈے میں سفر کر رہی تھی۔ میں یہ سب کچھ سوچتے سوچتے گہری نیند سو گئی۔ ریل گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو میری آنکھ کھل گئی۔ پتا چلا کہ حیدر آباد کا اسٹیشن آ گیا ہے۔ بیس منٹ تک گاڑی نہ چلی تو میں نے کھڑکی سے جھانک کر قلی کو بلایا جو پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا ایک مسافر سے بات کر رہا تھا۔ ٹرین کی روانگی کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔ جب وہ مسافر سے بات کر چکا تو میں نے اسے بلا کر پوچھا کہ بات کیا ہے، ریل گاڑی یہاں کتنی دیر

خدارا © خدارا

شوگر مریض

ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہنا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موڈی مرض انسان کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا، بے جان اور نا کارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریسرچ، تحقیق کے بعد ملکی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدا آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوائیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (جسٹڈ)
(دبئی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0308-6627979
0547-521787
آپ ہمیں صرف فون کریں
شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

رکتی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس کے انجن میں کوئی فنی خرابی پیدا ہوئی ہے اسے درست کرنے میں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا بھی لگ سکتا ہے۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ کوئی پیجر یا میل ایکسپریس گاڑی..... اس نے کہا کہ پیجر جاچکی ہے اب جو گاڑی آئے گی وہ ٹنڈو آدم نہیں رکے گی۔ دوسری پیجر تین گھنٹے بعد آئے گی۔ اس لیے انجن کے ٹھیک ہونے کا انتظار کریں۔

میں ابھی انہی خیالات میں مگمگ تھی کہ عقب سے ایک خوشی سے بھرپور مردانہ آواز سنائی دی ”شاہینہ! شاہینہ.....“

میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ کاشف تھا۔ وہ میری طرف تیزی سے آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوشی چمک رہی تھی۔ میں بار بار شانے اور سینے سے پھسل جانے والے ساڑی کا پلو سنبھال کر اسے دیکھنے لگی۔

”شاہینہ! کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں..... تم اور حیدر آباد انشٹیشن پر۔ اکیلی..... سجاد کہاں ہے؟“

”سنو.....“ میں نے کہا ”گاڑی ایک گھنٹا لیٹ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا، ہم کسی ایجنٹر ریسورٹ میں بیٹھ کر چائے پیئیں۔“

”اچھا تو تم سجاد سے ملنے ٹنڈو آدم جا رہی ہو۔ میں نے ایک برس پہلے کسی سے سنا تھا کہ وہ ٹنڈو آدم میں پڑھا رہا ہے۔ عجیب الحق آدمی ہے۔..... کراچی میں کیا اسکولوں کی کسی ہے۔..... خیر..... چلو، باہر نکلو۔ اسٹیشن کے باہر ایک انرکنڈیشنڈ ریسورٹ ہے۔“

اسے دیکھ کر خوشی تو میں ہوئی تھی البتہ حیرانی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں انرکنڈیشنڈ ریسورٹ کے ہال کے ایک کونے میں بیٹھے تھے، آئے سائے۔ میں نے سینڈوچز اور کافی کا آرڈر دیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد وہ بولا۔

”شاہینہ..... تم روز بہ روز جوان اور پرکشش ہوتی جا رہی ہو۔ سویت اور سکی..... تمہیں کتنے عرصے بعد دیکھ رہا ہوں۔ ایسی دوشیزہ لگ رہی ہو جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ ان دنوں سے بھی کم عمر جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی..... لگتا ہے کہ سجاد نے تمہیں بھرپور خوشیاں دی ہیں کہ جس نے تمہیں اور حسین بنا دیا ہے۔“

وہ کسی نان اسٹاپ ٹرین کی طرح بولے جا رہا تھا۔ میں نے اس کی باتیں سن کر درمیان میں قطع کلائی نہیں کی

بلکہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ سفید شرٹ اور کالی چٹون میں ملبوس تھا۔ اس نے کالے رنگ کی ٹائی باغمی ہوئی تھی۔ وہ میڈیکل سٹوڈنٹ کی جاب کر رہا تھا۔ اس کیے ہاتھ میں میڈیکل بیک تھا۔ اس کے چہرے پر چالیس برس کی عمر کی چٹکی تھی۔ وہ عمر سے بڑا دکھائی دیا۔ اس کی وجہ تندرست تھی۔ میری اس سے یہ ڈرامائی ملاقات ہوئی تھی۔ چونکہ مجھے ایک گھنٹا گزارنا تھا، میں چاہتی تو اس سے بے رحمی اختیار کر سکتی تھی، میں نے سوچا کہ میں اس کی باتیں سنوں گی۔ اسے اپنے بارے میں بھی بتا دوں گی۔ آخر میں اس بات کو کہاں تک چھپا کر رکھوں گی؟

جب اس نے جب سے سگریٹ نکال کر اسے سلگانے کی کوشش کی تو میں نے اس کی طرف دیکھا اور بڑی جلدیگی سے کہا۔

”کاشف..... کوئی ایک برس ہوا، میں بیوہ ہو چکی ہوں۔“

”کیا.....؟“ وہ اس طرح اچھل پڑا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ اس کے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا۔ ”تم کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ کسی نے بھی مجھے بتایا نہیں۔ نہ تم نے..... اتنا بڑا سانحہ.....“

”یہ تم پہلے محسوس ہو جسے میں بتا رہی ہوں۔ کسی کو بتا کر کرنا بھی کیا ہے؟ کیا کروں بتا کر، دنیا میں میرا ہے ہی کون؟“

”اب تم کہاں جا رہی ہو؟ بڑا صدمہ ہوا تمہارے بیوہ ہو جانے کا سن کر۔ تم جوانی میں بیوہ ہو گئیں۔“

”میں ٹنڈو آدم جا رہی ہوں۔“ چونکہ ویٹر سینڈوچز لے کر آ گیا تھا اس لیے اسے اتنا ہی بتایا۔

”کیا تم نے دوسری شادی کر لی ہے؟ کیا تم اپنی سسرال جا رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، میں نے شادی نہیں کی۔“ میں نے جواب دیا ”میں ٹنڈو آدم جا رہی ہوں اس لیے کہ سجاد کے اعزاز میں کالج میں ایک جلسہ رکھا گیا ہے۔ مجھے مدعو کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی آخری سانس تک وہاں پڑھا تا رہا تھا۔ اس کے طالب علم اسے خزانہ حسین پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن اس کے پرنسپل کے بے حد اصرار پر میں جانے پر مجبور ہو گئی۔“

”وہ کس لیے، تمہیں کراچی میں چھوڑ کر ٹنڈو آدم چلا گیا۔“ کاشف نے کہا ”اتنا باصلاحیت..... اس کے لیے

وہاں کیا مستقبل تھا؟“

پھر میں نے اسے اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا کہ پہلی محبت نے شک کا زہر گھول دیا تھا۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ اس کی محبت اور یادوں کے سہارے زندگی کا ٹر رہی ہوں۔

”میں نے ایک روز تمہیں اور تمہاری حسین بیوی کو زیب النساء اسٹریٹ پر شاپنگ کرتے دیکھا تھا۔“ میں نے کہا ”یہ ان دنوں کی بات ہے جب تمہاری شادی ہوئی تھی۔ میں دل میں سراپے بغیر نہ رہ سکی کہ کتنا حسین اور انمول جوڑا ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ یہ تمہاری محبت کی شادی ہے۔ تمہاری یہ دوسری محبت بڑی خوشگوار اور حسین گزر رہی ہو گی؟“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ میری پہلی محبت ناکام ہو گئی جس کا رنج اور قلق آج تک ہے۔“ وہ بڑے افسردہ لہجے میں کہنے لگا ”محبت اور جنگ میں ہر چیز جانتا رہتی ہے۔ لیکن تم نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔ تم نے میرے جذبات کو کچل دیا، محبت کو پامال کر دیا۔ تم جس بے جا جانی کی حالت میں تھیں اس نے مجھے بہکا دیا تھا۔ کاش! تم نے مجھے جھڑک نہ دیا ہوتا۔ میرے منہ پر تھپڑ نہ رسید کیا ہوتا۔ کاش..... اس وقت تم نے میرے جذبات کی قدر کی ہوئی، طوفان گزر جانے کے بعد میں تم سے شادی کی بات کرتا۔ ہم دونوں خواب ناک زندگی گزار رہے ہوتے۔ کاش..... ہم ایک سایہ تلے زندگی گزار رہے ہوتے۔“

”چلو جو نہیں ہوتا تھا وہ ہو گیا۔ اس حسین عورت کے ساتھ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟ دوسری محبت اور دوسری لڑکی!“ میں نے کہا۔ ”خوش تو ہونا.....؟“

”خوش..... دوسری محبت کی شادی.....“ کاشف کے چہرے پر کرب ابھر آیا اور اس کا لہجہ بے حد افسردہ ہو گیا۔ وہ دل گرفتہ لہجے میں کہنے لگا ”میری شادی محبت کی تھی۔ وہ میری خوبصورتی اور وجہ توجہ پر مبنی تھی۔ جب میں نے دو تین ملاقاتوں کے بعد اس کی طرف پیش قدمی کی تو اس نے نہ تو انکار کیا..... نہ مزاحمت اور نہ میرے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔ ہم طوفان کی زد میں آ گئے۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ پھر ایک دن اس نے بتایا کہ اس محبت کا نتیجہ نکل آیا ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں۔ پھر مجھے اس سے شادی کرنی پڑی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں اتنی جلدی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن شادی بہر حال اس سے کرنی تھی۔ میں ہر مہینے نو ہزار

ناکام عشق کی

مشہور داستانوں کے مرکزی کردار

عرب: لیلیٰ، مجنوں، قیس، لیلیٰ، واقعہ عذرا۔
فارس: شیریں، فرہاد۔

پنجاب: ہیر، رانجھا، سوئی، مہنوال۔ کسی پنوں
سندھ: عمر، ماروی

دہلی: سلطان رضیہ، یعقوت

ہنگالی: حسن بانو، امیر علی

انگریزی ادب: رومیو جولیٹ

مرسلہ: فہد طیب، لاہور

۵۵۵

عشق کا مارا سنگ تراش

قبل از اسلام ملک فارس میں ایک سنگ تراش رہا کرتا تھا۔ نام نامی اس کا فرہاد تھا۔ اس نے کسی طور جلوہ حسن شیریں دیکھ لیا اور سو جان سے فدا ہو گیا۔ شیریں بیوی تھی شہنشاہ وقت خسرو پرویز کی۔ اس نے شرط دیدار رکھی کہ فرہاد ایک نہر بنادے جبکہ مشہور یہ ہے کہ فرہاد نے خود آتش عشق میں سوزاں ہو کر خیال کیا کہ شیریں کو دودھ پسند ہے اور دودھ والی بکریاں پیاز پر چرتی ہیں۔ دودھ لانے کے لیے شیریں کی کینڑوں کو کوئی کوس دور جانا پڑتا ہے سو اس نے نہر تراش دی۔ لیکن جیسے ہی نہر تیار ہوئی خسرو کے غلاموں نے افوہ اُڑادی کہ شیریں رات گئے گزر گئی۔ فرہاد نے تیشہ اٹھایا اور سر پر مار کر اُدھوری محبت کا خاتمہ کر لیا۔

مرسلہ: فہد طیب، لاہور

روئے کا لیتا ہوں۔ سندھ کے اندرونی شہروں اور علاقوں میں جگہ جگہ بھٹکانا اور خوار ہوتا رہتا ہوں۔ ادویات فروخت کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے۔ آدمی سے زیادہ آمدنی بیوی کو دینا پڑتی ہے۔ وہ یہ آمدنی اپنی ذات پر خرچ کرتی ہے۔ فضول خرچ اور بد مزاج ہو گئی ہے۔ گھر کے اخراجات مجھے پورے کرنا پڑتے ہیں۔ میں اس عورت سے بیزار ہوں۔ اب اس میں کوئی کشش نہیں رہی۔ موتی اور بھدی بھی ہو گئی ہے۔ دو بچوں کی ماں ہے لیکن سات بچوں کی معلوم ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف بے رحم بلکہ خود غرض بھی ہے۔ وہ مجھے ایسا ہی سمجھتی ہے، ایک بستر پر ہوتے ہوئے بھی مجھے نہ تو قریب آنے دیتی ہے اور نہ چھونے۔ کبھی کبھی دو انسان جو ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، ایک دوسرے سے سخت نفرت کیوں کرنے لگتے ہیں؟ نفرت کرتے ہوئے بھی کس قدر بے بس نظر آتے ہیں۔ اب تو ہم ایک دوسرے سے الگ بھی نہیں ہو سکتے۔ ساتھ رہے جانے سے زیادہ مشکل الگ ہو جانا ہوتا ہے۔ الگ ہو جانے کا احساس ہمارے لیے سخت اذیت ناک بن گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم کبھی بھی الگ نہیں ہو سکیں گے۔ ہمیشہ کڑھتے رہیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں گے۔ اور ایک دوسرے پر برتن اور گھر کے استعمال کی چیزیں پیچھتے رہیں گے۔ اور پھر کبھی کبھی بے اختیار ہو کر ایک دوسرے کو پکار بھی کرتے رہیں گے۔ کتنی عجیب زندگی ہے شاہین! محبت کی شادی ایسی ہی ہوتی ہے۔ یہ تو ناکام محبت ہے۔ کاش! میں نے محبت کی شادی نہ کی ہوئی۔ اس نے جلد شادی کرنے کے لیے کہا تھا، وہ ماں بننے والی تھی۔ یہ جھوٹ تھا، کیا تمہیں میری دکھ بھری کہانی سن کر کچھ عجیب سا محسوس نہیں ہو رہا ہے؟ تمہارے دل میں میرے لیے ہمدردی محسوس ہو رہی ہے، اس ناکام محبت پر ترس آ رہا ہے؟“

کاشف نے کتنا عجیب سا سوال کر دیا تھا..... جس کے لیے وہ اتنی بڑی دنیا میں اکیلے رہ گئی تھی۔ اس ہمدردی کی بات سن کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے لفظ ہمدردی میرے سینے میں کسی خنجر کی طرح پیوست ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو بہنے لگے تو میں نے کالا چشمہ لگالیا۔ اتفاق سے صرف دو میزوں پر دو جوان جوڑے براجمان تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ہماری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا بھی ٹھہرا تو میں نے کاشف کو کچھ اور بھی بتایا تھا کہ..... میں اکیلی فلیٹ میں رہتی ہوں۔ میرے پڑوسی ایسے ہیں۔ کبھی انہوں نے مجھے شک

بھری نظروں سے نہیں دیکھا اور وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اور پھر فلیٹ ایسا ہے کہ کسی کی آمد و رفت کے بارے میں انہیں ہوا تک نہ لگے۔ اور پھر میں نے اسے جتادیا اور اس پر صاف کھل کر واضح کر دیا کہ میں نے اپنے شوہر سے تم سے زیادہ محبت کی ہے لیکن میرے شوہر نے میری محبت کا احساس نہیں کیا..... ورنہ وہ اس دنیا سے اتنی جلدی رخصت نہ ہوتا۔ نہ جانے کیوں اسے میری محبت پر اور مجھ پر بے اعتمادی تھی؟ میں نے ویٹر سے کہا کہ کیا وہ کسی سے معلوم کر سکتا ہے کہ گاڑی کی روانگی میں ابھی کتنی دیر ہے۔ میں نے اسے پچاس کا ایک نوٹ تمھارے پاس دے کر بتایا کہ مزید ایک ڈیڑھ گھنٹا لگے گا، پھر میں نے بیچ نکھوایا۔

”مجھے بے جان کر بہت افسوس ہو رہا ہے کہ میرے باعث ایک شخص موت کی نیند سو گیا۔“ کاشف نے کہا ”حالانکہ میں نے صرف تم سے محبت کی تھی۔ اس محبت کی ناکامی کا پس منظر تم نے اسے بھی بتایا تو نہیں تھا؟“

”نہیں۔“ میں سرخ سی ہو کر بولی ”عورت ایسے راز نہ تو شوہر کو بتاتی ہے اور نہ کسی کنبھلی کو۔ تمہاری دست درازی تو میں نے بڑی حد تک برداشت کر لی تھی لیکن حد سے تجاوز کرنا میں ایک شریف لڑکی ہونے کے ناتے کیسے برداشت کرتی۔ اس لیے میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اگر تم پہلی طرح حد میں رہتے تو آج ہم دونوں ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہوتے۔“

”تم اس بات کا اعتراف کیوں نہیں کرتی ہو؟ میرے بہنکے کا سبب تمہاری بے جا تکی تھی۔ تم نے اس روز وہ لباس پہن کر مجھ سے ملنے آتے وقت یہ کیوں نہیں سوچا کہ میں بہک نہ جاؤں؟ اس لیے کہ میں مرد ہوں۔“

”اب چھوڑو، اس بات کو۔ اس میں غلطی ہم دونوں کی تھی۔ تمہاری دست درازیاں پر میں نے مزاحمت نہیں کی تو تم نے مجھے غلط سمجھ لیا کہ میں تمہاری توجہ کے لیے ایسا لباس پہن کر آئی ہوں۔“ میں نے کہا۔

سامنے کافی رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک ہم دونوں کچھ کہے بغیر بیٹھے رہے، جیسے کوئی کنگے ہو گئے ہوں۔ ہم دونوں کے پاس کنبے کے لیے کچھ نہ رہا تھا۔ الفاظ کا خزانہ جیسے ہم لٹا کر بیٹھے تھے۔ وہ اپنی پہلی سی محبت مانگ رہا تھا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں؟ دل کو ٹھوٹا، میں سوچ رہی تھی کہ ویٹر ملے آیا۔ پھر وہ برتن سینے لگا تو میں اس رومانی جوڑے کو دیکھ رہی تھی جو چند لمحوں قبل آیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں محبت کے چراغ روشن تھے لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا، اس کے چپکے اور باتوں کے انداز سے وہ ایک خالی برتن ہو کر رہ گئی ہے۔ مرد نے محبت کے نام پر اسے لوٹ لیا ہے۔ اگر انہوں نے شادی کر بھی لی تو کیا یہ محبت کامیاب رہے گی؟ میں نے اکثر دیکھا اور سنا تھا کہ یہ جوان جوڑے جو محبت کرتے ہیں اور لڑکی اپنا سب کچھ بچھار کر دیتی ہے تو پھر یہ محبت ناکام ہو جاتی ہے۔ کسی نہ کسی طرح شادی ہو گئی تو زیادہ نہیں چلتی۔ باسی کڑھی میں اُبال آ جاتا ہے۔

میرے دل میں اس کی سوئی محبت اگڑائی لینے لگی۔ وہ جو بھی تھا، جیسا بھی تھا میری پہلی محبت تھا۔ لیکن اب تو وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ مجھ سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک بھکاری کی طرح بھیک کے لیے ترس رہا تھا۔ میں جواب موزوں کر رہی تھی کہ ویٹر دوبارہ کافی لے آیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے کافی کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ اپنی پیالی تمام لی پھر وہ کنبے لگا۔

”شاہینہ جان! جان تمنا! میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری بد قسمتی کا دراصل میں ہی ذمے دار اور تمہارا مجرم ہوں۔ لیکن تمہی بتاؤ کہ میں اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ میں حالات کے دلدل میں گردن تک و جھنچکا ہوں۔ میں اس سے لٹکنا تو دور کی بات ہے، اس میں فریب و حسنا چلا جاؤں گا، کیونکہ سامنے دلدل ہے۔ تنکے کا سہارا بھی نہیں ہے کہ نکل سکوں۔ لیکن اب مجھے تم ایک تنکے کی طرح محسوس ہو رہی ہو، تم اس دلدل سے نکال سکتی ہو۔ میں نے کسی نہ کسی طرح خاصی رقم بینک میں جمع کی ہوئی ہے جس کے متعلق میری بیوی کو علم نہیں ہے۔ مجھے دو ایک سو دو لاکھ میں بڑا اچھا کمیشن ملا تھا۔ میں وہ رقم تمہیں دینا چاہتا ہوں کہ کبھی تم مالی مشکلات میں نہ گھر جاؤ۔ تم چاہو تو میری محبت کی حفاظت میں آ جاؤ۔ سرمایہ ہو تو زندگی میں بھر جانا جاسکتے ہیں۔ کم سے کم آدمی کو کھڑے ہونے کا احساس تو پریشان

نہیں کرے گا۔ میں اندرون سندھ کا ایک چکر ایک چکر میں مکمل کر لیتا ہوں۔ پھر میں تمہارے پاس دو ایک دن کے لیے آ جاؤں گا۔ بیوی کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ میں سات دن یا بارہ دن یا پھر کیوں رہتا ہوں؟ اسے تو صرف پیسے سے غرض ہوتی ہے۔ تمہیں جب بھی میری ضرورت ہو ایک مس کال دے دینا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری مالی مدد کرتا رہوں۔ لیکن میں تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ صرف محبت کروں گا۔ محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہے۔ شادی ایک ایسا بندھن ہے جو کچھ دھاگے سے بھی کم زور ہے اور ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن محبت کا بندھن بہت مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے۔ ہم میاں بیوی کی طرح محبت کی بھرپور زندگی گزار سکتے ہیں۔ ایسی محبت بھی ناکام نہیں ہوتی۔ کیا تمہیں یہ محبت کی نئی زندگی منظور ہے؟“

میں اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میری خاموشی سے وہ کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ویٹر نے آ کر بتایا جسے میں نے پچاس کا نوٹ دیا تھا کہ گاڑی کا انجن ٹھیک ہے۔ وہ پندرہ منٹ بعد روانہ ہو جائے گی۔ میں میں خود ادا کرنا چاہتی تھی لیکن کاشف نے ادا کر دیا پھر ہم اسٹیشن کی عمارت میں آ گئے۔ کاشف کسی اور گاڑی سے نواب شاہ جا رہا تھا۔ وہ گاڑی تک رخصت کرنے آیا تو کہتا رہا تھا۔ محبت..... شادی کے بندھن کا نام نہیں ہے، یہ اس سے بھی بلند ہے۔

جب گاڑی چل پڑی تو میں دیر تک ذہنی کشش میں مبتلا رہی اور سوچتی رہی، کیا کروں؟ کیا میں پھر سے پہلی محبت سے رشتہ بنا جاؤں؟ اس کی مجھ بے بن جاؤں۔ گاڑی کی روانگی تک کھڑکی کے باہر کاشف سر جھکا کر جواب کے انتظار میں کھڑا تھا۔ پھر خود ہی بولا ”ہاں شاہینہ! تم نے کیا سوچا کیا فیصلہ کیا؟ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟ کیا تمہیں میری محبت پر اعتبار نہیں ہے؟ میں چونکہ بہت دھمی اور پریشان ہوں، محبت کا بھوکا ہوں اس لیے پہلے سے شدت سے چاہوں گا۔ میری محبت مثالی ہوگی۔“

لیکن اس کپل کے ہزاروں حصے میں، میں نے بہت کچھ سوچا تھا۔ کیا میں ایک بیوہ کی طرح زندگی گزاروں؟ یا اس کی مجھ بے بن جاؤں؟ میں نے چشم تصور میں دیکھا کہ کاشف بہت سارے شخصوں سمیت میرے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ لیکن دروازے پر کسی نام کی کوئی تکی نہیں ہے۔ یہ کسی کا گھر بھی نہیں ہے۔ اگرچہ اس گھر میں

عشق کی انتہا

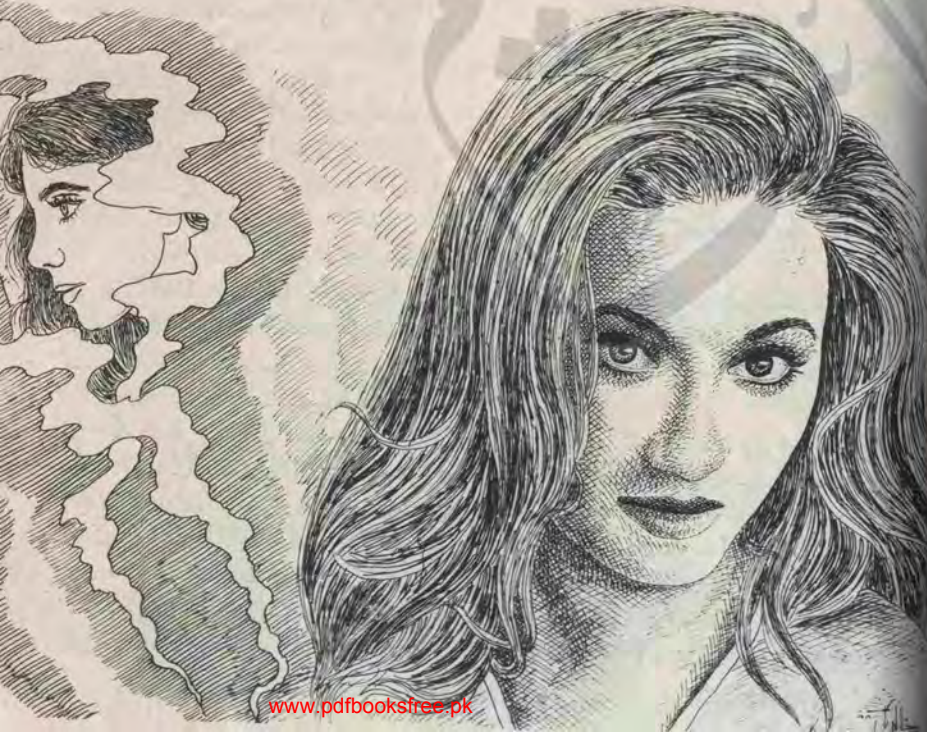
محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!

عشق ناکام کے لیے جتنی بھی آپ بیتیاں آپ تک پہنچی ہوں گی، یہ اُن
سب سے الگ سچ بیانی ہے جو مجھے بھولتے نہیں بھولتی۔ امید ہے یہ
مجھ بیٹی آپ کو بھی پسند آئے گی۔
نیلوفر یاسمین
(راولپنڈی)

مگر میرے نزدیک اسے محبت تو کہہ سکتے ہیں، عشق نہیں۔
کیونکہ عشق ایک اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے جو عورت اور مرد کے
درمیان ہی واضح ہو یہ ضروری نہیں، جیسا کہ عشق کی ایک قسم
کا میں نے مشاہدہ کیا۔

قلاں لڑکی کو قلاں لڑکے سے عشق ہو گیا،
ایسی اطلاعات آپ تک بھی پہنچی ہوں گی۔
یہ باتیں یعنی عورت اور مرد کے درمیان محبت
کا ہو جانا ایک فطری بات ہے۔ اسی کو لوگ عشق کہہ دیتے ہیں

عشق ناکام
نمبر



جب گاڑی نڈو آدم کے ریلوے اسٹیشن پر رکی تو مجھے
یقین نہیں آیا۔ نصف سے زیادہ پلیٹ فارم پر مجھے لینے اور
استقبال کرنے کے لیے طلباء اور طالبات نہیں بلکہ پرنسپل.....
لیکچرر زاور پروفیسر بھی آئے ہوئے تھے۔ ایسا لگا تھا کہ
سارا کالج امد آ رہا ہو۔ کالج کی طرف جاتے ہوئے پرنسپل نے
بڑی اپنائیت سے کہا ”ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر آپ ہماری
استدعا قبول کر لیں تو سجاد مرحوم کی خالی سیٹ آپ کو دے
دیں۔ نہ صرف تمام طالب علم اور عملہ بھی خوش ہو جائے گا
اس لیے کہ آپ نہیں جانتیں کہ سجاد نے کتنی جلدی انہیں
اپنا اسیر بنایا تھا۔“

کالج کے عقب میں جو بہت بڑا میدان تھا کرکٹ اور
فٹ بال کے کھیل کے لیے مخصوص تھا۔ اتنا بڑا پنڈال تھا اور
طالب علموں سے کچھ کچھ بھرا ہوا۔ اتنا بڑا ایجنج تھا کہ میرے
وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کے پیچھے بنز کے پاس بہت
بڑا سجاد کا پورٹریٹ لگا ہوا تھا۔ میں نے اس پورٹریٹ کو پہلی
بار بڑے غور سے دیکھا۔ سجاد کی آنکھوں میں مجھے کبھی اتنا
گہرا سمندر دکھائی نہیں دیا تھا۔ ”اور احساس کا ایک پرسکون
سمندر۔ طالب علم اس سے وہی کچھ بڑھنا چاہتے تھے جو وہ
انہیں پڑھاتا رہا تھا۔ ایک دہی اور ناکام محبت نے انہیں کیا
پڑھا ہوا ہوگا۔ آخر یہ لوگ اس سے اس قدر متاثر کیوں تھے؟
سجاد کوئی بڑا انسان نہیں تھا جیسا اس پورٹریٹ میں دکھائی دیتا
تھا۔ بس ایک عام قسم کا انسان تھا۔ اندر سے ٹوٹا ہوا، باہر سے
بھی یقیناً ٹوٹا ہوا۔ ممکن ہے کہ ٹوٹنے کے احساس ہی نے
اسے ذہن بنادیا ہو۔ اس قدر ذہین کہ چھوٹے بڑے سب
ہی اس کے گردیدہ ہو گئے۔ اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ
کو یہ لوگ خراج عقیدت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ نہ جانے
کیوں مجھے اپنے اندر ایک اُن جانا خوف محسوس ہوا۔
میں نے دیکھا کہ اس پورٹریٹ کا سایہ مجھ پر پڑ رہا ہے۔ اور
پھر پتا چلا کہ اس نے اپنا مکان اور رکھیت، کالج کے ان طالب
علموں کے نام لکھ دیا جو تعلیمی اخراجات کی استطاعت نہیں
رکھتے تھے۔ اس نے میرے نام ایک خط چھوڑا تھا جو مجھے
واپسی کے وقت دیا تھا۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا۔

”شاہینا!

”میں تمہارے نام اپنی ناکام محبت چھوڑے جا رہا
ہوں۔ جو تمہیں ساری زندگی درد دیتی رہے گی۔
سجاد..... جس کی تم نہ سکیں۔“

صرف میں ہی رہتی ہوں۔ پھر وہ اندر گھس آتا ہے۔ پھر وہ
سارے تختے ایک طرف پھینک کر مجھے اپنے بازوؤں میں
بڑے جذباتی اور وارسی سے گھر لیتا ہے۔ پھر وہ میرے ساتھ
دو تین دن رہتا ہے۔ پھر وہ سپیل بیک آگیا کر چل دیتا ہے۔
پھر جب وہ میرے ساتھ نہیں رہتا ہے تو پھر ایک گول منول
اور حسین عورت جس کے حسن کا ظلم اس کے موٹے،
بھدے ہونے سے اپنی شش کو کچا ہے، میری نظروں کے
سامنے اپنے دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑے کھڑی ہو جاتی ہے۔
بچے جب کبھی چیز کی فرمائش کرتے ہیں، انہیں بارہی جاتی ہے۔
لیکن کاشف بھی اس کے سامنے نہیں آتا۔ کبھی بھی وہ ایک
طرف کھڑا اپنی بیوی کو گھورا کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی باتوں
سے چڑ کر میرے پاس آ جاتا ہے۔ وہ تحائف دے کر یہ کہتا
ہے کہ میں ایک عورت ہونے کے ناتے خوش ہو جایا کروں
گی۔ اس پر بڑی فیاضی سے مہربان ہو جایا کروں گی۔ ہر
آدی اپنے تحفوں کے بدلے میں عورت کو اپنی ملکیت سمجھ لیتا
ہے۔ ایک کھلونا..... وہ یہی سمجھے گا کہ میں اپنی ایک خواہش
کے آگے کتنی بے بس ہوں، ہر عورت کو وہ ایسا ہی سمجھتا ہے۔
بہت ساری خوش نما اور قیمتی چیزوں کے عوض وہ اپنی ہر
خواہش پوری کرنا چاہے گا۔ بالکل ایک کاروبار کی طرح۔

کیا محبت ایسی ہی ہوتی ہے؟ کیا میں اپنا وجود آلودہ،
محبت اور دروغ..... نہاں خانے..... ستر، میں انکار کروں تو
کیا وہ ناراض ہو جائے گا؟ یہ محبت جو میں بہت کچھ کھو کر
پاؤں گی وہ ناکام ہو جائے گی۔ کیا میں اس کی داشتہ بن
جاؤں؟ پھر مجھ میں اور داشتہ میں کیا فرق رہے گا؟ وہ شادی
کر کے بھی تو اپنی بیوی کے علم میں لائے بغیر زندگی گزار سکتا
ہے۔ میں غلاقت کے سمندر میں گر جاؤں..... میں کوئی
پورپی عورت نہیں ہوں۔ اس ملک کی ہوں، مذہب سے گہرا
تعلق ہے۔ مجھے بہت سے ایسے مل جائیں گے جو میرا ہاتھ
تھام لیں گے۔ گھر بسالیں گے۔ کیونکہ میں آج بھی حسین
ہوں، پرکشش اور جوان بھی ہوں۔

اچانک گاڑی نے چلنے کے لیے سیٹی بجادی۔ پھر یک
لخت میرے اندر کی کوئی سوئی ہوئی محبت ایک دم سے
ہڑ ہڑا کر بیدار ہو گئی۔ میرے اندر ایک بہت تیز قسم کی حرکت
نے جنم لیا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ گاڑی
ریٹنے لگی تو وہ پلیٹ فارم پر چلنے لگا۔ میں بہت خاموش اور
ثابت قدم تھی، اعصابی جنگ سے آزاد۔ یہ میرا جواب تھا
کاشف کو اس کے سوال کا۔



اس دن میں اخبار دیکھ رہی تھی کہ میری نظر ایک اشتہار پر پڑ گئی۔

اشتہار یہ تھا کہ ایک گھر میں ایک خاتون کو ایک ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو گھسنے پڑھنے کا کام کر سکے۔ میں ان دنوں بی اے کر کے گھر میں پوری پوری تھی۔

ایم اے کا ارادہ تھا لیکن ابھی تک ایڈمیشن فارم وغیرہ نہیں آئے تھے۔ اسی لیے میں نے سوچا کیوں نہ یہ کام کر کے دیکھا جائے۔ اس طرح کچھ پیسہ ہی آگے۔

میں نے اپنے گھر والوں سے ذکر کیا تو انہوں نے اجازت تو دے دی لیکن اس شرط پر کہ میں پہلے وہاں کا ماحول دیکھ لوں۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں۔

میں اس پتے پر پہنچی۔

وہ شہر کے ایک صاف ستھرے علاقے کا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ خوبصورت بنا ہوا۔ میں نے کھٹی بھائی تو کھٹی کے جواب میں جس نے دروازہ کھولا میں اسے دیکھ کر کانپ کر رہ گئی تھی۔

وہ ایک عورت تھی۔ لیکن اس کی عمر کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ اس کا پورا چہرہ بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ سر کے بال تک اڑے ہوئے تھے۔ بہت ہی بھیا تک شکل تھی اس کی۔

اس کی آواز بھی بہت دہشت ناک سرسراتی ہوئی سی تھی۔ ”کیا بات ہے۔ کیوں آئی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

میری زبان لڑکھانے لگی تھی۔ ”وہ اس گھر سے ایک اشتہار شائع ہوا ہے۔ اس لیے آئی ہوں۔“

”ہوں۔“ اس نے ایک ہنکارتی۔ ”سمجھ گئی۔ یہ آ پا کا کام ہوگا۔ آؤ اندر آ جاؤ۔“

میں خوفزدہ سی اندر آ گئی۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔ بہت سلیقہ کا ڈرائنگ روم تھا۔ ہر چیز سے نفاست اور خوبصورتی کا اظہار ہو رہا تھا۔ سوائے اس عورت کے جو ایک بھیا تک خواب کی طرح تھی۔

وہ عورت مجھے بٹھا کر کمرے سے چلی گئی۔

کچھ دیر بعد ایک دوسری عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک نابل عورت تھی۔ یعنی اس کے چہرے پر اس قسم کا کوئی نشان وغیرہ نہیں تھا۔ لیکن خدا کی پناہ۔ جب اس نے اپنے ہاتھ آگے کئے تو ایک بار پھر میں لرز کر رہ گئی تھی۔

اس کے دونوں ہاتھ جھلے ہوئے تھے۔

نہ جانے یہ کیا ممتا تھا۔ ایک کا چہرہ جھلسا ہوا تھا دوسرے کے ہاتھ۔ مجھے اس گھر سے خوف محسوس ہونے لگا لیکن اب تو

آئی گئی تھی۔ اس لیے کسی نہ کسی طرح کچھ وقت گزارا تھا۔

”اشتہار دیکھ کر آئی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے گردن ہلا دی۔

”تم اردو لکھ لیتی ہو؟“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”کیوں نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”مجھے ضرورت ہے۔“ اس نے اپنے جملے ہوئے ہاتھ آگے کر دیئے۔ ”تم دیکھ سکتی ہو کہ میں ان جملے ہاتھوں سے لکھ نہیں سکتی۔“ اس نے کہا۔ ”اسی لیے میں بولتی رہوں گی اور تم لکھتی رہنا۔“

”جی ہاں۔“ میں یہ کام یہ خوبی کر سکتی ہوں۔“

”تمہاری تنخواہ دس ہزار روپے ہوگی۔“ اس نے بتایا۔

دس ہزار ایک اچھی تنخواہ تھی۔ ورنہ اگر میں اس سکول وغیرہ میں جاب کرتی تو چار پانچ ہزار سے زیادہ کما ل سکتا تھا۔ لیکن یہاں کا ماحول۔ یہ مجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ایک عورت جس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ پھر دوسری عورت۔ جس کے ہاتھ جھلے ہوئے تھے اور مجھے اس عورت کا ایک طرح سے سیکرٹری بننا تھا۔

”بتاؤ۔ کیا کہتی ہو؟“ اس عورت نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے میڈم۔ میں کل سے آ جاؤں گی۔“ میں نے کہا۔

”میڈم نہیں۔ میرا نام دردانہ ہے۔“ اس نے بتایا۔

”دردانہ آغا۔ تمہیں اگر گھسنے پڑھنے کا شوق ہے تو تم نے میرے ناولز ضرور پڑھے ہوں گے۔“

”اوہ۔ کیوں نہیں۔“ میں جلدی سے بولی۔ ”تو آپ ہیں دردانہ آغا۔“

”ہاں۔“ اس کے لہجے میں جھلکے سے تفاخر کے ساتھ تھوڑا سا دکھ بھی تھا۔ ”میں ہی دردانہ آغا ہوں، مشہور رائٹر۔ جس کے ہاتھ جھلے ہوئے ہیں اور جو خود سے لکھ بھی نہیں سکتی۔“

”یہ حادثہ۔“ میں نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ نہ جانے وہ کیا خیال کرے۔ کہیں تجربہ مان جائے۔

”تو پھر تم کل دس بجے سے آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔

”میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

میں نے جب گھر آ کر یہ سب بتایا تو سب ہی حیران رہ گئے۔ ”بیٹا۔ میرا خیال ہے کہ تم ایسی لڑکی پر اسرار جگہ پر

لازمت مت کرو۔“ امی نے کہا۔

”کچھ نہیں امی۔ وہ ایک مشہور عورت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ ہوا ہے۔ ویسے دونوں ہی نابل ہیں۔“

”اور وہ دونوں ایک دوسرے کی کزن ہیں۔“ ابو نے پوچھا۔

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے ابھی اس سے پوچھا نہیں ہے۔“

”بہر حال، محتاط رہنا۔“

میں دوسری صبح دس بجے اس مکان میں پہنچ گئی۔

دردانہ اسی عورت نے کھولا جس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک خاموش طبع عورت تھی۔ باتیں کرنا شاید پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے مجھے لاؤنج میں لے جا کر بٹھایا اور خود باہر چلی گئی۔

اس لاؤنج کی سجاوٹ بھی بہت خوبصورت تھی۔ ایک طرف کتابوں کا ریک تھا۔ اس ریک کے برابر میں ایک چھوٹی سی میز تھی۔ جس پر ایک بڑی سی فریم کی ہوئی تصویر رکھی ہوئی تھی۔

وہ تصویر ایک خوبصورت لڑکی کی تھی۔

میں نے ایسے پرکشش چہرے کبھی دیکھے ہوں گے۔ کیا لڑکی تھی۔ کیا چہرہ تھا۔ انتہائی خوبصورت آنکھیں۔ ستواں ناک۔ کسائی چہرہ۔ غرضیکہ صحیح معنوں میں وہ تصویر ایک خوبصورت لڑکی کی تھی۔

میں اس تصویر کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ لاؤنج میں کسی کی آمد کا احساس بھی نہیں ہوسکا۔

”کیا دیکھ رہی ہو۔“ آواز گونجی اور میں بڑی طرح چونک اٹھی۔ یہ وہی عورت تھی۔ جھلے ہوئے چہرے والی۔ جو ایک ٹرے میں چائے لے کر آئی تھی۔

”چائے پیو۔ تمہاری باس آ رہی ہیں۔“ اس نے اپنی سرسراتی ہوئی آواز میں کہا اور رے میز پر رکھ دی۔

”شکریہ۔“

وہ جانے لگی۔ پھر جاتے جاتے اچانک پلٹ کر میرے پاس آئی۔ ”جانتی ہو یہ تصویر کس کی ہے؟“ اس نے اشارہ کیا۔

”جی نہیں۔ یہ میں نہیں جانتی۔“ میں نے کہا۔

”یہ میں ہوں۔“ اس نے اپنی سرسراتی ہوئی آواز میں بتایا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ جو مجھے بہت

254

ماہنامہ سرگزشت

بھیا تک محسوس ہوئی۔

وہ انتہائی کرکمرے سے باہر چلی گئی۔ میرے خدا۔ کیا یہ تصویر اس کی ہو سکتی تھی؟ کیا یہ ممکن تھا؟ اگر وہ سچ کہہ رہی تھی تو یہ کتنی بھیا تک اور کتنی چٹائی تھی کہ اتنی خوبصورت لڑکی کا یہ حال ہو گیا تھا۔ خدا جانے اس کا چہرہ کس طرح مسخ ہو گیا ہوگا۔ کیا ساتھ ہوا ہوگا؟

کچھ دیر بعد دردانہ آغا لاؤنج میں داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر احترازاں کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں رائٹنگ پیڈ ز اور پوائنٹر تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے اشارہ کیا۔ ”اور یہ سب سنبھالو۔ تمہارا کام شروع ہو رہا ہے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے قلم کاغذ سنبھال لیا تھا۔

”میں آج سے ایک نیا افسانہ شروع کر رہی ہوں۔“

اس نے بتایا۔ ”یہ ایک بہت عجیب کہانی ہے۔ اس میں تنہائی کا کرب بھی شامل ہے اور خود غرضی کی انتہا بھی ہے۔“

”جی ہاں۔ آپ بتائیں، میں لکھ رہی ہوں۔“

اس نے آہستہ آہستہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں لکھوانا شروع کر دیا۔ اس نے مجھے ہیرا افنگ بتائی۔ یہ بتایا کہ کس طرح جملہ ختم ہونے کے بعد دوسری لائن میں جملہ کہاں سے شروع کیا جاتا ہے۔

اس کے بارے میں میرے جو تاثرات تھے۔ وہ ختم ہونے لگے تھے۔ اس کی آواز میں شفقت بھی تھی اور ایک ادیب کا علم بھی بول رہا تھا۔

اس نے ایک ایسی لڑکی کی کہانی لکھوائی تھی جو بہاؤوں کے درمیان ایک دکھش واوی میں رہا کرتی تھی۔ اس کا محبوب اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بظاہر تو یہ عام ہی کہانی تھی لیکن اس نے بہت خوبصورت انداز دیا تھا۔ اس دن وہ کہانی مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے اس کہانی کو اگلے دن کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔

میں نے گھر آ کر بتایا کہ میں اس جگہ سے مطمئن ہوں۔ پھر جب یہ بتایا کہ جھلے ہوئے چہرے والی اپنے زمانے میں بہت خوبصورت تھی تو سب کو یہ سن کر حیرت ہوئی۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ کہانی چونکہ طویل تھی۔ اس لیے دوسرے دن بھی مکمل نہیں ہو سکی۔ البتہ تیسرے دن جب میں نے دروازے کی کھٹی بھائی تو اس دفعہ دردانہ آغا نے دروازہ کھولا۔ ”جاؤ۔ لاؤنج میں جا کر بیٹھ

255

www.pdfbooksfree.pk

اگست 2012ء

www.pdfbooksfree.pk

اگست 2012ء

www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میں اس کم بخت کا مزاج ٹھیک کر کے آتی ہوں۔“

وہ غصے میں معلوم ہوتی تھی اور اس نے یہ جملہ بھینا اسی جہلے ہوئے چہرے والی کے لیے کہا ہوگا۔ میں لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی لاؤنج میں آ گئی۔ اب اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ”اب بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کبھی کبھی بے وجہ ضد کرنے لگتی ہے۔“

”میڈم۔ اگر آپ برآمدہ مائیں تو کیا یہ پوچھ سکتی ہوں کہ ان سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔“

”کیوں نہیں۔ وہ فرزانہ ہے۔ میری چھوٹی بہن۔“

دردانہ نے بتایا۔ ”میں نے اپنی اولاد کی طرح اس کی پرورش کی ہے۔“

”وہ تو بہت خوبصورت تھیں میڈم۔“ میں نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ”پھر یہ کیا ہوا کہ۔“

”لڑکی۔“ اس کی آواز میں اچانک سختی آ گئی تھی۔

”بہتر یہی ہے کہ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ تمہیں ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔“

”سوری میڈم۔“ میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”چلو۔ کام شروع کرو۔“ اس نے کہا۔

اس نے پھر لکھوانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے سختی سے نہیں بولنا چاہیے تھا۔ اسی لیے وہ نرم لہجے میں بولی۔ ”فرزانہ کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی تم اس بارے میں جان سکو لیکن ابھی نہیں۔“

”میں میڈم۔“

اس نے پھر کہانی ڈکٹٹ کروانی شروع کر دی۔ کہانی بہت خوبصورت جاری تھی۔ اس میں کئی موڑ تھے۔ کرداروں کی ہیئت بہت مضبوط تھی۔ احساس ہو رہا تھا کہ وہ واقعی ایک باکمال رائٹر ہے۔

وہ کہانی اسی دن ختم ہو گئی۔ جب میں جانے لگی تو اس نے کہا۔ ”سنو۔ میری عادت ہے کہ ہر کہانی کے خاتمے کے بعد میں ایک دن آرام کرتی ہوں۔ اب تم پرسوں آنا۔“

”ٹھیک ہے میڈم۔“

میں جب پرسوں صبح اس کے گھر پہنچی تو دروازہ کھولنے والی وہی اس کی بہن فرزانہ تھی۔ شاید وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی کیونکہ اس کے جہلے ہوئے ہونٹ اسی انداز سے پھیلے ہوئے تھے۔

”آؤ۔ آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”آج تمہاری باس آرام کر رہی ہیں۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی۔“

”اوہ۔ تو پھر میں چلتی ہوں۔“

”نہیں۔ اتنی جلدی کہاں جارہی ہو۔“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آج ہی تو موقع ملا ہے کہ میں بھی تمہیں ایک کہانی بتا سکوں۔ ورنہ آپا موقع ہی کہاں دیتی ہیں۔“

مجھے ویسے بھی اتنی جلدی گھر واپس نہیں جانا تھا۔ پھر وہ جو کچھ مجھے بتانے والی تھی۔ وہ بھینا کوئی دلچسپ بات ہوتی اسی لیے میں اس کے ساتھ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔

”لڑکی۔ میں نے آج تک تمہارا نام نہیں معلوم کیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”نیووفر۔“ میں نے اپنا نام بتایا۔

”نیووفر۔ یہ کہانی جو میں تمہیں سنارہی ہوں۔ تمہارے لکھنے کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یاد رکھنے کے لیے ہے۔ تم صرف یاد رکھنا۔ ہو سکتا ہے کبھی نہ کبھی تمہارے لیے ضرورت پیش آ جائے۔“

”جی فرمائیں۔ میں سن رہی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”یہ کہانی دو بہنوں کی ہے۔“ اس نے اپنی سرسراتی ہوئی آواز میں بتانا شروع کیا۔ ”دونوں نے ایک دوسرے سے بہت محبت کی کیونکہ پوری دنیا میں ان دونوں کا ایک دوسرے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر زندہ رہتی تھیں۔ ایک بیمار ہوتی تو دوسری بھی بیمار پڑ جاتی۔ ایک خوش ہوتی تو دوسری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی۔ ایک کو کچھ ہوتا تو دوسری بے قرار ہو جاتی۔ دونوں ایک ساتھ گھر سے لٹکا کرتیں اور ساتھ واپس آیا کرتیں۔ بہت سے لوگ دونوں کی محبت کو رشک سے دیکھا کرتے تھے۔ اب تم یہ کہو گی کہ یہ تو ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ ہمیں تو ایک دوسرے سے محبت کرنی ہی ہیں۔ یہ درست ہے لیکن ان دونوں کی محبت بے مثال تھی۔ عشق کی انتہا تھی، اس کا کسی اور سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔“

”اگر آپ ایسا کہہ رہی ہیں تو پھر واقعی ایسی ہی محبت ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”ایسا ہی تھا۔“ اس کی سرسراتی ہوئی آواز اور تیز ہو گئی تھی۔ ”تم ایسا سمجھ لو کہ ایک بار دونوں کو ایک ہی آدمی سے محبت ہو گئی۔ محبت کیا۔ تم اسے پسند سمجھو۔ دونوں نے ایک ہی لڑکے کو پسند کر لیا۔ ہاں۔ میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ چھوٹی

بہن بہت خوبصورت تھی اور بڑی بس واجبی صورت تھی۔ یہ بھی خدا کی مصلحت سمجھ لو۔ اس کے باوجود چھوٹی کو نہ احساس برتری تھا اور نہ بڑی کو کم تر کی کا احساس تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے سرپا قربان ہو کر رہ گئی تھیں۔ پھر یہ ہوا کہ ایک آدمی دونوں کو پسند آ گیا۔“

”اس وقت تو دونوں کے لیے ایک امتحان ہو گیا ہوگا میڈم۔“

”ہاں۔ بہت بڑا امتحان۔ اس میں ایک دشواری یہ تھی کہ اگر کسی ایک کی طرف اس آدمی کا جھکاؤ سمجھ میں آ جاتا تو معاملہ بہت آسان تھا لیکن وہ کم بخت دونوں کے ساتھ ایک جیسا رویہ رکھتا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی خاص مہربانی کس پر ہے۔ وہ اگر ایک طرف چھوٹی کے ساتھ آؤنگ پر جا رہا ہے تو دوسری طرف بڑی بھی اس کی مہربانیوں اور توجہ سے محروم نہیں ہے۔ اسی لیے دونوں بہنوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس پر مہربانی ہے یا کس کو پسند کرتا ہے۔“

”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی میڈم۔ یہ بات تو خود اس سے بھی معلوم ہو سکتی تھی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ یہ مرحلہ تو آیا تھا لیکن اس سے پہلے دونوں بہنیں ایک دوسرے کے حق میں دستبردار ہو چکی تھیں۔“ اس نے بتایا۔

”میں نہیں سمجھی میڈم۔ یہ کس طرح ہوا ہوگا؟“

”دونوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اس آدمی کو چھوڑ رہی ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”تا کہ دوسری اسے اپنالے۔ لیکن دونوں ہی اس بات پر ضد کرتی رہی تھیں کہ میں نہیں۔ تم اسے اپناؤ گی۔“

ابھی اس کی کہانی جاری ہی تھی کہ اچانک دردانہ آغا کمرے میں داخل ہو گئیں۔ وہ واقعی بیمار معلوم ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ایک شال لپیٹ رکھی تھی اور بری طرح کھانسی ہوئی کمرے میں آئی تھیں۔

ان کے آنے کے بعد کہانی کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

دردانہ آغا نے مجھ سے دو چار باتیں کیں۔ یہ بتایا کہ وہ دو چار دنوں تک کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ پھر میں اس سے اجازت لے کر ان گھر سے باہر آ گئی۔

کہانی دلچسپ تھی۔ دو بہنیں۔ ان میں سے ایک بہت خوبصورت اور دوسری نابل صورت کی۔ پھر درمیان میں ایک ایسا آدمی آ جاتا ہے۔ جس کی توجہ دونوں کی طرف ہوتی

ٹوٹے دلوں کی شاعری

فیض، ساحر اور ابنی انشا کی شاعری ہمیشہ میری دھڑکنوں میں رہی ہے۔ فیض کو ہمیشہ یہ کمال حاصل رہا کہ وہ جو بھی کہتے دل میں اُتر جاتا تھا کیونکہ تینوں ہی ٹوٹے ہوئے دلوں کی پکار کی لے نکلتا ہے۔ میں کئی ایسے لوگوں سے واقف ہوں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا مگر انہیں فیض کا پورا کلام زبانی یاد تھا۔ ساحر میں بھی فیض والی بات تھی یعنی دل میں اُتر جانے والی، کچھ تنگ نظر نقاد کہتے ہیں کہ اگر اردو شاعری میں فیض نہ ہوتے تو ساحر صلیب لونی بھی نہ ہوتے۔ دراصل یہ بات ابراہیم جلیس نے پھیلائی تھی مگر مذاق میں۔ جب ساحر اور جلیس کی آپس کی تکرار بڑھ جاتی تو وہ یہ بات کہتے تھے مگر چند لمحوں بعد وہی جلیس سب سے زیادہ ساحر کی تعریف کر رہے ہوتے تھے۔ ساحر نے جو نظم پر چھائیاں لکھی، یہ ادب میں سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں اس کا پورا رنگ ہویدا ہے۔ حیدر آباد (دکن) کے ایک مشاعرے میں ساحر نے یہ نظم پڑھی تھی۔ یہ نظم اتنی طویل تھی کہ ساحر کا تار ایک گھنٹے تک سناٹا اور داد و وصول کرتا رہا۔ بعد میں مجھے سجاد ظہیر نے اس نظم کے حوالے سے ایک ستائشی خط بھیجا کہ تمہارے دوست نے یہ نظم سنا کر مشاعرہ دہ لیا ہے۔

اقتباس: حمید اختر
مرسلہ: راجیل نواز، جھنگ

بجھے ایسی محبت کا۔ اس وقت میری جو کیفیت تھی۔ وہ میں بتا نہیں سکتی۔ مجھے اپنی پوری زندگی اکارت محسوس ہونے لگی تھی۔

غم اور غصے کی ایسی شدید حالت تھی کہ بس کچھ مت پوچھو۔ کیا کرنا چاہئے تھا مجھے۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جو مجھے بچو کے لگائے جا رہا تھا۔ میں سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ کسی بھی قیمت پر میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گی۔

اس وقت دردانہ آغا ہولے ہولے کاٹنے لگی تھی۔ شاید ماضی اسے یاد آ رہا تھا۔ یا اس کے اندر کے احساس نے اس کے وجود میں آگ لگا دی تھی۔

کہانی اب واقعی فیصلہ کن اور دلچسپ موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ اب صرف یہ معلوم ہونا تھا کہ دردانہ نے شادی کس طرح روکی ہوگی۔

میں ایسی ہزاروں کہانیاں سن چکی تھی۔ رقابت کا جذبہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے اور جب سے محبت کا کھیل شروع ہوا ہے۔ تب سے اب تک نہ جانے کتنے لوگ اس جذبہ رقابت کی جھینٹ چڑھ چکے

نہیں کی ہوگی۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تم جاؤ تو اس سے معلوم کر سکتی نیو فرا! میں اپنی محبت کے دغم میں تھی۔ اس محبت پر یقین تھا مجھے جو محبت میں نے فرزانہ سے کی تھی۔ میں نے اس کے لیے کتنی قربانیاں دی تھیں۔ والدین کی موت کے بعد ماں بن کر پرورش کی تھی اس کی۔ وہ میرے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ یہ میں اچھی طرح جانتی تھی۔ لیکن مجھے اس وقت شدید حیرت دکھ ہوا جب اس نے صاف صاف کہہ دیا۔“ ہاں آپا۔

میں نے خالد کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں شادی کے بعد اس کے ساتھ اس کے گھر میں رہوں گی۔“

”فرزانہ۔ کیا تو مجھے چھوڑ دے گی؟“

”ظاہر ہے آپا۔ میں کہاں تک شادی کئے بغیر تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اب تمہارا رشتہ تو آنے سے رہا۔ تو میں تمہارے ساتھ اپنی زندگی کیوں برباد کروں؟ مجھے جانے دو آپا۔ تم یہ مت خیال کر لینا کہ ہماری محبت میں کمی آ جائے گی۔ نہیں آپا۔ تمہاری محبت اپنی جگہ اور شادی کی زندگی اپنی جگہ۔“

”بس نیو فرا! میں تو ٹوٹ کر رہ گئی۔ کیا فائدہ ہوا تھا

تو جوان ہے۔ ابھی اس میں انگلیں ہیں۔ وہ ابھی آگے چل کر بہت کچھ دیکھے گی۔ اس کے سامنے خوشیوں سے بھری ہوئی زندگی پڑی ہے۔ تم اسے اپنا لو۔“

”دردانہ۔ کیا تم یہ کھلے دل سے کہہ رہی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ بالکل کھلے دل سے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ایک شرط کے ساتھ۔“

”وہ شرط کیا ہوگی؟“

”وہ شرط یہ ہے کہ شادی کے بعد تم بھی یہیں اس مکان میں ہمارے ساتھ رہو گے تاکہ فرزانہ میری نظروں کے سامنے رہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں دردانہ۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میرا اپنا گھر ہے۔ پوری فیملی ہے۔ میں کسی بھی حال میں اپنے خاندان کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر تم ہم دونوں کو بھول جاؤ۔“

”یہ بھی نہیں ہو سکتا۔“ خالد نے کہا۔ ”مجھے تم دونوں

میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے اور وہ بھی جلد سے جلد کیونکہ والدین مجھ پر شادی کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔“

”کچھ بھی ہو۔ شرط یہی ہوگی۔“ میں نے اسے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔

دو دنوں کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ”دردانہ۔ میں نے اب جا کر اپنا مائنڈ بنالیا ہے اور میں شادی کرنے کے لیے تیار ہو گیا ہوں۔“

”کس سے؟“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

”تمہاری بہن فرزانہ سے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیے وہی مناسب رہے گی اور میں اس سلسلے میں فرزانہ سے بھی بات کر لی ہے۔ وہ بھی تیار ہے۔“

”چلو۔ تم دونوں کو بہت مبارک ہو۔“ میں نے کہا۔

”لیکن وہ شرط برقرار رہے گی۔ چاہے تمہاری شادی فرزانہ سے ہو یا مجھ سے۔“

”لیکن فرزانہ تو کچھ اور کہہ رہی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”وہ کیا کہہ رہی ہے۔“

”وہ میرے ساتھ رہنے کو تیار ہے۔ وہ یہاں سے رخصت ہو کر میرے گھر چلی آئے گی۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نے ایسی کوئی بات

ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کو بے تاب ہیں۔ آگے نہیں معلوم کیا کیا ہوا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ یہ کہانی ان ہی دونوں کی تھی۔ دونوں ایک مکان میں رہنے والی۔ ایک دوسرے کے دکھ کھ میں شریک۔ ایک خوبصورت دوسری کم صورت۔ یہاں تک تو کہانی ان دونوں ہی کی تھی۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ یہ بھی کسی نہ کسی دن معلوم ہو ہی جاتا۔

دو دنوں کے بعد وہاں پہنچی تو دردانہ آغا کی طبیعت ٹھیک ہو چکی تھی۔ وہ اب کہانی کھولنے کے موڈ میں تھیں۔ لیکن جب میں نے قلم کاغذ سنجال کر ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے میں اس کہانی کو آگے بڑھا دوں۔“

”کس کہانی کو میڈم۔“

”وہی جو اس دن فرزانہ تمہیں سنارہی تھی۔ میں نے دروازے کے پیچھے سے وہ سب کچھ سن لیا تھا جو وہ تمہیں بتا رہی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ چلو اب یہ کہانی میں اس کے انجام تک پہنچاتی ہوں۔“

میں ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”پریشان مت ہو۔“ وہ مسکرا دیں۔ ”تمہیں شاید یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ یہ ہماری اپنی کہانی ہے۔ یعنی ہم دونوں بہنوں کی۔“

”جی ہاں میڈم۔ یہ اندازہ ہو گیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”قواب میں وہاں سے شروع کرتی ہوں۔ جہاں اس نے ختم کی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان ایک شخص آ گیا تھا۔ جس کی توجہ ہم دونوں پر تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ صرف میرا دل رکھنے کے لیے ایسا کر رہا ہے۔ اسی لیے میں نے ایک دن اس سے دریافت کیا۔“ خالد۔ میں جانتی ہوں کہ تم صرف میرا دل رکھنے کے لیے میری طرف توجہ دیتے ہو کیونکہ میں فرزانہ کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہوں جبکہ فرزانہ مجھ سے کہیں بہتر ہے۔“

”نہیں دردانہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں ایک دوراں پر آ کر کھڑا ہو چکا ہوں۔ میری نظر میں دونوں ایک ہیں۔ دونوں میں خوبیاں ہیں۔ تم میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو فرزانہ میں نہیں ہیں اور اس میں چند باتیں ایسی ہیں جو تم میں نہیں ہیں۔ اسی لیے میں کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔“

”چلو۔ اب میں تمہیں ایک آفر دیتی ہوں۔ تم فرزانہ سے شادی کر لو کیونکہ میری عمر تو نکلتی جا رہی ہے لیکن وہ ابھی

Advertisement Through

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to Millions of Our Readers, World Wide

JASOOSI DIGEST SUSPENSE DIGEST MONTHLY PAKEEZA MONTHLY SARGUZASHT

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
 PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
 Email : jdggroup@hotmail.com



پیل عشق

محترم معراج رسول
السلام علیکم!

میں سرگزشت کا بہت پُرانا قاری ہوں لیکن پہلی بار کوئی تحریر بھیج رہا ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ سرگزشت میں عشقِ ناکام کا اشتہار دیکھا۔ سوچا کہ میں بھی اپنی سوانح حیات لکھ دوں۔ چونکہ نہیں، کہنے کو یہ میری ایک ناکام عشق کی داستان ہے لیکن اسی پر میری زندگی تمام ہے کیونکہ اب تک میں اسی زخم کو سہلارہا ہوں، تنہا غمِ زندگی کا بوجھ احمد رضا انہارہا ہوں۔

کری ڈالے سائے ڈھولان کی طرف نظریں جمائے بیٹھا ہوں۔ تیز بارش نے سائے کا منظر دھندلا دیا ہے۔ اس کے باوجود میری نظریں ڈھولان سے آنے والی پگڈنڈی پر جمی ہوئی ہیں جیسے کسی کے آنے کا انتظار ہو۔ میں نے اپنے دل کو

آسمان گھرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور پانی کے شور نے عجیب سا لہجہ دیا ہے۔ میں اپنے کانچ کے برآمدے میں

عشقِ ناکام
نمبر

دونوں بہنوں کی المناک کہانی کا انجام سامنے آچکا تھا۔ کتنا بھانک اور وحشت زدہ انجام تھا۔ یہ عورت کتنی جنونی تھی۔ کتنی باکلی تھی۔ اب وہ ہنس رہی تھی۔ اس ہنسی میں دکھ بھی تھا۔ اس کے آنسو بھی پیسے جا رہے تھے۔

ایسا لگا جیسے اس کے جھپٹے ہوئے دونوں ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھ رہے ہوں۔ آہستہ آہستہ۔ نہ جانے ایسا خیال کیوں آ گیا تھا کہ اس عورت نے اپنی بہن کے چہرے کو اس لیے برباد کیا تھا کہ بہن شادی ہو کر کہیں دور نہ چلی جائے پھر یہ بھی تو ممکن تھا کہ اگر میں اس کی جاب چھوڑ دیتی تو یہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرتی۔ ایسی عورتوں کا کیا بھروسہ۔ یہ پاگل قسم کی عورتیں کچھ بھی کر سکتی ہیں۔

مجھے اس وقت اتنا خوف محسوس ہوا کہ میں کچھ کہے بغیر اٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی اس مکان سے باہر آ گئی۔ میں نے اس کی آوازیں سنیں۔ وہ مجھے بلارہی تھی۔ پکار رہی تھی لیکن میں نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ میں بس دوڑتی چلی گئی۔ میں نے گھر آ کر بتا دیا کہ میں نے وہ جاب چھوڑ دی ہے تو کسی نے اس پر افسوس کا اظہار نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک میری وہ جاب دیے بھی اس قابل نہیں تھی کہ میں اسے جاری رکھتی۔

میں دوبارہ مڑ کر وہاں نہیں گئی۔ پھر ایک دن (شاید چار مہینوں کے بعد) ان دونوں بہنوں کا انجام سامنے آ گیا۔ کہانی اب جا کر اپنے اختتام کو پہنچی گئی۔

اختیار میں مشہور رائٹر وردانہ آغا اور اس کی بہن کی موت کی خبر شائع ہوئی تھی۔ مجھے والوں نے دونوں کی لاشیں گھر سے باہر نکالی تھیں۔

اس مکان سے اٹھنے والی بدبو نے مجھے والوں کو پریشان کر دیا تھا۔ جب پولیس کی مدد سے مکان کا تالا توڑا گیا تو پتا چلا کہ دونوں مر چکی ہیں اور ان کی لاشیں کئی دن بُرائی ہیں اور دونوں کس طرح مریں، شاید یہ راز بھی معلوم نہ ہو سکے۔ مگر مجھے اندازہ ہے کہ اس کے پیچھے یہی بات ہوگی کہ ان میں سے کسی کو اپنی موت کے قریب ہونے کا مبالغہ ہو گیا ہوگا یا پھر دو ویں سے کسی ایک نے الگ ہونے کی کوشش کی ہوگی جس سے دوسری کو اپنے جذبہ عشق کی ناکامی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہوگا۔



ہیں۔ نہ جانے کتنی کہانیاں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں۔ نہ جانے کتنی فلمیں بن چکی ہوں گی؟ کچھ دیر بعد جب اس کی حالت سنسنیلی تو اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”میں نے فرزانہ کی شادی نہیں ہونے دی۔ میں یہ برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی اسی لیے میں نے۔ میں نے اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا۔“

”کیا؟“ میں اچھل پڑی۔ ”میڈم۔ آ۔ آپ نے اس کے چہرے کو لگا ڈالا ہے۔“

”ہاں۔ میں نے۔“ وہ اب آہستہ آہستہ رو رہی تھی۔ ”میں نے اس کے ساتھ ایسا کیا ہے کیونکہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ میں اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ تم ہی بتاؤ میں اور کس طرح روکتی۔“

”میرے خدا! آپ نے اپنی بہن کے اتنے خوبصورت چہرے کا ایسا حال کر دیا۔“

”ہاں۔“ وہ روئے جارہی تھی۔ ”خود میں نے اس کی زندگی برباد کر دی۔ جس کو میں نے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے ایسا سلوک کیا جانتی ہو کیوں؟“

”ظاہر ہے میڈم۔ رقابت چیز ہی ایسی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”رقابت نہیں بے وقوف۔ عشق کی انتہا۔ میں اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی اسی لیے میں نے اس کا چہرہ ہی لگا ڈیا کہ وہ کسی طرف بھی نہ جائے۔ کوئی بھی اس سے شادی کرنے کا نہیں سوچے اور ایسا ہی ہوا۔ جب اس کا چہرہ مسخ ہوا تو خالد نے شادی سے معذرت کر لی اور وہ میرے ساتھ رہنے کے لیے مجبور ہو گئی مگر فرزانہ کو اس کا زیادہ افسوس نہیں ہے کیونکہ وہ خود بھی مجھ سے دور ہونا نہیں چاہتی۔ وہ تو واقعی جذبہ تھا کہ وہ خالد کی باتوں میں آ گئی۔“

”افسوس ہے میڈم آپ پر۔“ میرے لہجے میں بے پناہ تلخی آ گئی تھی۔ ”آپ کو اتنا خطرناک عمل کرنے کے بعد پشیمانی بھی نہیں ہوئی۔“

”پشیمانی۔“ وہ ہنس پڑی۔ بہت ہی تلخ ہنسی تھی اس کی۔ ”یہ دیکھ رہی ہو۔“ اس نے اپنے دونوں جھپٹے ہوئے ہاتھ میرے سامنے کر دیئے۔ ”یہ وہی پشیمانی ہے۔ فرزانہ کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے بعد میں نے خود اپنے آپ کو سزا دی۔ خود اپنے دونوں ہاتھوں پر تیزاب گر کر انہیں ناکارہ بنا دیا۔ اب اس سے بڑی پشیمانی اور اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے۔“

بہانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ کم بخت مانتا ہی نہیں۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ جانے والے لوٹ کر نہیں آتے، جو پھنچ گیا، سو پھنچ گیا۔ میری محبت بھی اسی نشیب میں کہیں گم ہوئی تھی۔ لاکھ ڈھونڈنے پر بھی اس کا سراغ نہیں ملا لیکن شاید میں غلط کہہ گیا۔ وہ گم نہیں ہوئی تھی بلکہ میں نے خود ہی محبت کی لاش کو اپنے ہاتھوں دفن کیا تھا۔ پھر یہ انتظار کیا؟ میں کیوں آس کی ڈور تھامے بیٹھا ہوں؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اب نہیں آئے گی، یہ آنکھیں اس کا راستہ دیکھ رہی ہیں۔

ساون کا موسم مجھے ہمیشہ سے ہی پسند تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک دن میری زندگی بھی پیاسا ساون بن کر رہ جائے گی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھک جائے گا، گھٹائیں جھوم جھوم کر آئیں گی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل میں امنگ اور تنگ پیدا کریں گے لیکن میرے من کی کھیتی کبھی سیراب نہیں ہوگی۔ یہ بادل بن برسے گزر جائیں گے اور میں آسمان کی طرف خالی نظروں سے دیکھتا رہ جاؤں گا۔

وہ بھی ایسا ہی رومان پرورد تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور گھٹائیں اٹھ اٹھ کر آ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ سورج نکلا ہی نہیں، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے فضا کو معطر بنا دیا تھا۔ موسم کے تبود دیکھ کر میں نے کام پر جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ میں نے ملازم سے کہا کہ ناشتا وہیں منگوا لیا اور موسم کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس لمحے دل میں شدت سے تنہائی کا احساس ابھرا۔ میں سوچنے لگا کہ کاش اس حسین ساتوں میں کوئی میرے ساتھ ہوتا تو موسم کا لطف دو بالا ہو جاتا تو کہ میں نے کوئی دعا نہیں مانگی لیکن شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اسی لیے میری خواہش بہت جلد پوری ہو گئی۔

ابھی میں نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اس پہاڑی علاقے میں بارش کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر چیز گھری گھری اور دھلی دھلی سی نظر آتی ہے۔ بارش تو میرے شہر میں بھی ہوتی ہے لیکن وہاں کا منظر انتہائی تیزارکن اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ذرا سی بارش کے بعد سڑکوں اور گلیوں میں پانی کا جھج جھج ہوتا، جگہ جگہ پتھر اور گندک کے ڈھیر، بارش کے بعد جس اور چھروں کی لمٹار۔ میں اسی لیے اس موسم میں چھتیاں گزارنے اس پہاڑی علاقے کا رخ کرتا ہوں۔ ابا جان کے پاس اس علاقے میں جنگل کی کٹائی کا

ٹھیکا ہے۔ اس لیے میں گمرانی کی غرض سے ایک چکر سائے کا بھی لگا لیتا ہوں۔ اس طرح ابا جان بھی خوش ہو جاتے ہیں کہ میں نوکری کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی کام میں بھی دلچسپی لے رہا ہوں۔ مجھے اس پہاڑی علاقے میں چھتیاں گزارنے کا ایک مقول بہانہ مل جاتا ہے اور میری رومان پرور طبیعت کی تسکین بھی ہو جاتی ہے۔

تیز بارش کی وجہ سے سامنے کا منظر بالکل وضد لگتا تھا اور قریب کی چیزیں بھی صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔ موسم کی رنگینی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک بجلی زور سے کڑکی اور زوردار روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ پھر میری آنکھوں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ وہ کوئی انسانی وجود تھا جو اس تیز بارش سے بچنے کے لیے گرتا پڑتا کالج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ بہت زیادہ چڑھا ہونے کی وجہ سے اسے آگے بڑھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور وہ تقریباً ٹھہر چکا تھا۔

میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کالج کا گیت کھولا اور تیز تیز قدموں سے ڈھلواں گینڈنڈی پر چلنے کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچنے پر دیکھا کہ وہ ایک لڑکی تھی اور جھکن کی وجہ سے تقریباً نیم بے ہوش ہو چکی تھی۔ لگتا تھا کہ ابھی چکر اکر پیچ کر جانے کی۔ میں نے اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی۔ میں اسے بہ مشکل تمام کالج تک لے کر آیا اور برآمدے میں بڑی کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی پھر چوتکتے ہوئے بولی ”میں یہاں کیسے آ گئی اور آپ کون ہیں؟“

میں نے ملازم کو آواز دے کر گرم دودھ لانے کے لیے کہا اور بولا ”آپ بارش میں بری طرح بھیگ گئی تھیں اور اس سے بچنے کے لیے اسی کالج کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اتفاق سے میری نظر پڑ گئی اور میں آپ کو سہارا دے کر یہاں لے آیا۔ اب رہا یہ سوال کہ میں کون ہوں تو پہلے آپ اپنے حواس قابو میں کر لیں پھر سب کچھ بتا دوں گا۔“

وہ شکرانہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے اسے ایک تو لیا لاکر دیا اور بولا ”آپ بہت بری طرح بھیگ گئی ہیں۔ اپنا چہرہ اور بال خشک کر لیجئے، ورنہ بیمار پڑ جائیں گی۔“

اس نے شکر یہ کہہ کر مجھ سے تو لیا لے لیا۔ حالانکہ اس کا لباس بھی پوری طرح بھیگ چکا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ گیلے

کپڑے اس کے لیے نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔ میں کچھ سوچ کر اٹھا اور الماری سے اپنا ایک جوڑا نکال لایا۔ میں نے وہ کپڑے اس کی طرف بڑھائے اور بولا ”آپ کو لباس تبدیل کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ اس لیے زنا نہ کپڑوں کا انتظام نہیں ہو سکتا۔“

”الٰہی! انہی سے کام چلائیے۔ جب آپ کے کپڑے سوکھ جائیں تو دوبارہ لباس تبدیل کر لیجئے گا۔“

اس نے فکر مندی سے باہر کی جانب دیکھا اور بولی ”ارہے دیجئے، اس کی ضرورت نہیں۔ بارش ذرا سی کم ہو جائے تو میں چلی جاؤں گی۔“

”فی الحال! بارش ختمنے کے کوئی آچار نہیں ہیں۔ نہ جانے آپ کو کتنی دیر یہاں رکتا پڑ جائے۔ یہ کپڑے آپ کے سائز کے تو نہیں ہیں لیکن فوری طور پر اس کیلے لباس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ جب تک یہ سوکھ نہیں جاتے، آپ کو یہ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننا ہوں گے۔“

میری بات سن کر وہ ہنس پڑی اور مجھے یوں لگا کہ بہت سارے جلسے تک ایک ساتھ جگ اٹھے ہوں۔ تب میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ بلاشبہ بہت حسین تھی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، ستواں ناک، گلابی ہونٹ اور خوبصورت، متناسب جسم۔ بارش میں بھیگنے کے بعد تو اس کا حسن دو آتشہ ہو گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کے حسن کی تعریف کر کے رہ گیا۔

ملازم نے اس کے سامنے گرم دودھ کا گلاس رکھا تو وہ کچھ شرمندہ ہوئے ہوئے بولی ”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟“

”آپ بہت تھک گئی ہیں۔ اسے پینے سے جسم میں توانائی آ جائے گی۔ یہ دودھ پینے کے بعد آپ لباس تبدیل کر لیں پھر میں آپ کی تواضع گرم گرم کافی سے کر دوں گا۔“

”شاید میں زیادہ دیر نہ رک سکوں۔“ اس نے فکر مندی سے کہا ”میری پاپا پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”بارش کے ختم جانے تک تو آپ کو یہیں رہنا ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ جیسے ہی بارش کا زور کم ہوگا، میں آپ کو چھوڑ آؤں گا۔“

”نہیں نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔“ وہ جلدی سے بولی ”میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ مجھے ان راستوں کا پتا ہے۔“

”اچھا، اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔“ میں نے

مسکراتے ہوئے کہا ”پہلے آپ دودھ پی کر لباس تبدیل کر لیں۔“

اس نے دودھ کے گلاس کی جانب یوں دیکھا جیسے اس میں بے ہوشی کی دوامداد لگی ہو پھر پچھتاہٹ ہوئے گلاس ختم کیا اور کپڑے تبدیل کرنے کا بیج میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کا حلیہ خاصا مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ کرتے کی آستینیں اس نے فولد کر لی تھیں لیکن لمبا کٹھنوں سے بھی نیچے آ رہی تھی لیکن ان کپڑوں میں بھی وہ غضب ڈھاری تھی۔ اس لمحے میرے دل میں شدت سے یہ آرزو ابھری کہ کاش یہ بارش ابھی نہ ختمے۔ وہ یونہی میرے سامنے بیٹھی رہے اور میں اسے دیکھتا رہوں۔

میں نے ملازم سے کافی لانے کے لیے کہا۔ اس وقت تک میں نے ناشتا نہیں کیا تھا، لہذا وہ کافی کے ساتھ توس، اٹلے اور مکھن وغیرہ بھی لے آیا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ ناشتے میں شریک ہونے کی پیش کش کی تو وہ بولی۔ ”شکر ہے! میں گھر سے ناشتا کر کے آئی ہوں۔“

میرے بے حد اصرار کے باوجود اس نے صرف ایک سلاٹس لیا اور کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

”مجھے گھر سے نکلے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ وہاں سب لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”آپ رتی کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا ”آپ فون کر کے گھر والوں کو مطلع کر سکتی ہیں۔“

”ہماری رہائش تو اسلام آباد میں ہے۔ ہم لوگ چھتیاں گزارنے یہاں آئے ہوئے ہیں اور ہمارا قیام ریٹ ہاؤس میں ہے۔ ٹیلی فون تو ہے لیکن مجھے وہاں کا نمبر معلوم نہیں۔ کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ لگتا ہے کہ بارش کا زور ٹوٹ رہا ہے۔“

وہ کچھ نہ بولی لیکن میں اس کے چہرے پر بے چینی کے آثار دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے اس کا یہ اضطراب دیکھتا گیا اور میں نے اس کا دھیان بنانے کی خاطر کہا ”ہم لوگ اتنی دیر سے بیٹھے بائیں کر رہے ہیں اور ابھی تک ہمارا تعارف بھی نہیں ہوا۔ کیا آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟“

”کیا یہ بہت ضروری ہے؟“ اس نے عینک انداز میں کہا۔

”جی ہاں، بہت ضروری ہے۔ مجھے بھی تو معلوم ہونا

چاہے کہ جس خوبصورت مہمان سے مخاطب ہوں، وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے، کیا کرتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔“

وہ ایک بار پھر ٹھٹھکا کر بٹس پڑی اور بولی ”آپ دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔ میرا نام فرحانہ ہے، فرحانہ شعیب۔ میرے والد ریٹائرڈ فوجی افسر ہیں۔ ایک بڑا بھائی محسن ہے جو ڈاکٹر بننے کے بعد اب ملک سے باہر جانے کے لیے پرتول رہا ہے۔ میں نے نیکسٹری میں ماسٹرز کیا ہے اور فی الحال فرصت کے مزے لوٹ رہی ہوں۔ اب اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔“

”مجھے احمد رضا کہتے ہیں۔ والدین کا اکلوتا ہوں۔ ایم بی اے کرنے کے بعد ایک ملٹی ٹیکسٹل کمپنی میں ملازمت کر رہا ہوں۔ والد صاحب کا رد باری آدمی ہیں۔ یہاں جنگل میں ہمارا لکڑیاں کاٹنے کا ٹھیکہ چل رہا ہے۔ اس لیے مہینے میں دو تین مرتبہ اس کی گمرانی کے لیے مجھے یہاں آنا پڑتا ہے۔ یہ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ خاص کر برسات کے موسم میں تو یہاں کا حسن کچھ اور ٹکھ جاتا ہے اس لیے میں ہمیشہ یہیں پر چھٹیاں گزارتا ہوں۔“

”آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟“ وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

”جی نہیں، ابھی تک کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جسے اپنا جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سوچتا۔ حالانکہ اس سلسلے میں مجھ پر گھر والوں کی جانب سے کافی دباؤ ہے۔ امی تو صبح شام میرے لیے لڑکیاں دیکھتی رہتی ہیں۔ خدا جانے ان کی تلاش کب ختم ہوگی؟“

”جب آپ چاہیں گے۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ میں چونکتے ہوئے بولا۔

”دیکھیں..... ابھی آپ نے خود ہی کہا ہے کہ کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جسے جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سوچتے۔ گویا یہ فیصلہ آپ کو ہی کرنا ہے پھر اپنی امی کو کیوں دوڑا رہے ہیں؟“

میں ٹھوڑا سا گڑبڑا گیا۔ اس کے اس جملے کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اس لیے جھینپ مٹاتے ہوئے بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ لڑکی کے انتخاب میں ہم سب کی پسند شامل ہو۔“

”اچھی بات ہے۔ شادی کے معاملے میں والدین کی مرضی اور پسند کو ترجیح دینا چاہیے۔ ان کا فیصلہ بھی غلط نہیں

ہوتا۔ ویسے آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ کب تک اس طرح اکیلے بیٹھ کر موسم کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔“

میں نے غور سے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے کوئی انگلی نظر نہیں آئی۔ میں جانتا چاہ رہا تھا کہ اس کی منگنی یا رشتہ تو طے نہیں ہوا لیکن پہلی ملاقات میں اس طرح کا سوال پوچھنا مناسب نہ تھا۔ بارش رک گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی سے دوبارہ ملنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

میں ٹھٹھکا کر سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی ”میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے، کپڑے سوکھ گئے ہوں گے۔ میں پہنچ کر کے ابھی آتی ہوں۔“

وہ لباس تبدیل کر کے آئی تو پہلے سے زیادہ نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ میں نے اسے سائیکل نظروں سے دیکھا تو وہ کچھ جھینپ گئی امی اور بولی ”آپ کی مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ! اب چلتی ہوں۔“

”ذرا ٹھہریں۔“ میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”بارش کی وجہ سے راستے میں جگہ جگہ کچڑ اور پھسلن ہوگی۔ آپ کے لیے چلنا دشوار ہوگا۔ کچھ پتا نہیں کہ کب بارش دوبارہ شروع ہو جائے؟ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں پورچ میں کھڑی ہوئی جب کی طرف بڑھا۔ وہ چند لمحے تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ وہ میرے ساتھ جیب میں بیٹھے یا نہیں پھر آگے بڑھتے ہوئے بولی ”اگر بارش کا ڈر نہ ہوتا تو میں بھی آپ کی پیشکش قبول نہ کرتی۔ امی کہتی ہیں کہ اجنبیوں پر اتنی جلد بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“

”وہ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ دوچار ملاقاتوں میں یہ اجنبیت بھی دور ہو جائے گی۔“

”آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مزید ملاقاتیں بھی ہوں گی؟“

”جب تک میں اور آپ یہاں ہیں۔ اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

چند منٹوں کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ فرحانہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کے والدین پریشانی کے عالم میں ریٹ ہاؤس کے گیٹ پر کھڑے ہوئے تھے جبکہ بھائی باہر سڑک پر ٹھل رہا تھا۔ میں نے جیسے

جی جیب روکی۔ فرحانہ نے چھلانگ لگائی اور دوڑتی ہوئی اپنی امی سے لپٹ گئی۔ وہ بڑے جوش کے عالم میں انہیں کچھ بتا رہی تھی۔ اس دوران اس نے دو تین بار میری جانب اشارہ بھی کیا پھر وہ سب چلتے ہوئے میری طرف آئے۔

میں نے ان کے کچے میں خاصی رعوت محسوس کی۔ ریٹائر ہوئے کے باوجود ان کے انداز میں رعب اور غفلت نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی متانت سے جواب دیا ”مجھے احمد رضا کہتے ہیں۔“

”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی یک میں!“ انہوں نے اس طرح کہا جیسے مجھ پر احسان جتا رہے ہوں۔ فرحانہ کا بھائی پچھلے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملانے کی بھی دعوت گوارا نہیں کی۔ وہ مجھے خاصا مغرور لگ رہا تھا۔ میں نے بھی اسے اہمیت نہیں دی۔

فرحانہ کی ممی نے سائیکل نظروں سے مجھے دیکھا اور بولیں ”فرحانہ نے بتایا ہے کہ آج آپ نے اس کی بہت مدد کی۔ اس کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔“

”جی نہیں، آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے؟“

”آپ لوگ یہیں کھڑے کھڑے سب باتیں کر لیں گے۔“ فرحانہ بولی ”پلیس..... اندر بیٹھتے ہیں۔“

”مجھے تو اجازت دیجئے۔ اس وقت بارش رک رہی ہوگی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ ضروری کام نکالوں۔“

”نہیں بھئی، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کو کم از کم ایک چائے کی پیالی تو ہمارے ساتھ بیٹانی ہوگی۔“

مجھ تو یہ ہے کہ میں خود بھی فرحانہ کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہ رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ کوئی ایسی صورت بن جائے جس سے میرے اور فرحانہ کے دوبارہ ملنے کا امکان روشن ہو سکے۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ ریٹ ہاؤس میں چلا گیا۔ چائے کے بعد باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شعیب صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی خاصی خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے پاس کافی زمین تھی جس کی آمدنی پر وہ عیش کر رہے تھے۔ انہوں نے میری ملازمت اور بزنس کے بارے میں کڑید کڑید کر سوالات کیے۔ جیسے میں ان کا ہونے والا داماد ہوں اور بردھکے کے لیے آیا ہوں۔ کچھ دیر بعد جب میں نے ان سے اجازت طلب کی تو ان کی بیگم نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ میں اوپر سے انکار کرتا رہا لیکن دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ فرحانہ

سے دوبارہ ملنے کا موقع اتنی جلد ہی مل گیا۔

وہ مجھے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ میں جیب میں بیٹھنے لگا تو بولی ”ڈیڈی وقت کے بہت پابند ہیں۔ ہمارے یہاں رات کا کھانا آٹھ بجے کھایا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ دیر نہ ہونے پائے۔“

میرے بس میں ہوتا تو وہاں سے جاتا ہی نہیں۔ وہ میرے حواسوں پر تیزی سے چھائی جاری تھی۔ اس سے پہلے بھی میری زندگی میں کئی لڑکیاں آئیں لیکن ایسی کیفیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے برسوں کی تلاش ختم ہوگئی ہو، وہ میری زندگی کا خوش گوار ترین دن تھا۔ ساون تو ہر سال ہی آتا ہے لیکن اس برس کے ساون نے تو میری زندگی ہی بدل دی تھی۔ یہ کیسی برسات تھی جس نے میری پیاسی روح کو اس طرح سیراب کیا کہ عمر بھر کی فکری ختم ہوگئی۔ یقیناً مجھے فرحانہ سے محبت ہوئی تھی۔

اور اب اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ شاید پہلی نظر کی محبت اسی کو کہتے ہیں لیکن کیا وہ بھی میری محبت کا جواب محبت سے دے گی۔ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میری اس سے صرف ایک ملاقات ہوئی تھی اور میں نے سڑک پر چلتے ہوئے کسی آوارہ لڑکے کی طرح اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ یہ انتہائی گھٹیا اور سٹی سوچ تھی۔ میں ایک تعلیم یافتہ اور پیچورڈ شخص تھا اور میرے لیے کسی شریف و معزز گھرانے کی لڑکی کے بارے میں اس طرح سوچنا مناسب نہ تھا، لہذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اس وقت تک اپنے جذبات پر قابو رکھنا ہوگا جب تک فرحانہ کی جانب سے کوئی مثبت رد عمل سامنے نہ آجائے۔

شام کو میں نے اپنا بہترین سوٹ زیب تن کیا اور پوری جج دج کے ساتھ درجوب کی جانب چل دیا۔ وہ لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہوئے شعیب صاحب پر جوش انداز میں بولے ”ویری لڈ! مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو وقت کے پابند ہوں۔“

”ذرا نوازی ہے آپ کی۔“ میں نے انکساری سے جواب دیا ”میں وقت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں۔ اسی لیے ہر کام وقت پر کرتا ہوں۔ اس طرح زندگی میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے چھوٹی سی عمر میں ہی اس راز کو پایا۔ کاش ہمارے بیٹے کی بجھ میں بھی یہ بات آجائے۔

اسے معلوم تھا کہ تم زہر پر آنے والے ہو۔ اس کے باوجود ابھی تک نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں وقت ضائع کرتا پھرتا ہے؟“

”آپ تو خواہواہ اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔“

بیکرم شعیب مصنوعی ہنسی سے بولیں ”ہوسکتا ہے کسی کام میں بچس گیا ہو۔ بس آنے ہی والا ہوگا۔“

”بس رہنے دو۔ میں خوب جانتا ہوں اس کے کاموں کو۔“

اس نوک جھوٹکے سے میں نے اندازہ لگایا کہ شعیب صاحب اپنے بیٹے سے خوش نہیں تھے۔ خیر مجھے اس سے کیا، میری نظریں تو فرحانہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے تو رنگ کہ کہیں وہ بارش میں بھیگنے سے بیمار تو نہیں ہوگئی۔ ابھی میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ہلکے پیاز کی رنگ کے سوٹ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی گوکہ اس نے بننے سنورے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا لیکن ہلکے سے میک اپ میں بھی وہ قیامت ڈھارہی تھی۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر کھانا گلے کا اعلان ہوا۔ شعیب صاحب کی بیگم نے خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ میں نے کھانے کی تعریف کی تو وہ بولیں ”اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ سب فرحانہ نے کیا ہے۔ اسے کوکنگ سے خاص دلچسپی ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ڈش بناتی رہتی ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری بیٹی ہر فن مولا ہے۔“ شعیب صاحب خیر یہ انداز میں بولے ”کوکنگ کے علاوہ بھی یہ بہت کچھ کرتی ہے لیکن میں اس کے گھومنے پھرنے کے شوق سے بہت تنگ ہوں۔ صبح سویرے اٹھ کر سیر کے لیے نکل جاتی ہے اور گھنٹوں ادھر ادھر گھومتی رہتی ہے۔“

”ڈیڈی! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں فارغ نہیں بیٹھ سکتی اور ویسے بھی یہ جگہ اتنی خوبصورت ہے کہ یہاں کے نظارے دیکھ کر دل نہیں بھرتا۔ ویسے بھی ہم یہاں گھر میں بیٹھنے کے لیے تو ہیں آئے۔“

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ باتوں کے دوران وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ گھڑی پر نظر دالی تو گیارہ بج رہے تھے۔ وہاں سے اٹھنے کو دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مزید رکنے کا بھی کوئی جواز نہ تھا، لہذا میں نے اجازت

چاہی۔ شعیب صاحب کی بیگم بولیں ”تم مل کر بہت خوش ہوئی۔ کبھی کبھی چکر لگایا کرو۔ اچھا ہے، ذرا رونق رہے گی۔“

جی میں آیا کہہ دوں کہ اگر انہیں اعتراض نہ ہو تو میں روزانہ آنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ کس کم بخت کا دل نہ چاہے گا کہ وہ فرحانہ جیسی خوبصورت اور ہنس کھلڑکی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت نہ گزارے لیکن ایسی بات دل میں تو سوچی جا سکتی تھی لیکن زبان سے ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ بس اتنا ہی کہہ سکا ”جی بالکل، ضرور آؤں گا۔“

فرحانہ مجھے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ اس وقت بھی آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا کہ بس تھوڑی ہی دیر میں بارش شروع ہونے والی ہے۔ فریڈ نے موسم کے تئیر دیکھ کر بولی ”اگر بارش ہوگی تو آپ کے لیے جیب چلانا مشکل ہو جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ آپ رات کو یہیں رک جائیں۔“

”میرے لیے یہ موسم اجنبی نہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”ویسے بھی یہ راتے جانے بھانے ہیں۔ مجھے ان پر جیب چلانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ آپ اندر جائیں، میں بھی چلا ہوں۔“

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہہ دل ابھی بھرا نہیں۔ وہ جانے کے لیے مڑی پھر اس نے دو تین بار پلٹ کر مجھے دیکھا۔ میرے لیے اب وہاں کھڑا رہنا دشوار تھا۔ میں نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی اور جیب میں سوار ہو گیا۔

وہ میری زندگی کی یادگار رات تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی نہ سو سکا۔ فرحانہ ایک لمحے کے لیے بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ اسی کو ٹیلی فون کر کے بتا دوں کہ ان کی تلاش ختم ہوگئی ہے۔ میں نے ان کی بہو ڈھونڈ لی ہے لیکن عقل نے سمجھا یا کہ اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ فرحانہ سے میری ملاقات کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور میں اس کے بارے میں ایسی باتیں سوچ رہا تھا گوکہ اس کی آنکھوں نے بہت کچھ کہہ دیا تھا لیکن میری نظریں دھوکا بھی کھا سکتی ہیں۔ جب تک وہ زبان سے میری محبت کا اقرار نہ کر لیتی، اس وقت تک میں اس سلسلے میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔

رات بھر جانے کی وجہ سے صبح میری طبیعت بوجھل تھی

ہذا میں نے کام پر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے گھر پر ہی آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور برآمدے میں کرسی ڈال کر چائے پینے بیٹھ گیا۔ بارش رک چکی تھی اور فضا بھی ٹھنکی تھی۔ اس وقت بھی میں فرحانہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ دل سے بے اختیار دوغلی کرکاش وہ اس سہانے موسم میں ایک بار پھر جھوٹتی ہوئی اس طرف چلی آئے۔ وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ میری نظریں پگھلنے لگیں۔ وہ خراباں خراباں میرے کالج کی طرف آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میری سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے استقبال کے لیے گیٹ کی جانب بڑھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولی ”خدا کا شکر ہے کہ راستے میں بارش نہیں ہوئی، ورنہ میں تو ذرا ہی تھی کہ کہیں آج بھی کل والا پسینہ نہ ہو جائے۔“

میں نے آسمان کی طرف دیکھا جو بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور کہا ”آپ کو واقعی اس موسم میں گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ بارش کی وقت بھی شروع ہو سکتی ہے۔“

”کیا کروں، مجھ سے گھر میں نہیں بیٹھا جاتا اور اتنے حسین موسم سے لطف اندوز نہ ہوتا تو بد ذوقی کی علامت ہے۔“

ابھی اس کی بات پوری بھی نہ تھی کہ موٹی موٹی بارش پڑنا شروع ہو گئی۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی ”اب مزہ آئے گا۔ یہاں بیٹھ کر بارش کا نظارہ کرنا کتنا اچھا لگتا ہے۔“

میں نے اس کے لیے چائے منگوائی۔ اس روز وہ دیر تک میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ اس کے پاس کبھی نہ ختم ہونے والی باتوں کا ذخیرہ تھا۔ میں خوبیت کے عالم میں سے دیکھتا رہا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی بیٹھی باتیں کرتی رہے اور میں اسے دیکھتا رہوں۔ تھوڑی دیر بعد بارش رک گئی تو وہ بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”اب چلتی ہوں۔ دوبارہ بارش شروع ہوگئی تو نکلنا مشکل ہو جائے گا۔“

میں اسے گیٹ تک چھوڑنے آیا تو وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے بولی ”شام کو آ رہے ہیں نا۔ میں یہ بہت ہی خاص ڈش بناؤں گی۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ قدر نمودیتا ہے یہ روز کا آنا جانا۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ”جبکہ میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح

1694ء میں پیدا ہوئے والے والٹر کو آزاد خیالی کا بااؤد آدم مانا جاتا ہے۔ آزاد خیالی کی تجویز کے باعث باربار ملک بدر ہوتا رہا پابند سلاسل ٹھہرایا گیا۔ پہلی بار وہ 1717ء میں جیل گیا۔ رہائی کے بعد 1718ء میں اس نے اپنا مشہور ”ایڈیٹ“ تحریر کیا جس نے راتوں رات اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ 1723ء میں اس نے مذہبی آزاد خیالی کی حمایت میں قلم لکھی۔ یہ قلم شائع ہونے سے قبل مقبول ہوگئی تھی۔ حکومت فرانس نے فوری ایکشن لیا اور حکم نامہ جاری کر دیا کہ یہ قلم فرانس میں شائع نہیں ہو سکتا۔ اسے ملک بدر بھی کر دیا گیا۔ 1727ء کو وہ وطن لوٹا تو اس کی ملاقات مادام شائلے سے ہوئی۔ پندرہ سال تک وہ اس کے محل میں رہا مگر درمیان کی دوری برقرار رہی۔ اس دوران اس نے بے شمار مقالے، افسانے، ڈرامے، نظمیں، ناول اور طنزیہ مضامین لکھے۔ مادام شائلے کے بعد وہ کسی دوسری عورت کے قریب نہیں گیا۔ اس کا ناول کینڈیڈ (Candid) بہت مشہور اور بے شمار زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ 1778ء میں وہ فوت ہوا۔ کہتے ہیں مادام شائلے کا غم اسے لے ڈوبا۔

اقتباس: عجائبات دنیا از خورشید اقبال مرسلہ: ندیم فرحت، کراچی

میرے دل میں آپ کی قدر بڑھ جانے کی اور میں سمجھوں گی کہ آپ نے میرا مان رکھا۔“

”آپ نے بات ہی ایسی کہہ دی کہ اب میں انتظار نہیں کر سکتا۔“ میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا ”میں ضرور آؤں گا۔“

میں شام کو دوبارہ ریٹ ہاؤس چلا گیا۔ سوچ رہا تھا کہ دوبارہ آمد کا کوئی مقبول جواز ڈھونڈ لوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایسا لگا کہ وہ سب لوگ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میری خوب آؤ بھگت ہوئی۔ فرحانہ کی مٹی بڑی شفقت سے چسپاں آئیں اور بولیں ”اچھا ہوا تم خود ہی آ گئے ورنہ میں کسی کو بھیج کر تمہیں بلا لیتی۔ آج فریڈ نے نرگس کو فٹے بنائے ہیں۔ یہ اس کی پسندیدہ ڈش ہے۔ امید

ہے کہ یہ دُش تمہیں بھی پسند آئے گی۔“

کہ وہ مجھے اپنا سب کچھ سمجھ چکی ہے۔ بس میری طرف سے اظہار ہونا باقی تھا۔ اس کے بعد ہمارے ملن کی راہ آسان ہو جاتی۔

پندرہ دن ایسے گزر گئے کہ پتا بھی نہیں چلا۔ چٹھیاں ختم ہونے والی تھیں اور وہ لوگ واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔ میں بھی ایک دو دن بعد روانہ ہونے والا تھا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اسلام آباد جاتے ہی امی کو ان کے گھر رشتہ کی بات کرنے کے لیے بھیجوں گا لیکن اس سے پہلے فرحانہ کی مرضی جاننا ضروری تھا اور میں اس کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اچانک ہی ایک دھماکا ہوا اور میری محبت کا تاج محل لحوں میں زمیں بوس ہو گیا۔

اس رات میں فرحانہ کے گھر سے واپس لوٹا تو ملازم نے بتایا کہ امی کا دو تین بار فون آچکا ہے اور انہوں نے تاکید کی ہے کہ جیسے ہی گھر آؤں، انہیں فون کر لوں۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ میری غیر موجودگی میں وہ کیا گل کھلا چکا ہے۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ لباس تبدیل کرنے کے بعد امی سے بات کروں گا کہ فون کی کھٹی ایک بار پھر بجی۔ میں نے لپک کر ریسورٹ اٹھایا۔ دوسری طرف امی ہی تھیں اور کافی غصے میں معلوم ہو رہی تھیں۔

”کہاں غائب رہتے ہو؟ شام سے چار مرتبہ فون کر چکی ہوں لیکن تمہارا کوئی پتا ہی نہیں؟ سیر و تفریح میں اتنے مگن ہو گئے ہو کہ گھر والوں کی یاد بھی نہیں آئی۔ آج کتنے دن ہو گئے ہیں، تمہارا ایک فون بھی نہیں آیا۔“

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ ان کا شکوہ سمجھا تھا۔ واقعی فرحانہ کے چکر میں سب کو بھلا بیٹھا لیکن امی کو مطمئن کرنا ضروری تھا۔ اس لیے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”بس امی! مصروفیت زیادہ رہی۔ آج کل کٹنا کی کا سیرن چل رہا ہے، وہیں دیر ہو جاتی ہے۔“

”میں خوب جانتی ہوں تمہاری مصروفیت کو۔“ امی کے لہجے میں تیزی تھی ”اور یہ فرحانہ کون ہے جس کے ساتھ تم آج کل گھومتے پھرتے ہو؟ فضلونے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

اس لمحے مجھے ملازم پر بہت غصہ آیا۔ جی چاہا کہ اس کا سرو توڑ دوں۔ اسے کیا ضرورت تھی امی کو یہ سب کچھ بتانے کی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نے امی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ ایک جوان لڑکی کی ماں تھیں۔ ہر اچھے لڑکے کو دیکھ کر ان کے دل میں امیدوں کے چراغ روشن ہو رہے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ وہ میرے بارے میں بھی ایسا ہی سوچ رہی ہوں لیکن میں اتنی جلدی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میں ان کی محبت اور خلوص کو غلط رنگ دے رہا ہوں۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ فرحانہ کی مکھنی ہو چکی ہو یا وہ اپنے خاندان میں کسی سے منسوب ہو۔ ایسی لڑکیوں کے لیے رشتوں کی کیا کیا۔

کھانے کے بعد حسب معمول کافی کا دور چلا۔ باتیں ہوئیں، شعیب صاحب اور ان کی بیگم مجھ سے اس طرح کرید کرید کر سوالات کر رہے تھے جیسے میرے پورے خاندان کی ہسٹری کھگانا چاہ رہے ہوں۔ سوال جواب کا سیشن ختم ہونے پر وہ دونوں خاصے مطمئن نظر آئے اور ان سے زیادہ اطمینان مجھے تھا کہ انہیں متاثر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ واپسی پر ایک بار پھر فرحانہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی اور بولی۔

”آپ نے تو می اور پاپا پر جادو کر دیا ہے، ورنہ وہ اتنی جلدی کسی سے بے تکلف نہیں ہوتے۔“

”ان کی محبت ہے، ورنہ میں اس قابل کہاں؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اب آپ کس نفسی سے کام لے رہے ہیں۔“ وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بولی ”مجھے تو ان دونوں میں ہی اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ بہت اچھے انسان ہیں۔“

”زبانی تعریف سے کام نہیں چلے گا، وعدہ کریں کہ آپ کل صبح مجی آئیں گی۔“

”اگر آپ نہ کہتے تب بھی میں ضرور آتی۔ مجھے آپ سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔“

ان دو ملاقاتوں کے بعد حجاب نکل گیا اور ہم روزانہ ہی ملنے لگے۔ وہ صبح کے وقت واک کے یہاں میرے پاس آ جاتی اور گفتگوں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی رہتی۔ بارش بھی تقریباً روزانہ ہی ہو رہی تھی۔ اس طرح اسے میرے پاس بیٹھنے کا بہانہ مل جاتا۔ شام کے وقت بھی کبھی میں ان کے ریٹ باؤس چلا جاتا۔ وہ سب لوگ مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آتے اور یوں لگتا جیسے انہوں نے مجھے اپنے گھر کے فرد کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ فرحانہ بہت تیزی سے میرے قریب آ رہی تھی۔ اس کے ہر انداز سے ظاہر ہوتا تھا

عشق ناکام

معزز و محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!

عشق ناکام نمبر کا اشتہار دیکھا۔ خوشی ہوئی کہ میں بھی اپنے ایک ناکام عشق کی داستان رقم کر سکتا ہوں۔ میں بچپن میں جس لڑکی کے عشق میں گرفتار تھا اس نے کس آسانی سے مجھے آئینہ دکھا دیا ہے۔

خرم و حاجت
(فیصل آباد)



عشق ناکام
نمبر

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔
وہ لڑکی سات سمندر پار سے آنے والی تھی۔
میرے چاچا کی بیٹی۔ جس نے امریکا میں
آنکھ کھولی۔ وہیں تعلیم حاصل کی اور وہاں کے ماحول میں
رج بس کروٹن واپس آ رہی تھی۔ وہ میری مکیتر بھی تھی۔
مکیتر اس لحاظ سے کہ ہمارے والدین نے اس کی
پیدائش سے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ اس کی شادی مجھ سے
ہوگی۔ اس وقت میں صرف پانچ برس کا تھا۔

”وہ میرے جاننے والے ہیں۔ فرحانہ انہی کی بیٹی ہے۔ فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔ واپس آ کر آپ سے بات کروں گا۔“

”مجھے ضرورت بھی نہیں ہے کچھ جاننے کی۔“ امی کا لہجہ تلخ تھا ”میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ رشیدہ آیا کی لڑکی نازی سے تمہارا رشتہ طے یا گیا ہے اور اس اتوار کو تمہاری منگنی ہو رہی ہے۔ لہذا تم سب کچھ چھوڑ کر فوراً واپس آ جاؤ۔“

”مگر امی!.....“ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن انہوں نے میری بات کاٹ دی اور پولیس ”اگر کمر کچھ نہیں۔ جو کہا جا رہا ہے وہی کرو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب اس کام میں تاخیر مناسب نہیں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔ اب کہنے سننے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ امی کے فیصلے اٹل ہوتے تھے۔ وہ خالہ رشیدہ کو زبان دے چکی تھیں۔ اب اس سے بھرتا ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ ویسے بھی میں نے یہ اختیار انہیں دے رکھا تھا۔ اب کیسے انکار کر دیتا اور میرے پاس انکار کی وجہ کیا ہوتی؟ یہی کہ میں فرحانہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں جبکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے یا نہیں؟ ہاں اگر میں نے اس کی مرضی معلوم کر کے امی کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔

اس رات خوب بارش ہوئی۔ اتنا پانی برساکہ طوفان آ گیا۔ رات بھر میرے آنسو بہتے رہے۔ رات بھر آسمان روتا رہا۔ ہماری برسات میں میرے پیار کی ابتدا ہوئی تھی اور اسی ساون نے میرے پیار کو بھی نگل لیا۔

میں نے صبح بچ اپنا سامان باندھا اور گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میں، فرحانہ کے آنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ آگئی، میرا سامان بندھا دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے بولی ”کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟“

”ہاں، دفتر میں ایک ایمرنگنی ہو گئی ہے۔ مجھے فوراً جانا ہے۔“ میں نے نظریں چڑاتے ہوئے کہا۔

اس نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لگتا ہے آپ رات بھر سوئے نہیں۔ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟“

”جی ہاں، کیا بات ہے؟“

”کہہ دو یا کوئی بات نہیں۔“ میں نے جھجھلاتے ہوئے کہا ”ایک ضروری کام سے جانا پڑ رہا ہے۔“

”آپ کو میری قسم، بتائیں نا..... کیا بات ہے؟“ اس نے مجھے قسم دے دی تھی۔ اس لیے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا ”تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن ہمت نہیں پڑتی۔“

”میں جانتی ہوں، آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”میری منگنی ہو چکی ہے، اپنے تایا زادے۔“

”اوہ!“ میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا ”میں بلاوجہ ہی خوش گماں ہو گیا تھا۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اگر میری منگنی نہیں ہوئی ہوتی تو آپ میرے لیے دنیا کے بہترین مرد تھے۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں لیکن میں مجبور ہوں۔ اپنے پیار کی خاطر دو خاندانوں کی خوشیوں کا گلا نہیں گھونٹ سکتی۔ میں اتنی خود غرض نہیں ہوں۔“

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب جانے لگی تو اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔ شاید وہ توقع کر رہی تھی کہ میں اسے دلاسا دوں گا۔ اس کا حوصلہ بڑھاؤں گا یا اسے بغاوت پر اکساؤں گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں تو خود مصلحتوں کی زنجیر سے بندھ چکا تھا۔ کیسے ظاہر کرتا کہ اس کا انکار سننے سے پہلے ہی میرے پڑکٹ چکے تھے۔ جس طرح وہ اپنے گھر والوں کو دکھائیں دے سکتی تھی، اسی طرح میں بھی اپنی ماں کی مرضی کے خلاف نہیں جاسکتا تھا۔ اس لحاظ سے دونوں ہی مجبور تھے۔

وہ چلی گئی۔ اس کے بعد ہم کبھی نہیں ملے۔ امی نے میرے لیے جس لڑکی کا انتخاب کیا تھا وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ باہمت نکلی اور اس نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ اس کے انکار سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ قیامت ٹوٹی نہ آسمان گرا۔ بس اتنا ہوا کہ امی اور رشیدہ خالہ کے تعلقات خراب ہو گئے لیکن میرے پاس تو یہ راستہ بھی نہ تھا۔ اگر امی کی پسند ٹھکراتا تب بھی فرحانہ مجھے نہ ملتی۔

ہر سال ساون آتا ہے۔ بارشیں ہوتی ہیں۔ لوگ ساون کے گیت گاتے ہیں۔ میں نے شادی نہیں کی۔ فرحانہ کے جانے کے بعد میں نے دل کا دروازہ مضبوطی سے بند کر لیا۔ اب چاہے کتنا بھی میں نہ سے، میرے من کی پیاس کبھی نہیں بجھے گی۔ میرا ساون ہمیشہ پیاسا ہی رہے گا۔

اور بچپن ہی سے میرے ذہن میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ میرے اور اس کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہونے والا ہے جو زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہتا ہے۔

میرے گھر میں اس کے بچپن کی تصویریں بھی تھیں۔ تکیوں کی طرح رکھنے پر رکھنے لباسوں میں اڑتی ہوئی ایک خوبصورت لڑکی۔ جس کی برقع پر غصہ کی ہلکی سی تہنہ تھی۔

چونکہ شروع ہی سے یہ بتایا گیا تھا کہ دیکھو نئی تہنہ ہمارے ہم سفر ہے۔ اسی لئے میں نے کسی اور کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ گرجہ کالج اور یونیورسٹی میں بہت سی لڑکیاں میری دوست بنی تھیں لیکن میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں کسی اور کے لئے ہوں۔ لہذا اچھے پر ڈورے ڈالنے کی کوشش نہ کی جائے۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس کی تصویریں دیکھ دیکھ کر اور اس کی کہانیاں سن کر مجھے اس سے پیار سا ہو گیا تھا۔ وہ ایسی ہے۔ ویسی ہے۔ اتنی اسارت ہے۔ اتنی ذہین ہے۔ اتنی کیوت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میرا تو خیر امریکا جانا نہیں ہوسکا تھا لیکن جو لوگ اسے وہاں دیکھ کر آتے وہ اس کے بارے میں بہت کچھ بتاتے رہتے تھے اور میں خوش ہوتا رہتا۔

ہمارے درمیان فون پر بھی باتیں ہوا کرتیں۔ اس کی باتیں بھی ذہانت سے بھر پور تھیں۔ وہ جب انگلش لہجے میں اردو بولا کرتی تو کانوں میں رس سا گھلنے لگتا۔

وہ امریکا میں ایم ای اے کر رہی تھی اور اس کا مستقبل میرے مقابلے میں بیٹھا شاندار اور محفوظ تھا۔ پھر وہ دن میرے لئے انتہائی افسوس اور پریشانی کا تھا جب میرا ایک دوست امریکا سے واپس آیا تھا۔ وہ نیلی سے مل کر آیا تھا۔ بلکہ خود میں نے اس کے ہاتھ سے نیلی کو کچھ تحفے بھجوائے تھے۔ اس نے واپس آ کر نیلی کے بارے میں بتایا تھا۔ ”خرم۔ خرم۔ میرا خیال ہے کہ تم اس کا خیال چھوڑ دو۔ تمہارے لئے پاکستان میں بھی بہت لڑکیاں ہیں۔“

”کیوں بھائی۔ اس میں کیا خرابی ہوگئی؟“

”وہ بہت ایدوائس لڑکی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کی ڈریسنگ ہی ایسی ہوتی ہے کہ دیکھ کر شرم آتی ہے۔ یہ سب سن کر مجھے شرم ہی آئی اور شدید شاک بھی لگا تھا۔“

”خرم۔ میں نے بہت ہمت کر کے تمہیں اس کے بارے میں بتایا ہے۔“ دوست نے کہا۔ ”کیونکہ وہ تمہاری کزن بھی ہے۔“

مجھے ایسا دکھ ہوا تھا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوں۔ وہ میرے ساتھ رہتی ہو اور ہمارے درمیان پیار کا بہت گہرا رشتہ ہو۔

میں نے اس رات فون پر نیلی سے بات کی۔ ”نیلے کیا میرے دوست سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟“

”ہاں۔ ہاں۔ وہ آیا تھا میرے پاس۔ تمہارے تحفے لے کر۔“

”لیکن اس نے جو مجھے باتیں بتائی ہیں۔ وہ سب سن کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوہ۔ تو اس نے کیا کیا بتا دیا۔“

میں نے جھجکتے جھجکتے وہ سب کچھ وہاں یاد دہانی کے لئے اپنے دوست سے سنا تھا۔ یہ سب سن کر وہ بہت دیر تک ہنسی رہی تھی۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیا تم نے مجھے پاکستان کے کسی گاؤں کی کوئی لڑکی کبھی دکھا ہے؟ یہاں تو یہ سب کرنا پڑتا ہے کیونکہ میرا تعلق اسی ماحول سے ہے۔“

”نیلے۔ اپنی قدریں بھی تو کوئی چیز ہوتی ہیں۔“

”سب کہنے کی باتیں ہیں۔ بہر حال میں اس طرح کی ہوں اور اسی طرح رہوں گی۔ اب تمہاری مرضی کہ تم میرے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہو؟“

”مجھے کیا فیصلہ کرنا ہے۔ میں نے تو بچپن ہی سے تمہارے خواب دیکھے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر میں جیسی ہوں۔ اسی طرح مجھے قبول کرنا ہوگا۔“

گھر کے لوگ بھی سن کر نیلی سے بدول ہو گئے تھے لیکن میرے جنون عشق میں کمی نہیں آئی تھی۔ میں اس کو ہر حال میں اپنانا چاہتا تھا کیونکہ میرے خوابوں اور خیالوں میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

پھر دو چار مہینوں کے بعد یہ خبر سننے کو ملی کہ نیلی کچھ دنوں کے لئے پاکستان آ رہی ہے اور اس کی آمد کا واضح مقصد یہ تھا کہ وہ مجھ سے مل کر مجھے دیکھ لے۔ مجھے جان لے۔

پورا گھر سر جوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

اس کے لئے ایک کمر جلدی جلدی سیٹ کیا گیا۔ جس میں وہاں کے معیار کے مطابق چیزیں سجادی گئیں۔ سب سے زیادہ پریشانی امی کو تھی کیونکہ نیلی کے بارے میں سب کچھ سن رکھا تھا۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”بیٹا۔ تم نے اس لڑکی کے

بارے میں بہت کچھ سن لیا ہوگا۔ تم نے کیوں اپنے آپ کو اس سے وابستہ کر رکھا ہے؟“

”امی۔ نیلی میری کمزوری اور مجبوری بن گئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں اس کے علاوہ کسی اور لڑکی کا سوچنا نہیں نہیں چاہتا۔“

”بیٹا نہیں کیا ہو گیا ہے تم کو۔ خود سوچو۔ جب وہ آزاد اور بے باک لڑکی یہاں آئے گی تو محلے والے کیا سوچیں گے؟“

”سوچنے دیں امی۔“ میں نے کہا۔ ”میری کوشش ہوگی کہ میں اسے سمجھا سکوں۔“

”بہت مشکل ہے بیٹا۔ جو زندگی بھر ایسی رہی ہو اس پر تمہارے بھانے کا کیا اثر ہوگا؟“

دوسری طرف میرے امریکا سے آئے ہوئے دوست شہاب نے کہا۔ ”خرم۔ میں اس لڑکی کا غائب کچھ چکا ہوں۔ اس کو پینڈل کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ تم اس کی کسی بات پر اعتراض نہ کرو۔“

”تو پھر کیا کروں؟“

”ایک حد تک اس کا ساتھ دو۔ مثال کے طور پر وہ لازمی ڈانس پارٹیز میں جانی ہوگی۔ تو یہاں بھی اچھی پارٹیز ہوا کرتی ہیں۔ اس کو ساتھ لے جایا کرو۔“

”یار۔ یہ سب تو میں نے بھی نہیں کیا۔“

”اس کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ سب کرنا ہوگا۔“

اس نے بتایا۔ ”دوسری بات یہ ہے کہ تم نے اس کا کمر اس طرح سیٹ کیا ہے؟“

”جس طرح کے کمرے ہوتے ہیں۔“

”تم مشہور پاپ سٹارز اور فنکاروں کے پوسٹرز لگاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ اس کے کمرے کو امریکن اسٹائل کا کمرا بنا دو۔“

”یعنی جیسا وہ کہے۔ دیا کروں۔“

”ہاں۔ اگر تم اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ سب کرنا ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی مجبوری کے تحت تم سے شادی کرے گی کیونکہ یہ رشتہ ہو چکا ہے اور یہ اس کی بڑی بات ہے کہ اس نے ابھی تک انکار نہیں کیا۔ ورنہ میرا خیال ہے کہ اس کے لئے رشتوں کی تو کوئی کمی نہیں ہوگی۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

شہاب کے کہنے کے مطابق میں نے پورے کمرے

میں پوسٹرز چپکا دیے۔ اچھا خاصا کسی سٹار کا کمر بن کر رہ گیا تھا۔ پھر نیلی کے آنے کی تاریخ بھی آ گئی۔

انٹرویوٹ جانے کے لئے امی تیار نہیں ہو رہی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ انٹرویوٹ پر تیار نہیں بنیں گی۔ بڑی مشکلوں سے انہیں منا کرانے کے لئے مجھے گئے تھے۔

ہم نے نیلی کے نام کا کارڈ اٹھا رکھا تھا کیونکہ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ہم ہر چیز اور پینٹ والی لڑکی کو انہیں چھوڑا کر دیکھتے لیکن وہ کارڈ پر نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔

پھر ایک لڑکی ہمارے پاس آ کر رک گئی۔

اس نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔ ”کیا بات ہے۔ آپ لوگوں نے شاید مجھے پہچاننا؟ میں نیلی ہوں۔“

اب سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تو بہت سلیقے کے لباس میں تھی۔ شوارتھیں اور ایک خوبصورت سا۔ کراف بندھا ہوا۔

میرا دل اسے دیکھ کر دھڑک اٹھا تھا۔ بچپن کے خوابوں کی تعبیر سامنے آ گئی تھی۔ اس کے نام بتاتے ہی اس کے غم و خال واضح ہوتے چلے گئے تھے۔

سب سے پہلے امی نے اسے گلے لگایا تھا۔ پھر ابو نے اور جب میرے تعارف کے بعد وہ میری طرف آئی تو میں نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

وہ صرف مسکرا کر رہ گئی تھی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔

بہر حال ہم سب بہت خوشی خوشی اسے انٹرویوٹ سے گھر لے آئے۔ وہ راستے بھر باتیں کرتی رہی تھی۔ وہی لہجہ۔ وہی انداز۔ وہی امریکن لہجے میں خوبصورت اردو۔ جو اس کی زبان سے بہت بھلی لگ رہی تھی۔

گھر پہنچ کر جب اسے اس کے کمرے میں بھیجا گیا تو وہ جلدی سے باہر آ گئی۔ ”مائی گاؤ۔ یہ تم نے میرے کمرے کو کیا بنا دیا ہے؟“ اس نے یہ سوال مجھ سے کیا تھا۔

”تمہاری پسند کے مطابق سجائے کی کوشش کی ہے۔“ میں نے گڑبڑ کر کہا۔

”لیکن میری پسند اتنی گھٹیا تو نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پلیز۔ یہ سب پوسٹرز کمرے سے ہٹالیں۔“

امی اور ابو اس کی بات سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔ پھر ہم نے جلدی جلدی اس کے کمرے کو صاف کیا۔ اس کے بعد وہ تہانے چلی گئی۔

ٹریا اور دیو آنند کی پسندیدگی نے آہستہ آہستہ محبت کا روپ اختیار کر لیا۔ گھر والوں کی کڑی پابندیوں کے باوجود ٹریا دیو آنند کے قریب رہی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب نوجوان تھا۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت ہندوستان کی فلم انڈسٹری کے تین بڑوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ ہندوستان کی فلمی دنیا میں یوں تو اس وقت انتہائی خوبصورت اور مایہ ناز ہیروئیں موجود تھیں مگر فلم انڈسٹری پر اور لوگوں کے دلوں پر حکومت صرف تین مرد اداکاروں کی تھی اور یہ شلت انڈسٹری کی فلم انڈسٹری کے لیے باعث افتخار سمجھا جاتا تھا۔ بڑی سے بڑی ہیروئنوں کے مقابلے میں بھی ان تین ہیروؤں کو فیت دی جاتی تھی۔ اسکرین اور سکرین میں ان کا نام بلی حروف میں لکھا جاتا تھا۔ وہ سب سے بڑے باکس آفس اشارتے۔ ان کے نام پر لوگ کشاں کشاں سمیٹا گھر میں آ جاتے تھے۔ پہلے فلم ساز ان کا انتخاب کرتے تھے اور پھر ان کی مرضی اور منظوری سے ان کی ہیروئن چنا کرتے تھے۔ یہ تین اداکار، دیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند تھے۔ ان کی فلمیں کامیاب ہوں یا ناکام، ان کے چاہنے والوں کی تعداد کم نہ ہوتی تھی اور عام طور پر ان کی فلمیں ہٹ ہی رہتی تھیں۔ دیپ کمار ان تینوں میں سب سے بلند اور اہم مقام کا مالک تھا۔ اس کے بعد راج کپور اور دیو آنند کا نمبر پر آتا تھا۔ راج کپور اداکار کے ساتھ ساتھ فلم ساز اور ہدایت کار بھی تھا اور درحقیقت وہ اداکار سے بڑا فلم ساز اور اس سے بھی بڑا ہدایت کار تھا۔ اسی طرح دیو آنند بھی فلم سازوں کی صف میں شامل ہو گیا تھا مگر دیپ کمار نے اس کم کا کوئی جھگڑا نہیں بالا تھا۔ وہ محض ایک تھا۔ خالص اداکار، اس کی اداکاری، ہنرمندی اور مقبولیت سب پر ہماری جھجکی مگر ٹریا کے لیے دیو آنند کی ذات میں زیادہ کشش تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راج کپور ایک مخصوص اسکول سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے متلون مزاج، شو باز اور بناوٹی سمجھا جاتا تھا۔ دیپ کمار ان سب سے بلند تر تھا اور اسے کسی بھی لڑکی یا عورت کی جانب پیش قدمی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بڑی بڑی ہیروئنیں اس کے ساتھ کام کرنے کی حسرت دل میں لے لیتی تھیں اور اس کے ایک اشارے کی منتظر رہا کرتی تھیں۔ ان دونوں کے مقابلے میں دیو آنند ایک تنہا پسند، کم کاورڈ آ میز شخص تھا۔ اس کے ساتھ آئے دن ہیروئنوں کے

رات کے کھانے پر اس کے لئے انگلیں کھانے بنائے گئے تھے لیکن اس نے مقامی کھانے پسند کئے اور مزے لے لے کر کھاتی رہی۔ وہ ہر طرح خود کو ایک مشرقی لڑکی ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

دوسرے دن اس نے اپنے سامان کھولے۔ وہ ہم میں سے ہر ایک کے لئے بہت سی چیزیں لے کر آئی تھی اور یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ اس کا معیار بھی بہت اچھا تھا۔ اس دن مجھے اس سے باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ شاید گھر والوں نے جان بوجھ کر یہ موقع فراہم کیا تھا تاکہ ہم اچھی طرح ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہو جائیں۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ”میں ایک ایسی لڑکی ہوں جس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔“

”ہاں۔ یہ تو احساس ہو رہا ہے مجھے۔“

”بہت مشکلوں سے کوئی میرے معیار پر پورا اترتا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ خود امریکائی میں نے جانے کتنے انٹیشن کی سیر کرتی رہی ہوں۔ اس کے علاوہ ابو کے ساتھ اور کئی ملک بھی دیکھ چکی ہوں۔“

”معیار کیا ہے تمہارا کہ ان لوگوں کا مقیاس ہو۔“

”جو عام انداز کا نہ ہو۔“ اس نے کہا۔ ”جو دوسروں سے مختلف ہو۔ میں نہیں جانتی کہ تم میں سے کو الٹی ہے یا نہیں۔“

”تم اپنے فیصلے کرنے میں حق بجانب ہو۔ لیکن میرا معاملہ دوسرا ہے۔“

”اوہ۔ اور تمہارا معاملہ کیا ہے؟“

”میرا معاملہ یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں صرف تمہارے خواب دیکھے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہارے علاوہ کسی کو نہیں جانتا اور نہ ہی کسی کو جاننے کی خواہش ہے۔“

”مرنی ہے تمہاری۔ ویسے میں یہ بتا دوں کہ میں تمہارے لئے آسان نہیں رہوں گی۔“

”اس کی پروا بھی نہیں ہے مجھے۔ میں تو صرف تمہیں خوش رکھنا چاہتا ہوں۔“

شہاب سے ایک بار پھر میں نے میٹنگ کی۔ میں نے جب اسے یہ بتایا کہ نیلی کس طرح مکمل ڈریس میں اور اس کا رفاہ پاندہ کر آئی ہے اور کس طرح اس نے اپنے کمرے سے سارے پوسٹرز نکال چکے ہیں تو وہ ہنس پڑا۔

”خدا کی پناہ۔ ان لڑکیوں کو سمجھنا کتنا مشکل ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میری یہ بات لکھ لو کہ وہ تمہارے گھر والوں کی نگاہوں میں اپنا امپریشن ڈال رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔“

انکلیٹل بھی منسوب نہیں کیے جاتے تھے۔ اس کی بہت سی خوبیاں ٹریا کے دل کو بھاگ گئیں۔ ٹریا اور دیو آنند کی جوڑی بھی مشہور ہو گئی تھی اس لیے ٹریا نے دیو آنند کی جانب التفات زیادہ کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وعدے و وعید کی نوبت آ گئی۔

دیو آنند نے بھی ٹریا کو پسند کیا اور اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے ٹریا کو یقین دلایا کہ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کر کے رہے گا۔ چاہے اسے مذہب ہی کیوں نہ تبدیل کرنا پڑے۔ مشکل یہ تھی کہ دیو آنند کے گھر والے رشتے کے لیے تیار نہیں تھے۔ حالانکہ وہ ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ گھر والوں کی دلی دہلی ہی مخالفت دیو آنند کے لیے بے معنی اور بے اثر تھی۔ وہ ان کی مرضی کے خلاف بھی شادی کر سکتا تھا جیسا کہ اس کے دوسرے بھائیوں نے بھی کیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ایک بھائی نے اپنی بیٹی کی بھانجی سے شادی کر لی تھی۔ اگر دیو آنند ٹریا سے شادی کرنے پر جک جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہو سکتی تھی۔

ٹریا نے بھی دیو آنند سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم سے میری شادی نہ ہو تو پھر کسی اور سے بھی نہیں ہوگی۔ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گی اور تمام عمر کنواری رہوں گی۔ ٹریا کے گھر والوں کو دیو آنند کے ہندو ہونے پر اعتراض تھا لیکن دیو آنند، ٹریا کی خاطر اپنا مذہب چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ مگر ٹریا کے گھر والوں کو ٹریا کی شادی پر ہی اعتراض تھا۔ وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی تھی۔ گھر والے بھلا کس طرح اسے کسی اور کی چھوٹی میں ڈال دیتے۔

اگر ٹریا برأت سے کام لیتی تو دیو آنند کی بیوی بن سکتی تھی مگر مسلسل ہندوئوں نے اس سے سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی طاقت چھین لی تھی۔ وہ دیو آنند کے کہنے پر اپنے گھر والوں کو نہیں چھوڑ سکتی تو دیو آنند نے اپنی کے عالم میں کلپنا کا رنگ سے شادی کر لی۔ اسی طرح ٹریا اور دیو آنند کی محبت کا کامیابی کی قبر میں جا سکی۔

اقتباس: اون ٹریا از آشتا۔ مرسلہ: محمد ایا ز راہی، ماہنامہ

”اتنا میں بھی جانتا ہوں لیکن اسے اس مخصوص خول سے کیسے باہر لایا جائے؟“

”بہت آسان ہے۔ آج ہی اتفاق سے ایک ڈانس پارٹی ہے۔ اس کو ساتھ لے چلو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

”ڈانس پارٹی پر پوری پارٹی پر چھا جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تو پھر کم کارڈ لا کر دے دو۔“

کارڈ تو اس وقت بھی میرے پاس ہیں۔ میں احتیاطاً لیتا ہوا آیا ہوں۔“

شہاب نے دو کارڈز میرے حوالے کر دیے۔ شام کے وقت میں نے نیلی سے کہا۔ ”نیلی۔ رات کو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہاں کسی کو پتا نہ چلے۔“

”خیر یہ تو ہے۔ کہاں لے جانے کا ارادہ ہے؟“

”ایک ڈانس پارٹی ہے۔“

”کیا۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”یہاں بھی یہ سب ہوتا ہے۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟ ہم کسی سے کم تو نہیں ہیں۔“

میں نے کہا۔

”خرم صاحب۔ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”تم خود بتاؤ۔ میں نے اپنی زندگی میں جس قسم کی پارٹیز امیٹڈ کی ہیں۔ کیا ان کا کوئی جواب تمہارے یہاں

ہو سکتا ہے؟“

”شاید نہیں۔“

”میرے کمرے میں جس قسم کے پوسٹرز لگے ہوئے تھے۔ تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔“ اس نے کہا۔ ”خرم۔ بات یہ ہے کہ میں مغرب کو اس کے سارے رنگوں میں دیکھ چکی ہوں اور یہ احساس ہو گیا ہے کہ وہاں سوائے بے سکونی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے آپ کو مکمل بدل لیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ میں تو بے سکونی سے سکون کی طرف آ رہی ہوں اور تم اس زندگی کی طرف جارہے ہو جس میں سوائے غلاقت کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔“

”نیلی۔“ میں نے خوش ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں خود اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ میں تو تمہاری خوشی کی خاطر یہ سب کر رہا تھا۔“

”تو پھر یہ جان لو کہ اب میری خوشی ان باتوں میں نہیں رہی۔“ اس نے کہا۔ ”لعلت سمجھو ایسی باتوں پر۔ ان میں سوائے فزیشن کے اور کچھ بھی نہیں رکھا ہے۔“

”نیلی۔ تو پھر میں یہ سمجھوں کہ تم بالکل دیکھی ہی لڑکی ہو۔ جیسی امی نے سوچ رکھی ہوگی۔“

”ظاہر ہے۔“ تم مجھے تو دیکھ ہی رہے ہو گے۔ میں



معراج عشق

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
سلام تہنیت!

حکم ہوا کہ عشق ناکام کی کہانی تلاش کروں۔ کئی کہانیاں ذہن کے دریچے سے جھانکنے لگیں مگر وہ سب شوہزنس کے لوگوں کی ہیں جہاں عشق وعاشقی کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ ایک کھیل سمجھا جاتا ہے کیونکہ شوہزنس کی دنیا میں سب ”نفہا“ نہیں ہیں۔ خیر..... ایک ذرا منفرد انداز کی کہانی لایا ہوں شاید قارئین کو پسند آجائے۔

ارشاد علی
(کراچی)



مجھ سے کہا گیا کہ میں عشق ناکام کی کہانیاں
لکھوں۔
یعنی ان مشہور لوگوں کے عشق کی داستان
بیان کروں جو اپنے اپنے عشق میں ناکام ہوئے لیکن بہت نام
کمایا۔

ایسے لوگوں کے بارے میں پوری دنیا جانتی ہے۔ ان پر
بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کی ناکامی پر شاعری ہوئی ہے۔ ان
پر فلمیں بنائی گئی ہیں۔ مثلاً ہیرا پھڑی، جنتوں، واقعہ عذراء،



”تمہاری مرضی ہے نیلی۔“ میں نے شکست خوردہ
انداز میں اپنی گردن جھکا لی۔

وہ کچھ دن رہنے کے بعد واپس چلی گئی۔ میرے اور
اس کے درمیان پھر کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ وہ خواب کی طرح
صحی اور خواب ہی کی طرح آ کر گزر رہی تھی۔

پھر پتا چلا کہ اس نے امریکا ہی میں اپنی پسند کے کسی
نوجوان سے شادی کر لی ہے۔ وہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص اس کے
بنائے ہوئے معیار کے مطابق رہا ہو۔

پھر خبر ملی کہ نیلی نے وہی رنگ و ہنگ اختیار کر لیا
ہے۔ جو وہاں کے ماحول کا مزاج ہے۔ شوہر کے ساتھ وہ
پارٹیز وغیرہ میں جانے لگی ہے۔ اور اس کی ڈریسنگ بھی اسی
انداز کی ہوئی ہے۔

میں یہ سب سن کر اندر ہی اندر سلگنے لگتا تھا۔ آخر یہ
سب کرنا ہی تھا تو پھر میرے سامنے بارسا بننے کی کیا
ضرورت تھی؟ ایک دن اتفاق سے اس کا فون آ گیا۔ اس
نے ہماری خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کیا تھا۔ یہ فون
میں نے ہی ریسو کیا تھا۔ ”مبارک ہو۔“ میں نے کہا۔
”تمہارے چہرے سے نقاب اتر ہی گئی۔“

”کیسی نقاب۔“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔
”یہی کہ شادی کے بعد تم وہی سب کرنے لگی ہو۔
جس کے خلاف یہاں پھر دے گئی تھیں۔“

”اوہ۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”یہ تو ہے لیکن میں پھر وہی
بات کہوں گی کہ میرا شوہر ایک مکمل مرد ہے۔ وہ جو رو کا غلام
نہیں ہے۔ اس نے اپنی قوت ارادی اور قوت فیصلہ سے
میرے لئے جو چاہا مجھے اس کے لئے مجبور ہو جانا پڑا۔ خرم
صاحب۔ تم نے عورت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ عورت پانی کی
طرح ہوتی ہے۔ اسے جس برتن میں چاہو اٹھیل دو۔ وہ
اس کی طرح ہو جائے گی لیکن شرط یہی ہے کہ برتن میں
ڈالنے والے ہاتھوں میں اتنی صلاحیت ہو۔“

نیلی سے یہ میری آخری بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد
پھر اس سے بات نہیں ہو سکی اور خود میں نے شادی نہیں کی۔
اس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ میرے گھر والوں نے بچپن ہی
سے میرے ذہن کو نیلی کا اسیر بنا دیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی
کہ میرے ہاتھوں میں اتنی صلاحیت نہیں تھی۔ کہ میں
حاکمیت برت سکتا اس لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو
گیا۔ ہے ناں میرے عشق ناکام کی یہ کہانی کچھ اونٹنی کچھ
جدا جدا سی۔



تمہارے سامنے ہوں۔ تم چاہے جو بھی سمجھ لو۔“
”چلو۔ اب یہ بتا دو کہ میرے بارے میں تمہارا کیا
خیال ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”تم بہت اچھے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”بہت مہذب۔
سلجھے ہوئے لیکن افسوس کہ میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں
گزار سکتی۔“

”وہ کیوں؟“ مجھے ایک شاک سا لگتا تھا۔
”وہ اس لئے کہ دنیا کی ہر عورت کو ایک مرد کی
خواہش ہوتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ایسا مرد جو اپنے فیصلوں
کے لئے بیوی کا محتاج نہ ہو بلکہ بیوی کو اپنے فیصلوں کا پابند
کر سکے۔ لیکن تم میں یہ کوالٹی نہیں ہے۔“
”یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو۔“

”اس طرح کہ تم نے میرے بارے میں یہ سنا ہوگا
کہ میں بہت آزاد خیال ہوں۔ کلب جاتی ہوں۔ ڈانس
کرتی ہوں۔ اسی لئے تم نے میری خوشی کے لئے میرے
کمرے میں پوسٹر سجا دیے۔ میرے لئے ڈانس پارٹی کے
کارڈز لے آئے۔ اگر تمہیں یہ پتا چلا کہ میں شراب پیتی
ہوں تو شاید تم اس کا بھی بندوبست کر دیتے۔“

میں اس کی باتیں ستارہ گیا تھا۔
”تم میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں تھی کہ تم مجھے اپنے
کلچر کے مطابق ڈھال سکو۔ اسی لئے خود میرے کلچر میں ڈھل
جانے کی کوشش کرنے لگے اور مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ تم میں
وہ بات ہرگز نہیں ہے جو اپنے فیصلہ منوانے والے شخص میں ہونا
کرتی ہے۔ تمہارا ہی ایک محاورہ ہے جو رو کا غلام، ہو سکتا ہے
کہ دوسری عورتیں جو رو کا غلام پال کر خوش محسوس کرتی ہوں
لیکن مجھے جو رو کا غلام نہیں چاہئے۔ میری بات سمجھ گئے نا۔“

”نیلی۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں لیکن میں آہستہ
آہستہ جہیں اپنے راستے پر لانا چاہتا تھا۔ یہ میری حکمت عملی تھی۔“
”اب میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ حکمت عملی
اور حقیقت میں فرق نہ محسوس کر سکوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم
پوری طرح میرے infance میں تھے۔ اسی لئے تم نے
یہ حرکتیں کی تھیں۔“

”چلو چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ تم نے میرے لئے کیا سوچا
ہے؟“

”یہی کہہ چکی ہوں کہ تم اچھے دوست تو بن سکتے ہو۔
اچھے لائف پارٹنر نہیں۔ اسی لئے میں تم سے شادی نہیں
کر سکتی۔“

خدارا خدارا شوگر مریض ذرا عقلمندی سے کام لیں

کیونکہ ساری زندگی عارضی وقتی گولیاں ہی کھاتے رہتا آخر کہاں کی عقلمندی ہے؟ آج کل تو ہر انسان صرف شوگر کی وجہ سے بے حد پریشان ہے۔ شوگر موذی مرض انسان کو اندری اندر سے کھوکھلا، بے جان اور تار کارہ بنا کر اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ شوگر کی مرض تو انسانی زندگی ضائع کر دیتی ہے۔ شفاء مغائب اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہم نے جذبہ خدمت انسانیت سے سرشار ہو کر ایک طویل عرصہ ریورج، تحقیق کے بعد دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک ایسا خاص قسم کا ہربل شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے۔ جسکے استعمال سے آپ شوگر سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ شوگر کی مرض سے پریشان ہیں اور نجات چاہتے ہیں تو خدا را آج ہی گھر بیٹھے فون کر کے بذریعہ ڈاک VP دی پی شوگر نجات کورس منگوائیں۔ اور ہماری سچائی کو آزمائیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0308-6627979

0547-521787

آپ ہمیں صرف فون کریں

شوگر کورس آپ تک ہم پہنچائیں گے

ہوا کرتی۔ ہمارے محلے ہی میں ایک صاف ستھرا ہوٹل تھا جہاں ہم ہر شام کو بیٹھ جایا کرتے اور دنیا بھر کی باتیں ہوا کرتیں۔

ادب سے لے کر سیاست اور محبت سے لے کر مذاہب تک۔ ہم چار دوستوں کا ایک حلقہ تھا۔ میں یعنی آصف جمال، منور حسن، سلیم اور فرہاد۔

ہم میں سے ہر ایک کو زندگی کے خوبصورت پہلوؤں سے عشق تھا۔ ہم یونوٹیا کے خواب دیکھا کرتے اور غم دوراں کو غم جاننا میں شامل کرنے کی کوشش کرتے۔

ایک شام وہ ہوٹل نہیں آ سکا تھا۔

ہم بہت دیر تک اس کا انتظار کر کے اٹھنے ہی والے تھے کہ وہ آ گیا۔ اس وقت اس کی کیفیت کچھ مختلف ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، آنکھیں چمک رہی تھیں۔

ہم نے اس پر اس وقت دھیان دیا جب وہ کچھ کھویا کھویا سا محسوس ہونے لگا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ باتیں تو ہم سے کر رہا ہے لیکن اس کا دھیان کہیں اور ہے۔ وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔

”کیا بات ہے پیارے! آج کہاں کھوئے ہوئے ہو؟“ منور نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ اس نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک جھنجھپی سی مسکراہٹ تھی ”کہیں نہیں، مجھے کہاں کھونا ہے؟ میں تو غم لوگوں کے آس پاس ہی ہوں۔“ اس نے اپنے طور پر اطمینان دلانے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے کچھ دال میں کالا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک شام جب میں اور وہ ایک جگہ بیٹھے تھے تو میں نے اس سے پوچھ لیا ”میرے یار! اب تو صاف صاف بتا دے، میں تجھ میں ایک تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔ آخر کیا ہوا ہے تیرے ساتھ؟“

بڑی مشکل سے اس نے بتا دیا ”آصف بھائی، مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔“

”یہ بات ہوئی نا۔“ میں لپک اٹھا ”میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہے۔ اب یہ بھی بتا دو، کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اس کا؟“

”اس کا نام کامل ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کامل۔ خوبصورت نام ہے۔“ میں نے کہا۔

”اور وہ خود بھی خوبصورت ہے۔“ فرہاد نے کہا ”اب میں یہ نہیں جانتا کہ اردوں کے نزدیک خوبصورتی کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے لیکن میرے نزدیک خوبصورت وہ ہے جو آپ کو

مناسب بات نہیں ہے۔“

”آصف بھائی! اس نے کہا کہ میری کوئی شیریں نہیں ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا ”میری بھی شیریں ہے اور میں اس سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔“

”اوہو..... کون ہے وہ شیریں؟“

”وہ میری انا ہے۔ میری وہ محبت ہے جو میں اپنے آپ سے کرتا ہوں۔“ اس نے کہا ”انسان کو چاہیے کہ وہ پہلے اپنے آپ سے عشق کرنا سیکھے۔ اپنے آپ کو سنوارے، تراشے۔ اپنے آپ پر اپنا قیمتی وقت صرف کرے۔ اور جب یہ احساس ہو جائے کہ اس نے اپنے آپ کو کسی حد تک مکمل کر لیا ہے تو پھر ادھر ادھر دیکھے۔ اس سے پہلے نہیں۔ اس سے پہلے جو کچھ ہوتا ہے وہ سوائے فرسٹریشن کے اور کچھ نہیں اور خدا کا شکر ہے کہ میں ایسی فرسٹریشن کا شکار نہیں ہوں۔“

”یار، تمہارا فلسفہ تو بہت اچھا..... لیکن انسان مکمل کہاں ہوتا ہے؟ وہ تو آخر تک نامکمل ہی رہتا ہے۔“

”یہ بھی درست ہے۔“ اس نے گردن ہلائی ”اور یہی کسی اسے آگے اور آگے لے جاتی رہتی ہے۔ وہ پھر کہیں رکتا نہیں ہے۔“

”اگر تمہارے فلسفے پر عمل کیا جائے تو پھر دنیا کا کوئی انسان بھی شفق نہ کرے۔“ میں نے کہا۔

”کیوں نہ کرے۔ لیکن عشق صرف کامیاب لوگوں کا حق ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا ”گر وہ کامیاب ہو چکا ہے تو پھر اسے ضرور عشق کر لینا چاہیے کیونکہ اس کے بعد وہ واقعی مکمل ہو جائے گا۔“

تو ایسا تھا وہ نوجوان۔ اور ایسے تھے اس کے خیالات۔ وہ ایک کھاتے پیٹے گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے والد کسی سرکاری محکمے میں کسی ایسے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے دواور بڑے بھائی تھے جو اپنی تعلیم مکمل کر کے اچھی ملازمتیں کر رہے تھے۔

ایک بہن تھی جو کسی اچھے خاندان میں بیاہ کر اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔

اس کا پس منظر اس لیے بتانا ضروری تھا کہ اس کے ماحول اور اس کے گھر کو سمجھنے بغیر اس کہانی کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ یعنی وہ ہر طرح ایک روشن خیال گھرانے کا ایسا بکا فرد تھا جس کو ابھی تک کوئی لڑکی متاثر نہیں کر پائی تھی اور وہ خود بھی ان مہذبوں سے دور رہتا چاہتا تھا۔

ہماری اس سے تقریباً روزانہ ہی شام کے وقت ملاقات

شریں فرہاد وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ان کے علاوہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا عشق ان مشہور لوگوں کے عشق سے کسی طور کم نہیں تھا بلکہ انہوں نے ایسی ایسی قربانیاں دیں کہ ان کی کہانیاں سن کر یہ یقین آ جاتا ہے کہ یہ کم بخت عشق جو نہ کر دکھائے وہ کم ہے۔ میں ایسے ہی ایک آدمی کی کہانی لکھ رہا ہوں۔ یہ داستان سچی اس لیے ہے کہ میں خود اس کا گواہ ہوں۔ یہ پوری کہانی میرے سامنے ترتیب پائی ہے۔

فرہاد ایک لاٹوالی سانو جوان تھا۔ کبھی، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وقت سے بہت پہلے بعض باتوں کا ادراک ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کے والدین کو شاید یہ ادراک ہو گیا ہوگا کہ اس نوجوان کو آگے چل کر فرہاد جیسا بننا ہے اس لیے اس کا نام ہی انہوں نے فرہاد رکھ دیا تھا۔ اس کا مزاج بہ قول شخصے لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ خوبصورتی سے اسے پیار تھا۔ وہ خود بھی انتہائی خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے انتہائیں طبیعت کا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتا، سلیطے سے کاڑھی ہوئی مانگ، صاف ستھرے ہاتھ اور پاؤں۔ اور ہر وقت خوشبوؤں میں بسا ہوا۔

فرہاد ایسا نوجوان تھا جس کے ساتھ چلنے ہوئے، جس سے باتیں کرتے ہوئے خوش محسوس ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں میں ایک خاص کشش ہوا کرتی ہے۔ وہ بڑی آسانی سے کسی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ فرہاد بھی ایسا ہی تھا۔ اور کوئی تعجب نہیں تھا کہ محلے کی یا اس کے خاندان کی لڑکیاں اس پر مرمی ہوں لیکن اس نے بھی اپنے عشق کی داستان مجھے نہیں سنائی تھی۔

جبکہ اس کے برعکس ایسے دیسے لوگ ایسی کہانیاں سنانا کر بور کرتے رہتے ”یار! آج فلاں نے لفٹ دی۔ آج فلاں میرے ساتھ ہوئی تک گئی۔ آج فلاں نے محبت بھرا خط لکھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔“

لیکن فرہاد نے اس قسم کی کبھی کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ وہ دوسروں کی ایسی باتیں سن کر صرف مسکرایا کرتا۔ میری اس سے اچھی خاصی دوستی تھی بلکہ بے تکلفی تھی۔ وہ اپنی ہر بات مجھ سے شیریں کرتا لیکن عشق وغیرہ کی داستان میں نے اس سے کبھی نہیں سنی تھی۔

ایک دن میں نے اس سے کہا ”یار، تمہارا نام تو فرہاد ہے لیکن تم بغیر شیریں کے گھومتے رہتے ہو۔ یہ تو کوئی

اپنی طرف کھینچ لے، جس میں آپ کشش محسوس کریں۔
 ”تمہاری یہ تعریف تو بالکل صحیح ہے۔“ میں نے کہا
 ”لیکن اب یہ بتاؤ کہ تمہارا فلسفہ کیا ہوا؟ تم تو اس جذبے کے
 قائل ہی نہیں تھے، دور بھاگتے تھے، کسی کو اپنے قریب نہیں
 آنے دیتے تھے، اب کس طرح یہ سب ہو گیا؟“
 ”یہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے کہا ”تم ٹھیک کہتے تھے
 بھائی! اس جذبے میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ یہ اپنی
 طرف کھینچ کر مجبور کر دیا کرتا ہے، جس طرح میں مجبور ہو گیا
 ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس لمحے میں کیا ناشریحی جولہ مجھے
 اس کے پاس اس طرح اڑا کر لے گیا جیسے سوکھے پتے کو ہوا
 اڑا کر لے جاتی ہے۔“

”اور وہ رہی کہاں ہے؟ کیا جغرافیہ ہے اس کا؟“
 ”یہ مت پوچھو۔“ اس نے ایک گہری سانس لی ”میں
 ابھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دن میں صرف تم ہی
 کو بتا دوں کیونکہ دوسرے میرے اس جذبے اور اس مجبوری
 کو سمجھ نہیں پائیں گے۔“

میں اس سے پوچھتا رہا لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس
 کا کہنا تھا کہ وہ ابھی اپنی اس محبت کو راز ہی رکھنا چاہتا ہے۔
 اب وہ اکثر شام کو غائب رہنے لگا تھا۔ کہاں جاتا تھا؟
 کیا کرتا تھا؟ یہ ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم تھا لیکن جب بھی
 ملتا اس میں ایک تبدیلی محسوس ہوا کرتی۔
 ویسے تو بہت غیر محسوس ہی تبدیلی تھی لیکن میری نگاہوں
 سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ کچھ ضرور تھا جو آہستہ آہستہ بدلتا
 جا رہا تھا۔

ایک شام میں گھر واپس آنے کے لیے رکشا ٹیکسی کے
 انتظار میں کھڑا تھا کہ پتا چلا کہ شہر میں اچانک کوئی گڑبڑ ہو گئی
 ہے اور ٹرانسپورٹ نہیں مل سکتی۔

عجیب پریشانی تھی۔ اب اتنی دور گھر پیدل بھی نہیں
 جا سکتا تھا۔ کیا شہر ہے، کیا حالات ہوتے جا رہے ہیں۔ ذرا
 سی دیر میں کچھ سے کچھ ہو جاتا تھا۔

میں ابھی یہی سب سوچ رہا تھا کہ گولیاں چلنے کی
 آوازیں آنے لگیں۔ فائرنگ نہیں خراب ہی ہو رہی تھی۔ میں
 نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو اپنی جانیں بچانے کے لیے ادھر ادھر
 بھاگ رہے تھے۔

اسی وقت اچانک ایک ٹیکسی میرے پاس آ کر رک گئی۔
 اس میں پہلے سے دو آدمی بیٹھے تھے۔ ڈرائیور کوئی نیک
 انسان تھا کہ اس بے چارے نے مجھے پریشان کھڑا دیکھ کر

ٹیکسی روک لی تھی۔
 ”کس طرف جانا ہے صاحب!“ ٹیکسی والے نے
 دریافت کیا۔

”بھائی، مجھے گلشن کی طرف جانا ہے۔“ میں نے بتایا
 ”بہت بُری طرح چمٹ گیا ہوں۔“

”آؤ، جلدی سے بیٹھ جاؤ۔ ان دونوں کو تین ہی
 اُتار کے کسی طرح تمہیں گلشن پہنچا دوں گا۔“

اس وقت کسی قسم کے سوال جواب کا موقع ہی نہیں تھا۔
 میں جلدی سے پچھلی سیٹ پر ایک آدمی کے برابر بیٹھ گیا۔ جبکہ
 دوسرا آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

اس وقت میں نے غور کیا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ
 دونوں بیٹھ رہے تھے۔ دونوں نے بہت خوبصورت اور بھڑک
 دار لباس پہن رکھا تھا۔ دونوں کے چہرے میک اپ زدہ

تھے۔ بہر حال وہ جو بھی ہوں، اس وقت وہ سب مجھے اس لیے
 اچھے لگ رہے تھے کہ ان کی وجہ سے میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا
 ہو گا گھر کی طرف جا رہا تھا۔

”ہائے بابو صاحب! اتنے ہنگامے میں گھر سے کیوں
 نکل آئے؟“ ایک نے تالیاں بجاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ ہنگامہ تو اچانک ہوا ہے۔“ میں نے بتایا ”میں جس
 وقت نکلا تھا، اس وقت تو کچھ نہیں تھا۔“

”ہاں، یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آگ لگے کم بجتوں
 کو۔“ آگے والے نے کہا ”ذرا ذرا سی بات پر طوفان کھڑا
 کر دیتے ہیں۔ انسانی زندگی کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔
 جس کو جا ہمارا کر چلے گئے۔“

ٹیکسی والا بہت ہوشیاری سے ہنگاموں والے مقامات
 سے بچتا ہوا ٹیکسی نکال لے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم تین ہی
 پہنچ گئے۔

پہلے کے نیچے ایک کچی آبادی تھی، ان دونوں کا قیام اسی
 آبادی میں تھا اور جب ہم یہاں پہنچے ہیں تو پتا چلا کہ آگے
 کے حالات اور خطرناک ہو چکے ہیں۔

جگہ جگہ ہنگامے ہو رہے تھے، گولیاں پل رہی تھیں۔
 اس وقت ٹیکسی والے نے بھی آگے جانے سے انکار کر دیا تھا
 ”نہیں بھائی جان! اب میں یہیں سے واپس ہو جاؤں گا۔
 مجھے آگے نہیں جانا۔“

”لیکن میں کیا کروں، میں کہاں جاؤں؟“ میں نے
 پریشان ہو کر پوچھا۔ اس وقت ان میں سے ایک بیٹھوے نے
 کہا ”ارے بابو! کیوں اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے ہو،

آج رات یہیں ہمارے ساتھ رہ جاؤ۔ حالات ٹھیک
 ہو جائیں تو گھر چلے جانا۔“

ان کی پیشکش تو اچھی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
 کہ میں بیٹھوں کے گھر میں ایک رات کیسے گزار سکتا تھا؟
 میری کچھ بھاٹ دیکھ کر ان میں سے ایک نے کہا ”آئے ہائے!

اب اتنا سوچ بچار کس لیے۔ جان بھانا فرض ہے، جان
 بچالو۔ اور ہم تمہیں کھانا تو نہیں جائیں گے۔ ایک رات کے
 لیے مہمان رکھیں گے، صبح اُٹھ کر چلے جانا۔“

اس نے ایسی بات کر دی تھی کہ میں نے یہی مناسب
 سمجھا کہ ان کی پیشکش قبول کر لی جائے اور ویسے بھی راستہ تو
 تھا نہیں۔ میں جاتا تو کہاں جاتا؟

ان ہی دونوں نے ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا اور وہ
 چلا گیا۔ پھر وہ مجھے ایک چھوٹے سے گھر میں لے آئے۔ یہ
 ایک کچھان تھا جس میں ایک بوڑھا سا آنگن تھا اور اس آنگن
 میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔

اس تخت پر کوئی بیٹھا ہوا تھا۔
 گھر میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں تخت پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو
 دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جس نے
 بہت سلیقے کا لباس پہن رکھا تھا۔

دبلی پتلی، گوری اور بہت خوبصورت۔ دلوں میں
 اتر جانے والی آنکھیں۔

میں تو اسے لڑکی ہی سمجھتا تھا لیکن جب اس نے تالیاں
 بجا کر بات کی تو سمجھ میں آ گیا کہ وہ بھی بیٹھوہی تھی ”اے
 ہائے، یہ تم لوگ کس مہمان کو لے آئے ہو؟“

”کامل۔“ یہ بے چارے بہت پریشان ہو رہے
 تھے۔ ”ایک نے بتایا، ہم اسی لیے اپنے ساتھ لے کر آئے
 ہیں۔ آگے ہنگامے ہو رہے ہیں نا۔“

”اوہو، پھر تو یہ ایک رات کے مہمان ہوئے نا۔“
 کامل نے کہا ”ان کی خوب خاطر کرنا۔ کوئی تکلیف نہ ہو۔
 میں تو چلی اپنے پیارے پاس۔“

کامل تخت سے اتر کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ بہت ہی
 حیران کر دینے والا ماحول تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے پیارے
 کے پاس جا رہی ہے، خدا جانے کون تھا اس کا پیارے؟

جو مجھے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، انہوں نے میرے
 سامنے کھانا لار کھ دیا تھا۔ مجھے کچھ پچھتاہٹ تھی کہ میں سے
 ایک نے کہا ”بابو، بے فکر ہو کر کھالو۔ یہ بہت حلال کی کمانی کا
 کھانا ہے۔“

میرے ہم جماعت سر شاہ محمد سلیمان کے
 ایک بھائی شاہ محمد سلیمان تھے۔ میری طرح وہ
 بھی ریاضی میں دو سال فیل ہو چکے تھے اور
 ناکامی کے ہاتھوں عاجز تھے۔ وہ کھانا جانا چاہتے
 تھے مگر سر سلیمان اجازت نہیں دے رہے تھے۔

وہ بھی میری طرح سر پھرے تھے۔ ہم لوگ
 جولائی 1919ء میں نکلتے پہنچ گئے۔ عبداللطیف
 لینن میں ٹھہرے۔ آمدن کا کوئی ذریعہ نہ تھا سو

ٹیوشن کی تلاش شروع ہوئی۔ سنا کہ ایک انسپکٹر
 گرلز اسکول اردو پڑھنا چاہتی ہیں۔ کئی میل
 پیدل چل کر ان کے گھر پہنچا کہ بیروں میں

چھالے پڑ گئے۔ دستک دیا تو پتا چلا کہ سیم صاحبہ
 گھس گئی ہوئی ہیں۔ یہ منہا تھا کہ حواس جاتے
 رہے۔ میں نے نوکر سے کہا کہ گھر میں کوئی اور

ہے تو اسے بلاؤ۔ ایک دو شیئرہ باہر آئی۔ ایسی
 قبول صورت میں نے بھی نہ دیکھی تھی۔ اس کے
 سوال کرنے پر میں نے کہا کہ سیم صاحب نے

اردو پڑھنے کے لیے مجھے بلایا ہے۔ اس کے طرز
 گفتگو نے حیرت میں اضافہ کر دیا۔ کلکتہ میں کسی
 بیگانی عورت کا ششہ اردو بولنا غیر معمولی بات

تھی۔ وہ کچھ کہے جا رہی تھی اور میں کھویا کھویا سا
 اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب چپ ہونے کے
 قریب ہوئی تو میں پھر کچھ پوچھ لیتا اور وہ پھر

الفاظ کے پھول برسانے لگتی۔ میں نے بالآخر
 دریافت کیا کہ آپ یہاں رہ کر اتنی اچھی اردو
 کیسے بول سکتی ہیں؟ کچھ مسکرا کر جواب دیا کہ

میں اپنی خالہ کے ساتھ کلکتہ میں کافی عرصہ رہی
 ہوں۔ وہاں کا اثر میری زبان پر رہا ہے۔ ایک
 بیانی چائے کے بعد مجھے رخصت ہونا پڑا مگر خفا

کا اثر تھا کہ اب نکلان محسوس ہوتی تھی نہ آبلہ
 پائی۔ جب تک وہاں رہا دشمن کی پیاس بجھانے
 جاتا رہا مگر حوصلہ نہ ہوا کہ لب داہو جاتے۔

اقتباس: سوانح ڈاکٹر اعجاز حسین
 مرسلہ: تہیذہ اظہر، کراچی

مجھے بھی اب تھوڑا مذاق سوچھ گیا تھا۔ انسان کی یہی فطرت ہوتی ہے، ذرا سی راحت ملے تو پھر اس کے اندر کا سنجیدہ اور غیر سنجیدہ انسان جاگ اٹھتا ہے۔

”ایک بات بتاؤ۔“ میں نے پوچھا ”تم لوگ تو ناچ کر پیسے کاتے ہو۔ پھر یہ رزق حلال کہاں سے ہوا؟“

”نہیں بالو! ہمارے یہاں یہ سب نہیں ہوتا۔“ دوسرے نے بتایا ”ہم کاجل کی سہائیں ہیں۔ ہم سب مزدوری کرتی ہیں۔ کاجل بہت بڑی کارگر ہے۔ اتنی بڑی مستری ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ بڑی بڑی عمارتیں بناتی ہیں اور ہم دونوں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔“

”پھر تو یہ بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا ”اور یہ بیا کون ہے؟ جس کے پاس تمہاری کاجل گئی ہوگی ہے؟“

”ہائے ہائے، اب کیا سب کچھ ایک ہی سانس میں پوچھ لو گے؟“ ایک نے کہا۔

”پھر بھی۔ اپنے تجسس کے لیے پوچھ رہا ہوں۔“

”پریم لال۔“ ایک نے دوسرے سے کہا ”بالو جی کو اپنی کاجل کے پیاجی سے ملوادو، ورنہ بے چارے کو رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ بے گل ہوتا رہے گا۔“

”پریم لال نے میرا ہاتھ تھام لیا۔“ آؤ میرے ساتھ لیکن کچھ بولنا نہیں۔ چپ چاپ دیکھتے رہنا۔“

وہ مجھے اس کوٹھری کی پشت پر لے آیا جس کوٹھری میں کاجل گیا ہوا تھا۔ پیچھے کی طرف ایک کھڑکی تھی جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

پریم لال نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ میں کھڑکی سے جھانک کر دیکھ لوں۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا اور لرز کر رہ گیا۔

اس کمرے کے درمیان میں ایک بڑی سی جائے نماز بھی ہوئی تھی اور کاجل جگہ سے میں گرا ہوا تھا۔ پورے کمرے میں اللہ ہو، اللہ ہو کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

کاجل جگہ سے میں گرا ہوا ور کیے جا رہا تھا اور اس کی آواز میں بلا کا سوز تھا جیسے کچا بچہ کربا ہر آ جائے گا۔

میرے خدا! یہ کیا تھا، کیا کھسی یہ کاجل! پریم لال نے مجھے اشارہ کیا کہ میں وہاں سے ہٹ جاؤں۔ میں اس کے ساتھ آگن میں آ گیا۔

اس وقت میری کیفیت ایسی ہو رہی تھی کہ مجھ سے کچھ کہا نہیں جا رہا تھا۔

میں نے دورات ایک کرب مرگڑی تھی میرے

خدا کا جل کا کیر نہ تھا؟ کون تھا وہ.....؟ وہ محبت اور عبادت کے کس درجے پر تھا۔

میں رات بھر یہی سب سوچتا رہا تھا۔

دوسری صبح ایک اور حیرت میرے انتظار میں تھی۔ شاید مجھے نیند دیر سے آئی تھی اسی لیے میں بہت دیر تک سوتا رہا تھا۔

میرا ستر آ آگن کے تخت پر بچھا دیا گیا تھا۔

اور جب آگن کھلی تو میرا دوست فرما دیرے سامنے کھڑا تھا۔ شاید مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی ہوگی جتنی حیرت اسے ہو رہی تھی۔

”آصف بھائی، تم یہاں کہاں؟“ اس نے پوچھا۔

”میں تو یہاں ایک مجبوری کی حالت میں آیا ہوں۔“

میں نے بتایا ”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں تو یہاں آ کر رہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کیوں؟“

وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا ”میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے عشق ہو گیا ہے اور جس سے عشق ہوا ہے، اس کا نام کاجل ہے اور شاید اس سے تمہاری ملاقات بھی ہو چکی ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی ”تمہاری کاجل سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ اگر میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ نہیں دیکھا ہوتا تو شاید تم کو کلفت ملامت کرتا..... لیکن سب کچھ دیکھنے کے بعد دل چاہ رہا ہے کہ تم کو اس عشق کی مبارک باد دوں۔ بشرطیکہ تم نے کاجل کو اپنی منزل سمجھ لیا ہو اور تمہارا عشق سچا ہو۔“

”آصف بھائی، اب اس سے زیادہ سچائی اور کیا ہوگی کہ میں بس اسی کا ہو کر رہ گیا ہوں۔“

اسی دوران کاجل بھی کمرے سے باہر آ گیا۔

اس وقت اس کا حسن دیکھنے کے قابل تھا۔ اس کا چہرہ دیک رہا تھا اور مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے کی یہ دیک اس کے اندر کی روشنی کی وجہ سے ہے۔ وہ روشنی جو اس کی روح کی پاکیزگی کی کہانی سن رہی تھی۔

اس کو دیکھ کر میں نے اپنی گردن عقیدت سے جھکا لی تھی۔

”مہمان، رات میں تم آرام سے تو سوئے تھے نا؟“

کاجل نے پوچھا۔

”جی ہاں، بہت آرام اور سکون سے سویا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”مہمان! اپنے اس دوست سے کہو کہ میرا پیچھا نہ کیا

کرے۔“ کاجل نے کہا ”اس نے ایک گنگار میں ایسی کون سی بات دیکھی کہ اپنا ہوش گوا بیٹھا ہے؟ کاجل کے پاس ہے کیا، صرف چند دکھاوے کے بعد ہی تو ہیں۔“

”میں نے اپنی منزل آپ ہی کو بنالیا ہے۔“ فرما دیر زنی ہوئی آواز میں بولا ”یہ میرا عشق ہے اور عشق میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس کے پاس کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔“

”بہت مشکل ہے۔“ کاجل نے اپنی گردن ہلائی ”عشق کا مطلب سمجھتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے محبوب کے رنگ میں رنگ جانا۔ کیا تو میرے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کے لیے تیار ہے؟“

”ہاں، ہر لمحے، ہر وقت۔“ فرما دیر نے کہا ”میں نے کچھ سوچ کر ہی اس راہ پر قدم رکھا ہے۔“

”تو پھر ہو جاواری طرح۔“

”یہ تمہیں کہہ دیا ہوگا۔“

یہ سب کچھ چونکہ میرے سامنے ہوا تھا اسی لیے میں ایسے انوکھے عشق کا گواہ ہوں۔ کہاں فرما دیر جیسا بانکا جیلا نو جوان اور کہاں کاجل۔ ایک محنت..... لیکن نہیں، وہ تو کچھ اور تھا، کسی اور دنیا کی مخلوق۔ نہ جانے وہ کتنے نام نہاد ہیروں، فقیروں اور علمائے سو پر بھاری تھا۔ نہ جانے وہ کس منزل کا راہی تھا۔ نہ جانے وہ اپنے جہدوں میں کتنی لذت محسوس کرتا ہوگا؟

خدا کے نزدیک اس کا رتبہ کتنا بلند ہوگا اور وہ کوئی عام انسان نہیں تھا اور فرما دیر..... اس کا عشق بھی کوئی عام عشق نہیں تھا۔

نہ جانے کاجل نے کس کیفیت میں اس پر نگاہ ڈالی ہوگی کہ اس کی دنیا ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ میں بہت ہی حیرت انگیز تجربات کے لے کر اس مکان سے واپس آیا تھا۔

فرما دیر ہیں رہ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بعد میں آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ بعد میں بھی نہیں آیا۔ اس کے گھر والے، رشتے دار، دوست سب اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں تھا۔

میں نے اس کے گھر والوں بلکہ کسی کو بھی اس مکان، کاجل اور فرما دیر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ نہ جانے کیوں؟ اس میں میرے کسی ارادے کا دخل نہیں تھا۔ بس میری زبان پر چسپے مہر لگ گئی تھی۔

ایک شام میں اکیسوا کی کویتائے بغیر تین بیٹی کے اس مکان کی طرف چلا گیا جہاں میں نے کاجل اور اس کے

دو دیکھ گے کسی بھی گوشے میں اور ملک ٹھہریں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم ای حساب ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیلوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا بین الاقوامی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز 111 سیکشن 1 وٹس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 35802551

تقدیس عشق

جناب مدیر اعلیٰ
تسلیمات!

میں کہانی کار نہیں ہوں لیکن پڑھتی ضرور ہوں۔ سرگزشت مجھے اتنا عزیز ہے جتنا مجھے اپنے بچے۔ میرے بچے کہتے ہیں ”مما، آپ اس رسالے کے لیے اتنی کنشس کیوں ہیں کہ داغ دھبے نہ لگیں، وقت پر خرید لاؤ۔“ تب میں کہتی ہوں کہ اس میں سبق ہے، دوسروں کی زندگی سے، حالات سے انسان کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ جو کردار سرگزشت ادا کر رہا ہے اسے بھلایا نہیں جاسکتا۔ اب جب میں نے عشق ناکام نمبر کا اشتہار دیکھا تو سوچا کہ اپنی زندگی کا ایک باب رقم کردوں کہ کسی نے مجھ سے بھی عشق کیا تھا اور اس کا عشق ناکام نہ ہوا۔ اس روداد میں سبق ہے اسی لیے لکھ رہی ہوں لیکن نام مقام بدل دیا ہے۔ میرا اصل نام نہ لکھیں۔ کہانی پر جو نام ہے وہی چھاپیں۔

شاہین اظہر
(کراچی)



عشق ناکام نمبر
میں شام کے وقت صحن میں لگے پودوں کو پانی دے رہی تھی کہ کال بیل بجی۔ میں پانی بند کر کے گیٹ تک آئی۔ ”کون ہے؟“
”امی ہیں ہوں۔“ باہر سے ماہ جیوں کی آواز آئی، وہ
کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا تو صورت سے اور بھی پریشان نظر آئی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ جلدی سے اندر آئی تھی۔
”کیا ہوا ماہ جیوں، خیریت تو ہے؟“

اس کا نام کا جل تھا لیکن اس کے گزر جانے کے بعد اب خود اس نے اپنا نام کا جل رکھ لیا ہے۔“
”تو کیا یہ اسی علاقے میں رہتا ہے؟“
”جی صاحب! اور اس پورے علاقے میں یہ کا جل صاحب کہہ کر پکارا جاتا ہے۔“
”کمال ہے بھائی!“

”بابو صاحب، آپ اس کے سامنے والی حالت پر نہ جائیں، یہ اس دور کا ولی ہے۔ ایسا اللہ والا آدمی شاید پورے ملک میں کوئی اور نہیں ملے گا۔ اس نے نہ جانے کتنوں کی دنیا بدل کر رکھ دی ہے۔ نہ جانے کتنے بد معاش، غنڈے اور موالی اس کی وجہ سے سیدھے راستے پر آ گئے ہیں۔“

میں حیرت، غرور اور عجب قسم کے احساسات کے ساتھ اس شخص کی باتیں سن رہا تھا جو یہ بتا رہا تھا کہ پورا علاقہ کا جل صاحب سے عقیدت رکھتا ہے۔
اور یہ کا جل صاحب کون تھے؟
کل کا فرہاد۔ جس نے بھی کسی لڑکی سے عشق نہیں کیا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ اس قسم کا عشق اسے اپنے معیار سے کم تر معلوم ہوتا ہے۔

اور اس کا معیار کیا تھا اس ایک بھڑے نے اسے آسان تک پہنچا دیا۔ اس نے فرہاد کو کامل بنا دیا۔ یہ فانی الشیخ کی کہانی ہے۔ نہ جانے کس روپ میں کیسے لوگ ہوتے ہیں؟ کا جل ایک محنت تھا لیکن اس نے فرہاد کی زندگی بدل دی۔ اسے اپنے آپ میں جذب کر کے اپنے ہی جیسا بنا دیا۔ اس کے عشق کو ناکام بنا کر اپنا رنگ چڑھا دیا کیونکہ کا جل نے اپنے خدا سے عشق کیا تھا، فرہاد نے کا جل سے..... پھر کا جل درمیان سے ہٹ گیا اور فرہاد اپنے اللہ کا ہو کر رہ گیا۔

عشق مجازی سے عشق حقیقی تک کا یہ سفر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس دن میں نے فرہاد سے ملاقات نہیں کی لیکن اس کے بعد جب میں اس سے ملنے پہنچا تو محفل والوں نے بتایا کہ وہ لوگ تو یہاں سے جا چکے ہیں۔ کہاں؟ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا۔

عشق ناکام نمبر کے لیے یہ کہانی کسی مشہور آدمی کی کہانی نہیں ہے لیکن عشق کی کہانی ضرور ہے۔ عشق جو جھجے دکھاتا ہے اور نہ جانے کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ کاٹس اہم میں بھی عشق کرنے کا سلیقہ آ سکے۔

عشق ناکام نمبر

ساتھیوں کو دیکھا تھا اور جہاں آخری بار فرہاد سے ملاقات ہوئی تھی۔

لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ پتا چلا کہ وہ لوگ بہت پہلے مکان خالی کر کے جا چکے ہیں۔ کہاں؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے بعد فرہاد کا کوئی پتا نہیں چلا۔ اور بہت دنوں کے بعد شاید چار پانچ برسوں کے بعد فرہاد مجھے مل گیا۔

شہر سے بہت دور، ایک چھوٹی سی آبادی میں جہاں میں اسے کسی دوست کے ساتھ اس کے کسی رشتے دار کے پاس گیا ہوا تھا۔

فرہاد مجھے اسی محلے میں ملا تھا۔ اب وہ کچھ اور ہو چکا تھا۔ خوبصورت تو وہ پہلے سے تھا لیکن اب اس کے زانہ رنگ روپ نے اسے اور حسین کر دیا تھا۔

وہ ایک ٹھیلے لیے سبزیاں فروخت کر رہا تھا۔ بالکل وہی انداز، جو خواہہ سراؤں کا ہوا کرتا ہے۔ تالیاں بجا بجا کر۔ اس نے عورتوں والے پھولدار کپڑے پہن رکھے تھے۔

فرہاد کو اس روپ میں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔ اس بائسکے جیلے نو جوان کا کیا حشر ہوا تھا۔ میں اس کے پاس نہیں گیا۔ دور سے دیکھتا رہا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر شرمندہ ہو جائے گا۔ میں اس کی شرمندگی کے خیال سے اس کے پاس نہیں گیا۔

پھر میں نے ایک حیرت انگیز بات دیکھی۔ گرچہ وہاں اور بھی سبزی والے تھے لیکن سب سے زیادہ رش اسی کے پاس ہو رہا تھا۔

مرد، عورتیں اس کے ٹھیلے کے پاس آ کر اسے ادب سے سلام کرتے اور اس سے خریداری کر کے آگے چلے جاتے۔

میں نے چائے دینے والے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا ”بھائی، ایک بات تو بتاؤ، یہ بندہ جو سبزیاں بیچ رہا ہے، یہ کون ہے؟“

”اس کا نام کا جل ہے صاحب!“ اس نے بتایا۔
”کا جل!“ میں چونک گیا تھا ”اس کا نام کا جل ہے؟“

وہ روہاںسی ہوگئی۔ ”ای تین دن سے کچھ لنگھے میرا بچھا کر رہے ہیں۔ وہ سینئر کے باہر موجود ہوتے ہیں اور جب میں باہر آتی ہوں تو میرے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ آوازیں کستے ہیں اور بہت.... وہ بولتے بولتے رودی تھی۔ میں اسے اندر لے آئی، بٹھا کر پانی پلایا۔ ماہ جبین بی کام کر رہی تھی۔ اسی لیے اسے کوچنگ کی ضرورت پڑی تھی۔ اظہر نے اسے ایک مقامی اچھے کوچنگ سینٹر میں داخل کر دیا تھا۔ ماہ جبین ڈاکٹر بننا چاہتی تھی لیکن میٹرک میں بیماری کی وجہ سے اسے اچھے نمبر نہیں بنے تھے۔ اس لیے اس نے بدل ہو کر ایف ایس سی کے بجائے کامرس لے لیا۔ اب وہ ایم بی اے کرنا چاہتی تھی۔ ماہ جبین ہماری اکلونی اولاد ہے اس لیے اس کی ہر خواہش پوری کرنا ہم ماں بیوی کے لیے فرض ہو جاتا تھا۔ جب اس کی حالت سنبھلی تو میں نے اسے سمجھایا۔

”بیٹا یہ تو ایک عام مسئلہ بن گیا ہے، جولوہ کی تعلیم یا جاب کے لیے باہر نکلتی ہے اسے اس قسم کی باتوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ آپ توجہ مت دو، وہ کچھ دن بعد خود پیچھا چھوڑ دیں گے۔“

”ای مجھے بہت ڈر لگتا ہے اور بے عزتی بھی محسوس ہوتی ہے۔ اب تو لوگ بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ وہ لنگھے گلی کے کونے تک آتے ہیں۔“

”اچھا کل میں تمہارے سینئر آؤں گی اور پھر دیکھوں گی۔“

اس کے چہرے پر اطمینان دکھائی دیا تھا۔ ”یہ ٹھیک ہے ای آپ ایک دو دن میرے ساتھ آجائیں تو ہو سکتا ہے وہ پھر تنگ نہ کریں۔“

”ٹھیک ہے لیکن اپنے پاپا سے ذکر مت کرنا وہ پریشان ہو جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے امی۔“ ماہ جبین بیگ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ اظہر کو بتانے سے میں نے اس لیے منع کیا کہ وہ بہت سیدھے مزاج کے آدمی ہیں۔ ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ ہیں۔

صبح دفتر جاتے ہیں اور شام کو گھر آ کر بیوی کے آگے بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کا لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم ہے بلکہ وہ لوگوں سے ملتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ ان میں ایک طرح کا شرمیلا پن ہے۔ وہ مسائل کا سامنا نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی شخص ان کے سامنے کھڑا ہو تو وہ پیچھے ہٹ جائیں گے یا ہتھیار ڈال دیں گے۔ مقابلہ کرنا ان کی سرشت ہی نہیں

ہے۔ میں اسے بزدلی نہیں کہہ سکتی کیونکہ بزدل آدمی محنت سے بھی جی چڑاتا ہے اور اظہر بلا محنت ہیں۔ ایک زمانے میں جب ہم اپنا گھر بنا رہے تھے تو وہ دفتر کے بعد ایک جگہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرتے تھے اور صبح سات بجے کے نکلے رات بارہ بجے گھر آتے تھے۔ مسلسل پانچ سال ان کا یہی معمول رہا تھا۔ مجھ سے اور ماہ جبین سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ہمارے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کسی کا سامنا نہ کر پاتا ان کی کمزوری ہے تو میں نے اسے مسئلہ نہیں بنایا جب بھی کوئی ایسا مسئلہ ہوتا ہے تو میں انہیں آگے کرنے کی بجائے خود اس کا سامنا کرتی ہوں۔ اسی لیے میں نے ماہ جبین کو منع کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے لیکن اندر ہی اندر اس بات پر کڑھتے رہتے۔

اگلے دن میں جب ماہ جبین کے سینئر سے آنے کا وقت ہوا تو میں خود چلی گئی۔ سینئر ہمارے علاقے میں پیدل مسافت پر تھا۔ ماہ جبین کالج سے سیدھی وہیں چلی جاتی تھی۔ وہاں اس کی دو گھنٹی کی کلاسیں ہوتی تھیں اور چار بجے وہ سینئر سے نکل جاتی تھی سوا چار بجے تک گھر میں ہوتی۔ میں سینئر کے سامنے پہنچی تو وہ لنگھے کیلے سے وہاں موجود تھے۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ ماہ جبین کی چٹھی چار بجے ہوتی ہے اور وہ اس کے باہر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں دروازے پر موجود رہی۔ ماہ جبین باہر آئی تو میں نے اسے آواز دی۔

”بیٹے یہاں آؤ۔“

وہ پریشان تھی لیکن مجھے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ وہ تیزی سے میرے پاس آئی۔ ”ای آپ نے دیکھا وہ لوگ موجود ہیں۔“

”تم فکر مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے تو وہ تین لنگھے پیچھے پیچھے تھے۔ نینوں نو جوان تھے ان کی عمریں شاید بیس بائیس برس تھیں۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر چلتے ہوئے بے ظاہر آپس میں بات کر رہے تھے۔

ان کی گفتگو میں بے ہودگی اور فحش گوئی بہت زیادہ تھی اور ظاہر ہے وہ یہ سب ہمیں سنارہے تھے۔ ماہ جبین نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس کی گرفت سے لگ رہا تھا وہ اندر سے نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کی بے ہودہ گوئی سن کر کوئی لڑکی

نازل نہیں رہ سکتی ہے جبکہ اسے معلوم ہو کہ یہ سب اسے سنانے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ وہ لنگھے گلی کے سرے تک ہمارے پیچھے آئے تھے۔ ماہ جبین گھر میں داخل ہوئی تو پھر روہاںسی ہو رہی تھی۔

”دیکھا امی آپ نے.... میں چار دن سے ان کی بکریاں سن رہی ہوں۔“

”تو فکر مت کر ماہ جبین سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”جلد ہی لنگھے تیرا پیچھا چھوڑ دیں گے۔“

ماہ جبین چنچ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے لاؤنج میں رکھا فون اٹھایا اور ایک نمبر ملایا جو کہیں لکھا نہیں ہے لیکن مجھے یوں ازبر ہے جیسے اپنی تاریخ پیدائش یاد ہے۔ تیسری تیل پر کسی نے کال ریسیڈی۔ ”ہیلو۔“

”لوہ جھاری اور جانا بیچنا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔“ اکبر....؟“

”شاہن.... تم شاہن ہونا؟“

”تم نے پہچان لیا؟“

”ہاں میں نہیں کیسے بھول سکتا ہوں؟“ وہ چند لمبے کے لیے جذباتی ہو گیا لیکن پھر خود پر قابو پایا۔ ”معاف کرنا.... تم سناؤ خیریت ہے نا؟“

”خیریت نہیں ہے کچھ مسئلہ ہے اسی لیے تمہیں فون کیا ہے۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”کوئی تمہیں پریشان کر رہا ہے؟“

”مجھے نہیں میری بیٹی کو۔“ میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے ساری بات بتائی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔

”تم نے مجھے بتا دیا اب بے فکر ہو جاؤ۔“

میں نے سچ سچ اطمینان محسوس کیا تھا۔ ”جب میں نے نمبر ملایا تو ڈر رہی تھی کہ کہیں تم نے نمبر نہ بدل لیا ہو یا یہ نمبر بند نہ ہو۔ بیس سال بعد میں نے یہ نمبر ملایا ہے۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”ہاں وقت گزر گیا ہے، لیکن یہ نمبر تمہیں ہمیشہ آن لے گا۔ میں نے اب تک چار گھنٹیں بدلی ہیں لیکن یہ نمبر اپنے پاس رکھا۔ جب یہ بند ملے تو سمجھ لینا کہ میں اس دنیا۔“

”خدا نہ کرے۔“ میں نے تپ کر کہا اور پھر اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ”تم اب بھی ویسے ہی ظالم ہو۔“

وہ ہنسا۔ ”بدمعاش جو ظہرا.... اب تم بے فکر ہو جاؤ۔“

میں نے ریسیور رکھا تو ماہ جبین کپڑے بدل کر آگئی اس نے پوچھا۔ ”ای ابو کو کال کر رہی تھیں؟“

”نہیں بیٹا.... اور میں نے منع کیا تھا اپنے پاپا کو کچھ

نہیں بتانا ہے۔“

”جی امی میں نے پاپا کو کچھ نہیں بتایا ہے۔“

”بس بے فکر ہو جاؤ اب وہ بدمعاش تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔“ میں نے یقین سے کہا تو ماہ جبین مطمئن نظر آنے لگی۔ اسے مجھ پر اعتماد تھا۔ بچپن سے اب تک اس کے باہر کے سارے کام میں کرتی آئی تھی۔ باہر کا کوئی بھی مسئلہ ہوتا وہ مجھ سے کہتی تھی اور میں اسے حل کر دیتی تھی۔ اس لیے اسے اطمینان تھا کہ میں یہ مسئلہ حل کر دوں گی۔ اس دوران میں اظہر دفتر سے آگئے اور ماہ جبین ان کے ساتھ لگ گئی۔ نو دس سال کی عمر سے اس نے اظہر کی بہت ساری ذمے داریاں خود لے لی تھیں۔ جیسے ان کے کپڑے پریس کرنا، جب وہ دفتر سے آتے تو ان کی چیزیں ہاتھ روم میں رکھنی۔ ان کو پانی اور چائے بنا کر پیش کرنا تھی۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے کام جو بچپن میں کرتی تھی اب ماہ جبین کرتی تھی۔ میں رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔

اکبر نے مجھ سے بے فکر ہونے کو کہا تھا اور میں سچ بچے بے فکر ہو گئی تھی مجھے معلوم تھا کہ کام کر دے گا۔

رات سونے سے پہلے میں حسب معمول ماہ جبین کے کمرے میں آئی اور اسے پیار کیا تو اس سے سرگوشی میں کہا۔ ”ای وہ لوگ اب مجھے تنگ نہیں کریں گے نا؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”وہ اب نظر اٹھا کر کبھی تمہاری طرف نہیں دیکھیں گے تم پورے اطمینان سے سنبھاؤ۔“

ماہ جبین خوش ہو گئی اس نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ یہ ہوگا کیسے؟ اسے مجھ پر اعتماد تھا۔ میں کمرے میں آئی تو اظہر بیوی دیکھ رہے تھے۔ ہم گیارہ بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتے تھے۔ انہوں نے بیوی بند کیا اور میری طرف دیکھا۔ ”کوئی مسئلہ ہے کیا.... تم کل سے چپ ہو؟“

”نہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں ہنس کرانی۔ ”ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی مسئلہ ہو اور آپ سے متعلق ہو تو میں آپ کو نہ بتاؤں۔“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے پھر اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

ہم شاہ فیصل کالونی میں رہتے تھے جو اس زمانے میں ڈرگ کالونی کہلاتی تھی۔ ان دنوں میں کالج میں تھی اور میرا کالج صدر میں تھا روزانہ مجھے بس سے جانا اور آنا پڑتا تھا۔

ماہنامہ سرگودشتہ

اگست 2012

www.pdfbooksfree.pk

287

اگست 2012

www.pdfbooksfree.pk

286

”تت... جہیں کیسے پتا چلا؟“

”ام روز صبح آپ کو یوں میں جاتے دیکھا، آج بھی جاتے دیکھا لیکن جب آپس واپس نہیں آیا تو ام کو فکر ہوا اور ام یہاں آ گیا۔“

مجھے اس وقت بھی یقین تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے جھاڑیوں سے نکل کر مجھ پر دست دراز کی تھی اور میں دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ کوئی اور آجائے یا کوئی بس آجائے تو میں یہاں سے نکل جاؤں۔ اس نے میری صورت سے خوف بھانپ لیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ڈرنا نہیں... ام کوئی نقصان نہیں پہنچاے گا اور تم شاید مجھ ہی ام نے ہی تم پر حملہ کیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ تم پر حملہ کرنے والا انیشن پر چنے کی ریزھی لگا رہا ہے۔ ام نے اس کا ٹانگ توڑ دیا، اب وہ بیساحی کے سہارے چلتا ہے۔“

”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

”پتا نہیں... ام بہت عرصے سے آپ کو یہاں سے گزرتے دیکھتا ہے۔ دو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا۔ جب ام نے آپ کو پہلی بار دیکھا تو آپ ڈر اہوا لگا۔ تب سے ام کو ہمدردی ہو گئی اور ام تمہارے علم میں لائے بغیر ان جھاڑیوں میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوتا۔ اگر ام سامنے تمہارے ساتھ آتا جاتا تو تم ڈر جاتا اور ام پر بالکل اعتبار نہیں کرتا کہ ام تمہارا حفاظت کے لیے تمہارے ساتھ ہے۔ اس لیے ام چھپ کر تمہارے ساتھ ہوتا اور اسی وجہ سے ام ہر وقت تمہاری مدد کے لیے پہنچ گیا۔ تمہاری طرح اس بد معاش کو بھی علم نہیں تھا کہ ام جھاڑیوں میں ہوتا ہے۔“

وہ صورت سے اور طے سے خود بد معاش نظر آ رہا تھا لیکن اس کا لہجہ نہایت نرم تھا اور وہ بہت شریفانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس وقت تک میرا خوف کم ہونے لگا تھا اور پھر میری مخصوص نسوانی حس نے بتایا کہ وہ میرے لیے غلط عزائم نہیں رکھتا ہے۔ میں نے کہا۔ ”تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟“

”اس لیے کہ آپ کا خوف کم ہو جائے اور آپ یہاں کھڑے رہنے کی بجائے اپنے گھر جاؤ۔ ام اسی جگہ کھڑا ہے اور جب تک آپ ریل لائن تک نہیں پہنچ جاتا ام اسی جگہ رہوں گا۔ بے شک آپ دوستی رہنا۔“

اس کی بات سے میں نے ہمت پکڑی اور پہلے ہچکچاتے ہوئے ست قدموں سے اور پھر جب نصف راستہ

طے کر لیا تو تیز قدموں سے آبادی کی طرف جانے لگی۔ میں نے کئی بار مزکر دیکھا تو اسے اسی جگہ پایا حتیٰ کہ میں ریل لائن تک پہنچ گئی تب بھی وہ اسی جگہ کھڑا تھا۔ میں گھر پہنچی تو امی پریشان تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہیں والا نہیں آیا تھا اور مجھے بس میں آتا پڑا۔ لیکن میں نے امی سے اس شخص کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ میں امی سے کوئی بات چھپانی نہیں ہوں لیکن نہ جانے کیا بات تھی جو میں نے یہ بات نہیں بتائی۔ اس واقعے کے دو دن بعد میں انوار والے دن امی اور میری چھوٹی بہن مایین کے ساتھ ملیر کالونی جانے کے لیے نکلی وہاں میری خالہ کا گھر ہے۔ اس زمانے میں لوکل ٹرین یا قاعدگی سے چلتی تھی اس لیے ہم خالہ کے گھر لوکل ٹرین سے جاتے تھے۔

انشین برآ کر میں نے بے یقینہ والے آدمی کو دیکھا تو مجھے اس شخص کی بات یاد آئی کہ جس شخص نے مجھ پر حملہ کیا تھا، وہ انیشن پر چنے کی ریزھی لگا تھا اور اس نے اس شخص کی ٹانگ توڑ دی ہے۔ اب وہ بیساحی کے سہارے چلتا ہے۔ میں نے دیکھا صبح کچھ وہ بیساحی کے ساتھ تھا اور اس کے چہرے پر بھی دغموں کے کئی نشانات تھے۔ اس کی ایک آنکھ پر چوٹ تھی۔ سیاہ رنگت اور چہرے سے وہ خبیث لگ رہا تھا۔ وہ جس طرح آتی جاتی عورتوں کو کھوڑ رہا تھا اس سے اس کی ذہنت کا اندازہ ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی مجھے یقین آ گیا کہ اسی نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں بس اسٹاپ پر رہنے والے شخص پر بے جا شک کر رہی تھی۔

پہلے سال میرا انگریزی کا پیپر رہ گیا تھا۔ بخاری کی وجہ سے میں جا نہیں سکی تھی اس سال مجھے انگریزی کے دو پرچے بھی دینے تھے اور میری تیاری اتنی اچھی نہیں تھی اس لیے میں نے کالونی میں رہنے والی ایک سچریے انگریزی... پڑھنا شروع کر دی۔ میں شام چار بجے جاتی تھی اور چھ بجے واپس گھر آتی تھی۔ سچر کا گھر چھ بجے ہی دور تھا اس لیے میں اکیلی پیدل چلی جاتی تھی۔ واپسی میں کبھی بھائی دفتر سے آتے ہوئے مجھے لیتے آتے یا وہ لیٹ ہو جاتے تو میں خود واپس آ جاتی تھی۔ یہ اکتوبر کے دن تھے اور امتحان قریب آ گئے تھے اس لیے میں زیادہ دیر تک پڑھتی تھی اور اکثر مجھے گھر آتے آتے رات ہو جاتی تھی۔ ایک دن میں انیشن سے نکلی اور گھر کی طرف جا رہی تھی کہ مجھے لگا کہ کوئی شخص میرے پیچھے ہے وہ پاس نہیں تھا بلکہ اتنی دور سے احتیاط سے

پہچا کر رہا تھا کہ کئی بار مڑ کے دیکھنے کے باوجود میں اسے دیکھ نہیں سکتی تھی پھر کبھی اس کی ایک دو جھلک جو دکھائی دیں ان سے مجھے لگے وہ وہی شخص تھا جو اس دن مجھے بس اسٹاپ پر ملتا تھا۔

اس کے بعد یہ اکثر ہونے لگا جب میں ٹیوشن پڑھ کر دیر سے نکلتی تو کوئی میرا پیچھا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے جھنجھلا کر اسے پکڑنے کا فیصلہ کیا اور جب ٹیوشن سے واپسی پر اس شخص کو پیچھے پایا تو ایک تاریک گلی میں پہنچ کر میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اب کوئی بالکل پاس آئے بغیر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ نمودار ہوا اور اس نے آگے دیکھا لیکن ظاہر میں اسے نظر نہیں آتی تھی۔ اب وہ روشنی میں تھا اور میں نے اسے واضح پہچان لیا تھا، یہ وہی لمبے بالوں والا شخص تھا۔ اس وقت بھی اس نے اچرک اوڑھ رکھی تھی۔ ابھی وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ میں بلنگی گلی سے نکلی اور اس کے پاس آ کر بولی۔ ”تو یہ تم ہو؟“

اس نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ ”آپ... کہاں چلا گیا تھا؟“

”اس گلی میں تمہیں پکڑنے کے لیے... آخر تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟“ مجھے قصہ آ گیا تھا۔

”آپ کا حفاظت کے لیے۔“

”تمہیں میری حفاظت سے کیا دلچسپی ہے؟“

”کیا یہ بات جانتا آپ کے لیے ضروری ہے؟“ وہ ٹھہرے انداز میں بولا۔ اس کے انداز پر میں گھر گئی۔

”نہیں... لیکن تمہارا اس طرح میرے پیچھے آنا میری بدنامی کی وجہ بن سکتا ہے۔“

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”خدا کا قسم، اگر اکبر خان کو شب بھی ہو جائے کہ اس کی وجہ سے آپ کا بدنامی ہو رہا ہے تو وہ یہ علاقہ ہی چھوڑ جائے گا۔“

تو اس کا نام اکبر خان تھا، میں نے کہا۔ ”تم جو کر رہے ہو وہ لوگوں کی نظر سے چھپا نہیں رہے گا۔ میں مانتی ہوں کہ تم میرے خیال سے یہ سب کرتے ہو لیکن پلیز اس طرح مجھے مشکل ہوگی۔“

اس نے سوچا اور پھر کہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے لیکن ام تم پر نظر ضرور رکھے گا۔ اس طرح کہ آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

اگر تم میرے آس پاس رہے تو مجھے اور پھر دوسرے لوگوں کو

ضرور پتا چل جائے گا۔“

اس نے شانے اڑکے اور پلٹ کر واپس چلا گیا۔ ویسے بھی اس جگہ سے میرا گھر زیادہ دور نہیں تھی۔ میں گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وہ کیوں میری حفاظت کے لیے اتنا فکر مند ہے؟ اس کا میرے ذہن میں ایک ہی جواب آ رہا تھا لیکن میں اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ ساتھ ہی مجھے پریشانی ہونے لگی تھی۔ اگر یہ بات میرے گھر والوں کے علم میں آ جاتی تو وہ کیا سوچیں گے؟ میرے ابو، امی اور ایاز بھائی مجھ پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ ایک دن میں ٹیوشن سے ایاز بھائی کے ساتھ واپس آ رہی تھی تو ایاز روالی گلی سے گزرتے ہوئے اکبر خان کو کچھ افراد کے ساتھ ٹوڑتے دیکھا۔ وہ ایاز بھائی اور اس کے سامنے تین تھے لیکن ایاز ہی سب پر بھاری دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ کون ہے؟“

”بدمعاش ہے۔“ ایاز بھائی بد مزگی سے بولے۔

”آئے دن اس کے کسی نہ کسی سے جھگڑے ہوتے ہیں۔“

چند مہینے پہلے ایک اور تانی گرامی بدمعاش کی کسی بات پر

ٹانگ توڑ دی تھی اب وہ انیشن پر چنے کی ریزھی لگا رہا ہے۔

بیساحی کے بغیر چلی نہیں سکتا تو بدمعاش کہاں سے کرے گا؟“

گویا اکبر خان نے سچ سچ اس بدمعاش کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ بات جان کر مجھے بہت مسرت ہوئی تھی۔ یہ کام اس نے میری خاطر کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ سچ سچ مجھے نظر نہیں آیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے بے خبر نہیں تھا اور جب میں ٹیوشن سے واپس آتی تھی تو وہ میرے آس پاس ہوتا تھا۔ پھر میرے پیپر شروع ہو گئے اور ٹیوشن جانا بند کر دیا۔ پیپر زکے بعد گھر سے باہر جانا بھی بند ہو جاتا۔ اس لیے اکبر خان کے نظر آنے یا اس سے سرراہ ملاقات کا امکان بھی باقی نہ رہتا۔ جب یہ خیال میرے ذہن میں آیا تو مجھے تعجب ہوا تھا کہ میں کیوں اس سے ملنے کے بارے میں سوچ رہی تھی؟ پیپر زک شروع ہوئے تو میں سب بھول کر ان کی تیاریوں میں لگ گئی۔ اس سے کچھ دن پہلے میں نے ایک رات امی کو ابو سے کہتے سنا۔ ”اب شاہین کا شالہ ایکس کی ہو جائے گی اس لیے اس کی شادی کا سوچیں۔“

”سوچنا کیا ہے کوئی اچھا رشتہ آئے تو چھان چک کر شادی کر دو لیکن شاہین کی رضامندی لازمی لے لیتا۔“

اگست 2012ء

www.pdfbooksfree.pk

لے ہمیں فون مل گیا تھا۔ اسی دن میں نے امی سے کہا۔ ”آپ ابو سے کہیں اگر اکبر خان دوبارہ آپ سے بات کرے تو آپ اسے صاف منع کر دیں اور کہہ دیں کہ میں کسی صورت اس سے شادی نہیں کروں گی۔“

”تیرے ابو سے پہلے ہی منع کر چکے ہیں۔“ امی نے کہا۔

”تب اس نے کچھ کہا تو نہیں۔“

”وہی دھمکی دی ہے کہ تیری شادی کہیں اور نہیں ہونے دے گا۔“ امی پریشانی سے بولیں۔

”آپ فکر نہ کریں وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ بس ایسے ہی دھمکی دے رہا ہے۔“ میں نے امی کو تسلی دی۔ حالانکہ میں خود پریشان ہوئی تھی۔ اکبر خان خندی آدمی تھا۔ وہ آسانی سے ماننے والا آدمی نہیں تھا۔ پھر اس نے اپنی دھمکی پر عمل

کریوں سے عام لوگ سمجھتے ہیں، وہ عام آدمی نہیں ہے۔“

میں سمجھ رہی تھی امی اسے بدمعاش قرار دے رہی تھیں اور غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ ابو نے نہ جانے کیسے سمجھا بھگا کر بھائی کو ٹھنڈا کیا، ورنہ وہ بہت غصے میں آگئے تھے۔ اگلے دن جب ابو اور بھائی دفتر چلے گئے۔ ماہین کالج گئی تھی۔ میں بچن میں کام کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون لاؤنچ میں رکھا تھا۔ امی ناشتے کے بعد باہر صحن میں واک کر رہی تھیں میں نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

”شاہین ا! دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز آئی تو میں چونک گئی۔

”کون ہیں آپ؟“

”ام اکبر ہے۔“

میرادل ایک لمبے کور کا تھا میں نے ٹھٹھکی سے باہر واک کرتی امی کو دیکھا۔ ”تم.... کیوں فون کیا ہے؟“

”ام آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔“

”لیکن میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“ مجھے غصہ آگیا۔ ”تم نے میرے ابو کو راستے میں روک کر اس طرح سے بات کی۔“

”اماریات سنو۔ ام نے ان سے کہا کہ ام آپ کے گھر آنا چاہتا ہے لیکن انہوں نے کہا کہ جو بات کرتا ہے یہیں کرلو۔ ام نے کر لی۔“

”تم نے انہیں دھمکی دی کہ میری شادی کہیں اور نہیں ہونے دو گے؟“

”ہاں یہ ام نے ان سے بولا اور اسی سے اندازہ کر لو ام آپ کے معاملے میں کتنا مجبور ہے۔“

”تم کہاں سے مجبور ہو گئے، مجبور تو ہم جیسے شریف لوگ ہوتے ہیں۔“ میں نے ٹھٹھکیا۔

”آپ ام کو بدمعاش کہہ رہا ہے۔“

”تو اور کیا کہوں اکبر! میری شادی کا فیصلہ میرے ماں باپ کریں گے اور وہ جہاں نہیں گئے میں سر جھکا دوں گی۔ مہربانی کر کے اب یہاں فون مت کرنا۔“

”شاہین میری بات....“ اس نے کہا جاپا لیتن میں نے فون رکھ دیا اور پھر کڑیل سے ہٹا دیا تاکہ وہ دوبارہ ملائے تو اسے آنسو ملے۔ ”شکر ہے امی اس دوران میں باہر ہی رہی تھیں اور انہیں اس کال کا پتا نہیں چلا تھا۔ اس زمانے میں فون بہت کم گھروں میں ہوتا تھا لیکن ابو پروفیسر تھے اس

تھا۔ میں نے ایک بار پھر امی سے بات کی تو انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اکبر خان نے آج دفتر سے آتے ہوئے تمہارے ابو کو روک لیا۔“

میری سانس رک گئی۔ ”اکبر خان نے.... لیکن کیوں؟“

”وہ ہم سے تمہارا رشتہ چاہ رہا ہے۔“ امی بولیں۔

”تمہارے ابو سے یہ بات کرتے ہوئے اسے ذرا خیال نہیں آیا کہ وہ خود کیا ہے اور زمانہ سے کیا سمجھتا ہے۔“

میرادل ڈوبنے لگا۔ ”تو امی آپ مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہیں، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر اکبر خان مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی خواہش ہے میں نے تو اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔“

امی کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”میں جانتی ہوں میری بچی.... لیکن ہم مشکل میں تو پڑ گئے ہیں۔“

”ابو سے کہیں وہ اکبر خان کو صاف انکار کر دیں۔“

”اس نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ انکار کا بھی کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، اس نے تمہارے ابو سے کہا کہ وہ تمہاری شادی اس سے کریں یا نہ کریں یہ ان کی مرضی ہے لیکن تمہاری شادی کہیں اور نہیں ہوگی۔“

”میں حیران رہ گئی۔“ یہ کہا ہے اس نے؟“

”ہاں صاف دھمکی دی ہے۔“

”ابو نے اس سے کیا کہا؟“

”انہوں نے اس سے کہا کہ اول تو یہ کسی لڑکی کا رشتہ مانگنے کا کوئی شریفانہ طریقہ نہیں ہے، دوسرے ہر آدمی اپنی بیٹی کی شادی کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے رشتے دھمکیاں دے کر نہیں کرائے جاتے۔“

”ابو نے ٹھیک کہا۔“

”مجھے ڈرا بڑی طرف سے ہے، وہ جوان ہے اور اس کا خون بھی گرم ہے کہیں وہ اکبر سے لڑنے پڑے۔“

میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔ میں نے اکبر خان کو لڑتے دیکھا تھا اور میرا بھائی ایک عام شریف آدمی تھا جس کا لڑائی بھڑائی سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ ابو امی نے ان کی تربیت ہی اس طرح کی تھی۔ ”امی آپ بھائی کو روکیں... لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا.... بس ابو اور آپ چپ کر جائیں.... وہ خود سمجھ جائے گا۔“

امی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میری بیٹی اس قسم کے

کہا۔ ”بس اکبر خان کی طرف سے پریشانی ہے۔ اللہ کرے وہ حد سے نہ گزرے۔ ورنہ ہم شریف لوگ کسی بدمعاش کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہیں۔“

اکبر خان بدمعاش تھا، میں نے جس سے سنا اس نے اسے بدمعاش ہی قرار دیا لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کے لیے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس دن کے بعد سے امی نے یہ ذکر نہیں کیا۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ ابھی تک اکبر خان نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جو ہمارے لیے مسئلہ بنی تو اس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ امی نے اپنی بیماری کے باوجود میرے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے امی کی فکر تھی۔ ماہین ابھی پڑھ رہی تھی اور گھر کی ذمہ داری امی پر آ جانی جبکہ ان کی بیماری اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ لیکن میں امی کو منع بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ نہ جانے میرے منع کرنے کو کن معنوں میں لیں۔ انہوں نے سب سے میرے رشتے کے لیے کہنا شروع کر دیا تھا۔ ابو پہلے ہی ان کو اجازت دے چکے تھے۔

گزشتہ چند مہینوں میں امی کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی لیکن میں جانتی تھی ابھی وہ گھر کی ذمہ داریاں پہلے کی طرح نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ میری خواہش تھی کہ میرے شادی ہونے تک امی ایاز بھائی کی دہن بھی لے آئیں تاکہ گھر کے کام ویسے ہی چلتے رہیں پھر کچھ وقت گزرتا تو ماہین بھی کاموں میں حصہ لے سکتی تھی۔ ابھی تو اسے چھوٹی ہونے کی وجہ سے چھوٹی ملی ہوئی تھی۔ ایک دن ابو دفتر سے ذرا دیر سے آئے اور وہ کچھ پریشان بھی لگ رہے تھے۔ وہ امی کو لے کر کمرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر کے ان سے نہ جانے کیا بات کرتے رہے؟ جب باہر آئے تو امی بھی پریشان تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسی کیا بات ہو گئی ہے۔ امی کی تازہ رپورٹس بھی ٹھیک آئی تھیں۔ میں نے امی سے پوچھا تو وہ ٹال ٹال گئیں۔ رات کو ایاز بھائی دیر سے آئے تو ابو نے انہیں بھی کمرے میں بلا لیا۔ کچھ دیر بعد کمرے سے ان کی آواز بلند ہونے لگی، وہ کہہ رہے تھے۔

”وہ غنڈا بدمعاش ہوگا لیکن اس کی جرأت کیسے ہوئی آپ سے ایسی بات کرنے کی؟“

ابو ایاز بھائی کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرادل دھڑک اٹھا تھا۔ کیا ابو کا کسی سے جھگڑا ہو گیا

تھا۔ میں نے ایک بار پھر امی سے بات کی تو انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اکبر خان نے آج دفتر سے آتے ہوئے تمہارے ابو کو روک لیا۔“

میری سانس رک گئی۔ ”اکبر خان نے.... لیکن کیوں؟“

”وہ ہم سے تمہارا رشتہ چاہ رہا ہے۔“ امی بولیں۔

”تمہارے ابو سے یہ بات کرتے ہوئے اسے ذرا خیال نہیں آیا کہ وہ خود کیا ہے اور زمانہ سے کیا سمجھتا ہے۔“

میرادل ڈوبنے لگا۔ ”تو امی آپ مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہیں، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اگر اکبر خان مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی خواہش ہے میں نے تو اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔“

امی کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”میں جانتی ہوں میری بچی.... لیکن ہم مشکل میں تو پڑ گئے ہیں۔“

”ابو سے کہیں وہ اکبر خان کو صاف انکار کر دیں۔“

”اس نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ انکار کا بھی کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، اس نے تمہارے ابو سے کہا کہ وہ تمہاری شادی اس سے کریں یا نہ کریں یہ ان کی مرضی ہے لیکن تمہاری شادی کہیں اور نہیں ہوگی۔“

”میں حیران رہ گئی۔“ یہ کہا ہے اس نے؟“

”ہاں صاف دھمکی دی ہے۔“

”ابو نے اس سے کیا کہا؟“

”انہوں نے اس سے کہا کہ اول تو یہ کسی لڑکی کا رشتہ مانگنے کا کوئی شریفانہ طریقہ نہیں ہے، دوسرے ہر آدمی اپنی بیٹی کی شادی کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے رشتے دھمکیاں دے کر نہیں کرائے جاتے۔“

”ابو نے ٹھیک کہا۔“

”مجھے ڈرا بڑی طرف سے ہے، وہ جوان ہے اور اس کا خون بھی گرم ہے کہیں وہ اکبر سے لڑنے پڑے۔“

میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔ میں نے اکبر خان کو لڑتے دیکھا تھا اور میرا بھائی ایک عام شریف آدمی تھا جس کا لڑائی بھڑائی سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ ابو امی نے ان کی تربیت ہی اس طرح کی تھی۔ ”امی آپ بھائی کو روکیں... لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا.... بس ابو اور آپ چپ کر جائیں.... وہ خود سمجھ جائے گا۔“

امی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میری بیٹی اس قسم کے

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

WELCOME BOOK SHOP

شروع کر دیا۔ امی کی کوشش سے میرے لیے کچھ رشتے آئے تھے ان میں سے ایک امی ابو کو مناسب لگا تو انہوں نے لڑکے والوں کو بلالیا۔ وہ آئے اور مجھے پسند بھی کر گئے لیکن اس کے بعد ان کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔ کچھ عرصے بعد امی نے معلوم کرایا تو انہوں نے جواب دیا کہ بعض مجبور یوں کی وجہ سے ہمارے ہاں رشتہ نہیں کر سکتے ہیں۔ امی افسوس کر کے رہ گئیں کیونکہ انہیں رشتہ بہت پسند آیا تھا۔ پھر ایک رشتہ اور ایلڑا لڑکا سعودی عرب میں ملازم تھا۔ اس کے گھر والے بھی مجھے پسند کر کے گئے بلکہ لڑکے کی والدہ نے تو جانتے ہوئے کہہ دیا کہ لڑکی بس ان کی ہے اور وہ جلد رسم کرنے آئیں گے مگر جانے کے بعد وہ بھی چپ کر گئے۔ جب کئی مہینے بعد بھی انہوں نے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تو امی نے انہیں فون کیا۔

”بہن کیا بات ہے آپ نے دوبارہ رابطہ ہی نہیں کیا؟“

”رابطہ کیا کریں۔“ خانو تن لہجے میں بولی۔ ”جبکہ آپ کی بیٹی کو پہلے ہی کوئی بد معاش پسند کرتا ہے اور ہمیں دھمکیاں دیتا ہے۔ نہ بہن ایسا رشتہ نہیں چاہیے ہمیں۔“

بات واضح تھی دونوں رشتوں کو اکبر خان نے مداخلت کر کے بھگا دیا تھا۔ اس روز امی رو پڑی تھیں۔ ”اب کیا عزت رہ گئی ہے ہماری دوسروں کی نظروں میں؟“

میں تصور وار نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بن گئی تھی۔ امی ابو کی نظروں سے بچتی پھر رہی تھی حالانکہ انہوں نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا لیکن یہ سب ہو تو میری وجہ سے رہا تھا۔ ایاز بھائی البتہ مجھ سے بات نہیں کرتے تھے۔ شاید وہ مجھے قصور وار سمجھتے تھے یا شاید شرم آتی تھی۔ ماہین کو بھی صورت حال کا پتا تھا، اس نے کئی بار اس موضوع پر مجھ سے بات کی کہ اکبر خان ایسا کیوں چاہ رہا ہے؟ میں نے ہر بار یہی کہا کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہو گیا تھا۔ گھنا ہوا اور مایوس سا۔ کوئی کسی سے بات کم کرتا تھا اور زیادہ تر سب گم صم سے رہتے تھے۔ ابو کالج سے آتے اور اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ ایاز بھائی آتے ہی دیر سے تھے۔ میں کام کرتی اور پھر اپنے کمرے میں آ جاتی۔ جب رات کو سب سو جاتے تو تنگے میں منہ چسپا کر گھٹ گھٹ کر روتی تھی۔ اس سے زیادہ میں اور کیا کر سکتی تھی۔ اگر میں جان دے کر اپنے گھر والوں کو اس مشکل سے نکال سکتی تو میں اس کے لیے جی تیار تھی۔

امی کی طبیعت اس پریشانی کی وجہ سے دوبارہ بگڑنے لگی تھی۔ اکثر انہیں انجانا کا درد اٹھتا تھا۔ وہ دوا اور معمولات میں تاخیر کرنے لگی تھیں۔ واک اور سونے جانے کی باہندی چھوڑ دی تھی۔ کھانا بھی برائے نام کھا پاتی تھیں۔ میں کوشش کرتی تھی لیکن ان کو سنسناہل نہیں پانی تھی۔ بس انہیں دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھی۔ ابو انگ گم صم سے ہو گئے تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر لگتا جیسے دو زندہ مردے ہوں جو حرکت کرتے ہوں، سانس لیے اور کھاتے پیتے ہوں، باقی ان میں زندگی کے آثار باقی نہیں رہے تھے۔ ماہین بہت شوخ اور ہنسنے بولنے والی لڑکی تھی لیکن گھر کے ماحول نے اسے بھی چپ کرادیا تھا۔ ایک رات امی کو پھر انجانا کا درد ہوا اس بار دورہ شدید تھا اس لیے ابو اور بھائی انہیں لے کر اسپتال کی طرف بھاگے۔ وہاں فوری علاج سے ان کی حالت سنبھل گئی تھی لیکن ڈاکٹروں نے وارنٹک دے دی کہ اگر ان کا مسئلہ اسی طرح خراب رہا تو اگلا دورہ جان لیوا بھی ہو سکتا تھا۔ میں اور ماہین گھر میں روئے اور امی کی صحت کے لیے دعا کرتے رہے تھے۔ صبح ابونے آکر ان کی حالت بتائی تو ہمیں ڈرا سکون ملا لیکن ساتھ ہی ڈاکٹروں کی وارنٹک نے پریشان کر دیا تھا۔ اگلے دن امی گھر آ گئی تھیں اور انہیں مکمل بیڈ ریسٹ کا کہا گیا تھا۔ اس رات جیب امی اور سب گھر والے سو گئے تھے تب بھی میں جاگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا اور سو گئی۔

اگلی صبح میں نے امی کا برقع پہنا۔ ماہین کی پیچھے سے پہلے کی چٹیاں ہو گئی تھیں اس لیے وہ گھر پر موجود تھی۔ مجھے برقع پہننے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہی ہیں؟“

میں چادر لے کر باہر جاتی تھی جہاں بار برقع پہنا تھا۔ ”ماہین میں ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں امی کو مت بتانا اگر وہ میرے بارے میں پوچھیں تو کہہ دینا کہ نہا رہی ہوں۔“

ماہین فکر مند تھی لیکن میں اسے بتائے بغیر باہر آ گئی۔ میں نے برقع کی نقاب بھی لگا لی تھی اور اب مجھے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ میں نے راستے میں دکان سے ایک چیز لی اور اس ہوٹل تک آئی جو اکبر خان کا مخصوص ٹھکانا تھا۔ میں ہمت کر کے ہوٹل میں آئی اور کاؤنٹر پر بیٹھ آدی سے اکبر خان کے گھر کا پتا پوچھا۔ وہ اکبر خان کے نام پر چونکا۔ ”اس سے آپ کو کیا کام ہے؟“

”بھائی ایک کام ہے اگر آپ کو اکبر خان کا پتا معلوم ہے تو بتا دیں۔“

اس نے ایک ہیرے کو بلایا۔ ”یہ بی بی اکبر خان سے ملنا چاہتی ہے اس کے گھر کا سمجھا دو۔“

”آؤ بی بی۔“ ہیرے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”سمجھاتا کیا ہوں، پہچان کر آ جاتا ہوں۔“

اس کے لہجے پر میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھ رہا تھا۔ اکبر خان جیسے آدمی سے کوئی شریف عورت تو ملنے آ نہیں سکتی۔ بہر حال وہ مجھے کالونی کی ایک گندی سی گلی میں لے کر آیا جہاں چھوٹے چھوٹے مکانات تھے۔ وہاں کچرے کے ڈھیر تھے اور اس ڈھیر پر کتے بلیوں کے ساتھ غریبوں کے بچے بھی موجود تھے۔ وہ چیزیں جن جن کر کھا رہے تھے۔ میں اسی جگہ بی بی بوھی تھی لیکن میں نے آج تک یہ گلی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا بد بو اتنی شدید تھی۔ پیرا ایک کھڑی نما انعام تک لایا اور اس کا دروازہ جایا۔ اندر سے اکبر خان کی آواز آئی۔

”کون ہے؟“

”خان جی دروازہ کھولو تمہاری مہمان آئی ہے۔“

اکبر خان نے دروازہ کھولا اور میری طرف دیکھا تو میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اکبر خان، میں ہوں۔“

وہ چونکا اور اس نے ہیرے سے کہا۔ ”ٹھیک ہے تو.... اور سن.... اگر ام نے کسی اور کے منہ سے کچھ سنا تو تیری گردن مروڑ دے گا، سمجھتا؟“

ہیرے نے خوف زدہ انداز میں سر ہلایا اور وہاں سے تقریباً بھاگ گیا۔ اس کے جانے کے بعد اکبر خان نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کیوں آیا ہے؟“

”تم نے مجبور کیا ہے۔“ میں نے تنگی سے کہا۔ ”میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔“

”اگر ایک بد معاش پر اعتبار ہے تو اندر آ جاؤ۔“

میں اندر آ گئی، یہ چھوٹی سی کھڑی تھی جس میں ایک طرف چار پائی تھی اور ایک ٹریک پر میلے کپڑے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے کہیں سے ایک کرسی برآمد کر کے میرے لیے رکھی۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

”اکبر خان.... میں فیصلہ کرنے آئی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کیسا فیصلہ؟“

”میرے ماں باپ شریف لوگ ہیں وہ تمہارا مقابلہ نہیں

کر سکتے ہیں، میں اس ذلت اٹھانے کی سکت بھی نہیں ہے۔“

”ام نے ایسا کچھ....“

”میری بات سنو.... تم نے جو کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کل امی کو دوبارہ ہارٹ ایٹیک ہوا اور ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے اگلا ایک جان لیوا ہوگا۔ میرا بھائی اور میرے ابو اب مجھ سے نظر ملا کر بات نہیں کرتے ہیں کہ وہ ایک بد معاش سے میری حفاظت نہیں کر سکتے۔“

اکبر خان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے شیشے کا ایک گلاس اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ ”ام نے کب آپ کو بے عزت کیا ہے ام نے تو ہمیشہ آپ کا حفاظت کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں مانتی ہوں اور تمہاری احسان مند ہوں لیکن اس کے سلسلے میں تم نے میرے باپ کو ہر راہ روک کر رشتہ چاہا اور پھر انکار پر دھمکی دی اور پھر اپنی دھمکی پر عمل بھی کیا۔ جو رشتے ڈر کر لوٹ گئے وہ دس دوسرے لوگوں کو بتائیں گے کہ اس لڑکی کا تو کسی بد معاش سے چکر ہے۔ رفتہ رفتہ بات ہمارے سارے جاننے والوں میں پھیل جائے گی اور تم بتاؤ کہ پھر ہماری کیا عزت ہوگی؟“

”ام آپ کو کسی اور کا ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔“ اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ پہلے ہی سمجھ گیا ہوگا کہ ام آپ کو پسند کرتا ہے لیکن آج میں ام آپ کو بتاتا ہے کہ ام آپ سے محبت کرتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے تم مجھے بزدلی حاصل کرنا چاہو۔“

”ام اس معاملے میں مجبور ہے۔ آپ کا رشتہ دینا یا نہ دینا آپ کے ماں باپ کا اختیار میں ہے لیکن ام کی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ امار اس کا بات نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے تب ایک کام میرے بس میں ہے۔“

میں نے اسے لفافے سے ڈی ڈی کی بی بول نکال کر دکھائی جو میں نے ابھی دکان سے لی تھی۔ ”میں یہ بی بی ہوں میرے ماں باپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا کچھ دن روکھو کر میر کر کہیں گے اور تمہاری ضد بھی پوری ہو جائے گی میں کسی کی نہیں ہوں گی۔“

”نہیں۔“ اس نے اضطراب سے کہا اور مجھ سے بول چسین لی۔ ”آپ ایسا نہیں کرے گا۔“

”اکبر، اگر تم بول چسین کر سمجھ رہے کہ میں ایسا نہیں کروں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ایسی بولیں ہر پرچون کی دکان پر ملتی ہیں۔ کیا تم وہ سب بھی حاصل کر لو گے اور صرف



ڈی ڈی ہی نہیں ہے بہت ساری طریقے ہیں اپنی جان لینے کے۔ تم نے میرے لیے عزت سے جینے کا راستہ نہیں چھوڑا ہے لیکن میں عزت سے مر تو سکتی ہوں۔“

اکبر خان کا چہرہ ایسے ٹوٹنے لگا جیسے پتھر کا مجسمہ ٹوٹا ہے۔ اس پتھر کیلے چہرے کے پیچھے سے ایک شکست خوردہ انسان کا چہرہ نکلا تھا۔ اس نے ایک آتشیں سانس لی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ چاہتا ہے کہ اکبر خان اپنا یہ ضد چھوڑ دے تو وہ چھوڑ دے گا۔“ وہ گرنے کے انداز میں چار پائی پر بیٹھ گیا۔ ”بچپن سے اکبر خان نے صرف محرومیاں دیکھا۔ ماں باپ چٹائیں کہاں گیا؟ کچھ دن رشتے داروں کے ہاں ٹھوکرین کھاتا رہا پھر جب خود سے زندہ رہنے کا ہمت آیا تو گلیوں میں نکل آیا تب سے دنیا سے اپنا رزق اور اپنا حق کے لیے لڑ رہا ہے کیونکہ مانگنے سے صرف ہجک ملتا ہے۔ کوئی رشتہ نہیں پایا، کسی کا محبت نہیں پایا پھر آپ کو دیکھا تو لگا جیسے آپ امارے لیے ہے۔ ام پائل اپنا دل کا خیال کوچ سمجھ بیٹھا۔ آپ سے محبت کرنے لگا اور یہ سوچ لیا کہ آپ بھی ام سے محبت کرتا ہے لیکن....“ اس نے رک کر ایک اور گہری سانس لی۔ ”یہ امارا خوش نہیں تھا۔“

میں رو رہی تھی، اکبر خان کا اعتراف قطرہ قطرہ کر کے میرے دل پر گر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے جیسا آپ چاہے گا ویسا ہی ہوگا، اکبر خان اپنا دل ماروے گا۔ پھر یہ دل بھی کسی کے لیے زندہ نہیں ہوگا، پہلے بھی زندہ نہیں تھا بس آپ کے واسطے زندہ ہوا تھا۔“

”پلیز ایسی باتیں مت کرو۔“ میں نے کہا۔

”شایں آپ نے اکبر خان سے وہ منوالیا جو اس سے موت کا فرشتہ بھی نہیں منوا سکتا تھا لیکن ایک بات سے آپ ام کو نہیں روکے گا۔“

”کون سی بات سے؟“

”جب تک شادی نہیں ہو جاتی آپ کا حفاظت میرا ذمہ ہے، اس کا بعد ام فکر نہیں کرے گا۔“

میں نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“

”اب آپ جاؤ.... اور فکر مت کرو، ام آج ہی آپ کا والد سے معافی مانگ لے گا اور آئندہ کے لیے وعدہ کر لے گا۔ آپ کا خوشی، امارا خوشی ہے۔“

لیکن میری خوشی کیا تھی، یہ مجھے گھر آکر پتا چلا۔ میری خوشی اکبر خان تھا، میں اس کے دل سے اپنی محبت نکالنے لگی

تھی لیکن اللہ اس کی محبت دل میں بسا کر لے آئی۔ میں جانتی تھی، میں کبھی اس کی نہیں ہو سکتی تھی۔ امی ابو اس رشتے پر قیامت تک راضی نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود میں اس سے محبت کر بیٹھی تھی اور تب میں نے جانا کسی سے محبت کرنا یا نہ کرنا آدمی کے اپنے اختیار میں کہاں ہوتا ہے، یہ تو وہ آگ ہے جو خود گتی ہے اور خود ہی جلتی ہے۔ اسے نہ کوئی لگا سکتا ہے اور نہ بچھا سکتا ہے۔ اس شام ابو آئے تو ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اکبر خان نے ان سے بات کر لی ہے۔ وہ امی کو کمرے میں لے گئے اور یہ ”خوشخبری“ ان کو بھی سنادی۔ امی کے چہرے پر راتنی تیزی سے رونق آئی تھی کہ مجھے اپنی محبت کی نارسائی کا ذرا بھی دکھ باقی نہیں رہا۔ ماں باپ کی خوشی میرے لیے دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر تھی۔ پھر امی فکر مند ہو گئیں۔ ”اب تو کوئی رشتہ بھی نہیں ہے جو دو لوٹ کر گئے تو اس کے بعد کوئی آیا ہی نہیں۔“

”رشتہ سے ایاز کی ماں.... میرے ایک کو لیک ہیں، ان کا بیٹا ہے، ابھی حال میں کسی فرم میں اکاؤنٹنٹ لگا ہے۔ خاندان بہت اچھا ہے وہ مجھ سے کئی مہینے سے کہہ رہے ہیں لیکن میں ٹال رہا تھا۔“

”بس تو اب جلدی سے کہہ دیں، میں اپنی زندگی میں اپنی بچی کو اس کے گھر کا دیکھنا چاہتی ہوں۔“

یوں اظہار کا رشتہ آیا اور چند مہینوں بعد میں رخصت ہو کر اپنے گھر آگئی۔ شادی سے چند دن پہلے مجھے اکبر خان کی کال آئی۔ اس نے مجھے شادی کی مبارک دی اور پھر اپنا فون نمبر بتایا۔ ”اسے نوٹ کر لو، زندگی میں کبھی کسی امارا ضرورت ہو تو بس مجھے ایک کال کر دینا۔“

میں نے وہ نمبر کہیں نہیں لکھا تھا، اپنے دل پر نوٹ کر لیا تھا۔

☆☆☆

آج برسوں بعد اس نمبر کی ضرورت پڑی اور میں نے اسے لپٹا تو اکبر خان مل گیا۔ اس نے اپنے وعدے کی لالچ نبھائی تھی۔ میں اسے کہہ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اکبر خان مسئلہ حل کر دے گا اور ایسا ہی ہوا۔ اگلے دن جب ماہ جمیں شام کو سینئر سے آئی تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ اس نے آتے ہی ہر جوش انداز میں کہا۔ ”امی، آپ نے ٹھیک کیا تھا، آج وہ لفظ وہاں نہیں تھے۔“

”اب وہ کبھی آئیں گے بھی نہیں۔“ میں نے یقین سے کہا۔